مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ آل عمران (جلد نمبر 2)

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ آل عمران (جلد نمبر 2)

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۂ آل عمران)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	دسمبر 2016ء
مطبع	....	باقر یونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورہ آل عمران (جلد نمبر 2)
مطالب القرآن فی دروس الفرقان

انیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 121 تا 122)

لفظ توکّل کی وضاحت اور اس کے ثمرات ____ 29

جنگِ بدر کے بعد جنگِ اُحد کی مختصر سی تاریخ اور قرآنِ حکیم کی طرف سے یاد دہانی ____ 29

نبوت کے بعد رسالت کے فریضۂ زندگی کی اہمیت اور اس کے ثمرات ____ 30

قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کو مسخ کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ملتِ اسلامیہ کا ہر شعبہ مفلوج ہو کر رہ گیا ____ 31

مذہب نے دین کو تومی شدہ لاش بنا دیا ہے ____ 32

ظہورِ اسلام کے لیے اصطلاحاتِ قرآنیہ کو قرآنِ حکیم کے آئینہ میں پیش کرنا ہوگا ____ 32

نظامِ ربوبیت کے برعکس کفار کی ذہنیت اور ان کی ترجمانی _ 33

قرآنِ حکیم کے نزدیک لفظ توکل کا مفہوم قانونِ خداوندی پر بھروسے یا اعتماد کا ہے ____ 33

خدا کا قانون نہ تو کبھی بدلتا ہے اور نہ ہی راستے کا کبھی غلط تعین کرتا ہے ____ 35

خدا تعالیٰ کے قانون پر اس قدر یقینِ محکم کو ایمان کہتے ہیں _ 36

قانونِ خداوندی کے لیے لفظ کلمہ اور سنت اللہ کا بنیادی مفہوم اور اس پر یقینِ محکم کا نتیجہ ____ 36

کائناتی قوانین کے سلسلہ میں انسان کی حیثیت اور ان پر کنٹرول کا ملکہ ____ 38

خدائے علیم وخبیر کی طرف سے انسانی زندگی کے قوانین ہوں یا کائناتی اصول' ان کی حقیقت کو تسلیم نہ کرنا ہی کفر ہے ____ 38

خدا کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات ہی تمام خود ساختہ نظامِ زندگی پر غالب آئے گا ____ 39

خود کو مکمل راہنما کہلوانے والے کے لیے ان بنیادی صفات کا حامل ہونا ضروری ہے ____ 40

انسان کا خدا کے ساتھ تعلق صرف قوانین کی بنا پر ہے ____ 40

خدا کا صحیح تصور مردہ قوموں میں زندگی کی روح پھونک دیتا ہے 41

انسانی زندگی کے لیے دیے گئے قوانین اسی طرح محکم اور نتیجہ خیز ہیں جس طرح خارجی کائنات کے ____ 42

توکل کا وہ مفہوم جو قرآنِ حکیم اپنے ہاں پیش کرتا ہے ____ 43

لفظ اطاعت کا لغوی مفہوم اور اس کی عملی شکل ____ 43

اطاعت کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا دل ودماغ

قوانین کی صداقت پر پختہ یقین رکھتا ہو ______ 44
نظامِ خداوندی کے نفاذ کی خاطر ہجرت کی کٹھن منزل کی اہمیت 45
توکل اور پھر عمل یعنی کام لازم وملزوم ہونے کے باعث
ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں ______ 46
ایمان بالغیب بڑا پُر معنی لفظ ہے انسانی تگ وتاز اور
انہماک اسی کا رہینِ منت ہے ______ 46
دینِ خداوندی، مذہب کی شراکت تو کسی شکل بھی قبول نہیں کرتا 47
ہم صدیوں سے بغیر کوئی وضاحت کیے نظامِ حیات کے
مکمل ہونے کا نعرہ بلند کیے جارہے ہیں ______ 48
میدانِ عمل توکل کی ایک محسوس شکل پیش کرتا ہے ______ 49
خدا کے قانون پر بھروسہ نہ کرنے کا نتیجہ اور اس کی عملی شکل _ 49
خود کو خدا کے قانون کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے
ذرائع کے استعمال کی اہمیت ______ 50
نوعِ انسانی کے لیے سابقہ قوموں کی زندگی کے حالات
کو سامنے لانے کا مقصدِ عظیم ______ 51
حضرت موسیٰؑ کا مقابلے کے لیے اپنی قوم سے مطالبہ اور اس
کا ردِعمل اور اس کا انجام ______ 52
نئی نسل کی تیاری کے لیے 40 سال تک حضرت موسیٰؑ
کو صحرائے سینا میں رہنا پڑا ______ 52
توکلِ انسانی زندگی میں خود اعتمادی کا ملکہ پیدا کر دیتا ہے __ 53

بیسواں باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 123 تا 129)

سابقہ درس کے مطابق کسی غیبی مدد کا انتظار مکمل طور پر
قرآنی تعلیم کے خلاف ہے ______ 55
سفر اور آوارگی میں ایک بنیادی فرق ہے ______ 56
جنگِ بدر، جنگِ احزاب اور جنگِ اُحد میں مخالفین تعداد کے
مطابق ملائکہ کی تعداد کے ذکر کے علاوہ ملائکہ کے لفظ کا مفہوم 57
قرآنِ حکیم میں لفظ امر، امیر یا امیر المؤمنین کے لفظ کا استعمال
اور اس کا لغوی مفہوم ______ 57
قرآنِ حکیم میں قصۂ آدم کے دوران ملائکہ کا ذکر بڑا
قابلِ غور ہے ______ 58
انسان کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر باہر کی زندگی میں کسی قسم
کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ______ 59
انسان کی ساری زندگی اس کی نفسیات کا ہی آئینہ ہوتی ہے _ 59
مقامِ آدم کے بعد مقامِ مومن کے لیے بنیادی شرائط کو
پیشِ نظر رکھنا ہوگا ______ 60
معاشی نظام کی بدحالی انسان کو انسان ہی کا غلام بنا دیتی ہے 60
ملائکہ کا نزول انسان سے انقلاب آمیز دعوے کے لیے
استقامت کا تقاضا کرتا ہے ______ 61
جنت کسی خاص مقام کا نام نہیں بلکہ یہ تو زمین و آسمان کی
وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے ______ 61
قدرت خارجی کائنات کی مانند زندگی کے لیے دیے گئے
غیر متبدل اصول دعا سے نہیں بدلا کرتی ______ 63
نفسیاتی تبدیلی سے پیدا ہونے والی قوتیں (ملائکہ)
انسان کو خوف وحزن سے محفوظ کر دیتی ہیں ______ 63

فریبِ نفس سے ہمیشہ اضطراب پیدا ہوتا ہے ______ 64

ہمارے ہاں 1965ء کی جنگ کے افسانوں کی حقیقت _ 66

کلمہ جسے نظریہ زندگی کہا جاتا ہے اس کا تعلق ایک حقیقت
سے اور اس کی قوت کے اظہار سے ہوتا ہے ______ 66

جو قوم اپنے تاریخی حافظے کو کم کردے، وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔
اس سلسلے کی ایک گہری سازش ______ 67

1965ء کی جنگ کے شہدا کا خون اور وہاں کے مجاہدین
کی فتح کے علاوہ فلسطین کی بربادی وتباہی ہمارے جواب کی
آج بھی منتظر ہے ______ 67

جنگِ بدر، جنگِ احزاب اور جنگِ اُحد کے مجاہدین کا
ذکرِ خیر اور نزولِ ملائکہ کی کیفیت ______ 68

پاکستان کی نئی زیارت گاہوں کو جنم دینے والوں کی قربانی
کو افسانوں میں بدل دینے کی کوشش ______ 69

میدانِ جنگ میں مجاہدین کا ہر عمل خدا اپنی طرف
منسوب کر لیتا ہے ______ 70

خدا تعالیٰ کی طرف سے بدر کے میدان میں صحابہ کبارؓ
کو وارننگ ______ 70

میدانِ اُحد میں حضورﷺ کے حکم سے کوتاہی برتنے کا
نتیجہ فتح شکست میں بدل گئی ______ 71

قوموں کی تقدیر افراد کے ہاتھوں ہی سے بدلتی ہے ______ 71

شکست خوردہ قوم کے متعلق خدائے علیم وخبیر کی طرف سے
وحی کا نزول ______ 72

غلام اور لونڈیوں کے متعلق پہلی تفسیر طبری اور آخری تفسیر
تفہیم القرآن کا تفصیلی فتویٰ ______ 72

ہارون الرشید کے ہاں تین تین ہزار لونڈیوں کا معاملہ اور
یو این او چارٹر پر دستخطوں کا مسئلہ اور ہم ______ 73

جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآنِ حکیم کا حکم ______ 74

جنگ کے بعد مالِ غنیمت کے متعلق قرآنِ حکیم کا حکم ______ 74

جنگ کا جذبۂ محرکہ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی ______ 75

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نظامِ حیات کی ایک جھلک
صلح حدیبیہ بھی ہے ______ 76

حج کا بنیادی مقصد قرآنی نظامِ حیات کی عملی شکل کو
نوعِ انسانی کے سامنے پیش کرنا تھا ______ 76

خدا کرے کہ دین کا یہ نورِ آفتاب ایک بار پھر اس کرۂ ارض
کو منور کردے ______ 77

قندیلِ آسمانی سے مار و تنہا عقلِ انسانی کے سہارے
وضع کردہ نظام ہائے زندگی کی پسماندگی ______ 78

میدانِ جنگ سے گرفتار ہونے والے دشمنوں کے ساتھ سلوک
روا رکھنے کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی دو صفات قابلِ غور ہیں 78

کیا قرآنِ حکیم بے ربط کتاب ہے یا یہ ہماری بے نور عقل
کا قصور ہے؟ ______ 79

دشمن کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کے
معاشی نظام کے ذکر کی وجہ ربٰو سے بچنے کی تاکید ہے ______ 79

اکیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 130 تا 134)

دیدۂ کور کی بجائے کوئی آنکھ والا ہی قرآن کے جوبن کا نظارہ کرسکتا ہے ____ 81

دنیا میں ہر جنگ کے بعد سب سے زیادہ دقیق مسئلہ معاشی ہوتا ہے ____ 82

جنگ کی کامیابی کے بعد فوری طور پر تعمیری پروگرام کی ضرورت 82

قرآنِ حکیم کے بلند حقائق کو سمجھنے کے لیے قرآنی اصطلاحات کو سمجھنا نہایت ضروری ہے ____ 82

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں رِبٰوا کی اصطلاح کو ذہن نشین کیے بغیر اصل حقائق سامنے نہیں آسکتے ____ 83

جماعتِ مومنین کو جنگ کی اجازت لیکن کب اور کیسے؟ ____ 83

مسلمانوں کو خود مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ حکم ہے لیکن کیوں؟ ____ 84

مومن کو مومن رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ رِبٰو کی بنیاد پر حاصل ہونے والی رقم کو چھوڑ دے ____ 85

رِبٰوا کے جرم کی نوعیت نظامِ خداوندی کے خلاف کھلی بغاوت ہے ____ 85

خدا کی کتاب کے مطابق حکومت کا قیام ایک عملی پروگرام کا نام ہے، جس میں معاشی سسٹم کو اولیت حاصل ہے ____ 86

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے بالمقابل دوسرا معاشی نظام خدا اور رسول کے خلاف بغاوت ہے ____ 87

روپیہ کا استعمال ضروریاتِ زندگی کے علاوہ جمع شدہ سرمایہ رِبٰو کی شکل اختیار کر لیتا ہے ____ 88

اصل بات تو کسی نظام میں محنت کے معاوضے کی ہے ____ 88

دنیا بھر میں صدیوں سے اختیار کردہ معاشی نظام کی نوعیت اور قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی وضاحت ____ 89

رِبٰوا کا نظام وہ معاشی نظام ہے، جس کو قرآنِ حکیم نے اعلانِ جنگ سے تعبیر کیا ہے ____ 90

رِبٰوا کی بنیاد پر حاصل کردہ دولت انسانی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے ____ 91

سامانِ نشوونما کو عام کرتے ہوئے انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے بغیر وسائل میں اضافہ ممکن ہی نہیں ہوتا ____ 92

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے برعکس رِبٰوا پر مبنی نظام کے خدوخال ____ 93

مضاربت مزارعت کا سارا نظام رِبٰوا پر مبنی ہے ____ 94

بچوں کے نصاب میں سود مرکب اور سود سادہ کی بحثیں اور پھر کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کا معاملہ ____ 94

لفظ اَضْعَافًا اور مُضٰعَفَۃً کا لغوی مفہوم ____ 95

لفظ فساد کا لغوی مفہوم اور اس کی نوعیت ____ 96

قرآنی نظامِ حیات کا ماحصل ارض وسما میں پھیلی ہوئی جنت کا ظہور ہے ____ 97

لفظ متقی کا مروجہ ترجمہ قرآنی مفہوم کی بجائے رہبانیت کا تصور پیش کرتا ہے ____ 98

نفسیات کی دنیا میں غصے کی قوت کو استعمال کرنے کا

طریق اور قرآنِ حکیم ______ 99

غصے کی قوت کا رخ کسی بلند مقصد کی طرف موڑ دینے کا تعمیری انداز ______ 100

جنتی معاشرے میں متقیوں کی طرف سے زائد از ضرورت خواہ دولت ہو یا صلاحیتیں وہ دوسروں کی طرف منتقل کر دی جاتی ہیں 101

قرآنِ حکیم کے ہاں احسان کا مفہوم تو فریضۂ زندگی کا ادا کرنا ہے ______ 101

انسانی ذات کی نشوونما دوسروں سے کسی قسم کی شکریہ کی متمنی نہیں ہوتی ______ 102

بائیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 135 تا 143)

انسانی شخصیت کی نشوونما کا راز اپنی قوت کے استعمال میں ہے 104

انسان کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ چیز اس کا اپنی ذات کے ساتھ زیادتی کرنا ہے ______ 105

انسانی ذات کی آئندہ زندگی اعمالِ انسانی کے مجموعہ کی شکل وصورت کا ہی دوسرا نام ہے ______ 106

معاشرتی زندگی کا ایک دوسرا رخ' اس کا نتیجہ اور اس کا سدِ باب ______ 107

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی ذات کی اہمیت اور اس کے تحفظ کی تاکید ______ 108

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حضرت عمرؓ کی عدالت میں سال بھر کوئی مقدمہ بھی پیش نہ ہوا آخر کیوں؟ ______ 109

جہانِ فردا کی نوعیت کے علاوہ ذاتِ انسانی کی اہمیت ______ 110

انسانی اعمال کا تمام تر دارومدار احساس کی آبیاری کا رہینِ منت ہے ______ 110

صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی بنیادی وجہ قرآنِ حکیم کی پیش کردہ اصطلاحات کے مفہوم کو بدلنے کی بنا پر ہے 111

تقویٰ شعاری کا نتیجہ اور لفظ ذکر کا قرآنی اور لغوی مفہوم کسی چیز کو ہر آن سامنے رکھنے کے ہیں ______ 112

لفظ استغفار کی وضاحت ______ 113

کسی غلطی کے ارتکاب کے سلسلہ میں استغفار اور لفظ ذکر کے قرآنی مفہوم کو عملی شکل دینا ہوگی ______ 113

دینِ فکرِ انسانی کو اگر جلا بخشتا ہے تو مذہبی تصورات عقلِ انسانی کو پست ترین سطح پر دھکیل دیتے ہیں۔ ______ 114

انسانی زندگی کے آغاز میں فطرت کی مہیب قوتوں کے سامنے عقلِ انسانی کا کردار ______ 115

فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں الفاظ اور کچھ لکیروں کے سہاروں کی غلط سوچ اور اس کا نتیجہ ______ 115

قرآنِ حکیم کے ہاں تلاوت کا مفہوم تو اتباع کرنے یا پیروی کرنے کا ہے۔ ______ 116

مذہب نے ہمارے ہاں قرائت کا لفظ ہو یا مغفرت کا' جزا کا ہو یا ثواب کا' یا برکت کا' ہر لفظ پر عجمی رنگ کی تہیں جما رکھی ہیں ______ 117

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نزدیک ''اعمالِ قرآنی'' میں قرآنِ حکیم کی آیتوں کی تاثیر قابلِ غور ہے ______ 117

صداقتوں کی حقیقت اور حقائق کی اہمیت کی بجائے اعتقادات

کو اپنانے کا نتیجہ ________ 118

حجروں میں بیٹھ کر سیروا فی الارض کے وظیفے کرنے والی قوم کی
داستان کا نتیجہ ہمیشہ بے چراغ بستیوں کی شکل ہوتا ہے __ 119

کیا پاکستان میں آنے والے اس موجودہ تاریخی سیلاب کی
تباہی ہماری مذہبی اور سیاسی تفرقہ بازی کی عملی تفسیر نہیں؟ __ 120

قرآنِ حکیم اور اقبالؒ کے الفاظ میں مقامِ آدم کے بعد
مقامِ مومن کی پہچان ________ 121

زندگی میں پیش آنے والے مختلف حوادث انسانی صلاحیتوں
کو جلا بخشنے کا ذریعہ ہوتے ہیں ________ 122

جنت کے حصول کا طریق اور اس کا معیار (2:214;29:2;3:142) 123

جنت کے حصول کا فیصلہ میدانِ جنگ میں نکھر اور ابھر کر
سامنے آ جاتا ہے (33:10) ________ 125

جنت کے حصول کے لیے عملی تگ و تاز کے خلاف
ایک گہری سازش ________ 126

خود ساختہ روایات کے تحت جنت کے حصول کا طریق ____ 126

شہدا کو اپنے خویش و اقارب میں 70 افراد کے لیے
شفاعت کے حق کی سہولت ________ 127

اقبالؒ تو بخشش کی جنت کو قبول ہی نہیں کرتا ________ 128

دین کی بنیاد کے برعکس مذہبی تصورات کی
حاصل کردہ جنت کا حشر ________ 128

موت کے سلسلہ میں مومن کی پہچان ________ 129

مومن کسی فرد کا نام نہیں بلکہ یہ تو کریکٹر کے مجموعہ کا نام ہے _ 130

تیئسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیت 144)

ملتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے کی گہری سازش کی نشاندہی
اور اس کا علاج ________ 131

قرآنِ حکیم کے نزدیک نظامِ زندگی کا دارو مدار شخصیت کی
بجائے غیر متبدل اصولوں کا رہینِ منت ہوتا ہے ______ 131

زندگی کی شاہراہوں پر نشاناتِ راہ کی تکمیل کی ضرورت
اور ان کی اہمیت ________ 133

ختمِ نبوت دراصل انسانیت کی بلوغت کا اعلان تھا ______ 134

زندگی کے معاملات میں عام سطح سے لے کر مقامِ نبوت
تک باہمی مشاورت کی اہمیت اور اس کا حکم ________ 134

قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ حیات زندگی کے ہر شعبہ میں
مکمل شکل میں ہر لحاظ سے محیط ہے ________ 135

نبی اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد حضرت صدیق اکبرؓ
کا ایک عظیم حقیقت کشا اعلان ________ 135

انسانی دنیا میں اختیار کردہ اجتماعی نظام کی اہمیت اور اس
کے نتائج اور اثرات ________ 136

نبی اکرم ﷺ کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد قرآنی نظام
کی شکل و صورت کو ہی بدل دیا گیا لیکن کیسے؟ ________ 137

رسول کی اطاعت کا مفہوم نیز باہمی مشاورت کا طریقِ کار _ 138

مرکزِ ملت کی جگہ بادشاہت اور مذہبی پیشوائیت کے باہمی
گٹھ جوڑ کی ابتدا اور اس کا نتیجہ ________ 138

احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ابتدا اور قرآنِ حکیم

کی نشر واشاعت کی نوعیت اور سعی وکاوش ________ 139
امام مالکؒ کا مرتب شدہ چھوٹا سا مجموعہ جو صحاح ستہ
میں شامل نہیں ________ 140
امام احمد بن حنبلؒ کی مرتب کردہ مستند کتاب ہے کہ حدیث
اور کتاب اللہ کو ستھری اور خالص رکھو ________ 140
حدیثوں کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کا فرمان ____ 141
حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کا بیان
کردہ ایک اہم واقعہ ________ 141
روایات کے سلسلہ میں حضرت عمر بن خطابؓ کی بلند نگہی __ 141
جامع البیان میں ایک اور حدیث کا ذکر ________ 142
امام مالکؒ کی کتاب موطا میں مختلف واقعات کا ذکر ہے __ 142
سنیوں اور شیعوں کے الگ الگ حدیثوں کے مجموعوں کی
تاریخی حیثیت کا تفصیلی ذکر ________ 143
شروع میں حدیثوں کی جو تعداد جمع کیں ان کی تفصیل
اور پھر جو باقی رکھیں ان کی تعداد ________ 144
ان پیش کردہ حدیثوں کے سلسلہ میں پرکھ اسماء الرجال
کے مراحل ________ 144
اسماء الرجال کے مابین اعتماد اور عدم اعتماد کی شکل وصورت
اور راوی کے لیے ثقہ کی شرط کا جواز ________ 145
خلافتِ راشدہ کے بعد پیدا ہونے والی سیاست کے اثرات
جو فرقہ بندی کی شکل اختیار کر گئے ________ 145
صدیوں سے ملت اسلامیہ کی حد تک فرقہ بندی کی پیدا
کردہ مایوس کیفیت اور آئین کی پاسداری ________ 146
ہر فرقے کا الگ امام اس کی اپنی فقہ اور پھر وحی کی
دو قسموں کا عقیدہ ________ 147
مسلمانوں میں Personal Laws الگ اور پبلک لا
الگ یہ مذہب کی پیداوار ہے دین کی نہیں ________ 148
ختمِ نبوت کے بعد ہر صدی کے آخر میں ایک مجدد کے
آنے کا عقیدہ ________ 149
علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ذات خود اپنے آئینہ میں ____ 149
اگر انسان کے لیے دو قسم کا علم ہے تو پھر دو قسم کے ہی
مختلف ذریعے ہیں ________ 149
الہام اور کشف کے علاوہ مجدد وغیرہ کی اصطلاحات کا مفہوم
نیز حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تعارف ________ 150
مذہب کے نام پر پیدا کردہ غلط تصورات کو ختم کرنے کا طریق 151
ہر مذہب پرست قوم میں ایک آنے والے کے تصور کا
عقیدہ موجود ہے ________ 151
مذہبی پیشوائیت اور ملوکیت کا پروگرام اور اس کا نتیجہ ____ 152
انسانیت کی دنیا میں ختمِ نبوت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ
کی شخصیت اور اس روشن مینار کی حیثیت ________ 153
مذہب کی جگہ دین کا احیاء ختمِ نبوت کے بغیر ممکن ہی نہیں __ 153
انسانیت کو آخر کار شخصیتوں کی بجائے خدا کی کتاب کو ہی
معیار تسلیم کرنا پڑے گا ________ 155

چوبیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 144 تا 150)
سابقہ درس کے متعلق پیدا ہونے والے تاثرات کی نوعیت _ 157
ختمِ نبوت کا اعلان اس بات کی شہادت کہ اب انسانیت
کے لیے ہدایت کو مکمل کر دیا گیا ہے __________ 158
موت کے سلسلہ میں جھوٹے نبی اور سچے نبی کے سلسلہ
میں ایک غلط تصور __________ 159
کیا موت کا ایک دن مقرر ہے نیز تقدیر کے سلسلہ میں
مجوسیوں کی سازش کا ذکر __________ 161
شبِ برات کی حقیقت کے برعکس ہمارے ہاں پائے جانے
والے تصورات اور مکافاتِ عمل کا قانون __________ 161
کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (3:145) کے علاوہ خدا کا امر، حکم،
اذن یا خدا کے ارادے کی تفصیلی وضاحت اور ہمارے
ہاں لکھی گئی تفاسیر کا مقام __________ 162
لفظ اذن کے لغوی اور قرآنی مفہوم کا تفصیلی ذکر ______ 162
خدا تعالیٰ کی طرف سے کائنات میں طبعی قوانین کے مرتب
کرنے کی اہمیت اور ان کا نتیجہ __________ 164
لفظ اذن کے کیے گئے غلط تراجم، لفظ رجس کا مفہوم
اور پھر خودکشی کا معاملہ __________ 165
غلط عقائد کی پیدا کردہ غلط سوچ کا نتیجہ متضاد خیالی کے
سوا اور کچھ نہیں ہوتا __________ 166
زندگی کے معاملہ میں زندہ قوموں کے ہاں عمر کا بڑھنا یا
دوسری طرف عمر کا گھٹنا کیا معنی؟ __________ 167
لفظ کتاب اور اجل کے قرآنی مفہوم کی وضاحت ______ 167
مذہب پرست قوم جو تقدیر کے چکروں میں الجھ کر رہ چکی ہو،
ان کی نفسیاتی کیفیت __________ 169
طبعی قوانین کی دو قسموں کی وضاحت، لفظ ثواب کا حقیقی
مفہوم اور ہماری پریشاں نظری کا نتیجہ __________ 169
مقامِ آدم اور مقامِ مومن کی بنیادی خصوصیات اور ان
ہر دو مقامات تک رسائی کا طریق __________ 172
غیر متبدل قرآنی احکام و قوانین کی اہمیت اور نبی اکرم ﷺ
کی جفاکش زندگی کا ایک ایک مرحلہ نیز آپ ﷺ کی
ایک معصوم سی خواہش کا تذکرہ __________ 173
دل جمعی اور یک سوئی کے ساتھ ٹھوس پروگرام کا نتیجہ ہمیشہ
ہزاروں سال پر محیط ہوتا ہے __________ 174
انسانیت ساز پروگرام کی تکمیل کے لیے جدوجہد کے
دوران صبر و استقلال حصولِ منزل کے لیے نشانِ راہ ہے __ 175
میدانِ جنگ میں جماعتِ مومنین کے احساسِ ذمہ داری
کی نوعیت اور پھر خدائے خبیر کی طرف سے اس کے اجر کا انداز 176
صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کی حالتِ زار قابلِ افسوس بھی
اور قابلِ غور بھی __________ 178
پچیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیت 151)
شرک کی مختلف نوعیتیں اور ان کا حل __________ 179
لفظ شرک کی وضاحت اور اس سے پیدا ہونے والے
نفسیاتی نتائج کی مکمل شکل و صورت کا ذکر __________ 179

شرک کی بنا پر انسان کا دل خوف وحزن کی آماجگاہ بن جانے کی وجہ سے جرات وشجاعت اور قلندری کی نعمت سے ہی محروم ہوجاتا ہے ________ 179
خدا کے صحیح تصور کے اہمیت کے پیشِ نظر کائنات میں انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرنا ہے ________ 180
شرک کے بالمقابل دین کی پوری تعلیم کا محور مقامِ انسانیت کو سمجھ لینے کے گرد گھومتا ہے ________ 180
مقامِ آدمیت اور مقامِ انسانیت میں ایک بنیادی فرق ہے _ 181
کسی انسان کا اپنے سرکش جذبات کے سامنے جھک جانا ہی مقامِ انسانیت کی نفی ہے ________ 181
مقامِ انسانیت کا شعور تو انسانی سوچ اور اس کے تصورات کو فلک بوس بلندیوں سے ہم کنار کر دیتا ہے ________ 182
قوانینِ فطرت کی اطاعت غلامی یا ذلت کا تصور پیدا نہیں کرتی 182
شرک کے بنیادی مفہوم کی ایک عملی اور محسوس تر واضح مثال _ 183
مغربی جمہوریت کا ایک حقیقت کشا تجزیہ ________ 183
لفظ توحید کا بنیادی مفہوم صرف قوانینِ حداوندی کو تسلیم کرنے میں ہے اور اگر یہ نہ ہو تو وہ شرک ہے ________ 184
آدمی، انسان اور مقامِ مومن کا باہمی فرق ________ 184
مقامِ انسانیت کے حصول کے لیے نبی اکرم ﷺ کی زبانی قرآنِ حکیم کا ارشاد اور وہ یہ کہ خدا کی کتاب کو حاکم تسلیم نہ کرنے والے کافر ہیں (5:44) ________ 185
انسانیت کے لیے قرآنِ حکیم ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ہر طرح سے محفوظ ہے ________ 186
انسانوں کی آزادی کا راز اس میں ہے کہ وہ کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون کے سامنے نہ جھکیں ________ 186
توحید کی ثمر باری کے برعکس مختلف انسانوں کی غلامی کی اذیت ناکیوں کی ایک سبق آموز مثال ________ 187
شرک کے خوگر انسانوں کی نفسیاتی کیفیت اور ان کی عملی زندگی کی تصویر کشی ________ 188
شرک کی ماری افیون زدہ قوم کی زبوں حال زندگی کا ذکر ___ 189
قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ قوانین میں انسانی قوانین کی آمیزش شرک کے مترادف ہے ________ 189
کسی غلط سوچ کی بنا پر اختیار کردہ انسانوں کی اطاعت کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں ________ 190
ختم نبوت کے تصور کو عملی طور پر اپنانے کا طریق ________ 190
انسانوں کی اطاعت کے سلسلہ میں فریب دہی کا عمل اور اس کے اثرات ________ 191
قرآنِ حکیم جیسی کتابِ مبین کے متعلق باطنی معنی کا وہ غیر قرآنی عقیدہ جس نے اس قندیلِ آسمانی کے حقیقی مفہوم کو ہی اوجھل کر دیا ________ 191
باطنی علم کا تمام تر دارومدار نبوت کی مہر کو توڑتے ہوئے براہِ راست خدا سے ہم کلام ہونے پر ہے۔ ________ 192
خاصۂ نبوت کے برعکس انسانی علم کی وسعت صرف حواسِ خمسہ کے علاوہ کسی باطنی یا الوہیاتی کیفیات کی حامل نہیں ہوتی ___ 192

شخصیت پرستی کی پہچان یہ ہے کہ کسی انسان کی کہی ہوئی بات کو وحی کے درجے تک تسلیم کرلیا جائے 193

ذکر للعالمین کے لغوی اور قرآنی مفہوم کے سلسلہ میں قرآنی حقائق سے باخبر ہونے کا طریق 194

قرآنِ حکیم کی سند کے بغیر اگر پوری دنیا بھی کسی اصول پر متفق ہو جائے تو وہ بھی جمہوریت نہیں کہلا سکتی 194

قرآنِ حکیم کے احکامات سے ہٹ کر کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون کی پیروی سب سے بڑا شرک ہے 195

خالص مادہ پرستی کا عمل قوموں کی سوچ کو پتھروں کی تراش خراش تک ہی محدود کر دیتا ہے 196

کائنات کے ذرے ذرے میں پائی جانے والی ہر قوت اس قوت کی رہینِ منت ہے جس نے اس کائنات کے ہر فارمولے میں یہ الگ الگ قوت پیدا کی ہے 196

مادہ پرست یورپ کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کو مقامِ آدم سے آگاہ کیا 197

قرآنی معاشرے کی شکل وصورت، اس کے جنتی ماحول کا عکس نیز اس کو شرک کے نقصان سے بچائے رکھنے کا طریق 197

زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی خاطر تنہا عقلِ انسانی کا کردار اور اس کا محسوس نتیجہ 197

مشرک قوم کو دوسری قوم اس طرح اُچک کر لے جاتی ہے جس طرح چیل چڑیا کے گھونسلے سے بوٹ کو 198

کرۂ ارض پر آج قومِ مسلم کی حالتِ زار اور اس کی کوتاہ نظری کا تفصیلی ذکر 199

قانونِ فطرت کی اطاعت کرنے والی قوموں کی پوزیشن 199

ہمارے ہاں فطرت کے قوانین پر غور و فکر کی دعوت دینے والا نیچری کہلوایا اور قرآن کی طرف دعوت دینے والا منکرِ حدیث اور کافر ٹھہرا 200

روحانیت کے پردے میں فریب در فریب کی نوعیت کا ذکر 200

لاریب شکل میں خدا کی طرف سے پیش کردہ دین صرف اور صرف کتابِ مبین میں ہی ہے 200

کسی شے کا اپنے مقام پہ نہ رکھنا ظلم ہے تو انسان اگر اپنے آپ کو صحیح مقام پہ نہ رکھے تو یہ ظلمِ عظیم ہے 201

قوانینِ خداوندی کے حصے بخرے کرنا لفظ توحید کے ساتھ بغاوت ہے 201

کیا خالص کفر مخلوط دین کے مقابلے میں سودمند ثابت ہوتا ہے 202

فکرِ قرآنی کی روشنی میں پیش کردہ دلیل ہمیشہ صاحبِ قوت ہوتی ہے جو کسی غلبے کے زور پر مبنی نہیں ہوتی 202

انسانوں کی طرف سے پیش کردہ دلیل وہی حق پر مبنی ہوگی جو قرآنی قوانین پر منطبق ہو 203

الحق کی دلیل کو الحق ثابت کرنے کا ایک عملی طریق 204

اس ارض و سما میں قرآنِ حکیم کی تعلیم ہی انسان کا صحیح صحیح مقام متعین کرتی ہے 204

انسان کو خدائے رحیم سے ڈرنے کی بجائے اپنی بدعملیوں کے بدنتائج سے بچنا چاہیے 204

چھبیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 152 تا 158)

جنگِ اُحد کی تفصیل ______ 206
شرک کے سلسلہ میں سابقہ درس کی بازگشت اور زیرِ نظر درس کا تمہیدی ذکر ______ 207
دین کے برعکس مذہب کی دنیا میں خدا اور رسول کے متعلق خود ساختہ تصور کی شکل و صورت ______ 207
قرآنِ حکیم کی وضاحت کے برعکس ہمارے ہاں نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا معیار ______ 208
انسانیت کے امام نبی اکرم ﷺ کا ذکرِ خیر اور جنگِ احزاب ______ 209
خاندانِ نبوت تو اپنے ہاں انسانیت کے قلب و نگاہ میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کرنے کا عظیم پروگرام لیے ہوتا تھا ______ 210
امام کے قرآنی تصور کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے جنگِ اُحد میں مجاہدین کے نزدیک مالِ غنیمت کی اہمیت کو متعین کر دیا گیا 211
مجاہدین کی طرف سے جنگ کے فوری بعد پہاڑی کے ایک درے کو خالی کرنے کا نتیجہ ______ 212
میدانِ جنگ میں ملائکہ کی مدد کا مفہوم ______ 213
میدانِ جنگ میں اپنے کمانڈر کے حکم کی نافرمانی کا نتیجہ اور حضرت ابراہیمؑ کے اسوۂ حسنہ کا ذکر ______ 214
ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد کی نگاہ تو فضا کی پہنائیوں میں اڑنے والے پرندے کی مانند ہر آن اپنے آشیانے پر مرکوز ہوتی ہے 215
میدانِ بدر میں عین جنگ کے وقت مجاہدین کے لیے قرآنِ حکیم کی ایک کھلی وارننگ ______ 215
جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے ______ 216
خداتعالیٰ کی طرف سے معافی دینے کا معیار اور لفظ عفو کا لغوی مفہوم ______ 217
جنگِ اُحد میں ایک نافرمانی کی بنا پر پیدا ہونے والی بدحواسی کے عالم میں نبی اکرم ﷺ کی عظمتِ کردار ______ 217
منصبِ رسالت کے لیے شبانی کی ضرورت، ہر لحظہ تگ و تاز اور نت نئے مسائل کا سامنا ______ 218
نبوت کی سرفرازی میں امامت کا فریضہ یعنی بھیڑوں اور بکریوں کی (رعایا کی) تربیت کی ذمہ داری اور طاغوتی قوتوں سے مقابلہ ______ 219
مومنین کے نزدیک نبی کی اہمیت، اس کی عظمت، وقار اور احترام کی وجہِ جواز ______ 220
نبی کی شخصیت صفاتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے ______ 221
جنگِ اُحد میں بدحواسی کے عالم میں مرکز کی ثابت قدمی نے مجاہدین کو فتح سے ہمکنار کر دیا ______ 222
جنگ کے دوران منافقین کا کردار سب سے زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے ______ 222
منافقین کا کردار، اُن کی پہچان اور ان کی چالیں ______ 223
آیت نمبر (3:154) کا وہ مفہوم جو کئی الجھنوں کا باعث ہے ______ 224
میدانِ جنگ وہ کٹھالی ہے جو کھوٹ کے ایک ایک ذرّے کو الگ کر دیتی ہے ______ 225

قرآنی معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ
کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دیتا ہے ________ 225
لفظ حلیم کا عربی لغت کا مفہوم قابلِ غور ہے ________ 226
مومن اور کافر کے اندازِ زیست میں ایک بنیادی
فرق کی وضاحت ________ 227
چاند کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں حضرت انسان کو موت
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا پڑی تھیں ________ 229
حیات بے شرف اور مرگِ باشرف میں اتنا فرق ہے جتنا
زمین اور آسمان میں اور جتنا عمر اور زندگی میں ________ 230
موت و حیات کے پیمانے تو صرف قرآنِ حکیم ہی
متعین کرتا ہے ________ 231
ستائیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 159 تا 163)
میدانِ جنگ میں کمانڈر کے کردار اور مجاہدین کے
جذبۂ شہادت کا نتیجہ ________ 233
نبی اکرم ﷺ کے سلسلہ میں زیرِ نظر آیت کا مروجہ ترجمہ 'نرم
دل' کرنا موقع کی مناسبت سے درست نہیں ________ 234
قرآنِ حکیم میں لفظ 'فظًا' کا مفہوم بڑا غور طلب ہے ________ 236
قرآنِ حکیم کے علاوہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں
'غَلِيْظَ الْقَلْبِ (3:159)' کا بیان کردہ مفہوم ________ 237
قرآنِ حکیم میں جا بجا بیان کردہ خدائی صفات کا مقصد انسانی
صلاحیتوں کے استعمال کے لیے راہنمائی کا بہترین ذریعہ ہے 238
نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی باہمی رفاقت اور
شانِ عظمت کا بیان ________ 239
نبی اکرم ﷺ کی طرف سے جماعتی زندگی کی خصوصیات
اور اس کا نتیجہ ________ 240
اسلامی نظامِ وحی کی حکمرانی کا ہی دوسرا نام ہے نہ کہ
شخصیت پرستی کا ________ 242
معاشرے میں جرات کا فقدان ہمیشہ قوموں کی
تباہی کا باعث بنتا ہے ________ 243
قرآنِ حکیم کے نزدیک لفظ مشاورت کا لغوی مفہوم'
اسکی اہمیت اور اسکی ضرورت ________ 243
زندگی کے معاملات میں فیصلہ تو مشاورت سے ہوگا لیکن
تمام ذمہ داری مرکزی اتھارٹی پر ہوگی ________ 244
لفظ توکل کا بنیادی مفہوم خود اعتمادی کے سلسلہ میں بولا جاتا ہے 245
قدرت نے تو انسان کے اعمال کو زمین سے تشبیہ دی ہے ___ 246
نبوت کے فرائض میں یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ وحی کے کسی
حصہ کو دوسرے سے چھپائے رکھے ________ 246
قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ دیکھا جائے آخر ہزار سال سے
ہمارے یہ اعمال بے نتیجہ کیوں ہیں؟ ________ 247
ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی اصل وجہ باطنی علم کے
خود ساختہ تصور کی آبیاری اور مولانا رومؒ کا فرمان ________ 248
وحی کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ
کو تاکیدی ہدایت ________ 249
قرآنِ حکیم کی انفرادی تعلیم کی عظمت کے معیار کے عملی

ثبوت کے باوجود ہماری کم فہمی اور اس کا علاج ________ 249
قرآنِ حکیم کے الفاظ 'رِضْوَانَ اللّٰہِ' کا لغوی مفہوم اور لفظ
اطاعت کی وضاحت ________ 250
خدا کے رنگ میں رنگے جانے کا مفہوم اور اس کا طریق __ 251
لفظ 'سخط اللّٰہ' خدا کا غصہ اور اس کے غضب سے مراد انسان
کے اعمال کا رائیگاں ہو جانا ہے ________ 251
خدا کے ہاں ہر شخص کا رتبہ اس کے اعمال کی بنیاد پر ہی
متعین کیا جاتا ہے ________ 252
خدا تعالیٰ کی ذات نے ہر چیز کے لیے قوانین بنا رکھے ہیں
وہ کسی کی خوشنودی کا محتاج نہیں ________ 253
خلافت و ملوکیت وہ بنیادی فرق جسے حضرت عمرِ فاروقؓ
کے دو لفظوں نے واضح کر دیا ________ 255
خلیفۂ وقت کی ذمہ داریوں کی نشاندہی ایک بڑھیا کی زبانی _ 255
گھروں میں بہو کے انتخاب کے لیے حضرت عمرِ فاروقؓ
کی طرف سے راہنمائی کا طریق ________ 256
قرآنِ حکیم میں صفاتِ خداوندی بیان کرنے کا مقصد ___ 256
اٹھائیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 164 تا 168)
نظامِ ربوبیت کی تکمیل کی خاطر انسانیت کے لیے ہر
دو شعبوں کی راہنمائی کی وضاحت اور ان کی اہمیت ____ 257
انسانی آنکھ کے لیے روشنی اور انسانیت کی راہنمائی کے لیے
وحی کے بغیر تو اس پوری کی پوری کائنات کا وجود ہی بے کار
اور بے سود تھا ________ 258
وحی کے حقائق کو تسلیم کرنے والا شخص خدا تعالیٰ یا رسول
پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوتا ________ 258
خدا کا رسول وحی کے پیش کردہ حقائق کو عام کرنے کے
سلسلہ میں کسی معاوضوں کا طلب گار نہیں ہوتا ________ 260
اجر کی وصولی اپنے ہاں کئی ایک روپ اختیار کیے ہوتی ہے _ 260
خدا کے ہاں سے وحی پانے والی عظیم شخصیت کی عظمت
اور وحی کی اہمیت کا ذکرِ خیر ________ 261
قرآنی تعلیم کے برعکس مذہب کی دنیا میں شخصیات کو
فوق الفطرت قوتوں کی حامل قرار دینے کے تصور کا نتیجہ __ 262
مذہب کی دنیا میں معجزہ طلبی کا تصور عقلِ انسانی کو مسلوب
کر دیتا ہے ________ 263
قرآنِ حکیم کے نزدیک عقلِ انسانی کا مقام اور خاصۂ نبوت 264
معاملہ انسانی ذات کا ہو یا جسمِ انسانی کی نشوونما کا' قرآنِ حکیم
ان ہر دو شعبوں کے باہمی ربط کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے __ 265
انسانی جسم کے مقابلے میں ذاتِ انسانی کی نوعیت اور
اس کی اہمیت ________ 266
لفظ خاب کا لغوی اور قرآنی مفہوم ________ 266
انسانی ذات کی نشوونما کے لیے 'دَسّٰھَا (91:10)'
پر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ اَفْلَحَ ہوتا ہے ________ 267
انسان کے لیے تقویٰ شعار بننے کا ایک ہی طریق ہے کہ
وہ معاشرے کے لیے' دیتا کیا ہے' اس کے لیے کرتا کیا ہے _ 268
اپنی ذات کو جہنم کے عذاب سے بچانے کا طریق دوسروں

کی نشوونما کے ابدی اصول میں ہے ____ 268
تزکیۂ نفس کا قرآنی تصور لیکن تصوف کی دنیا میں پائے
جانے والی سوچ کے خدوخال ____ 269
رہبانیت کی تو بنیاد ہی مادے کو آلائش سمجھنا جبکہ دین
اس تصور کو کفر کہتا ہے ____ 270
رسالت کے فریضے کے متعلق قرآنِ حکیم سے پوچھیے کہ
کتاب وحکمت کے سلسلہ میں اس نے کیا کچھ کرنا ہوتا ہے ____ 271
انسانوں کا قانون کی طرف سے منہ موڑنے کا بنیادی سبب
اور اس کا علاج ____ 272
قرآنِ حکیم کے بیان کردہ فلسفۂ حیات پر عمل کرنے کا طریق 273
علاج کے دوران مطلوبہ نتائج سامنے نہ نکلنے کی صورت میں نسخہ
کی صداقت یا اپنے طریق استعمال پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے 273
فریضۂ رسالت اور سیرت کی بلندی نیز میدانِ جنگ
میں کمانڈر کے حکم کی اہمیت ____ 274
مسئلہ تقدیر کی وضاحت اور ہمارے ہاں صدیوں سے
پائے جانے والے غلط تصورات کا نتیجہ ____ 275
قرآنِ حکیم میں کوئی ایک بات بھی متضاد نہیں ہے، اس
نے ہر چیز کے لیے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں ____ 276
ذاتِ خداوندی اپنے مقرر کیے ہوئے اٹل پیمانوں کو کسی کی
خاطر بھی نہیں بدلتی ____ 277
لفظ اذن کے متعلق ہمارے ہاں کے غلط تراجم کے برعکس
قرآنی مفہوم کا پیش کردہ تصور ____ 278
مادہ پرست اور خدا پرست میں فرق ____ 279
انسانی زندگی میں مختلف تصادمات قوت ارادی میں اضافے
کا موجب بنتی ہیں ____ 279
کفر اور ایمان میں امتیازی نشان کی وضاحت ____ 280
انتیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 169 تا 178)
مقامِ انسانیت کے لیے اقدار کے تحفظ کی اہمیت ____ 282
موت وحیات کے بنیادی فرق کی وضاحت کے علاوہ طبعی
زندگی سے انسانی زندگی کی طرف سفر ____ 282
حیوانی زندگی میں اقدار کا یا Values کا تصور ہوتا ہی نہیں 283
طبعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اقدار (Values)
کی اہمیت اور اس کے تحفظ کی ضرورت ____ 284
جبلت کے بنیادی تقاضوں پر ہونے والے ریسرچ، اس
کا مشاہدہ اور پھر اس کا نتیجہ ____ 285
مرگِ باشرف کی خاطر اقدار (Values) کا تحفظ
جن سے بھی زیادہ قیمتی شے ہے ____ 285
قرآنِ حکیم کے ہاں اقدار کی مدافعت کا ثمر اپنے اندر
تو ایک نئی زندگی کی شکل لیے ہوئے ہے ____ 286
موت وحیات کا قرآنی معیار اور عقلِ انسانی کی غلط نگہی کا نتیجہ 286
مذہبی طور پر انفرادی نیکی کے برعکس دین کے عطا کردہ اجتماعی
نظام کی عملی زندگی میں بنیادی فرق ہے ____ 287
صادقین کا تو ایک ایک قدم اور ایک ایک لمحہ خدا کے
ہاں محفوظ کیا جاتا ہے ____ 288

قرآنِ حکیم کے ہاں مذہبی تصورات کے تحت کی گئی
نیکیوں کا ذکر ______ 289
نیکیوں کی ہر دو قسموں کے لیے قرآنِ حکیم نے
دو مختلف اصطلاحات بیان کی ہیں ______ 290
زندگی بھر کے لیے جماعتِ مؤمنین کا بنیادی شعار ______ 291
شہید کی اصطلاح کا قرآنی مفہوم اور اس کی وضاحت ______ 292
قرآنِ حکیم نے مرنے کے بعد کی زندگی کو دو کیٹگریز میں
تقسیم کیا ہے ______ 293
موت کے بعد کی زندگی یہاں کی زندگی سے مختلف ہوگی
اور وہاں کی جنت بھی کوئی آخری مقام نہیں ہوگا ______ 294
اقدار (Values) کی محافظت کا احساس اپنے
اندر ایک عجیب لطف لیے ہوتا ہے ______ 295
اقبالؒ کے الفاظ میں مردِ مومن حصولِ جنت کی سوداگری
کے تصور سے ماورا ہوتا ہے ______ 295
قرآنِ حکیم کے نزدیک میدانِ جنگ میں مجاہدین کے
مقام کی وضاحت ______ 295
شہادت کے مقام تک پہنچنے والوں کی زندگی تو ایک
نیا روپ اختیار کیے ہوئے ہوتی ہے ______ 296
قرآنِ حکیم کے مطابق مومن کی شناخت ہر آن زندگی
کے حصول میں مصروفِ کار رہنا ہے ______ 297
مکہ کے مظلوم مسلمانوں کی اہلِ مدینہ سے پکار اور خدا کی
طرف سے اس کا حل ______ 299
مومن کے ہاں فائدے اور نقصان کا معیار ہی دوسرا ہوتا ہے 299
حیات الدنیا اور حیات الآخرت کا بنیادی مفہوم ______ 300
انسانی خودی، اس کی ذات یا اس کے نفس کی بالیدگی کے
لیے صرف (Value) کا تحفظ ہی ایک زادِ راہ ہے ______ 301
انسان کے لیے سب سے اہم سوال اس ’میں‘ کی
قدر و قیمت کا ہے جو اس حیوانِ ناطق کے اندر بولتی ہے ______ 302
ذات جیسی قیمتی شے کو نقصان سے بچائے رکھنے کے سنہری
اصول کے علاوہ کفر اور ایمان کے فرق کی وضاحت ______ 302
قانونِ مکافاتِ عمل کا نتیجہ خیز ہونے کا طریق ______ 303
نتائج کے لحاظ سے اعمالِ انسانی کے دو رُخ ______ 304
انسانی ذات وہ قطرۂ نیساں ہے جسے مادیت کے پیکر میں
رہ کر گوہر تابدار بننا ہوتا ہے ______ 304
خودی کو ضعف پہنچانے والے اعمال کا نتیجہ وہ عذاب ہے
کہ جس میں نہ زندگی ہوتی ہے نہ موت ______ 305
تیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 178 تا 179)
صحابۂ کرامؓ کا مقامِ بلند اور پیشین گوئیوں کی حقیقت ______ 307
فکرِ قرآنی کے سلسلہ میں آغازِ اسلام کے عہد میں پیش آنے
والی مشکلات کی نوعیت اور نبی اکرم ﷺ کی بلند نگہی ______ 307
نبی اکرم ﷺ کی ساری زندگی بحیثیت بشر انسانیت کے لیے
ایک ماڈل تھی آخر کیوں؟ ______ 308
قرآنِ حکیم نے زندگی کے کسی اہم معاملے کو بھی واضح
کیے بغیر نہیں چھوڑا ______ 309

منافق کی پہچان کا احسن طریق عقل وبصیرت اور
کڑی نگاہ کا متقاضی ہے ______ 310
انسانوں کی دنیا میں نظامِ خداوندی کے نفاذ کا طریق ______ 310
انسان کے ماتھے پر نمودار ہونے والی لکیریں انسانی کریکٹر
کی ترجمان ہوتی ہیں ______ 311
علامہ غلام احمد پرویزؒ کا عقیدہ کہ "میں صرف مسلمان ہوں
اور میرا کسی فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہے" ______ 312
قرآنِ حکیم کے نزدیک صحابۂ کبارؓ کی عظمت کا ذکرِ خیر ______ 313
صحابۂ کبارؓ کے احترام میں کسی قسم کے فرق کا خیال بھی
قرآنِ حکیم کی شہادت کا انکار ہے ______ 314
صحابۂ کبارؓ سے خدا کے راضی ہونے کا مفہوم ______ 315
صحابۂ کبارؓ کو شروع کے دور میں پیش آنے والی
مشکلات کی نوعیت ______ 315
صحابۂ کرامؓ کی شب وروز کی تگ وتاز آخر کار ثمر بار
ہونا شروع ہوگئی ______ 316
ووٹوں کی خرید وفروخت سے تشکیل پائی جانے والی حکومت'
حسین نتائج پیدا کر ہی نہیں سکتی ______ 317
انسانوں کی دنیا میں انتظامی امور چلانے کی خاطر خدا تعالیٰ
کے ساتھ انسانوں کی رفاقت کی اہمیت ______ 317
جماعتِ مومنین کو خالقِ کائنات کی طرف سے
وجد آفریں الفاظ میں خراجِ تحسین ______ 317
قصۂ آدم میں کائنات کے اندر تخلیقِ آدم کے مقامِ بلند کا
ذکر اور ملائکہ کا اعتراض ______ 318
ایک جامع مثال میں صدرِ اوّل کی تاریخ کا نچوڑ ______ 319
قرآنِ حکیم کی شہادت کے برعکس ہمارے ہاں کے
تاریخی بیانات کی نوعیت ______ 320
تاریخ کے میدان میں ملتِ اسلامیہ کے ساتھ ہونے والی
سب سے بڑی اور گہری سازش کا ذکر اور اس کی نوعیت ______ 321
صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کے مابین سرپھٹول کی بنیادی
وجہ ہماری مرتب شدہ تاریخ ہے ______ 321
تاریخ کو پرکھنے کا معیار ______ 322
نبی اکرم ﷺ کی سیرت دنیائے انسانیت کے لئے
ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے ______ 323
نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر لکھی جانے والی کتاب از پرویزؒ ______ 324
غیب کا علم صرف رسولوں کو صرف وحی کے ذریعے ہی
دیا جاتا تھا ______ 325
علمِ غیب اور نبی اکرم ﷺ کی عظیم ہستی کا مقام ______ 326
آنے والے واقعات کے متعلق علمِ غیب کی نوعیت
اور انسانی علم کی حدود ______ 327
مستقبل کے علم کے متعلق پیشین گوئیاں کرنے والوں
کا مقام قرآنِ حکیم کی نظر میں ______ 327
انسانوں کے تمام نظریوں کو قرآنِ حکیم کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا 329
غیب کے علم کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا فیصلہ ______ 329
علمِ غیب کی تعریف ______ 330

قرآنِ حکیم کے مطابق پیشین گوئیاں کرنے والوں کے لیے عذاب ہے ____________ 331

جہالت اپنے پہلو میں کئی قسم کی نفسیاتی بیماریاں اپنے دامن میں لیے ہوتی ہے ____________ 332

اکتیسواں باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 180 تا 186)

قرآنی نظامِ معیشت انفاق کے ایک لفظ کے گرد گھومتا ہے _ 333

دنیا بھر میں ملتِ اسلامیہ کے مابین باہمی سر پھٹول کی بنیادی وجہ قرآنی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرنا ہے ____________ 333

قرآنِ حکیم کے بیان کردہ معاشی نظام کی اہمیت اور لفظ انفاق کی وضاحت کے باوجود ہماری حالتِ زار ________ 334

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں کس چیز کا روک لینا جرم ہے، بخل ہے شر ہے ____________ 335

مذہب کی دنیا میں احبار و رہبان کی کیفیت اور پھر مال جمع کرنے کا نتیجہ ____________ 336

محروم لوگوں کے سلسلہ میں اربابِ مذہب کا طرزِ عمل اور غلط سوچ کی آبیاری کے خطوط ____________ 337

مذہب کی طرف سے دورِ حاضر میں پھیلائی جانے والی گمراہیوں کی نوعیت اور اس کا نتیجہ ____________ 338

بخاری شریف اور مشکوٰۃ شریف کی ایک روایت ________ 338

حضرت عمرؓ جیسی عظیم شخصیت کے متعلق خودساختہ کہانی __ 339

کیا نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی اس اڑھائی فیصد کے تصور کی شہادت فراہم کرتی ہے؟ ____________ 340

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام پہلے ہر متنفس کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے ____________ 340

قرآنِ حکیم کے نظام کے بغیر وراثت یا دیگر قرآنی احکام پر کیسے عمل ہوگا؟ ____________ 341

ملوکیت کے سایے میں نظامِ سرمایہ داری کا نتیجہ دلوں کو لپیٹ لینے والی آگ کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا ____________ 342

قرآنِ حکیم میں عربی کے الفاظ کا ترجمہ اردو زبان میں پورا اتر ہی نہیں سکتا ____________ 343

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام سے منحرف ہونے کی شکل میں کسی دوسری قوم کے تسلط کی وارننگ ____________ 343

قرآنی نظامِ معیشت تو ہر جگہ سلسبیل کی صورت لیے ہوئے ہوتا ہے ____________ 344

قرآنی نظامِ معیشت میں رزق کے تمام کے تمام سرچشمے مملکت کی تحویل میں ہوتے ہیں ____________ 344

قرآنی نظامِ حیات میں کسی قسم کی پیوندکاری ثواب نہیں بلکہ یہ شرک ہے ____________ 345

کرۂ ارض پر ذاتی ملکیت کا تقدس ملوکیت کو جنم دیتا ہے جو تذلیلِ انسانیت ہے ____________ 345

قرآنِ حکیم کے مطابق نظامِ خداوندی کا انکار کرنے والا ہی تو کافر ہے، مشرک ہے، ظالم ہے ____________ 346

خدا تعالیٰ کے ہاں رزق کی تقسیم و انتظامی امور کا طریق انسانوں کی کٹ حجتیوں کا ذکر ____________ 347

غلط معاشرے میں آنے والی تباہی نیک و بد دونوں کو پھر برباد کر دیتی ہے ___ 348

انسانوں کے تخریبی اعمال ہوں یا تعمیری ان کا نتیجہ بتدریج ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے ___ 348

لائل پور میں ایک محفل استفسارات کے دوران پرویز صاحبؒ سے لیے گئے سوالات کی نوعیت ___ 349

عقلِ انسانی کی توہم پرستیوں کی نوعیت ___ 350

عقلِ انسانی کی مکاری اور قرآنِ حکیم کا ارشاد ___ 350

نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر سب سے زیادہ اذیت پہنچانے والا الزام ___ 351

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابوسفیان کی حق گوئی ___ 352

قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ ظہورِ نتائج کا نکلنا صرف حشر پر ہی موقوف نہیں ___ 353

قیامت کے محدود تصور کے علاوہ نجات کا غلط تصور جو دنیا بھر کے مذاہب میں مشترک پایا جاتا ہے ___ 353

فیثاغورث، آواگون، اشوک اور نروان والوں کا تصور ___ 354

عیسائیوں کے عقائد ___ 355

یہودیوں کا تصور ___ 355

قرآنِ حکیم نجات کے اس تصور کو غلط قرار دیتے ہوئے صراطِ مستقیم کے تحت ارتقائی منازل کی آگہی بخشتا ہے ___ 356

قرآنِ حکیم کے نزدیک جہانِ فردا کی زندگی کا معیار ___ 357

مومن کی معراج تو سنگلاخ پتھروں پر سفر کرنے کا تقاضا کرتی ہے ___ 357

قرآنی اعمال تو ہر آن نت نئے اضافے کی نوید دیتے ہیں ___ 358

کسی با اصول اور باوقار فرد کو اذیت ناک کیفیت میں مبتلا کرنے کی ایک گہری سازش کا طریق ___ 358

ایک پاکباز شخصیت پر کیا گزری ___ 359

بتیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 187 تا 192)

قرآنِ حکیم کی آیات اور اس کی پیش کردہ تعلیم دوسروں سے چھپانا اور کمائی کا ذریعہ بنانا' جرمِ عظیم ہے ___ 360

دینِ خداوندی کو مذہب کے اندر بدلنے کے لیے مذہبی پیشوائیت کا ہاتھ ہمیشہ قابلِ ذکر رہا ہے ___ 361

یہودیوں کے ہاں وحی کی دو قسموں کے عقیدے کی وضاحت اور ان کے نتائج کا تفصیلی ذکر ___ 361

خود ساختہ روایات کی پیدا کردہ وحی' اسکی بنیاد پر تصوف اور پھر اس کے اندر باطنی معنی کے پھیلاؤ کا سلسلۂ دراز ___ 362

وحی متلو اور وحی غیر متلو کے علاوہ مثلہ معہ اور ناسخ و منسوخ جیسے عقائد کی حقیقت' فقہ کی تائید اور پھر قرآنِ حکیم کے باطنی معنوں کے افسانوں کے جال میں الجھی ہوئی ملتِ اسلامیہ کی حالتِ زار 363

قرآنِ حکیم کو حق ثابت کرنے والوں کے خلاف کفر کے فتوے اور نبی اکرم ﷺ کی حدیث ___ 364

کیا فقہ کے قوانین قرآنِ حکیم کے قوانین سے مقدم ہیں؟ ___ 365

کسی قانون کے اسلامی ہونے یا نہ ہونے کے لیے کسی معیار

اوراتھارٹی کا ہونا تو ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہوتا ہے ____ 365
قرآنِ حکیم کے الفاظ اور حروف کی ادائیگی کے سلسلہ میں
ہماری احتیاط کی کیفیت ____ 366
عمل سے بالا تلاوت کا مقصد صرف ثواب کی حد تک یا قبر
پر مُردوں کو سنانے کی خاطر پروفیشن کے لیے رہ گیا ہے ____ 366
فکرِ قرآنی سے دور انسانی سوچ ہمیشہ خود نمائی کے گرد ہی
گھومتی رہتی ہے ____ 367
کیا ہم مسلمان بھی ہیں؟ اگر ہیں تو پھر یہ ہر سو مرثیہ گوئی
کی چیخ و پکار کیسی؟ ____ 368
کوئی فرد ہو یا کوئی قوم وہ تب ڈوبتی ہے جب وہ کہے
کچھ لیکن کرے کچھ ____ 368
کیا قوموں کے اعمال نامے کو کسی ترازو میں بھی نہیں تولا جاتا؟ 368
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق اور کائناتی قوانین کو بروئے
کار لانے کا مقصد ____ 369
کائنات کا تو ذرّہ ذرّہ صاحبِ عقل و بصیرت والباب کے لیے
اپنی اپنی حد تک ایک معجزہ ہے ____ 370
یذکرون کے الفاظ کا مفہوم تسبیح پھیرنا نہیں بلکہ
قوانینِ خداوندی کے سامنے سرنگوں ہونا ہے ____ 370
کائنات کا کوئی ذرّہ بھی ایسا نہیں جو بے مقصد یا تخریبی
نتائج کے لیے پیدا کیا گیا ہو ____ 371
علامہ پرویزؒ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ____ 371
قرآنِ حکیم کے حقائق کو سمجھنے والوں کی علیٰ وجہِ البصیرت
ایمان لانے کی سعی و کاوش ____ 372
کائنات پر ریسرچ کا ملکہ مذاہبِ عالم کے شعور میں
کہیں نہیں ہوتا ____ 372
قرآنِ حکیم کی طرف سے تعلیمی کورس کا اہم ترین موضوع
کائنات کے ذرّے ذرّے پر غور و فکر کرنا ہی ہے ____ 373
وحی کی روشنی کے بغیر کرۂ ارض پر ابتدائی دور کے
انسان کی کیفیت ____ 374
عقلِ انسانی کا اولین گہوارہ یونان اور وہاں کے سقراط کے
فلسفے کی اہمیت اور بیدل شاعری ____ 374
زبان کی اہمیت سے دوری قوموں کو گونگا بنا دیتی ہے ____ 375
سقراط کے بعد تصوف کی وادیوں میں افلاطون کی پرواز کی
بلندی کے اثرات اور ایشور کا خواب ____ 376
ایران کے آتش کدوں سے تصوف کی تپش نے مسلمانوں
پر آخر کیا کیا اثرات مرتب کیے ____ 376
قرآنِ حکیم کے پیش کردہ کائناتی تصور کے برعکس دنیا بھر کی
پژمردہ سوچ کی کیفیت ____ 377
مقامِ آدم کے سامنے تمام کائناتی قوتیں سرنگوں ہیں لیکن اس
کے باوجود حضرتِ انسان کی یہ حالتِ زار۔ آخر کیوں؟ ____ 378
قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی پستی کی وجۂ جواز
اور اس کا علاج ____ 378
علامہ اقبالؒ کی آگہی کے مطابق اس قدر گھمبیر صورت حال
کے کچھ ذمہ دار شعبوں کی نشاندہی ____ 379

یہ کائنات توتو بالحق ہے جو پیدا کی گئی ہے ______ 379

قرآنِ حکیم کے الفاظ میں مومن کی تعریف لیکن ہمارے
ہاں کی پنجابی شاعری ______ 380

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کرنہیں سکتی ______ 380

پلیٹو کا فلسفۂ حیات ______ 381

پلیٹو کے فلسفے کے بالمقابل قرآنِ حکیم کے غیر متبدل
اصولوں کی اہمیت اور علمِ انسانی کے حدود ______ 382

اہلِ طریقت کے نزدیک علم کے ذریعے کے سلسلہ میں
علامہ پرویزؒ کے ذاتی تجربے کے علاوہ ایک مشکل عمل کا ذکر 382

قرآنِ حکیم کے نزدیک جہنم میں جانے والوں کے جرم کی
نوعیت کے بالمقابل شریعت کے نزدیک جرم کی شکل وصورت 383

قرآنِ حکیم کی بارگاہ میں عقل وبصیرت سے کام لینے والوں
کوخراجِ تحسین ______ 384

کائنات کی ساخت اوراس کے نشیب وفراز پر غوروفکر
کرنے والوں کی ذہنی کیفیت ______ 384

بھکاری کے نامہ اعمال میں عزت ووقار کے نام کی کوئی
شے نہیں ہوتی ______ 385

تیتیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 192 تا 194)

وحی کی روشنی کے بغیر عقلِ انسانی کی زبوں حالی کا تذکرہ ___ 387

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسان کا کائنات کے ساتھ باہمی
رشتے کی اہمیت وافادیت کوسمجھنا نہایت ضروری ہے ___ 387

فکرِ قرآنی کے برعکس پلیٹو کی فکر نے ہزاروں سال سے
نوعِ انسانی کو الجھا رکھا ہے ______ 388

پلیٹو کا تصورِ حیات ''یہ کائنات سراب ہے' وہم ہے'
تخیل ہے'' ______ 388

تصوف کے نزدیک اصل علم صرف باطنی علم ہی ہے جبکہ حواس
کا علم ناقابلِ یقین ہے ______ 389

پلیٹو کے خلاف' تصوف کے خلاف' قرآنِ حکیم کا فلسفۂ حیات'
کائنات کا تصور اور ملائکہ کا مقام ______ 389

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں پر غوروفکر کرکے انہیں
قرآنی احکام کے تابع صرف کرنے کا ذکر ہے ______ 390

حق اور باطل کی تعریف اوراس کا ماحصل ______ 391

قرآنِ حکیم کی روشنی میں سائنس توانسان اور کائنات کے
باہمی رشتے کو مستحکم کرتی ہے ______ 391

سائنس سے دور لوگوں کی کیفیت اوراس کے برعکس مومن کی
عظمت توہر قدم پر کائنات پر غوروفکر کرنے سے وابستہ ہے _ 392

خودساختہ شریعت میں دوچیزوں کی ممانعت ______ 393

خداتعالیٰ پر یا قرآن پر ایمان لانے کا وہ طریق جو اس نے
ازخود آخری حجت کے طور پر پیش کیا ہے ______ 394

کائنات کے متعلق چھٹی صدی عیسوی میں قرآنِ حکیم
کے انکشافات کے باوجود انیسویں صدی تک
عقلِ انسانی کی علمی سطح ______ 395

قرآنِ حکیم کی طرف سے حقائق پر ایمان لانے کی
دعوت کا طریقِ کار ______ 396

قرآنِ حکیم کے ہاں لفظ متقی کا مفہوم اور ہمارے ہاں کی گئی سازشوں کا نتیجہ ____ 397

خود کو علماء کہلانے کا حق کن کو ہے؟ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس سوال کے جواب کا متمنی ہے ____ 397

زوآلوجی ہو یا بائیوآلوجی یا باٹنی‘ کیڑے مکوڑے ہوں یا مویشی‘ کائنات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جس کو قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں پیش نہ کیا ہو ____ 398

آنکھ والا تیرے جوبن کا نظارہ دیکھے ورنہ دیدۂ کور کو کیا نظر آئے‘ کیا دیکھے ____ 399

اجرامِ فلکی میں ہمارے اس سورج کے نظام کی ماہیت پوری کائنات کے صحرا میں ایک ذرّے کی مانند ہے ____ 400

فضائی کرّوں میں بسنے والی مخلوق کو آپس میں ملا دیا جائے گا 401

دین اور دنیا میں ثنویت پیدا کرنے والوں کا حال اور قرآنِ حکیم کا ارشاد ____ 402

یہ کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے کائنات کا علم ہے یہ تو یہ حاصل کر سکتے ہیں‘ اصل میں جو دین کا علم ہے‘ وہ ہماری اجارہ داری ہے۔ دین کے علم میں بنیادی طور پہ تو قرآن آتا ہے۔ 402

غور و فکر کرنے والوں پر خارجی کائنات میں پوشیدہ حقائق بتدریج خود واضح ہوتے چلے جائیں گے ____ 402

رموزِ فطرت کے سلسلہ میں کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اُن تک پہنچنے کے لیے سائنسی علوم کے کردار کے سلسلہ میں ایک قابلِ قدر کتاب کا تعارف ____ 403

دنیا میں وہی نظامِ حیات قائم رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو ____ 404

قدیم آثاروں کی کھدائی کا عمل اپنے اندر سبق آموز داستانوں کی عکاسی کرتا ہے ____ 405

فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے والی مغربی اقوام کا اقدارِ خداوندی سے لاتعلقی کا نتیجہ! عالم گیر سطح پر جہنم ____ 406

قندیلِ آسمانی کے بغیر عقلِ انسانی کو صراطِ مستقیم تک پہنچنے کے لیے صدیوں کا وقت درکار ہوتا ہے ____ 407

لاؤڈ سپیکر کے سلسلہ میں مولانا مفتی محمد شفیع کا فتویٰ نیز قرآنِ حکیم کے ہاں قصۂ آدم کو بیان کرنے کا محاکاتی انداز 408

انسان کے سرکش جذبات (شیطان) کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی حدیث ____ 408

کائناتی قوتوں کو تابع فرمانِ نظر نہ کرنے کا نتیجہ مستقبل کو تاریک کرنے کے مترادف ہے ____ 409

عقل کو تابع فرمانِ نظر کرنے والوں کی کیٹگری ____ 410

تیسری کیٹگری کا ذکر وحی کی روشنی کے بغیر سفرِ حیات کو روشن کرنے کی سعیٔ لاحاصل کا ذکر ____ 410

خدا کا قانون انسانوں کی دعاؤں کو عمل کے ترازو میں تولتا ہے 411

چونتیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیت 195)

دعا کا بصیرت افروز‘ قرآنی مفہوم ____ 413

گزشتہ سے پیوستہ موضوع ____ 413

ہمارے ہاں کا مروّجہ تصور‘ اس کے مضمرات اور الجھنیں __ 414

ایمان عقل وفکر کے بعد لانے کی چیز ہے' یہ کوئی جذباتی چیز نہیں
ہے پھر نوجوان طبقہ مورد الزام کیوں؟ ________ 415
ایسے دلائل جن کی کوئی بنیاد ہی نہ ہو' ان پر اٹھنے والی عمارت
کبھی قائم نہیں رہ سکتی ________ 416
انسان کا جذباتی طور پر اطمینان حاصل کر لینا علم وبصیرت کی
کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا ________ 417
دعا کا لغوی مفہوم ''پکارنا'' ہوتا ہے مانگنا نہیں' خدا کی طرف
سے پکار کا جواب ''انسانی عمل سے مشروط ہوتا ہے'' ____ 417
کسی عظیم مقصد کے حصول کے لیے ہجرت تک کا عمل
ناگزیر ہو جاتا ہے اور اس عمل کا بدلا بھی ________ 418
لفظ ثواب کا لغوی مفہوم ''کچھ حاصل ہونا'' ہے نیز خدا
کو پکارنے کی ایک عملی مثال ________ 419
خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ قوانین کو عملی طور پر تسلیم کرنا'
عبادت یا عبودیت کہلاتا ہے تو پکار کا جواب چہ معنی دارد __ 420
خدا تعالیٰ کا انسانوں کے ساتھ باہمی ربط کس سے قائم ہے
اور جواب کہاں سے ملتا ہے؟ ایک اہم سوال ________ 421
خدا کی ذات پہلے انسان سے اپنی پکار کا جواب لینا چاہتی ہے
پھر تمہاری پکار کا جواب دیتی ہے ________ 421
خدا تعالیٰ کے احکام پر تکبر کا برتنا جہنم کو دعوت دیتا ہے ____ 422
کس کی دعا قبول ہوتی ہے؟ خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی
پکار کا نہایت واضح جواب' مگر ایمان اور اعمالِ صالحہ شرط ہے 423
دعا کی قبولیت کے لیے قوانینِ خداوندی پر یقینِ محکم اور
استقامت کے ساتھ جمے رہنا شرطِ اول ہے ________ 424
اور تو اور انبیائے کرام کی دعائیں بھی جہدِ مسلسل کے
ساتھ مشروط تھیں ________ 425
ہمارے ہاں کی دعاؤں کا انداز اور قرآنِ حکیم کا فرمان
کہ یہ ضائع چلی جائیں گی ________ 426
انسان کی آرزو اور اس کی ہر چاہت انسانی قوتوں کو متحرک
کرنے کے ساتھ ساتھ ایک پروگرام کی طالب ہوتی ہے _ 427
لفظ دعا کا وہ مفہوم جو اہلِ عرب اپنے ہاں لیا کرتے تھے ___ 427
انسانی جذبات کی تربیت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی راہنمائی:
تم اپنے چاہنے کو ہمارے چاہنے کے ساتھ منطبق کر دو ____ 428
زندگی کے معاملات میں انسانی چاہت قوانینِ خداوندی
سے ہی ہم آہنگ ہونی چاہیے ________ 428
تکمیلِ آرزو کی شدت انسان سے شدید محنت کا بھی
تقاضا کرتی ہے ________ 429
دراصل انسان کے اندر کی تبدیلی ہی وہ ملکہ ہے جو باہر کی دنیا
میں ایک انقلاب برپا کرتی ہے ________ 430
مؤثر انداز میں صحیح نتائج کے ثمرات انفرادی تگ وتاز کی
بجائے ہمیشہ اجتماعی نظام کے رہینِ منت ہوتے ہیں ____ 430
خوشگوار زندگی کے لیے سورۃ الفاتحہ میں بیان کردہ ایک
عظیم راہنمائی کی وضاحت کے سلسلہ میں اجتماعی زندگی کی
اہمیت' اس کی افادیت اور تاکید ________ 431
دوسروں کے لیے دعا کرنا یا دعا دینے کا بنیادی مفہوم ____ 431

دوسروں کے کسی تعمیری کام میں ہم آہنگی کا اظہار بھی ایک قافلے کا اثر رکھتا ہے ____ 432

پانی کا ایک ایک قطرہ مل کر ہی سمندر کی صورت میں ثابت رہتا ہے اور سمندر کی ہی خصوصیات کا حامل ہو جاتا ہے ____ 432

خدا اپنے قانون کو کسی حضرت صاحب کی خاطر تبدیل نہیں کرتا مگر ہم سوچتے نہیں ہیں ____ 433

خدا کا کسی خاص کے قریب ہونے کا غلط مفہوم اور دعا مانگتے وقت انسانی کیفیت ____ 433

تقسیمِ پاک و ہند سے پہلے یا بعد، مزاروں پر رونق افروز ہونے والوں کی تعداد کی کیفیت اور اس کی وجۂ جواز ____ 434

دعا کے متعلق حضرت عمر فاروق اعظمؓ کا ایک بصیرت افروز اعلان ____ 434

خدا کا غلط تصور انسانی زندگی کو اجیرن بنا دیتا ہے ____ 434

مقربین کے ذریعے خدا تک پہنچنے کا تصور قرآنِ حکیم کے ہی خلاف ہے ____ 436

کسی تعمیری پروگرام کو عملی شکل دیے بغیر دوسروں کے سرہانے جنتی معاشرے کی اُمیدیں چہ معنی ____ 436

مقامِ انسانیت کی عظمت کے برعکس ذلّت کی انتہائی شکل کا شافی علاج ____ 437

پینتیسواں باب: **سورۂ آلِ عمران** (آیات 195 تا اختتام)

قرآنِ حکیم کی روشنی میں مرد و زن کی حیثیت اور رفاقت اور پھر ہمارے ہاں کی بیان کردہ روایات کی نوعیت ____ 439

قرآنِ حکیم کے نزدیک مقامِ عورت کی وضاحت اور اس کی اہمیت ____ 440

عورت کے سلسلہ میں ارسطو جیسے نامور مفکر کی سوچ اور عیسائیت میں پائے جانے والے تصورات ____ 441

قرآنِ حکیم کے نزول سے پہلے دنیائے مذاہب میں مقامِ عورت ____ 443

معاشرتی زندگی میں بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ج (3:195) کے الفاظ مفہوم کے تحت مرد اور عورت کی باہمی رفاقت کی نوعیت کا نتیجہ 444

آسمانِ عالم پر عہدِ نبوی ﷺ مساواتِ انسانیہ کے لیے ایک روشن چراغ ہے ____ 445

مذہبی طور پر مرد اور عورت کی رفاقت میں تنقیص کی ابتدا تورات سے ہوئی ____ 446

قرآنِ حکیم کے خلاف ایک گہری سازش یعنی خود ساختہ روایات پھران کا نتیجہ ____ 446

ہمارے ہاں صدیوں سے پیش کیے جانے والے لٹریچر کی نوعیت ____ 447

خود ساختہ افسانوں کی بنا پر ماں اور بیوی کی حیثیت سے سوچ کے اندر پیدا ہونے والا فرق ____ 447

غیر از قرآنی تصورات کی نشاندہی کے بعد مقامِ عورت کے سلسلہ میں ایک اہم سوال؟ ____ 448

اسرائیل کے ہاتھوں دنیائے عرب کے علاوہ پورے عالمِ اسلام کو ذلتِ آمیز شکست کیوں؟ ____ 449

ملتِ اسلامیہ کے غمزدہ حالات کے تسلسل کے پیشِ نظر
علامہ پرویزؒ کی آہ وفغاں — 450
بچی کی پیدائش پر افسردگی کی وجہ سے پیدا ہونے والی
نفسیاتی کیفیت کا اثر — 451
چائنا میں مردوں کے اخلاقِ حسنہ کے علاج کا طریق کار — 451
اسلام میں عورت کو ملنے والے حقوق کی وضاحت — 452
سراپا مصائب و آلام سے تنگ ایک مظلوم عورت کی پکار
اور آخر کار اس کا نتیجہ — 453
ایک غلط فہمی کا ازالہ اور خدائے رحیم وکریم کی طرف سے
انعام واکرام کا تذکرہ — 454
حضرتِ انسان کا وہ مقام جو قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں اس
کے لیے متعین کر رکھا ہے — 455
قدرت انسان کو کائنات کی طرح جنت بخشش کے طور
پر عطا نہیں کرتی — 455
لفظ عاصی کا یا گناہگار کا ترجمہ عربی زبان میں مجرم ہے — 456
مومن تو جنت میں خدا کے مہمان ہونگے اور اُن کی
خصوصیت ابرار کی سی ہوگی، وہ تنگ نظر نہیں ہوں گے — 456
جنت کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کا عقیدہ اور
پھر سینٹ پال کا فرمان — 457
عیسائی ہو یا یہودی جو بھی صداقتوں پر ایمان لائے گا
اور باعمل ہوگا وہ جنت کا حق دار ہوگا — 457
کیا ہم مسلمان برہمن اور شودر کے باہمی طبقاتی
امتیاز سے مبرا ہیں؟ — 458
ہمارے پاس انسانوں کے مابین باہمی تفریق کا کیا جواز ہے؟ 458
قرآنِ حکیم کے پیش کردہ معاشرتی نظام کے سلسلہ میں
بے رخی کا نتیجہ — 459
دین کی طرف سے ملنے والی راہنمائی جو مذہبی دنیا میں شکم
پروری کے کام آتی ہے — 459
انسانی اعمال کے نتائج کو مرتب کرنے میں خدا کا قانون
بڑا سریع الحساب واقع ہوا ہے — 460
قرآنِ حکیم کے آئینہ میں جنت کا حصول اجتماعیت کے
پیغام کی برومندی میں ہے — 460
قومیں تب زوال پذیر ہوتی ہیں کہ جب انسان کے لیے
بنیادی اصطلاحات کے الفاظ کا مفہوم بدل دیا جائے — 461
زندگی میں کامیابی کا راز صبر، استقامت، سبقت اور ربط
باہم میں پوشیدہ ہے — 462
جماعت سازی کا بنیادی مقصد انقطاع کے بغیر مفلحون کی
منزل کو حاصل کرنا ہے — 462
قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ اس کی ایک ایک آیت اور اس
کی ہر ایک سورۃ باہمی طور پر مربوط ہے — 463

انیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 121 تا 122)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لفظ توکّل کی وضاحت اور اس کے ثمرات

عزیزانِ من! آج فروری 1970ء کی یکم تاریخ ہے اور قرآنِ کریم کے درس کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی 121 ویں آیت سے ہوتا ہے: (3:121)۔

آپ کو یاد ہوگا سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ جو لوگ تم میں سے نہیں ہیں؛ جو تمہاری اس آئیڈیالوجی میں BELIEVE نہیں کرتے، اس نظریۂ زندگی پر ایمان نہیں لاتے، انہیں اپنا رازدار مت بناؤ۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ اب اس سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ بہت نقصان پہنچائیں گے۔ اور کہا یہ تھا کہ اگر تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو گے وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا لَا یَضُرُّکُمۡ کَیۡدُهُمۡ شَیۡـًٔا (3:120) تو ان کی سازشیں تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ تم قوانینِ خداوندی کا اتباع کرو اور استقامت سے اپنے پروگرام پر گامزن رہو، عمل پیرا رہو۔ ان کی سازشیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ اور اس کے بعد دو واقعات ہیں جن کی طرف اشارہ کیا ہے یہاں۔ ان کی تفصیل تو آگے جا کر آئے گی اور میں بھی تفصیلی طور پر گفتگو اسی مقام پر کروں گا جہاں قرآن نے خود تفصیل سے ان کے متعلق ذکر کیا ہے۔ یہاں اس نے اشارہ کیا ہے جنگِ احد کی طرف اور پھر جنگِ احزاب کی طرف۔

جنگِ بدر کے بعد جنگِ اُحد کی مختصر سی تاریخ اور قرآنِ حکیم کی طرف سے یاددہانی

مختصراً عرض کر دوں کہ جنگِ بدر کے میدان میں جب قریش کو شکست ہوئی ہے تو اس کے بعد پھر وہ اپنی اس شکست کا بدلہ لینے

کے لیے (بدر میں ایک ہزار کی فوج سے وہ آئے تھے تو اس کے بعد) وہ تین ہزار کا لشکرِ جرار لے کر پھر اُمڈے۔ مدینہ سے باہر تین چار میل کے فاصلے پہ احد کے میدان میں یہ جنگ ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا یہ لشکر جم کے لڑا' مقابلے میں حریف کو شکست ہوئی لیکن تیر اندازوں کا ایک دستہ جو پہاڑ کے ایک درے میں کھڑا کیا گیا تھا' ان سے وہاں ذرا سی غلطی ہوگئی۔ انہوں نے اپنے کماندار کے حکم کے خلاف اپنی پوزیشن کو چھوڑ دیا یہ سمجھ کر کہ اب ہمیں فتح ہوگئی ہے' اب ہماری یہاں ضرورت نہیں رہی۔ جوں ہی انہوں نے اس مقام کو چھوڑا' پیچھے سے مخالفین کا لشکر اُمڈ کر اسی درے کے راستے آ گیا اور اس نے آ کر ادھر کھلبلی مچا دی۔ وہ فتح شکست میں بدلی جا رہی تھی کہ پھر نبی اکرم ﷺ ایک چٹان کی طرح وہاں کھڑے ہوئے آپ ﷺ نے آواز دی پھر دوبارہ اجتماع ہوا پھر دوبارہ یورش کی گئی' پھر مقابلہ کیا گیا' پھر کامیابی ہوئی۔ تو کہا یہ کہ وہاں کہا تھا کہ اگر تم قوانینِ خداوندی کی پابندی کرتے رہو گے اور استقامت سے ثابت قدمی سے اپنے مقام پر جمے رہو گے تو پھر یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ تو اس کے لیے اس واقعہ کی یاددہانی کرائی کہ یہ دیکھو تم نے وہاں اس میدان میں جب استقامت سے کام لیا تو اگرچہ ان کی تعداد تم سے اتنی زیادہ تھی پھر بھی وہ کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن جوں ہی تم نے قانون کی خلاف ورزی کی' تمہارے پاؤں میں لغزش آ گئی' ثابت قدمی نہ رہی تو پھر انہوں نے نقصان پہنچایا اور اس کے بعد جوں ہی تم اپنی پہلی روش پہ پلٹ گئے' پھر کامیابی تمہاری ہوگئی۔ تو وہ صبر اور تقویٰ کے متعلق قرآن اس واقعہ کی یاد کو سامنے لایا کہ جس کے نتائج سے انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سو ضمناً اس طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے تفصیل یہاں نہیں دی گئی تفصیل جا کر آگے آئے گی۔ یہاں اتنا ہی کہا ہے کہ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (3:121)

نبوت کے بعد رسالت کے فریضۂ زندگی کی اہمیت اور اس کے ثمرات

یہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک رسول کے فرائضِ زندگی کیا تھے؟ جیسا کہ میں نے اس سے پیشتر کئی مرتبہ بتایا۔ نبوت تو یہ ہے کہ وہ خدا سے وحی پاتا ہے۔ وہ علم کہ جو اس کی اپنی فکر کا نتیجہ سعی و کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتا' خدا کی طرف سے براہِ راست اسے ایک علم ملتا ہے' جسے وحی کہتے ہیں۔ یہاں تک تو نبوت ہے۔ اور آگے پہلا فریضہ اس کا یہ ہے کہ جو کچھ اس نے خدا سے پایا ہے' اسے دوسروں تک پہنچا دے یہ رسالت ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی کہ چٹھی رسان کی طرح اس نے پیغام پہنچا دیا اور فریضۂ رسالت ختم ہو گیا۔ اسے اپنی وحی کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل کرنا ہوتا ہے' ایک جماعت قائم کرتا ہے' ایک نظام قائم کرتا ہے' ایک مملکت قائم کرتا ہے۔ اس مملکت کا سب سے پہلا سربراہ ہوتا ہے۔ معلم بھی ہوتا ہے' مبلغ بھی ہوتا ہے' مملکت کا سربراہ بھی ہوتا ہے اور یہاں یہ

جو چیز کہی گئی کہ اپنی فوجوں کا سپہ سالار بھی ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ جب دین' مذہب کی سطح پر آجاتا ہے تو جتنا زیادہ کوئی شخص مذہبی ہوتا چلا جاتا ہے' اتنا ہی وہ دنیا کے دھندوں سے دور بھاگتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر یہ مذہب پرست طبقہ ہمارا میدانِ جنگ اور مذہب پرست طبقہ سوال ہی نہیں۔ بڑا کارنامہ ان کا یہی تھا 1965ء میں یہ کہتے تھے کہ صاحب! ہم نے دعائیں کیں اس کی وجہ سے یہ ساری کامیابیاں ہوئیں۔ جنہوں نے سینے کے اندر وہ گولیاں کھائیں اور وہاں جانیں دیں اور اس کے بعد اس ثابت قدمی سے وہاں انہوں نے دشمن کو مار بھگایا' اُن کا تو کوئی کارنامہ نہیں تھا؟ اِن کا کارنامہ یہ تھا یہ کہتے تھے کہ ہم صاحب! یہاں بیٹھے ہوئے دعائیں کرتے تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ رسول پیچھے بیٹھا ہوا دعائیں نہیں کیا کرتا وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ (3:121) جب تو صبح سویرے اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کے باہر آیا تھا اور اس کے بعد تو فوج کو صحیح صحیح پوزیشن پہ بٹھا رہا تھا۔ رسول کا یہ فریضہ بھی تھا۔ اس امتِ رسول اللہ ﷺ کے اوپر اتباع کرنے کے لیے انہوں نے مختص کر دیا ہوا ہے اور لوگوں کو۔ گھر سے نکل کے اپنی فوجوں کو مختلف پوزیشنز میں بٹھا رہا تھا تو اور خدا سننے والا جاننے والا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ تو کیا کر رہا ہے' اب اس فوج نے کیا کرنا ہے' کیا تمہارا پروگرام ہے' اس پروگرام کے مطابق تم چلتے ہو یا نہیں چلتے۔ اور وہیں یہ کیفیت پیدا ہوئی تھی کہ اِذۡ هَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا ۙ (3:122) تم میں دو پارٹیاں دو گروہ ایسے بھی تھے جنہوں نے دل میں ہمت ہار دینے کا کچھ خیال کر لیا تھا۔ ہمت ہار نہیں دی تھی بلکہ ان کے دل میں کچھ خیال تھا یہ پیدا ہو گیا تھا۔ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ(3:122) لیکن خدا ان کا کارساز تھا۔

قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کو مسخ کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ملتِ اسلامیہ کا ہر شعبہ مفلوج ہو کر رہ گیا

میں ابھی ان الفاظ کے معنی عرض کروں گا کیوں کہ آج کا موضوع جو ہے اتفاق سے ایسا سامنے آگیا ہے کہ جس پر وضاحت سے گفتگو کی ضرورت پڑے گی' شاید پورا درس یا اس سے بھی زیادہ۔ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (3:122) اور مومن تو خدا پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جس کے متعلق کہا ہے کہ بڑا اہم موضوع سامنے آگیا ''توکل علی اللہ''۔ جس طرح قرآنِ کریم کی اور بہت سی زندگی بخش' قوت افزا اصطلاحات کے غلط معانی سے یہ سرتاپا زندگی' تعلیم جو ہے وہ موت میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے ماننے والے چلتی پھرتی لاشیں بن کے رہ گئے' دنیا میں سب سے زیادہ کمزور اور ذلیل قوم ہو گئے۔ اور یہ اس وجہ سے ہوئے

کہ یہ قرآنِ کریم کی ان اصطلاحات کے غلط مفہوم ان کے اندر رائج ہوئے' غلط معنی پہنائے گئے۔ اور الفاظ کے غلط معنی اصطلاحات کے غلط مفاہیم سے تو انسان میں ایک قلب و دماغ کی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے مطابق ہی وہ قوم ہوجاتی ہے۔ قرآن کی اصطلاحات صبر' شکر' قناعت' اطمینانِ قلب' ذکراللہ' تقدیر' راضی برضا یہ اس قسم کی اصطلاحیں تھیں جنہوں نے اس اونٹ چرانے والی' کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرنے والی قوم کو روما اور ایران کی تہذیب کا مالک بنا دیا تھا۔ انہی اصطلاحات کے صحیح مفہوم سے انہوں نے اپنے اندر ایک انقلاب پیدا کیا تھا' اسی کو قرآن کی تعلیم کہتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ الفاظ اسی طرح سے آپ کے ہاں چلے آ رہے ہیں' ان میں تو تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور مذہب جو فریب دیتا ہے (آپ کو یاد ہے کہ میں دین نہیں کہہ رہا مذہب کہہ رہا ہوں) دین خدا کی طرف سے ملتا ہے' مذہب انسانوں کا خود ساختہ ہوتا ہے۔ جب دین کو مسخ کر دیا جاتا ہے تو اس کا نام مذہب ہوتا ہے۔

مذہب نے دین کو تو ممی شدہ لاش بنا دیا ہے

مذہب کرتا ہی یہ ہے کہ ان الفاظ کو' ان اصطلاحات کے الفاظ کو' ان ارکان کو' ان رسوم کو' ان FORM کو' وہ شکلیں وہی رکھتا ہے جو دین کی ہوتی ہیں۔ التباس یہ کرتا ہے کہ وہ شکلوں کو وہی کچھ رہنے دیتا ہے ان کے اندر ان کی روح بدل دیتا ہے۔ اب اس فریب میں آ جاتی ہے ساری امت ساری قوم' وہ جب یہ دیکھتی ہے کہ محسوس طور پہ یہ یہی کچھ ہے۔ الفاظ بھی وہی ہوتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہی کچھ ہے جو وہاں ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ ایک اس قسم کا ممی شدہ لاش بنا دیتا ہے وہ دین کو کہ اس کی شکل و صورت تو وہی رہتی ہے بس اس میں سے جان نکل جاتی ہے' اتنا ہی فرق آتا ہے اس میں۔ اور پھر وہ یہ قومیں اس لاش کو حقیقت سمجھ کے اپنے سینے سے لگائے لگائے پھرتی ہیں اور جس طرح سے وہ ایک لاش ہوتی ہے چلتی پھرتی' یہ بھی ایک لاش بن کے رہ جاتے ہیں۔

ظہورِ اسلام کے لیے اصطلاحاتِ قرآنیہ کو قرآنِ حکیم کے آئینہ میں پیش کرنا ہوگا

عزیزانِ من! بڑی اہم چیز ہے جنہیں اصطلاحات کہتے ہیں یہ درحقیقت وہ BASIC CONCEPTS ہوتے ہیں کسی نظام کے' وہ تصورات ہوتے ہیں بنیادی جنہیں اصطلاح کے لفظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ صحیح اسلام کو سمجھنے کے لیے اصطلاحاتِ قرآنیہ کے جو مروج مفہوم ہیں' ان کو بدل کے جب تک آپ قرآن کے مفہوم کی طرف نہیں لے جاتے' آپ اسلام کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ بنیادی چیز ہے اسے یاد رکھیے۔ یہ ساری تباہیاں آپ کی اس لیے آئی ہوئی ہیں کہ یہ جو بنیادی تصورات ہیں دین کے' ان کو

بدل دیا گیا ہے اور بدلنے کی تکنیک یہ ہے کہ الفاظ وہی رکھے گئے ہیں ان کا مفہوم بدل دیا گیا ہے۔ میں توکل کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے اب توکل کسے کہتے ہیں؟ ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جانا' کچھ نہ کرنا' کوئی سامان کوئی ذریعہ کوئی اس قسم کے وسائل' کوئی اختیار نہ کرنا۔ کوئی کام نہ کرنا' کسی کام کے لیے کچھ کوشش نہ کرنا۔ بیٹھے ہیں' کاہے پہ؟ توکل علی اللہ بیٹھے ہیں صاحب وہی دے گا۔ جوں جوں پھر زیادہ اللہ والا ہوتا چلا جاتا ہے' اتنا ہی زیادہ وہ متوکل علی اللہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ سامان اسباب جو ہیں وہ توڑ کے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ جو ڈھونگ ہے چلتا کس طرح سے ہے؟ وہ دوسرے کماتے ہیں' لا کے دیتے ہیں۔ توکل تو اس پہ چلتا ہے ورنہ یہ نہ لا کے دیں تو ان کو کہیے کہ ذرا توکل پہ چل کے بتائیں تو سہی۔ لیکن یہ چیز بڑی ہوتی ہے فریب دینے کے لیے کہ صاحب! متوکل علی اللہ بیٹھے ہیں۔ جب ان سے کہیں تو وہ کہتے ہیں کہ خدا یہ انتظام کرتا ہے ہمارے لیے۔ بھیک مانگنے کا نام یہاں خدا کا انتظام رکھا ہوا ہے۔

نظامِ ربوبیت کے برعکس کفار کی ذہنیت اور ان کی ترجمانی

میں آگے بڑھنے سے پیشتر خدا کے اسی انتظام کے متعلق ایک بات عرض کر دوں یعنی یہ کہ یہ بیٹھے ہیں' بھوکے ہیں اور پھر تصور یہ ہے کہ خدا براہِ راست ان کے لیے انتظام کرتا ہے' خدا براہِ راست انہیں یہ دیتا ہے' اس کا نام ہے نا توکل۔ قرآنِ کریم نے یہاں کفار کی ایک ذہنیت کا بیان کیا ہے۔ سنیے کفار کیا کہتے تھے؟ **وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ** (36:47) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں اپنے اس مال کو کھلا رکھو دوسروں کی ضرورت کے لیے **قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا** (36:47) تو یہ جو کفار ہیں یہ مؤمنین سے کہتے ہیں (سنیے عزیزانِ من! کفار کا قول ہے یہ) **اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ** (36:47) کہ تم کیا کہتے ہو کہ ہم ان کی روٹی کا کچھ انتظام کریں' خدا نے اگر ان کو روٹی دینی ہے تو وہ ان کو روٹی براہِ راست کیوں نہیں دے دیتا۔ یہی ہے نا توکل آپ کا کہ بغیر کسی قسم کے حیلے کے' کوشش کے' انتظام کے' انصرام کے براہِ راست خدا دے۔ وہ کہتا ہے کہ کفار یہ کہتے تھے ان سے کہ تم جو ہمیں کہتے ہو کہ ان کا کچھ انتظام کرو۔ اگر خدا کو یہ مقصود ہو کہ انہیں روٹی دینی ہے' بھوکا نہیں مارنا تو وہ خود ہی کیوں نہیں دے دیتا ان کو روٹی۔ یہ کفار کا قول قرآن نقل کرتا ہے اور کہتا ہے **اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ** (36:47) کس قدر کھلی ہوئی گمراہی ہے جو تم یہ تصور لے کے بیٹھے ہو کہ خدا براہِ راست دیا کرتا ہے آ کر۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک لفظ توکل کا مفہوم قانونِ خداوندی پر بھروسے یا اعتماد کا ہے

عزیزانِ من! توکل کے اس غیر قرآنی مفہوم کا گلا تو ایک آیت سے کٹ جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم صرف NEGATIVE

ASPECT نہیں دیتا منفیانہ پہلو ہی سامنے نہیں لاتا POSITIVE چیز وہ سامنے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے آؤ میں بتاتا ہوں توکل کسے کہتے ہیں؟ دیکھیے قرآن کی رو سے اس ایک CONCEPT کو بھی اگر آپ نے صحیح طور پر اس کے معنی کو متعین کر لیا قرآن کی رو سے تو آپ دیکھیں گے بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ توکل' بھروسے یا اعتماد کو کہتے ہیں' کسی پر بھروسہ کرنا۔ آپ اتنی سی چھت کے اوپر ہو' اس دیوار کے اوپر ذرا سا آپ اِدھر ہوں آپ کا پاؤں تھوڑا سا لڑکھڑا جائے تو آپ فوراً پکڑ لیتے ہیں کسی دوسرے کو' آواز دیتے ہیں' جلدی سے ادھر ہو جاتے ہیں کہ بس میں نیچے گرا اور اس کے بعد میری ٹانگ ٹوٹے گی۔ لیکن آپ دس ہزار فٹ کی بلندی پہ ہوائی جہاز سے ایک اشارے پر بلا خطر کود جاتے ہیں۔ ذرا سا ہراس آپ کے دل میں نہیں ہوتا' کیسے کود جاتے ہیں آپ؟ پیراشوٹ کی چھتری آپ کے پاس ہوتی ہے۔ میدانِ جنگ میں تو ہم نے کہاں یہ دیکھنا تھا بہر حال فلموں میں تو یہ دیکھتے ہیں' وہ اس طرح جہاز میں سے نکل نکل کے چلے جا رہے ہوتے ہیں کہ ہم یہاں اتنی سی بلندی سے اس اطمینان سے چھلانگ نہیں لگاتے جس طرح وہ دس پندرہ ہزار فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا کے کودتے چلے جاتے ہیں ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا۔ کس چیز نے ان کا خوف و ہراس مٹا دیا ہوتا ہے؟ ان کو اتنا بے باک کر دیا ہوتا ہے؟ اتنی جرأتیں ان کے اندر ہوتی ہیں؟ ایک ٹرسٹ ایک اعتماد' کس چیز پہ اعتماد؟ اس قانون پہ اعتماد کہ اگر ایسا سامان موجود ہو کہ جو ہوا کو اس طرح سے تھام لے کہ وہ ہمارے وزن سے زیادہ اوپر ہو یا اس کے برابر ہو تو ہم اس طرح سے آہستہ آہستہ نیچے جائیں گے۔ وہ ایک قانون کے مطابق بنائی ہوئی ہوتی ہے چھتری۔ بلا خوف و خطر وہ کود جاتے ہیں' کتنا بھروسہ ہوتا ہے اس چیز کے اوپر۔ سمندر میں اگر آپ ایک سوئی لوہے کی پھینکیں' وہ اسی وقت ڈوب جاتی ہے' نیچے چلی جاتی ہے۔ اسی سمندر میں آپ ہزاروں ٹن کا بھاری بھرکم لوہے کا جہاز' خشکی کے اوپر اس کو بناتے ہیں اور اس کو ایک CEREMONY کے ماتحت پانی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ہزاروں آدمی اس کے اندر بیٹھ جاتے ہیں کس اطمینان سے آپ اس کے اندر لوہے کے جہاز میں؟ ایک سوئی تو اس میں تیر نہیں سکتی' یہ اتنا بڑا جہاز تیرتا ہے اور آپ اطمینان سے اس میں بیٹھے ہوئے ہیں ہنسی خوشی چلے جا رہے ہیں۔ مہینوں اس میں سفر کر رہے ہیں کس اعتماد پہ؟ ایک قاعدہ ہے' ایک قانون ہے' ایک فارمولا ہے' کہ اتنے حجم کی چیز ہو اور اتنا اس کا وزن ہو' اس وزن سے وہ کم وزن ہو جتنا مساوی الحجم پانی کا وزن ہے۔ وہ ایک قاعدہ ہوتا ہے جس کے برابر وہ پانی ہوتا ہے تو وہ شے تیرے گی اس میں۔ اس کیپٹن کو معلوم ہوتا ہے کہ اس نشان تک اگر یہ پانی میں ڈوبتا ہے تو کوئی خطرہ نہیں ہے وہ اس سے زیادہ ایک آدمی اس میں نہیں بٹھاتا۔ کیوں نہیں بٹھاتا؟ اس قانون کی خلاف ورزی ہو جائے گی اس کے بعد وہ توکل نہیں کر سکتا۔ اس لائن تک وہ توکل کرتا ہے کس چیز پہ؟ اس قاعدے' پہ اس قانون پہ'

جس کے مطابق یہ ہے کہ اتنے وزن کا یہ جہاز، اتنا وزن لیے ہوئے پانی میں تیرے گا۔

خدا کا قانون نہ تو کبھی بدلتا ہے اور نہ ہی راستے کا کبھی غلط تعین کرتا ہے

خدا کا قانون ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلاً (33:62) اور خدا کا قانون بدلا نہیں کرتا۔ دو چیزوں پہ اعتماد ہے ایک تو یہ کہ یہ قانون سچا ہے جس کے مطابق جہاز بنا ہے اور دوسرا یہ ایمان کہ خدا کا قانون بدلا نہیں کرتا۔ اگر ان میں سے ایک چیز کی بھی کمی ہو جائے یعنی وہ جہاز اس قانون کے مطابق نہ بنا ہوا ہو DEFECTIVE ہو وہ اسے پانی میں تیراتے ہی نہیں ہیں۔ اور اگر کہیں اس پہ اعتماد نہ ہو کہ قانونِ خداوندی بدلا نہیں کرتا تو آپ دیکھیں گے کوئی شخص بھی اس جہاز میں نہیں بیٹھے گا۔ کہ صاحب! ٹھیک ہے اس وقت تو یہ تیرتا ہے کیا معلوم ہے کہ یہ کس قانون کے مطابق تم نے بنایا ہے وہی قانون بدل جائے۔ LAW OF NATURE کہہ لیجئے' کچھ کہہ لیجئے جس قانون کے تابع یہ جہاز تیرتا ہے' اگر اس پہ یہ اعتماد نہ ہو کہ یہ ٹوٹے گا نہیں لَا انْفِصَامَ لَهَا (2:266) قرآن کہتا ہے ہمارا قانون ٹوٹے گا نہیں۔ اس اعتماد پہ انسان اس اطمینان سے اس جہاز میں بیٹھتا ہے اور تیرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور زندگی کا سارا کاروبار آپ دیکھیں گے' اسی پہ چل رہا ہے کہ کوئی چیز جو قاعدے قانون کے مطابق بنی ہے' اسے آپ کس CONFIDENCE سے لے لیتے ہیں' کتنا بڑا رسک اس کے اوپر آپ لے لیتے ہیں پورے بھروسے سے۔ اور اگلی چیز یہ ہوتی ہے کہ یہ قانون ٹوٹے گا نہیں۔ آپ نے کسی مقام پہ پہنچنا ہے' راستے میں دوراہا آ گیا۔ وہاں سے راستے دو طرف کی طرف پھٹے اس دوراہے کے اوپر ایک سائن پوسٹ لگا ہوا ہے جو آپ کو بتا رہا ہے کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے اور یہ کدھر جاتا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ اس سائن پوسٹ کے متعلق آپ کو یہ علم ہونا چاہیے کہ کسی ذمہ دار اتھارٹی نے اسے لگایا ہے۔ پھر اس کے بعد آپ یہ بھروسہ کر کے کہ یہ جو INDICATION دے رہا ہے کہ یہ راستہ ادھر جائے گا' اب آپ کو یقین ہے اس کے اوپر کہ یہ ادھر جائے گا۔ آپ کس اطمینان سے اس راستے کے اوپر چلے جاتے ہیں' کہیں راستے میں تذبذب نہیں ہوتا' کوئی شک اور شبہ آپ کے دل میں نہیں گذرتا کہ میں منزلِ مقصود پہ نہیں پہنچ سکتا۔ کتنے ہی ہرڈل راستے میں آئیں' کتنی مزاحمتیں راستے کے اندر آئیں' آپ ان کو پار کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں' عبور کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس یقین اور اس بھروسے کے ساتھ کہ یہ راستہ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچائے گا۔ یہ جو بھروسہ ہے آپ کو اس INDICATOR کے اوپر جو وہاں سائن پوسٹ لگا ہوا تھا کہ یہ راستہ مجھے پہنچائے گا وہاں تک' اس بھروسے پہ آپ سفر کی ساری صعوبات برداشت کرتے ہیں۔ (14:12) آیت نکالیے۔ یہ ایک پروگرام لے کے نکلے ہیں خدا کے رسول' لوگ اس میں شک و شبہ کی باتیں ڈال رہے ہیں' وسواس ڈال رہے ہیں' بہکانا چاہتے

ہیں۔ان سے کہتے یہ ہیں کہ تم بالآخر کس بھروسے پہ یہ چیز کر رہے ہو؟

خدا تعالیٰ کے قانون پر اس قدر یقینِ محکم کو ایمان کہتے ہیں

عزیزانِ من! جواب سنیے وَ مَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَکَّلَ عَلَی اللّٰہِ (14:12) وہ کونسی بات ہے کہ جس کی بنا پہ ہم پورا خدا پر بھروسہ نہ رکھیں؟ اور آگے ہے وَ قَدۡ ھَدٰنَا سُبُلَنَا ط (14:12) اس نے تو صحیح راستے کی طرف ہماری راہنمائی کر دی ہوئی ہے۔آپ نے دیکھا یہ توکل اور بھروسہ کس بات کا ہے؟ صحیح راستے کی طرف راہنمائی۔تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ یقین ہونا چاہیے کہ یہ جو سائن پوسٹ لگایا گیا ہے' کسی ذمہ دار نے لگایا ہے۔اس نے لگایا ہے جو راستے سے واقف ہے' اسے ایمان کہتے ہیں۔اس یقین کے ساتھ آپ چل نکلتے ہیں کہ وہ سائن پوسٹ لگانے والا ذمہ دار بھی ہے' راستے سے واقف بھی ہے' یہ کبھی مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔اس یقین کے ساتھ آپ اس راستے پہ چل پڑتے ہیں وہاں کھڑے نہیں رہتے۔آپ کو معلوم ہو جائے کہ راستہ اُدھر جاتا ہے' راستہ بتانے والے پر بھی یقین ہو' راستے کی صحت پر بھی ایمان ہو اور وہاں سائن پوسٹ کے نیچے آپ کھڑے رہیں کہ مولا دے گا۔آپ اس راستے پہ چلیں گے تو اس صورت میں آپ وہاں جا کے پہنچیں گے۔سفر کا سامان لیں گے' حفاظت کا سامان ساتھ رکھیں گے اور اس کے بعد چلیں گے سواری ہے سواری پہ' پیدل چلنا ہے پیدل۔آپ کو وہاں پہنچنے کے لیے یہ سب کچھ خود کرنا ہوگا۔راستے کی صحت کی ہدایت آپ کو ملی ہے' راہنمائی آپ کو ملی ہے۔سائنٹسٹ ایک فارمولے کو لیتا ہے اور اس کے راستے میں بڑی بڑی مشکلات آتی ہیں' لمبا عرصہ لگتا ہے اس کے اوپر آزمائش کے لیے۔وہ اس میں چلا جاتا ہے' لگاتار چلا جاتا ہے' کونسی وہ چیز ہے' کونسی وہ قوت ہے' جو اس کو ان تمام چیزوں میں ثابت قدم رکھتی ہے؟ جسے صبر کہا جاتا ہے وہ استقامت سے چلا جاتا ہے اس بھروسے پر کہ یہ جو فارمولا ہے میرا یہ بالکل سچا ہے' یہ حق ہے اس کے مطابق اگر میں عمل کرتا رہا تو یہ وہ نتیجہ پیدا کر کے رہے گا جس کے لیے یہ فارمولا وضع کیا گیا ہے۔فارمولا' قانون ہی کو جب لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے تو وہ فارمولا ہو جاتا ہے۔یاد رکھیے!

قانونِ خداوندی کے لیے لفظ کلمہ اور سنت اللہ کا بنیادی مفہوم اور اس پر یقینِ محکم کا نتیجہ

قرآنِ کریم نے قانونِ خداوندی کے لیے دو لفظ استعمال کیے ہیں ایک تو اس نے کلمہ کا لفظ استعمال کیا ہے' وہ ہوتا ہے قانون جب فارمولے کی شکل میں ہوتا ہے۔اور دوسرا اس نے سنت اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے جب فارمولا APPLY کیا جاتا ہے THE LAW APPLIED جب ہوتا ہے تو وہ سنت کی شکل اختیار کر لیتا ہے' اس کے لیے لفظِ سنت آ جاتا ہے۔اسے یقین ہوتا ہے اس سائنٹسٹ کو کہ یہ فارمولا مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔یہ یقین ہے اس کو کہ یہ فارمولا صحیح ہے فارمولے کی صحت پر یقینِ

کامل ہے کہ جو اسے کبھی تھکنے نہیں دیتا' مسلسل محنت کیے چلا جاتا ہے۔ اور جیسا میں مثال دیا کرتا ہوں اس کسان کی طرح جس نے بڑی محنت سے زمین تیار کی اس میں بیج ڈالا۔ اب وہ ہر صبح گھر سے نکلتا ہے کسّی درانتی لے کر' دن بھر اس کھیت میں محنت کرتا ہے' شام کو خالی ہاتھ واپس چلا آتا ہے۔ دوسری صبح اٹھ کے پھر اسی طرح سے چلا جاتا ہے۔ کوئی مزدور اس طرح سے اس قسم کے بظاہر بے کار بلا کسی قسم کے مزد و معاوضہ کے' بغیر نتیجہ کے' بغیر پھل کے' کسی کام کے لیے دوسرے دن تیار تو کوئی مزدور نہ ہوگا۔ کسی مزدور کو مزدوری پہ لگائیے' شام تک کام کرائیے' شام کو اس کو مزدوری نہ دیجیے' کہیے مزدوری نہیں ملا کرے گی۔ وہ آئے گا دوسرے دن آپ کے ہاں کام کرنے کے لیے؟ یہ کسان کیوں روز جاتا ہے اسی طرح سے؟ ایک دن نہیں دو دن نہیں مہینوں چلا جاتا ہے اسی راستے کے اوپر صبح جاتا ہے شام آ جاتا ہے؟ اس لیے کہ اسے اس پہ یقین ہے کہ جو بیج ڈالا گیا ہے ایک ایک بیج (قرآن کے الفاظ میں) سات سات سو دانے بن کے' ابھر کے گھر میں آئے گا میرے۔ اسے اس فارمولا' اس پروسیس کی صداقت پر یقین ہونا چاہیے۔ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط (27:79) بھروسہ کرو خدا پر اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ (27:79) اس لیے کہ تو یقینی طور پر ایک سچی بات کو لیے ہوئے ہے۔ جس فارمولے پر تو عمل کر رہا ہے' وہ حق پر مبنی ہے' وہ حقیقت ہے۔ اس میں کوئی غلطی نہیں' کوئی اشتباہ نہیں' وہ محض ایک افسانہ نہیں' ایک تصوراتی چیز نہیں۔ حق تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ صداقت جو ٹھوس نتائج پیدا کر کے سامنے آ جائے۔ کہا کہ تو خدا پہ اس لیے بھروسہ کر کہ تو تو جس بات کو لے کے اٹھا ہے' تو جس پروگرام کو لے کے اٹھا ہے' وہ ایک یقینی ہے۔ یقینی ایسا ایک تو الحق ہی ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو ٹھوس طور پہ سامنے آئے پھر مبین ساتھ کہا ہے کوئی گم صم بات نہیں ہے' کوئی رازِ درونِ پردہ نہیں ہے' محض تصوراتی چیز نہیں ہے' تخیلاتی چیز نہیں' محض عقیدے کی بات نہیں ہے' ایک صداقت ہے' ایک حقیقت ہے جو اپنے ٹھوس نتائج سامنے لائے گی' مبین ہے ساتھ اس کے۔ اس یقین کے ساتھ چلنے والا اس فارمولے پہ عمل کرنے والا' اس دہقان کی طرح جیسے میں نے عرض کیا ہے وہ چار مہینے پانچ مہینے چھ مہینے اتنا عرصہ مسلسل استقامت سے اس کے اوپر گامزن رہے گا۔ یہ ہے تقویٰ اور صبر خدا کے اس قانون پہ یقین اور استقامت سے اس کے اوپر عمل پیرا رہتے ہوئے۔ یہ جو ہے خدا کے اس قانون پہ یقین یہ ابتدائی شرط ہے' بنیادی شرط ہے کسی کام کے لیے۔ اگر آپ کو فارمولے کی صداقت پہ یقین ہی نہیں ہے' آپ کبھی اس کو TRY نہیں کرتے اگر آپ تذبذب میں ہیں کہ یہ راستہ وہاں جائے گا یا نہیں جائے گا' آپ قدم نہیں اٹھاتے اس کے اوپر۔ کونسا سپاہی جہاز سے چھلانگ لگا دے گا اگر اس کو یہ یقین نہ ہو کہ یہ پیراشوٹ کی چھتری مجھے بچا لے گی؟ کونسا سپاہی میدانِ جنگ میں دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو کے کھڑا ہو جائے گا اگر اس کو یقین نہ ہو کہ میرے ہاتھ کا جو ہتھیار ہے یہ بھی گولی چلا کے دوسرے کے سینے کو چھلنی کر دے گا؟ یقین

ہے ان چیزوں کے اوپر۔ اپنے مقصد کی حقانیت پہ یقین۔ اس کے لیے جو سامان ذرائع ہیں' ان کے اصلح ہونے کے اوپر یقین کامل' صحیح پروگرام' صحیح راہنمائی' صحیح ہدایت اس سے جو اعتماد پیدا ہوتا ہے' اسے توکل کہا جاتا ہے۔ **اِنَّکَ عَلَی الْحَقِّ الْمُبِیْنِ** (27:79)۔ یہ حقِ مبین کس طرح سے آتا ہے؟ جیسا کہ میں اس سے پیشتر کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کچھ تو قوانینِ خداوندی ہیں جو خارجی کائنات میں کارفرما ہیں انہیں ہماری آج کی اصطلاح میں LAWS OF NATURE کہا جاتا ہے۔ یہ جسے کہہ دیا جاتا ہے ناکہ صاحب! یہ بڑی مادہ پرستی ہے یہ ٹھیک ہے اگلا حصہ جو ہے میں عرض کروں گا' مادہ پرستی یہی نہیں ہے کہ ان کو LAWS OF NATURE کیوں کہہ دیا جاتا ہے' یہ تو صرف الفاظ کا فرق ہے۔ یہ LAWS بھی اسی خدا ہی کے متعین فرمودہ ہیں۔ نہ نیچر میں از خود کوئی ایسی قوت ہے جو وہ LAWS بنا سکے نہ غیر از خداوندی کوئی قوت ہے جو اس قسم کے LAWS بنا دے۔ LAWS OF NATURE قوانینِ خداوندی کا نام ہے جو باہر کی دنیا کے اندر کارفرما ہیں۔ یہ جو LAWS ہیں ان کا علم سائنٹفک طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کائناتی قوانین کے سلسلہ میں انسان کی حیثیت اور ان پر کنٹرول کا ملکہ

قصہ آدم اسی حقیقت کی تشریح ہے کہ آدمی کے اندر' انسان کے اندر یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے **عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا** (2:31) کائنات کی ہر شے کے متعلق جو قوانین ہیں' ان کے علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر رکھ دی گئی۔ وہ انکشاف کر سکتا ہے وہ DISCOVER کر سکتا ہے' وہ ان قوانین کو ایجاد نہیں کرتا' INVENT نہیں کرتا' اس کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتا ہے صرف۔ اور جب یہ فطرت کے قوانین کا علم حاصل کرتا ہے تو فطرت مسخر ہو جاتی ہے اس کے سامنے۔ یہی ملائکہ کا سجدہ ہے جو آدم کے سامنے ہوا تھا۔ یہ خارجی کائنات کے قوانین ہیں۔ اگلا حصہ آتا ہے جہاں کفر اور ایمان ہے' یہاں تک کفر اور ایمان نہیں ہے۔ یہاں تو جو ان قوانین کی صحت پر یقین کرتا ہے' وہ ان قوانین کی حد تک ایمان لا رہا ہے۔ یہاں کفر وہ ہے کہ ان قوانین کی صداقت پر ایمان نہ ہو' ان کا علم نہ رکھے فطرت کو مسخر نہ کرے۔ یہ کفر ہے۔

خدائے علیم و خبیر کی طرف سے انسانی زندگی کے قوانین ہوں یا کائناتی اصول' ان کی حقیقت کو تسلیم نہ کرنا ہی کفر ہے

اگلا حصہ کفر کا یوں شروع ہوتا ہے کہ انسانوں کی اپنی تمدنی زندگی کے اندر انسان کی اپنی ذات کے متعلق خدا نے قوانین دیے

ہیں۔ وہ فطرت کے قوانین کی طرح عام نہیں کیے ہیں۔ وہ ہیں جو وحی کے ذریعے ایک نبی کو دیئے نبی نے دوسرے انسانوں تک پہنچائے اور آج ہمارے پاس اپنی اصلی اور منزہ شکل میں قرآن کے اندر محفوظ' مکمل' غیر متبدل ہیں۔ یہ ہے دوسرا حصہ قوانینِ خداوندی کا' کفر اور ایمان حقیقی یہاں سے آتا ہے۔ اگر ان سے انکار کیا جاتا ہے تو یہ ہے وہ کفر جسے میں نے کہا ہے۔ مادہ پرست اسے آپ کہیے اگر یہ معنی خدا سے انکار کے مرادف ہیں کہ جو ان قوانینِ خداوندی انکار کرتا ہے جو اس نے وحی کے ذریعے سے دیے۔ اب انسانی زندگی کے لیے ان دونوں قوانین کا اتباع نہایت ضروری ہے۔ فطرت کے قوانین کا علم حاصل کر کے فطرت کو مسخر کرنا اور جو قوتیں اس طرح سے حاصل ہوں انہیں ان قوانین کے تابع صرف کرنا جو وحی کے ذریعے سے ملی ہیں' یہ ہے جسے اسلام کہتے ہیں۔ فطرت کی قوتوں کو اپنے سامنے جھکا لینا اور خود خدا کے قوانین کے سامنے جھک جانا۔ جب ان قوانین پر انسان کاربند ہوتا ہے تو پھر یہ زندگی جنت کی زندگی بن جاتی ہے۔ اس کے خوشگوار نتائج پوری انسانیت کے لیے زندگی بخش ہو جاتے ہیں' خوشگواریوں کے حامل ہو جاتے ہیں۔ دیکھیے اب توکل کہاں آیا ہے؟ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ ط (33:1) اے نبی! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کر' کفار اور منافقین کا اتباع مت کر' ان کی اطاعت مت کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا لا (33:1) یہ قوانین اس خدا کے دیے ہوئے ہیں جو علم رکھتا ہے اور یہ حکمت پر مبنی ہیں' دھاندلی پر مبنی نہیں ہیں۔ وَّاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (33:2) جو تیرے رب کی طرف سے تمہیں بذریعہ وحی دیا جاتا ہے' اس کا اتباع کیے چلا جا۔

خدا کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات ہی تمام خودساختہ نظامِ زندگی پر غالب آئے گا

آگے ہے اِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (33:2) خدا تمہارے اعمال سے' تمہارے کاموں سے باخبر ہے۔ اگلی بات دیکھ لی کہ یہاں کاموں کا ذکر ہے۔ اتباعِ وحی جو ہے وہ کوئی ذہنی چیز نہیں ہے' وہ عمل میں لانے والی چیز ہے۔ خدا تمہارے کاموں سے جو کچھ تم کرتے ہو' وہ اس سے باخبر ہے۔ اور اس کے بعد ہے وَّ تَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ ط (33:3) بھروسہ کرو اس بات پر کہ جو کام اس کے قانون کے مطابق کیا جائے گا' وہ نتیجہ برآمد کر کے رہے گا جو اس نے کہا ہے۔ اس نے جب کہا ہے کہ یہ دین تمام ادیان پر غالب رہے گا۔ یہ نظام جو ہم نے دیا ہے دنیا کے ہر نظام پر غالب رہے گا' یقین رکھو اگر تم نے خدا کے بتائے ہوئے قوانین کا اتباع کیا اور ان کے مطابق عمل کیا تم نے کام کیا ان کے مطابق تو یہ نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا' اسے توکل کہتے ہیں۔ توکل کے لیے پہلی شرط اس قانون یا قاعدے کی صداقت' اس کی محکمیت پر یقین پھر اس کے مطابق عمل پیرا ہونا' اس کے بعد لازمی طور پہ وہ نتیجہ نکلے گا۔ اس یقین کے ساتھ عمل پیرا ہونا کہ اس سے یقیناً وہ نتیجہ برآمد ہوگا۔

خودکو مکمل راہنما کہلوانے والے کے لیےان بنیادی صفات کا حامل ہونا ضروری ہے

راہنمائی کے لیے آپ کوایسی راہنمائی یاایسے راہنما کی ضرورت ہوتی ہے کہ جب بھی کسی معاملے میں آپ کوضرورت پڑے آپ اس کی طرف اسے ریفر کریں'اس کی طرف رجوع کریں۔وہاں سے آپ کوراہنمائی مل جائے۔جہاں تک شخصیتوں کا تعلق ہے' یہ راہنمائی کسی ایک فرد کی زندگی تک مل سکتی ہے۔بچہ اپنی ہر دشواری میں ماں باپ کی طرف جاتا ہے ''اب میں کیا کروں'' وہاں سے پوچھتا ہے۔شاگرد استاد کی طرف جاتا ہے ''اس معاملے میں کیا کیا جائے'' وہ اسے بتاتا ہے۔شاگرد نے اگر ابھی آدھا فن یا آدھا علم سیکھا ہوا اور استاد مر جائے اس کی راہنمائی کا دروازہ بند ہوگیا۔خدا کی طرف سے ایک ایسی کتاب ملے کہ کچھ عرصے کے بعد وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہے' راہنمائی کا دروازہ بند ہوگیا۔اور اگر وہ اس قسم کا ضابطۂ ہدایت دیدے جس کے متعلق کہہ دے کہ لو بیٹا! (میں استاد کی TERM میں گفتگو کر رہا ہوں) اس میں جو کچھ تمہیں ضرورت ہے جتنی GUIDANCE کی ضرورت ہے' وہ اس کے اندر دیدی ہے ہم نے' یہ کبھی تلف نہیں ہوگی' یہ ضائع نہیں ہوگی کتاب۔یہ محفوظ ہے اس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہوگا وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) مکمل ہو گئے صدق وعدل کے ساتھ اس میں کوئی تبدیلی نہیں اور ہم نے اس کو نازل کیا وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم اس کے محافظ۔ اس قسم کی راہنمائی جب دی جائے یہ زندۂ جاوید ہوتی ہے راہنمائی۔اسی لیے اس نے یہ کہا وَتَوَكَّلْ (25:58) بھروسہ کر۔کس پر؟ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ (25:58) اس پر بھروسہ کر' ہمیشہ زندہ ہے کبھی مرتا نہیں ہے۔کتنا بڑا بھروسہ ہے یہ کہ رہنمائی دینے والا وہ ہے جو کبھی مرے گا نہیں' جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔

انسان کا خدا کے ساتھ تعلق صرف قوانین کی بنا پر ہے

عزیزانِ من! اگر خدا کی طرف سے دیے ہوئے قوانین ہمارے پاس باقی نہ رہیں' ضابطۂ ہدایت باقی نہ رہے تو خدا کا زندہ رہنا ہمیں فائدہ کیا دے سکتا ہے۔جن اقوام کے پاس یہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں نہیں رہیں تھیں' خدا تو اس زمانے میں بھی زندہ تھا۔ان کے لیے خدا کا زندہ ہونا کیا فائدہ دیتا تھا؟ یاد رکھیے! ایک BASIC CONCEPT خدا کے متعلق وہ درست ہو جائے تو آپ دیکھیں گے اس کے اوپر ساری عمارت درست ہو جاتی ہے۔بنیادی تصور خدا کے متعلق یاد رکھیے! خدا کا اور ہمارا تعلق اس کے ان قوانین کے ذریعے سے ہے جو اس نے دیدیے ہوئے ہیں۔مذہب کی سطح کے اوپر ایک تصوراتی تعلق ہوتا ہے اللہ

اور بندے کا باہمی PRIVATE معاملہ' اس سے لو لگائی ہوئی ہے۔ اپنے ہی ہاں بیٹھے ہوئے ہیں دھیان گیان کے اندر' سمجھے ہوئے ہیں کہ اللہ کے ساتھ ایک تعلق پیدا ہو رہا ہے۔ اس انفرادی SUBJECTIVE تخیلاتی تعلق' یہ اس کی وجہ سے ہی ہے کہ آپ کے ہاں کا ایک بہت بڑا ولی اللہ اپنے حجرے میں بیٹھے ہوئے تعلق قائم کر رہا ہوتا ہے۔ اسی قسم کا ایک مشرک سادھو اپنے مندر میں بیٹھا تعلق قائم کر رہا ہوتا ہے۔ عیسائیوں کے سینٹس' ہندوؤں کے سادھو' بدھ مت والوں کے اپنے ہاں یا جو بھی خدا کو ماننے والے ہیں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (20:32) مگن ہیں اس بات سے کہ ہمارا تعلق خدا کے ساتھ قائم ہوا ہوا ہے' تعلق باللہ ہو رہا ہے صاحب۔ یہ ہے خدا کا غلط تصور' ایک شخصی خدا جسے آپ کہتے ہیں' ایک PERSONAL GOD ہے کہ اس کا ہر فرد کے ساتھ اس طرح سے جو چاہتا ہے' تعلق قائم وہ کرتا ہے پھر اس سے ہر معاملے میں جا کے وہ رہنمائی لے لیتا ہے۔ وہ جو میں نے بتایا ہے یا اکثر بتایا کرتا ہوں کہ جب ان سے کہا جائے کہ صاحب! یہ چیز دیکھیے قرآن یہ کہتا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے آپ قرآن کے یہ معنی سمجھتے ہیں' ہم تو رات کو جا کے اللہ تعالیٰ سے خود پوچھ کے آئے تھے 'انہوں نے کہا تھا نہیں! اس کے معنی یہ ہیں۔ وہ روز پوچھ کے آتے ہیں۔ یہ خدا کا وہ تصور ہے جو جب دین کو مذہب کی شکل میں تبدیل کیا جائے اور اس سے آگے اور سڑی ہوئی شکل اس کی جو ہے' جسے تصوف کہتے ہیں۔ ان کے ہاں تو جیسا میں نے کہا تھا ایسا یارانہ ہوتا ہے اللہ میاں کا جیسے ''لنگوٹیا ہوندا اے ایہناں دا'' کھیل رہے ہیں' ہنس رہے ہیں' مذاق ہو رہا ہے اس کے ساتھ' کبھی وہ روٹھتا ہے' کبھی یہ روٹھتے ہیں منوا رہے ہیں جا کے' کھیل کھیل رہے ہیں صاحب اس کے ساتھ۔ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (6:91) قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے معلوم ہی نہیں کیا کہ خدا کہتے کس کو ہیں۔ اتنی بڑی عظیم القدر کائنات کے پیچھے ایک قوت اور ''او ایناں دا لنگوٹیا ہوئے گا؟'' ملاحظہ فرماؤ۔

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

خدا کا صحیح تصور مردہ قوموں میں زندگی کی روح پھونک دیتا ہے

عزیزانِ من! خدا کا تصور قرآن کی رو سے صرف اس کے قانون کی رو سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اس نے قوانین دیدیے ہیں ان قوانین کو مکمل کر دیا ہے' غیر متبدل ہے' محفوظ کر کے رکھ دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ اب اس کتاب کے ذریعے سے اس کتاب میں دیے ہوئے قوانین کے ذریعے سے تمہارا تعلق پیدا ہوتا ہے اس کتاب کے ساتھ۔ قانون کا خدا۔ کتاب بھی موجود ہے۔ مانا جاتا ہے

کہ غیر محرف ہے غیر متبدل ہے مکمل ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ نہیں صاحب! پھر بھی نبی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ارے! اب کاہے کے لیے ضرورت پڑ جاتی ہے؟ BASIC تصور غلط ہے' سمجھے ہی نہیں ہیں۔ کہ صاحب! مسلمانوں کا تعلق خدا کے ساتھ چھوٹ گیا ہوا ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ بتایئے خدا تمہارا زندہ ہے یا مر گیا ہے؟ صاحب! خدا تو زندہ ہے۔ تو جب وہ زندہ ہے تو زندہ خدا کے ساتھ تعلق۔ یعنی جو اس نے تعلق کا ذریعہ بتایا تھا ان کے نزدیک وہ ذریعہ یا تو اب ختم ہو گیا وہ بیٹری میں سے سیل جیسے ختم ہو جاتا ہے نا تھوڑے عرصے بعد کہ وہ ہوتا ہے اس کے اندر اسی طرح سے' پھر وہ لائٹ نہیں دیتا' یہ کہتے ہیں۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ جو خدا اس سارے ہزار سال کے اندر تیرہ سو سال کے اندر بھی زندہ رہا تھا اس وقت کا تعلق جو تھا وہ تو اس کی زندگی بخش کتاب اور قوانین کی رو سے تھا۔ آج اگر یہ چیز مسلمانوں میں حیات بخش نہیں رہی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے ان قوانین پہ عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان پہ عمل کرو' وہی نتائج پھر پیدا ہو جائیں گے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ خدا کے متعلق یہ غلط تصور جو ہے انفرادی طور پر اس سے ایک براہِ راست SUBJECTIVE تعلق پیدا کرنا' یہ مذہب کا پیدا کردہ ہے جو انسانوں کے ذہنوں کا خود ساختہ ہوتا ہے۔

انسانی زندگی کے لیے دیے گئے قوانین اسی طرح محکم اور نتیجہ خیز ہیں جس طرح خارجی کائنات کے

خدا کا دین قوانین کے ذریعے سے قائم ہوتا ہے یاد رکھیے۔ جب اس نے کہا ہے وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَايَمُوْتُ (25:58) بھروسہ کرو اس کے قوانین پر جو زندہ ہے کبھی نہیں مرتا۔ اس کا قانون دیا ہوا بھی ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔ عزیزانِ من! کائنات کا کوئی قانون آج تک مرا نہیں' اسی طرح سے وحی کے ذریعے دیا ہوا قانون بھی مرتا نہیں ہے۔ انسان اس میں اگر تلبیس اور تحریف کر دیتا ہے تو اپنے مقام پہ وہ نہیں رہتا۔ جب پھر آ کے خدا کا رسول خدا کی طرف سے وحی پا کر اس کو پھر اپنی شکل میں دیدیتا ہے' قانون وہی ہوتا ہے' ہم نے اس کے اوپر پردہ ڈال دیا تھا' وہ اس پردے کو اٹھا دیتا ہے۔ اور اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ پھر وہ پردوں کے نیچے دبے ہی نہیں۔ وہ قانون محرف نہ ہو' اس میں کوئی دخل انداز نہ ہو سکے' کوئی اس کو تبدیل نہ کر سکے' قانون اپنی شکل میں رہے' خدا کے ساتھ ہر وقت تعلق قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ جو زندہ ہے جسے موت نہیں آتی۔ اگلی چیز وہ ہے کہ پھر توکل ہوتا کیا ہے؟ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ط (25:58) بات دوسری طرف چلی جائے گی اور آپ کے سامنے آ چکی ہوئی ہے۔ اس کے دیے ہوئے قانون کو ایک محسوس شکل میں سامنے لا کر' قابلِ حمد وستائش بنا کر' دکھا دو دنیا کے سامنے اور اس کے لیے کوشش کرو۔ یہ ہے خدا کے اوپر بھروسے کی بات۔ لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تفصیل دوسری طرف چلی جائے گی۔

توکل کا وہ مفہوم جو قرآنِ حکیم اپنے ہاں پیش کرتا ہے

اس وقت آپ صرف یہ دیکھیے کہ توکل جو قرآن کہتا ہے اس کے معنی کیا ہیں۔ اب یہی نظام قائم ہوا حضورِ نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے۔ قوانینِ خداوندی آ گئے' حضورِ نبی اکرم ﷺ نے ایک نظام متشکل کر دیا' مملکت وجود میں آ گئی' ایک امت وجود میں آ گئی۔ اب اس کے بعد اس نظام کی کیفیت؟ حضورِ نبی اکرم ﷺ سے ارشاد ہو رہا ہے وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج(3:159) ایک اصول سامنے آیا ہے' اس اصول کے اوپر عمل پیرا ہونا ہے' طریقِ کار تجویز کرنا ہے۔ کہا کہ اس کے لیے اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا کرو۔ وحی کے معاملے میں کسی سے مشورہ تو ایک طرف اس میں تو رسول کی اپنی فکر کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس وحی کو عملی نظام کی شکل میں آپ نے متشکل کرنا ہوتا ہے تو پھر اس کی جزئیات' طریقِ کار' پروگرام اس کے لیے آپ نے یہ چیزیں طے کرنی ہوتی ہیں۔ اس کے لیے چودہ سو سال پیشتر جب دنیا کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ مشاورتی نظام بھی کوئی ہو سکتا ہے رسول اللہ ﷺ سے تاکید کی گئی ہے' حکم دیا گیا ہے کہ ان سے مشورہ کیا کرو معاملات میں۔ مشورہ کیا اس کے بعد فَاِذَا عَزَمْتَ (3:159) جب تو پھر پختہ طور پہ معاملے کو طے کر لے' عزم کر لے' فیصلہ ہو جائے تو پھر فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ(3:159) آپ دیکھتے ہیں کہاں توکل آ رہا ہے؟ قانون موجود ہے اصولی طور پر' باہمی مشاورت سے اس کے متعلق پوری گفتگو ہوگئی ہے' طریقِ کار تجویز کر لیا ہے عَزَمْتَ جب تو فیصلہ کر لے اور فیصلہ ہی نہیں کہا ہے عَزَمْتَ عزم محکم ہے اس کے لیے' کرنے کے لیے طے کر لے کہ یہ کرنا ہے پھر تذبذب کی بات نہیں ہے پھر' پھر تو اس قانون کی محکمیت پر یقینِ کامل رکھ کے چل پڑ۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (3:159) یہاں اب ٹرسٹ اور بھروسے کی ضرورت ہے اعتماد کی ضرورت ہے۔ اگر یہاں پھر دل کے اندر بھی کسی قسم کا وسوسہ پیدا ہو جائے گا' کانپتے ہاتھوں سے نشانہ کبھی ٹھکانے پہ لگتا ہی نہیں ہے۔ کوئی سپاہی میدانِ جنگ میں کھڑا نہیں ہو سکتا اگر اس کے دل میں اپنی فتح کے متعلق ذرا سا بھی شبہ ہو جائے۔

لفظ اطاعت کا لغوی مفہوم اور اس کی عملی شکل

نبی اکرم ﷺ سے یہ فرمایا اور یہ جو جماعت تھی ان سے کیا کہا؟ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ج (64:12) اطاعت کرو تم خدا اور اس کے رسول کی۔ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (64:12) اگر ان سب چیزوں کے سامنے آ جانے کے باوجود پھر تم یہاں سے روگردانی کرو گے' یہاں اعراض برتو گے' رسول کے ذمہ تو یہ تھا کہ تم تک بات پہنچا دے' وہ

تم پہ داروغہ نہیں مقرر کیا گیا کہ مار مار کر تم کو اس راستے پہ چلائے۔ اس کا کوئی اپنی ذاتی فائدہ نہیں ہے' اس کے ذمے تم تک بات پہنچا دینی تھی۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ ط (64:12) بات یہ پہنچائی ہے اس نے کہ یہاں کسی اور کے سامنے جھکنا نہیں' کوئی صاحبِ اقتدار ہستی نہیں' کسی اور کی حکومت' کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کرنا تم نے۔ یہ بات تم سے اس نے کہی تھی اس کے اوپر اگر یقین ہے وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (64:13) اطاعت پہلے کہا ہے' قانون کی صداقت پہ یقین رکھو پھر جو اس کے اوپر چلانے والا ہے' اس چلانے والے کے احکام کی اطاعت کرو اور اطاعت کرو اس یقین اور بھروسے کے ساتھ کہ یہ چیز ہمیں منزلِ مقصود تک ضرور پہنچائے گی۔ قانون کی صداقت پر یقین' مشاورت سے جب بات طے کر لی اس کے بعد اطاعت اور اس سارے راستے میں وہ یقین جو ہے مسلسل ساتھ رہے کہ ہم حق پر ہیں۔ فارمولا صحیح ہے' نتائج مرتب ہو کے رہیں گے۔ عزیزانِ من! اطاعت اسی صورت میں کی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اطاعت کا لفظ استعمال کیا ہے' اطاعت ہمیشہ دل کے جھکاؤ کے ساتھ ہوتی ہے' دل کی رضا مندی کے ساتھ ہوتی ہے جبراً جو کچھ کرایا جاتا ہے تو عربی زبان میں اطاعت کا یہ لفظ اس کے لیے نہیں بولا جاتا۔ طاع نخل بولتے ہیں جس وقت کوئی پھل (کھجور) پک جائے اور پکنے کے بعد از خود نیچے گر جائے' وہ جھانپل سے اس کو نیچے نہ گرایا جائے اس کو اطاعت کہتے ہیں۔ یہ جو اطاعت کرائی جاتی ہے استبداد کے اندر اس کے لیے عربی کا لفظ اطاعت ہی نہیں استعمال ہو سکتا۔ یہ اطاعت کس طرح سے ہو سکتی ہے؟ کہ آپ کو یقین ہو کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ حق و صداقت کی ہے' کہنے والے کا ذاتی مقصد و مفاد نہیں ہے۔ اس میں میرا فائدہ ہے اس میں سب کا فائدہ ہے' یقینی چیز ہے نتیجہ بر آمد ہو کے رہے گا' پھر دل کے جھکاؤ کے ساتھ آپ اطاعت کرتے ہیں۔

اطاعت کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا دل و دماغ قوانین کی صداقت پر پختہ یقین رکھتا ہو

یہی ہے وہ چیز جس کے متعلق پھر کہا ان سے کہ فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَاشَجَرَ بَیْنَھُمْ (4:65) تیرا رب اس پہ شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے ہر معاملے میں' اپنے ہر اختلافی معاملے میں تجھے اپنا حکم متعین نہ کریں' مقرر نہ کریں۔ تمہارے پاس لائیں پھر جو تو فیصلہ دے ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ (4:65) اس کے بعد جو تو فیصلہ دے اس کے خلاف ان کے دل کے اندر بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ ہو وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (4:65) اسے کہتے ہیں اطاعت۔ یہ چیز کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اس یقین کے ساتھ کہ یہ جو قوانین ہیں یہ کوئی مستبد حاکم کے احکام نہیں ہیں' قوانینِ خداوندی ہیں جن کی صداقت پر میں ایمان لا کے مومن ہوا ہوں۔ پھر یہ ایک نظام ہے جس نظام کے سربراہ کو میں نے اپنا امام مانا

ہے' سربراہ مانا ہے اس کو' اس کے کریکٹر کی صداقت کے اوپر پھر تمہارا یقین ہو۔ پھر جو معاملہ ہوا تھا' وہ باہمی مشاورت سے طے ہوا ہے۔ پھر اگلا یقین یہ ہو۔ اب جو تم اس کے فیصلے کی اطاعت کر رہے ہو تو یہ ہے جسے اطاعت کہا جا رہا ہے۔ اس کے خلاف دل کے اندر بھی کبھی گرانی محسوس نہیں ہو سکتی۔ گرانی تو اس وقت ہو گی کہ یا تو اول آپ کو یقین ہی نہ ہو کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے' یہ ٹھیک کہہ رہا ہے یا مار مار کے منوایا جا رہا ہو۔ اس لیے اس نے کہا ہے کہ اطاعت کے بعد توکل علی اللہ' اطاعت کے ساتھ جو استقامت ہو گی پھر اس کے لیے یہ لفظ آیا۔ یہ دیکھیے پروگرام مؤمنین کا۔ وَ الَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا فِی اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا لَنُبَوِّئَنَّہُمۡ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً ؕ وَ لَاَجۡرُ الۡاٰخِرَۃِ اَکۡبَرُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ (16:41)

نظامِ خداوندی کے نفاذ کی خاطر ہجرت کی کٹھن منزل کی اہمیت

یہ لوگ جنہوں نے اس بلند مقصد کے حصول کے لیے سب کچھ تیاگ دیا۔ ہجرت صرف وطن کو چھوڑنا ہی نہیں ہے' وطن کی تو حیثیت ہی قرآن کی رو سے کوئی شے نہیں ہے۔ وطن تو ان جامد درختوں کا ہوتا ہے جن کی جڑیں زمین کے اندر گڑی ہوئی ہوتی ہیں' جو ہل نہیں سکتے۔ مومن کے لیے تو سارا کرۂ ارض مسجد ہے نبی اکرم ﷺ کے الفاظ کے مطابق۔ ہجرت کے معنی ہر وہ شے جس کے چھوڑنے کی ضرورت پڑے ہنستے ہوئے' چھوڑ دے اس کو۔ یہ لوگ جنہوں نے یہ کیا ان پہ بڑی سختیاں ہوئیں۔ کہا کہ ہم ان کو ایسا عمدہ ٹھکانہ دیں گے فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً (2:201) وہ قیامت پہ ہی نہیں اٹھا رکھتا' زندہ نظام کے نتائج اس زندگی میں سامنے آتے ہیں۔ اس دنیا کے اندر تم دیکھو گے کہ ان کو کتنی خوشگواریاں ملیں گی تمکن عطا ہو گا۔ اور پھر آخرت کا اجر تو پوچھو نہیں' کتنا بڑا ہوتا ہے۔ جس کی یہ دنیا حسین ہوتی ہے' اس کی اگلی دنیا حسین تر ہوتی ہے۔ وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی (17:72) جو یہاں کا اندھا ہوتا ہے' وہ وہاں بھی اندھا ہوتا ہے۔ خیر بات اور تھی۔ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ (16:41) اے کاش یہ اس بات کو سمجھ جاتے۔ یہ کون لوگ ہیں جو اس ضرورت پڑنے پر ہنسی خوشی ہر چیز تیاگ کے آگے بڑھ جاتے ہیں الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا (16:42) یہ لوگ جن کے پاؤں میں کبھی لغزش نہیں آتی وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ (16:42) یہ ہیں جو خدا کے قانون کے اوپر اعتماد کرنے والے ہیں۔ کیا قانون تھا؟ جسے وعدہ کہتے ہیں خدا کا' وہ حقیقت میں خدا کے قوانین کے نتائج کا نام ہوتا ہے۔ وعدہ اس نے یہ کیا تھا کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ اس زندگی میں تمکن ہو گا۔ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (24:55) اس دنیا میں ان کو حکومت اور استقامت اور استخلاف عطا ہو گا' وعدہ ہے۔ وعدہ کیا ہے؟ قانون ہے کہ ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ یہ ہو کے رہتا ہے۔ اب جب اس قانون کی محکمیت پر یقین ہو تو پھر اس کے

لیے یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں کون نہیں چھوڑ دیتا۔ وہ کسان اپنا گھر بار، بیوی بچے، راحت اور آرام یہ سب کچھ چھوڑ کے باہر کھیتوں میں جا نکلتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے اس پہ۔ کہا کہ یہ لوگ اس لیے چھوڑ کے یہ سب کچھ نکلتے ہیں کہ ہم نے جو وعدہ کیا ہے کہ ہم اس زندگی میں تمہیں ایک بڑی حسن کارانہ انداز سے معیشت دیں گے، تمہاری یہ زندگی سنور جائے گی، حسین ہو جائے گی، اس پہ انہیں یقین تھا۔ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا (16:42) یہ ہیں کہ جو استقامت سے اس راستے کے اوپر چلے رہے۔ وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ (16:42) یہ ہیں جو خدا کے قانون پر اعتماد کرنے والے لوگ ہیں۔

توکل اور پھر عمل یعنی کام لازم و ملزوم ہونے کے باعث ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے توکل خالی ایک عقیدے کا نام نہیں ہے۔ اس بھروسے کے بعد عمل کرنے کا نام ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (29:58) جنہوں نے یقین کیا ان قوانین کی محکمیت پر وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (29:58) پھر صلاحیت بخش کام کیے لَنُبَوِّئَنَّہُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ غُرَفًا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ (29:58) تم دیکھو گے کس قدر خوشگواریوں کی جنتی زندگی ان کو عطا ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! الفاظ غور طلب ہیں۔ یہ جنت بخشش کی جنت نہیں ہے نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ (29:58) کام کرنے والوں کے کام کا کتنا اچھا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا جہاں اور تصورات ہمارے بگڑے ہیں نا عمل، اعمال یہ لفظ آپ استعمال کیجیے، ذہن فوراً آپ کا ان گوشوں کی طرف چلا جاتا ہے، وہی کچھ چند رسومات جو ادا کی جاتی ہیں۔ ترجمہ کام کیجیے آپ اس کا کچھ بات سمجھ میں آتی ہے پھر کچھ کرنا پڑتا ہے۔ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ کام کرنے والوں کے کام کا کتنا اچھا خوشگوار نتیجہ ہے یہ۔ الۡعٰمِلِیۡنَ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ (29:59) غور فرما رہے ہیں کہاں آ رہا ہے توکل کا لفظ۔ کام کرنے والے، استقامت سے کام کرنے والے، خدا کے قانون کی محکمیت پر پورا اعتماد رکھنے والے۔ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن کی رو سے کیا ہے توکل۔

ایمان بالغیب بڑا پُر معنی لفظ ہے انسانی تگ و تاز اور انہماک اسی کا رہینِ منت ہے

کیوں کہ اہم موضوع ہے اس لیے میں چاہتا ہوں جتنی بھی تفصیل ممکن ہو سکے ایک درس میں پوری کروں۔ وَ لِلّٰہِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (11:123) یہ کام جن کے ابھی نتائج تمہارے سامنے نہیں آئے، وہ چھپے ہوئے ہیں، تم نہیں جانتے۔ پہلی دفعہ اگر کوئی کام اس قسم کا کیا جائے قانون کے بھروسے پہ اور وہ اس سے پہلے ابھی سامنے نہ آیا ہو، اس پہ یقین رکھنا جو ہے اسے کہتے

ہیں ایمان بالغیب۔ان چیزوں کے بھی ترجمے‘ مفہوم عجیب ہوئے ہوئے ہیں ہمارے سامنے صاحب۔کہہ دیا یہ میٹا فزکس سے تعلق ہے۔کوئی پروسیس کوئی فارمولا جو پہلی دفعہ آزمانا ہےتم نے ابھی اس کے نتائج سامنے نہیں آئے‘اس کے اوپر یقین رکھنے کے لیے‘ قانون دینے والے کی حاذقیت اوراس کی صداقت پہ بڑے ہی یقینِ محکم کی ضرورت ہوتی ہے۔جب وہ ایک دفعہ سامنے آجاتی ہیں چیزیں پھراس کے بعدتو سب شروع کردیتے ہیں۔تو کہا ہے کہ یہ اس خدا کے قانون دیے ہوئے ہیں کہ جو چیزیں تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں‘ وہ بھی جانتا ہے۔ وَ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّہٗ (11:123) جتنے معاملات یہاں ہوتے ہیں تمام کے تمام اس کی طرف لوٹتے ہوئے‘ چلے جاتے ہیں اس کے قانون کی طرف‘ کوئی ادھر ادھر نہیں جا سکتا کائنات کے اندر۔فَاعۡبُدۡہُ (11:123) لہٰذااسی کے احکام کی تعمیل کرواسی کی محکومیت اختیار کرو۔عبادت کے معنی میں بتا چکا ہوں۔وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡہِ ؕ (11:123) بھروسہ رکھواس کے اوپر۔یہ ٹھیک ہے کہ جو کچھ قانون دیا جار ہا ہے‘فارمولا دیا جار ہا ہے‘ پہلی دفعہ تم بظاہر آزمار ہے ہو۔

دینِ خداوندی‘ مذہب کی شراکت تو کسی شکل بھی قبول نہیں کرتا

عزیزانِ من! یہ اس زمانے کی زندگی نبی اکرمﷺ کی‘ ان حالات کے اندر یہ کہنا کہ یادرکھو! تم قیصروکسریٰ کے تختوں کے مالک بن جاؤ گے۔وہ قوم کہ جن کو گھروں سے نکال دیا گیا تھا‘ خدا کے اس وعدے کے اوپر یقین رکھنا جو تھا یہ ہے جسے ایمان بالغیب کہتے ہیں۔اتنا محکم یقین تھا ان کو کہ چل نکلے اور نتائج نے بتادیا کہ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ (10:55) خدا کے وعدے سچے ہوا کرتے ہیں کہا بھروسہ رکھو جو کچھ ہم کہتے ہیں۔ قُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰہُ ؕ (39:38) آہاہا! کیا بات ہے حسبی اللہ کی؟ مجھے خدا کے قوانین کافی ہیں۔تمہارے ان نظاموں کی‘ تمہاری ان از مزکی مجھے ضرورت نہیں ہے میرے لیے وہ کافی ہے عَلَیۡہِ یَتَوَکَّلُ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ (39:38) صحیح بھروسہ کرنے والے اس کے قانون کے اوپر بھروسہ کرتے ہیں۔یہ کہو کس سے کہا گیا ہے؟ خود نبی اکرمﷺ فرمارہے ہیں۔بات چلی آرہی ہے یوں کہ یہ مخالف جو تھے‘ وہ سامنے آمنے آئے۔انہوں نے آ کے یہ بات کہی کہ صاحب! آپ کچھ کہتے ہیں ہم بھی کچھ کہتے ہیں‘ خوامخواہ جھگڑا کیوں کریں آؤ کچھ COMPROMISE کرلیں مل جل کر ایک مخلوط قسم کی حکومت قائم کرلیں‘ ایک ایسا نظام قائم کریں‘ تم بھی آجاؤ‘ ہم بھی آجائیں خوامخواہ انرجی WASTE ہورہی ہے ہماری۔کہا ان سے کہہ دو کہ میرے پاس جو فارمولا ہے وہ فی ذاتہٖ مکمل ہے۔اس میں اب کسی پیوند سازی کی ضرورت نہیں ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ الفاظ آج جتنے دہرائے جارہے ہیں پھر کبھی الیکشن کا زمانہ آئے گا تو پھر دہرائے جائیں گے ورنہ اس سے پہلے نہیں

دہرایے جائیں گے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے صاحب۔ زندگی کے ہر گوشے میں ہمیں راہنمائی دیتا ہے۔ یہ سارا کچھ ہو رہا ہے اور اس کے بعد وہ بھی ضابطۂ حیات مکمل لیے ہوئے ہیں' یہ بھی مکمل ضابطۂ حیات لیے ہوئے ہیں۔ سارے کے سارے کہے چلے جا رہے ہیں' کوئی نہیں بتاتا یہ ضابطۂ حیات ہے کیا؟ کہ صاحب! بتایے نا؟ کہتے ہیں ''الیکشن ہو جان دو فیر دساں گے۔ اوہدا ڈھگا گواچ گیا سی نا مراثی داتے لبھدا پھر داسی' لبھے نا' تے ہن اوہنے اٹھکورے لینے شروع کیتے تو کل دے۔ سائیں تو کل شاہ جے میرا ڈھگا لبھ جائے تے ویہاں رپیاں دی نیاز تینوں دیواں گا' نہ لبھا۔ سائیں لسوڑی شاہ جے لبھ جائے تے اکونجا روپیاں دی نیاز دیاں گا' فیروی نہ لبھا۔ یا یارہویں والے آ میرا ڈھگا لبھ جائے تے سو روپیہ دی نیاز دیاں گا۔ اک نے کہیا او سارا جیہڑا تیرا ڈھگا سی او ستاں روپیاں داتے ڈھگا سی' تے ڈوڑھ سو روپیہ دی توں نیاز سُکھ چکا ہیگا ایں' اے کی گل ہوئی؟ کہن لگا سنگیں ہتھ پے لین دے' ساریاں نوں ڈوکا دے دیاں گا فیر۔ اے سارا مکمل نظامِ حیات دی ڈگڈگی جیہڑی وجدی اے نا اے سنگیں ہتھ پے لین دیو فیر اے تہانوں ڈوکا ڈوکا دین گے سارے''۔ عزیزانِ من! جس کو اس پہ یہ یقین ہے ایمان ہے جب وہ یہ کچھ بولتا ہے وہ بتائے گا تمہیں کہ یہ کیا نظامِ حیات ہے۔ پھر وہ نہ کسی کے ساتھ COMPROMISE کرے گا' نہ اسے کسی دوسرے گوشے کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے وہ کہے گا کہ حَسْبِیَ اللّٰـهُ ط(39:38)۔ اور اسی کے اتباع میں تھا کہ جس نے اس سے اسلام کو صحیح شکل میں سیکھا تھا۔ اس ذاتِ اقدس ﷺ کی دنیاوی زندگی کے آخری لمحات میں جب یہ کہا گیا کہ کوئی چیز اور چاہیے؟ تو اس سیکھنے والے حضرتِ عمرؓ نے کہا تھا حسبنا کتاب اللہ وہ رسول ﷺ جو کتاب دے کے چلا گیا' ہمارے پاس وہ ہے اس کے بعد اور کس چیز کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

ہم صدیوں سے بغیر کوئی وضاحت کیے نظامِ حیات کے مکمل ہونے کا نعرہ بلند کیے جا رہے ہیں

عزیزانِ من! ہمیں پتہ ہی نہیں' یہ ضابطۂ حیات کیا ہے' ورنہ اس کے بعد ہم یوں بھیک مانگتے پھریں۔ ہے کسی کے سامنے جو سامنے کر کے دکھائے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:2) یہ تو ایک ایک ووٹ مانگتے ہیں' دنیا بھر ووٹیں نہیں ان کے پاؤں پکڑ لیں اور ہمیں کہیں جانے ہی نہ دیں۔ حَسْبِیَ اللّٰهُ ط عَلَیْهِ یَتَوَکَّلُ الْمُتَوَکِّلُوْنَ (39:38) صحیح بھروسہ کرنے والے اس پہ بھروسہ کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! سنیے اس بھروسے کے بعد کیا کہہ رہے ہیں؟ تم کہتے ہو کہ آؤ ہمارے پروگرام کے اوپر عمل کر کے دیکھو ہمارے ساتھ COMPROMISE کرو۔

میدانِ عمل توکل کی ایک محسوس شکل پیش کرتا ہے

کہا قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَكَانَتِكُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ط (39:39) یہاں گالیاں دینے کی بات نہیں ہے' بحث وتمحیص کی بات نہیں' مکالمے کی بات نہیں ہے۔ یہ افریقی رقص جو آج ہو رہا ہے' اس کی ضرورت نہیں' سیدھی بات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا پروگرام جو ہے وہ ٹھیک نتائج دے گا' میرا دعویٰ ہے کہ میرا پروگرام نتائج دے گا۔ اس کی شہادت کیا ہے؟ دلیل کیا ہے اس کی؟ کہا یہ ہے تم اپنے پروگرام پہ عمل کرو' مجھے اپنے پروگرام پہ عمل کر لینے دو' میں تمہارے معاملے میں INTERFERE نہیں کرتا' تم میرے معاملے میں INTERFERE نہ کرو۔ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ. مَنۡ یَّاۡتِیۡهِ عَذَابٌ یُّخۡزِیۡهِ وَیَحِلُّ عَلَیۡهِ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ (39:39-40) تھوڑے ہی دنوں کے بعد بات صاف ہو جائے گی کہ کس کا پروگرام نتیجہ آور ہے' کس کا پروگرام تباہ کن ہے۔ یہ کیچڑ اچھالنے کے معنی کیا ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہاں آیا ہے یَتَوَكَّلُ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ . قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَكَانَتِكُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ج (39:38-39) عزیزانِ من! توکل اسے کہتے ہیں۔ کتنا بڑا بھروسہ ہے اور کن حالات میں ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے قرآن کہتا ہے ان حالات میں کہ دو نفوس ایک غار کے اندر پناہ لے کے بیٹھے ہوئے ہیں' دشمن کے پاؤں کی آہٹ کان میں آ رہی ہے۔ وہاں ایک رفیق کی پیشانی پہ تذبذب کے آثار نظر آتے ہیں۔ اپنے لیے نہیں اس کے لیے جو جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور وہ وہاں اسے کہتا ہے کیوں گھبراتے ہو؟ خدا کے وعدوں پر پکا یقین ہے ہمیں۔ لیکن یقین اس صورت میں سامنے وہ صداقت آتی ہے قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا (39:39) اتنا بڑا چیلنج ہے اور کتنا بڑا بھروسہ ہے جس کے ساتھ یہ شخص کہہ رہا ہے' کھلی چھٹی دے رہا ہے۔ جاؤ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو' مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو' صرف میں یہ چاہتا ہوں تم سے DON'T INTERFERE ۔ لَكُمۡ دِیۡنُكُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ(109:6) اس کے نتائج تم دیکھ لو گے میں اپنے نتائج دیکھ لوں گا' معلوم ہو جائے گا۔

خدا کے قانون پر بھروسہ نہ کرنے کا نتیجہ اور اس کی عملی شکل

عزیزانِ من! دیکھا توکل کے معنی کیا ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو پہلے دن سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ یہ تمہارا نظام غالب آ کر رہے گا۔ قرآن کے الفاظ ہیں كَتَبَ اللّٰهُ (58:21) خدا نے یہ بات اپنے اوپر واجب کر لی ہے لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ(58:21) خدا اور اس کے رسول غالب آ کر رہیں گے۔ یعنی خدا نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے۔ کتنی بڑی چیز ہے صاحب یہ کہنے کا انداز۔

ہمارے اوپر تو قرآن نے کہا ہے **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ** (2:216) ' **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (2:183) تمہارے اوپر یہ فرض ہے یہ فرض ہے۔ کہا ہے ایک بات خدا پہ بھی فرض ہے' فرض یہ ہے کہ صحیح نظام زندگی کے اوپر اگر کوئی عمل کرنے والا کھڑا ہو جائے تو غالب آ کر رہے گا صاحب۔ جس رسول کو یہ وعدہ دے دیا گیا ہو' معاذ اللہ اگر وہ بھی یہ سائیں توکل شاہ والا توکل لے کے بیٹھے تو پھر تو راوی عیش لکھتا ہے' بیٹھے ہوئے رہتے کہ صاحب خدا نے وعدہ کر لیا ہے' یہ تو ہو کے رہنا ہے۔ سوال ہی نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس وعدے کے ایفا ہونے میں جس کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ ہم نے اپنے اوپر یہ واجب کر لیا ہے کہ غالب آ جاؤ گے کم از کم بیاسی لڑائیاں جو اس قوم کو اور حضورﷺ کے ساتھیوں کو لڑنے پڑیں اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے' خدا کے اس فریضے کی ادائیگی کے لیے۔ جنگوں میں شکستیں کھائیں' دانت شہید ہوئے' زخم آئے' کتنے صحابہؓ جو تھے ان کا خون بہا' مسلسل جنگیں ہوتی چلی گئیں۔ اُدھر سے خدا نے یہ وعدہ کیا کہ ہم نے فرض قرار دے لیا ہے اپنے اوپر کہ یہ ہو کے رہے گا۔ اُدھر ان سے کہا کہ اپنی سرحدوں کے اوپر گھوڑے باندھ کے رکھنا **وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ** (33:48) پھر بھروسہ کرنا خدا پر۔ KEEP YOUR POWDER DRY AND THEN TRUST IN WAR بارود کو نمی سے بچانا پھر بھروسہ کرنا۔ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ** (5:11) خدا کی اس نعمت کو یاد کرو ہجوم کر کے یہ مخالفین آ گئے تھے کہ تمہیں کسی طرح سے پسپا کر دیں' نیست و نابود کر دیں' شکست دے دیں تمہیں' تم نے دیکھا کہ اس نے کس طرح سے ان کے ہاتھوں کو روکا۔ یعنی نظریوں آ رہا ہے کہ وہاں انہوں نے وہ ہاتھ اٹھائے اور اللہ تعالیٰ نے وہیں ان کے ہاتھ مفلوج کر دیے۔ ہمارے ہاں کا توکل یہ ہے نا کہ یہ سب کچھ خدا کرے گا کہ اس نے ہاتھ ان کے وہیں کے وہیں اس طرح سے باندھ دیے۔ یہاں ہے **وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ** (5:11) یہاں لفظ توکل آیا ہے لیکن یہ کس طرح سے ان کے ہاتھ رکے تھے؟ قرآن کریم کے صفحات یہ بتا رہے ہیں' یہ بتا رہے ہیں کہ ایسا وقت آیا جنگِ احزاب میں۔ یہ ہے کہ وہ ایسا وقت آ گیا تھا کہ تمہارے دل اچھل کر حلق میں آ رہے تھے' آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں' زمین میں تزلزل پیدا ہو گیا تھا' آسمان سے مصائب تمہیں نظر آ رہے تھے' اس قسم کے صبر آزما مراحل میں تم نے اپنے پاؤں میں لغزش نہیں آنے دی یوں خدا نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔

خود کو خدا کے قانون کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے ذرائع کے استعمال کی اہمیت

یہ خدا نے روک دیے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ تم نے جب اس کے قانون کے مطابق کیا تو یہ کچھ ہو کے رہا۔ ورنہ سیدھی سی

بات تھی کہ خدا کہنے والا اس کا رسول ﷺ سننے والا اس سے وہ وعدہ کر رہا ہے کہ یہ ہو کے رہے گا تو پھر اس کے بعد کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ یہ اتنی جنگیں اتنا ساز وسامان، یہ ساری پہلے مکے کی تیرہ سال کی زندگی ان تیاریوں کی، سات سال کی زندگی مسلسل جہاد کی زندگی اس کے بعد ہے یہ جو کچھ توکل کہتے ہیں۔ توکل کی ایک بڑی محسوس سی مثال ہے حضرتِ نوحؑ کا واقعہ۔ مخالفوں کا ہجوم آ رہا ہے یہ نظر آ رہا ہے وہ جو سیلاب آ رہا ہے اس کے لیے کہا ہے فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ (10:71) میں خدا پہ بھروسہ کرتا ہوں۔ لفظ یہی ہیں نا۔ تم تباہ ہو جاؤ گے خدا نے مجھ سے کہا ہے تم اور تمہاری جماعت بچ جائے گی، سیلاب سے یہ نہیں غرق ہو گی، وعدہ کیا۔ اور اس کے بعد کیا ہوا؟ خدا نے کہا کہ نوحؑ! کشتی بناؤ جلدی سے، جلدی کرلو۔ دیکھا آپ نے یہ توکلت علی اللہ کہہ رہے ہیں، یہ کیا تھا توکل؟ مجھے اس نے یہ بتایا ہے ایک قانون اور وہ یہ ہے کہ اگر اس طرح سے لکڑیاں جوڑ کے وہ قرآن کہتا ہے لکڑیاں جوڑیں، میخیں ٹھونکیں، یہ کچھ کرلیا جائے، اتنا اس کا حجم اگر ہو جائے اور اتنے اس میں آدمی سوار کرا دیے جائیں جن کا وزن دوگنا ہو تو پھر کتنا ہی پانی کیوں نہ ہو، وہ تیرتی جائے گی، مجھے اس نے بتا دیا ہے اس کا نام ہے توکلت علی اللہ، بتا دیا ہے مجھے۔ سامنے بنا رہے تھے، ان کی تو مت ماری گئی ہر بات میں جب مخالفت ہو تو اندھا ہو جاتا ہے۔ سامنے یہ کچھ کر رہے تھے، وہ مذاق کر رہے تھے کہ دیکھو یہ کر کیا رہا ہے؟ وہ پوچھتے تھے کیا کر رہے ہو؟ وہ کہتے تھے اللہ پہ توکل کر رہا ہوں۔ یہ کرو۔ اور وہ جو چمکتی ہوئی ہیرے کی طرح ہے حدیث نبی اکرم ﷺ کی کہ جب وہ بدو آ گیا تھا اندر، آپ ﷺ نے کہا کہ کیسے آئے ہو؟ کہا کہ وہ اونٹ ہے، کہاں اونٹ ہے؟ کہا باہر چھوڑ دیا ہے، کہا ﷺ باہر چھوڑ دیا ویسے ہی؟ اس نے کہہ دیا کہ ہاں جی توکل علی اللہ چھوڑ دیا ہے، فرمایا ﷺ ''اعقل وتوکل''، جا کے پہلے اونٹ کا گھٹنا رسی سے پکی طرح باندھ پھر توکل کر۔ لیکن ایک توکل اس کے بعد پھر وہ آیا جس کی مثال خود قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کی زندگی کے اندر ہمیں دی۔

نوعِ انسانی کے لیے سابقہ قوموں کی زندگی کے حالات کو سامنے لانے کا مقصدِ عظیم

کیا بات ہے قرآن کی؟ پرانی قوموں کے واقعاتِ زندگی اس طرح سے لاتا ہے صاحب ''دھی اے تو گل سن نونہہ اے تو کن کر۔ اے داستاناں، اے ہیگیاں نیں'' باتیں ان کی ہیں، کہا ہم سے جاتا ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ قوم کو لے کے نکل آئے فرعون کی غلامی سے نجات بھی مل گئی۔ انڈیا کی تقسیم بھی ہوگئی پاکستان کی سرزمین بھی مل گئی، بعینہٖ ایسے ملی تھی جیسے بنی اسرائیل کو یہ ملی ہے۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے کہا کہ لیجیے یہ کچھ تو یوں ہو گیا ہے۔ اب اس سرزمین کا تمکن حاصل کرنا ہے، مجاہدانہ زندگی بسر کرنی ہو گی۔ خدا نے کہا ہے کہ تمہارے نام پہ ہم نے اس زمین کو لکھ دیا ہے یعنی انتقال چڑھ گیا تمہارے نام پہ، قبضہ لے لو اٹھ کے۔ قَالُوْا

یٰمُوْسٰٓی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (5:22) کہنے لگے موسٰی! اس میں تو بڑے کچھ زبردست سے لوگ نظر آتے ہیں ''مار مار کے بتھاڑ سیک دین گے'' نہیں بھائی! ہم تو نہیں جائیں گے ہم تو نہیں داخل ہوں گے اس میں۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ ہم چاہتے نہیں ہیں اگر یہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم ضرور اس پہ قبضہ کر لیں گے۔ ''لو بڑے بہادر''۔

حضرت موسٰیؑ کا مقابلے کے لیے اپنی قوم سے مطالبہ اور اس کا ردِعمل اور اس کا انجام

سنیے عزیزانِ من! **قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ** (5:23) یہ خدا کے دو بندے موسٰیؑ اور ہارونؑ جو تھے انہوں نے کہا او کم بختو! کچھ تھوڑی سی ہمت کرو اٹھو اور اٹھ کے قبضہ لے لو اپنے ہاتھ میں۔ بس تمہارے اٹھنے کی دیر ہے اٹھو اور قبضہ لے لو۔ سنیے عزیزم! کہا ہے **وَ عَلَی اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ** (5:23) اگر تمہیں اس کے اس وعدے کے اوپر ایمان ہے تو بھروسہ کیوں نہیں کرتے اس کے اوپر اٹھ کے۔ کیوں نہیں ان کا مقابلہ کرتے' ان کو شکست دے دیتے۔ دیکھا توکل۔ **قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا** (5:24) نہیں! جب تک وہ ہیں وہاں' فوجیں ان کی بیٹھی ہوئی ہیں نہر کے اس پار ہم تو نہیں اٹھیں گے صاحب۔ پہلے تو جا کے وہاں سے ان کی فوجوں کو ہٹا کے امرتسر بھیج آ ''فیر دیکھاسی کیویں جانے آں مار دے مار دے اٹاری تیکر'' جاؤ۔ وہ کہنے لگے کہ کون جا کے یہ کچھ کرے گا؟ کہا **فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ** (5:24) تیرے اللہ نے وعدہ کیا ہے اور تجھ سے وعدہ کیا ''تسی دوویں جاؤ۔ اسی ہندوواں دا مال لٹاں گے ایتھے' لڑو تسی جا کے اوتھے''۔ **اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ** (5:24) ہم کہیں بھاگے جا رہے ہیں ہم بیٹھے ہیں یہاں۔ عزیزانِ من! **اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ** (5:24) یہ ہے جو آپ کے ہاں کے مذہب اور تصوف نے توکل بتا دیا **قٰعِدُوْنَ** (5:24) بیٹھے رہو۔ قرآن نے دوسری جگہ کہا کہ یاد رکھو! **قٰعِدُوْنَ** (5:24)' **مُجٰهِدُوْنَ** برابر کبھی نہیں ہو سکتے **لَا یَسْتَوِیْ** (4:94) دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اس طرح سے توکل بر خدا باہر بیٹھے رہنے کا نتیجہ کیا ہوا؟

نئی نسل کی تیاری کے لیے 40 سال تک حضرت موسٰیؑ کو صحرائے سینا میں رہنا پڑا

عزیزانِ من! کہا تھا خدا نے ان سے **یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ** (5:20) اٹھو قبضہ کرو اس زمین پہ تمہارے نام لکھ دی ہے اس نے زمین' یہ ملک لکھ دیا ہے تمہارے نام۔ جب وہ اس طرح **قٰعِدُوْنَ** (5:24) کی

حیثیت سے اس ہمارے معنی میں توکل کر کے بیٹھ گئے کہ لڑو تم، ہم بیٹھے ہیں تو کیا ہوا اس کے بعد؟ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (5:26) لکھ تو دی تھی ہم نے زمین، حرام قرار دیدی ان کے اوپر یہ سرزمین چالیس سال کے لیے يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ط (5:26) جاؤ! یہ جو پرانے بڑے بوڑھے کھوسٹ چلے آ رہے ہیں وہاں سے لیڈر بن کے ان کو پھیراؤ سرگردانی کے، ایک ایک کر کے ان میں سے مر جائے نئی نسل اٹھے گی، اس کے ہاتھوں سے یہ قبضہ ہوگا۔ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (5:26) یوں ہی اپنے اندر گھل کے نہ رہنا کہ صاحب! یہ اس طرح سے مر گئے، یہ مر گئے یہ ہیں ہی اس قسم کے لوگ۔ قٰعِدُوْنَ (5:24) بھی کبھی دنیا میں زندہ رہے ہیں؟ زندہ مجاہد رہتا ہے اس کا حق ہے زندہ رہنے کا، اتنا زندہ رہنے کا کہ جسے دنیا کہتی ہے مر گیا خدا کہتا ہے اسے مردہ مت کہو زندہ رہنا اس کا حق تھا (2:154) مردہ تم ہو جو بیٹھے ہوئے ہو لاشو، زمین کی چھاتی کے اوپر بوجھ بن کے، اُسے زندہ رہنے کا حق تھا۔ حرام قرار دے دی وہ زمین جس کے لیے کہا تھا، لکھ دی ہے۔ عزیزانِ من! دیکھا آپ نے توکل کیا ہوتا ہے؟ اور آخر میں پانچ چارمنٹ کی مہلت اور چاہوں گا اس لیے کہ بات ختم ہو رہی ہے آخری چیز سامنے آنی چاہیے۔ جتنی مشکلات اور سامنے آتی ہیں، اتنا ہی یہ یقین محکم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ط لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ج (3:172) یہ وہ لوگ ہیں کہ شکست بھی ملی تھی، زخم بھی کھائے تھے، اس کے باوجود جب آواز دی گئی تو لبیک کہتے ہوئے اس کے اوپر چلے آئے، حاضر ہیں ہم اس کے لیے، ان کے لیے ہے خوشگوار زندگی۔ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ (3:173) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے آن کے کہا کہ تمہیں پتہ ہے کتنا عظیم لشکر تمہارے مقابلے میں وہ لیے آ رہے ہیں، امڈتا ہوا چلا آ رہا ہے لشکرِ عظیم، تم اتنی سی جماعت ہو چھوٹی سی۔ کچل ڈالیں گے تمہیں، روند ڈالیں گے تمہیں، ڈرو ان سے۔ نتیجہ اس کا کیا ردِعمل ان کا ہوا؟ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا (3:173) اس سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ عزیزانِ من! سنیے وَّقَالُوْا (3:173) انہوں نے کہا ٹھیک ہے لشکر بڑا عظیم ہے ساز و سامان بھی زیادہ ہوگا حَسْبُنَا اللّٰهُ (3:173) خدا کا قانون ہمارے لیے کافی ہے۔ اور یہاں آیا ہے وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ (3:173) یہاں ہے لفظ، جس پہ توکل کیا جائے، اسے وکیل کہتے ہیں۔ کتنا اچھا ہے وہ جس کے اوپر ہم بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ لا وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ط وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ (3:174)

توکلِ انسانی زندگی میں خود اعتمادی کا ملکہ پیدا کر دیتا ہے

جھولیاں بھر بھر کے خدا کی نعمتوں کی وہ واپس آئے۔ عزیزانِ من! توکل یہ چیز ہے۔ خیال میں آپ کے آ گیا لکھ لیجیے، توکل

قرآن کی رو سے کیا ہے۔توکل علی اللہ جسے آپ کہتے ہیں وہ اس خوداعتمادی کا نام ہے جو قانونِ خداوندی کے اتباع سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔اس SELF CONFIDENCE کو کہتے ہیں جو خدا کے قانون کی محکمیت پر ایمان سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ترجمہ اس کا کرو جب کہا جائے توکل علی اللہ کہ وہ خوداعتمادی وہ SELF CONFIDENCE کہ جو خدا کے قوانین کی اطاعت سے انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے، اسے توکل علی اللہ کہتے ہیں۔نہ وہ توکل کہ بیٹھے رہو بنی اسرائیل کی طرح دروازوں کے باہر اور کہو کہ وہ سارا کچھ ہمارے لیے فتح کر کے ہمیں دیدے گا۔عزیزانِ من! یہ تھا وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (3:122) مومن خدا پر بھروسہ کرتا ہے خدا کے قوانین کی صداقت پر اس کو اتنا یقین محکم ہوتا ہے کہ اس سے اس کے اندر ایک خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کرسکتی۔سورۃ الِ عمران کی آیت 122 تھی جو ہم نے لی اس کے بعد ہم آگے چلیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

بیسواں باب: سورۃ آلِ عمران (آیات 123 تا 129)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1970ء کی 8 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی 123 آیت سے ہوتا ہے (3:123)۔

سابقہ درس کے مطابق کسی غیبی مدد کا انتظار مکمل طور پر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں بات آخری یہ تھی کہ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (3:122) مومن اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ اور پورا درس اس کی تشریح میں گذر گیا تھا کہ توکل کے قرآنی معنی کیا ہیں۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک ذہنی عقیدے کے مطابق کسی غیبی مدد کے انتظار میں بیٹھے رہنا' یہ تصور یکسر قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے جو تصور دیا ہے توکل کا اس کے معنی وہ خود اعتمادی ہے وہ SELF CONFIDENCE ہے جو خدا کے قوانین کے مطابق فیصلے اور عمل کرنے سے انسان کو حاصل ہوتا ہے کہ میں جس راستے پہ چل رہا ہوں وہ بالکل صحیح راستہ ہے اور یہ مجھے منزلِ مقصود تک ضرور پہنچا کر رہے گا۔ یہ یقین جو ہے اپنے راستے کی صداقت کا' قوانینِ خداوندی کی محکمیت کا' اس امر کا کہ اس کے مطابق چلنے سے وہ نتائج پیدا ہو کر رہیں گے جو نتائج اس نے کہے ہیں' یہ یقین جو پیدا ہوتا ہے اس سے قلب کو جو ایک خاص اطمینان حاصل ہوتا ہے' اس کا نام توکل ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو قرآن نے مختلف مقامات پر یہ کہی کہ صحیح راستے پر چلنے والے کو ایک یقین ہوتا ہے' اس کا نام توکل رکھا جاتا ہے۔ اسی کی تشریح میں

قرآن نے آگے دو واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ہے جنگِ بدر بلکہ تین ہیں جنگِ بدر جنگِ احد اور جنگِ احزاب۔ ان جنگوں کی تفصیل تو دوسرے مقامات پر آئے گی' سورۃ انفال میں بھی اس کا ذکر آئے گا تو میں ان کی تفصیل تو ان مقامات پر عرض کروں گا جہاں خود قرآن نے ان کی تفصیل دی ہے۔ یہاں اس نے بات ایک اشارتاً کہی ہے اور وہ بھی بڑی اہم چیز ہے آج اس کی تشریح سامنے آئے گی۔ وَ لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ وَّ اَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ ۚ (3:123) تم دیکھ چکے ہو کہ بدر میں خدا نے تمہاری مدد کی تھی درآں حالیکہ تم وہاں اس زمانے میں بڑے کمزور تھے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ تعداد بھی بہت کم تھی' سامانِ جنگ کی بھی قلت تھی لیکن اس کے باوجود تمہیں وہاں کامیابی ہوئی تھی۔

سفر اور آوارگی میں ایک بنیادی فرق ہے

جس طرح توکل کا مفہوم آپ کے سامنے آ گیا اسی طرح جسے خدا نے اپنی مدد کہا ہے اس مدد کے متعلق بھی قرآن نے بہت سے مقامات میں یہ بتا دیا ہے کہ وہ یوں ہی بیٹھے بٹھائے نہیں آ جاتی' وہ خود انسانوں کے ہاتھوں سے ہی ہوتی ہے۔ اور وہاں بھی یہی کہا ہے کہ جب انسان اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرتا ہے تو اس کے نتیجے یقینی طور پہ سامنے آتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص ہے جو غلط راستے پہ چل رہا ہے' غلط راستے پہ چلنے والا بھی دن بھر چلتا رہتا ہے' اسے بھی تکان ہوتی ہے' اس کی محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن شام کے وقت وہ اپنی منزل سے اس سے بھی زیادہ دور ہوتا ہے' جتنا دور وہ اس وقت تھا جب اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ سفر اور آوارگی میں فرق یہ ہوتا ہے کہ مسافر کا ہر قدم اپنے منزل کی طرف اٹھتا ہے کیوں کہ وہ صحیح راستے پہ گامزن ہوتا ہے اور آوارگی وہ ہوتی ہے کہ جس میں سامنے کسی نصب العین کا تعین نہیں ہوتا' منزلِ مقصود کوئی نہیں ہوتی' چلتا رہتا ہے انسان چلتا رہتا ہے' دن بھر چلتا رہتا ہے اور کوئی نتیجہ سامنے اس کا نہیں آتا۔ یہ جو صحیح راستے کے اوپر چلنا ہے یہ جسے نصرتِ خداوندی کہا گیا ہے۔ ابھی ایک لفظ اور سامنے آتا ہے جس کی تشریح ضروری ہے۔ کہا کہ اس وقت ہم نے تمہاری مدد کی تھی۔ اب یہ دیکھیے کہ یہاں کیا کہا ہے کہ اس مدد کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ (3:123) تم قوانینِ خداوندی کی احتیاط برتو' اس کے مطابق چلو' اس کی خلاف ورزی کے عواقب اور نتائج سے ہمیشہ محتاط رہو' خائف رہو تا کہ (شکر کے معنی آپ کے سامنے آ چکے ہوئے ہیں) تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ کوششوں کے بھرپور نتائج پیدا کرنے کی شرط فَاتَّقُوا اللّٰهَ (3:123) ہے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے چلے جانا' اس کی خلاف ورزی کے نتائج کو ہمیشہ سامنے رکھنا اور اس شکل سے بچ کر چلنا' اسے تقویٰ کہا جاتا ہے۔ تا کہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ اِذۡ تَقُوۡلُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَلَنۡ يَّكۡفِيَكُمۡ اَنۡ

يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ(3:124)

جنگِ بدر، جنگِ احزاب اور جنگِ اُحد میں مخالفین تعداد کے مطابق ملائکہ کی تعداد کے ذکر کے علاوہ ملائکہ کے لفظ کا مفہوم

یہ جنگِ احد کا بیان ہے کہا کہ جب تو مؤمنین سے یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کیا کافی نہیں تمہارے لیے کہ خدا تمہاری مدد تین ہزار فرشتوں سے کرے۔ یہ ہے وہ چیز جو میں نے کہا تھا کہ آج کے درس میں اہم بات سامنے آئے گی۔ یہ ملائکہ کی امداد کیا ہوتی ہے؟ جنگِ بدر میں بھی قرآن نے کہا ہے وہاں مقابلے میں ایک ہزار کا لشکر تھا وہاں کہا تھا کہ ہم نے تمہاری مدد ایک ہزار ملائکہ سے کی۔ جنگِ احد میں فریقِ مخالف کے لشکر کی تعداد تین ہزار تھی، وہاں کہا تھا کہ ہم نے تین ہزار ملائکہ سے مدد دی۔ جنگِ احزاب میں ان کی تعداد پانچ ہزار تھی وہاں کہا کہ پانچ ہزار ملائکہ سے تمہاری مدد کی۔ یہ ملائکہ کی مدد کیا ہوتی ہے؟ کیسے حاصل ہوتی ہے؟ ملائکہ اگرچہ شروع سورۃ بقرہ میں بھی قصۂ آدم میں ملائکہ کا لفظ آیا تھا اور وہاں بھی میں نے تشریح کی تھی لیکن چونکہ وہ بات پرانی ہوگئی ہے اس لیے میں اس کی تجدید کے لیے پھر عرض کیے دیتا ہوں۔ ملائکہ لغوی اعتبار سے لغت والوں نے لکھا ہے کہ اس کے دو مادے ہوسکتے ہیں 'ا ل ک' بھی ہوسکتا ہے اور 'م ل ک' بھی ہوسکتا ہے۔ پہلے مادہ کی رو سے اس کے معنی پیغام رسانی کے ہوں گے۔ لیکن چونکہ قرآنِ کریم نے ملائکہ کا FUNCTION یا ان کا کام صرف پیغام رسانی ہی نہیں بتایا، اس لیے یہ دوسرا جو مادہ ہے جس کے معنی قوت کے ہیں، وہ زیادہ صحیح ہے، زیادہ موزوں ہے یوں کہہ لیجیے۔ ملائکہ کچھ قوتیں ہیں انہیں مدبرات الامر کہا گیا ہے، تدبیرِ امور کرنے والی قوتیں۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ یہ ایک تو عالمِ خلق ہے THIS PHYSICAL UNIVERSE جسے آپ کہتے ہیں یہ محسوس کائنات۔ اور اس کے علاوہ ایک عالمِ امر ہے خدا کا وہ عالم کہ جس میں ان تمام امور کے PLANS ہوتے ہیں یہ چیزیں طے ہوتی ہیں، ان کے لیے قوانین بنتے ہیں۔ وہ عالمِ امر وہ ہے کہ جس کی کنہ وحقیقت سے ہم واقف نہیں ہوسکتے۔ ہمارا علم صرف عالمِ محسوس تک محدود ہے۔ عالمِ امر کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ خود امر کے معنی بھی ایک ڈائریکشن کے ہوتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں لفظ امر، امیر یا امیر المؤمنین کے لفظ کا استعمال اور اس کا لغوی مفہوم

عربوں کے ہاں یہ سڑکیں تو ہوتی نہیں تھیں، صحراؤں میں وہ راستے کی نشاندہی کے لیے کہیں چھوٹے چھوٹے پتھر رکھ دیا کرتے تھے۔ اب بھی ایسی جگہوں میں جہاں سڑکیں نہیں ہوتیں نشاندہی کے لیے اس طرح سے ایک پتھر رکھ دیتے ہیں۔ یہ جو

نشاندہی کے پتھر ہوتے تھے یہ امر ہوتا تھا حقیقت میں۔ میں نے ایک دن عرض کیا تھا کہ آپ کے ہاں یہ جو ہیڈ آف دی سٹیٹ کے لیے امیر المؤمنین کا لفظ تجویز کیا گیا تھا وہ امیر نہ تو امارت اس معنی میں تھی جو غریبی کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ وہ تو سب سے زیادہ غریب ہوا کرتا تھا اور نہ ہی یہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی میں آتا ہے بلکہ وہ تو صرف ایک ڈائریکشن دینے والا ہوتا ہے' خدا کے راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرنے والا ہوتا ہے۔ تو امر کے معنی ہوتا ہے ڈائریکشن۔ اسی لیے اس کو عام طور پر خدا کی DIRECTIVE ENERGY جسے کہتے ہیں اس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ مقام جہاں کہ یہ ساری چیزیں طے ہوتی ہیں کس چیز نے کیا کرنا ہے' کیسے کرنا ہے' قانون اس کے لیے کیا ہے' منزل کیا ہے۔ بہرحال یہ چیزیں ایک دوسری دنیا سے متعلق ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے اس کی کنہ وحقیقت کو تو ہم نہیں جانتے۔ جتنا کچھ قرآن نے بتایا ہے ہم اتنا ہی جان سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں قصہ ٔ آدم کے دوران ملائکہ کا ذکر بڑا قابلِ غور ہے

قرآن نے ملائکہ کے متعلق کہا ہے کہ یہ خدا کی پیدا کردہ وہ قوتیں ہیں کہ اس کا جو عالمِ امر ہے اس کی تدبیر کرتی ہیں' ان کے ذمہ یہ چیزیں لگی ہوئی ہیں۔ ان کا ایک حصہ وہ ہے کہ جو ہمارے ہاں جسے FORCE OF NATURE کہتے ہیں' فطرت کی قوتیں کہتے ہیں' ان فطرت کی قوتوں کو بھی ملائکہ کہا گیا ہے اور یہ وہ ملائکہ ہیں جو قصہ ٔ آدم میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ میں وہاں عرض کر چکا تھا کہ آدم کسی فرد کا نام نہیں' آدمی ہی کو آدم کہا جاتا ہے وہ آدمی کی داستان ہے آدمی کی ممکنات کا ذکر ہے وہاں۔ کہا وہاں یہی گیا تھا کہ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا (2:31) آدم کے اندر اشیائے کائنات کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی تھی۔ اور جب کائنات میں جو قوانین جاری و ساری ہیں' ان کا علم حاصل ہو جائے تو کائنات کی قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں۔ اس علم کے آنے کے بعد کہا گیا تھا کہ ملائکہ آدم کے سامنے جھک گئے۔ فطرت کی قوتوں کو یہ مسخر کر سکے گا اگر اس نے ان کے اس قوانین کا علم حاصل کر لیا جن کے تابع یہ قوتیں یہاں کارفرما رہتی ہیں۔ تو ایک شق تو ملائکہ کی یہ ہے کہ فطرت کی قوتیں جو اس محسوس کائنات کے اندر کارفرما ہیں' انہیں بھی ملائکہ کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی دنیا میں کچھ اور قوتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں انہیں آپ نفسیاتی قوتیں کہہ سکتے ہیں۔ وہ محسوس شکل میں تو آپ کے سامنے نہیں آتیں' اسے کہتے ہیں کہ SUBJECTIVELY (داخلی طور پر) آپ انہیں محسوس کرتے ہیں ان چیزوں کو اور وہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔

انسان کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر باہر کی زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

قرآنِ کریم نے بتایا یہ ہے کہ خارجی دنیا میں، خارجی حالات میں، باہر کی زندگی میں، قوموں کے اندرونی حالات کے اندر تبدیلی کس طرح ہوتی ہے؟ اس تبدیلی کی بنیاد یہ ہے کہ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ۙ (8:53) کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی خود پیدا نہ کرلے۔ یہ نفسیاتی تبدیلی جسے قرآن نے کہا ہے کہ PSYCHOLOGICAL CHANGE اندر آتا ہے، قلب و ذہن کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! باہر کی تبدیلیاں تو اس کا ایک محسوس نشان ہوتی ہے، حقیقی تبدیلی جو ہے انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، اس سے اس کی خواہشات بدلتی ہیں، آرزوئیں بدلتی ہیں، تمنائیں بدلتی ہیں، ارادے بدلتے ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ PLAN کرتا ہے اس کے مطابق یہ ساری چیزیں، جتنی خدا کے ہاں عالمِ امر میں ہوتی ہیں، یہ تمام چیزیں انسان کے قلب و دماغ میں ہوتی ہیں، نفسیاتی اس کو کہا جاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اس کے اندر ہوتی ہے جسے کوئی دوسرا انسان محسوس نہیں کرسکتا۔ اور جب یہ پھر عمل میں آتی ہیں تو محسوس طور پر پھر ہمارے سامنے یہ چیز آتی ہے کہ اس نے کیا سوچا تھا، کیا آرزو تھی اس کی، کیا ارادہ کیا تھا، کیا فیصلہ کیا تھا، اب کیا کر رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اس کے افراد کے اندر پہلے نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ ہو۔ بڑی اہم چیز ہے جو قرآن نے یہ بتائی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جس وقت آپ کے اندر کوئی پریشانی ہوتی ہے کسی قسم کی، کسی چیز کے متعلق پریشانی ہو، آپ کبھی صحیح فیصلے نہیں کرسکتے۔ آپ کی کوئی کوشش بارآور نہیں ہوسکتی۔ ہر قدم غلط اٹھتا ہے آپ کا۔ اضطراب کے عالم میں آپ وہی ہوتے ہیں، آپ کی قوتیں بھی وہی ہوتی ہیں لیکن کوئی کام آپ کا صحیح نتیجہ پیدا نہیں کرتا ایک اضطراب کی بنا پر۔ انسان کے اندر اس کی ذات میں ایک اعتدال کا ہونا A BALANCED PERSONALITY کا ہونا نہایت ضروری ہے اس کے فیصلوں کے صحیح ہونے کے لیے، اس کے کاموں میں صحیح نتیجہ مرتب ہونے کے لیے۔ اسے بنیادی طور پہ سمجھ لیجیے تو اگلی بات جو میں کہنے والا ہوں وہ سمجھ میں آئے گی کہ قرآن نے ملائکہ کا جو دوسرا FUNCTION بتایا ہے وہ کیا FUNCTION ہوتا ہے۔

انسان کی ساری زندگی اس کی نفسیات کا ہی آئینہ ہوتی ہے

بنیاد ہے کامیابی اور ناکامی کی انسان کے اپنے اندر کی جو حالت جسے نفسیاتی حالت قرآن نے کہا ہے۔ اور عجیب چیز ہے کہ

اس چودہ سو سال گذرنے کے بعد بھی آج انسانی علم نے بھی آخری چیز جو آپ کے ہاں سائیکولوجی میں کہی ہے اس کا ترجمہ ہی نفسیات کیا گیا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن بتا رہا ہے بنیادی طور پر کہ اس کی تبدیلی سے باہر کی خارج کی تبدیل منحصر ہے اس تبدیلی کے اوپر اندرونی تبدیلی ایک جو آتی ہے انسان کی۔ اب دیکھیے قرآنِ کریم ملائکہ کا فریضہ کیا بتاتا ہے؟

مقامِ آدم کے بعد مقامِ مومن کے لیے بنیادی شرائط کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا

پہلا میں نے عرض کیا تھا کہ فطرت کی قوتیں جو اس محسوس کائنات کے اندر کارفرما ہیں' انہیں بھی قرآن نے ملائکہ کہا ہے۔ ان کے متعلق علم حاصل کرنے سے یہ قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں اور انسان آدمی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ آدمی کہا اسے جائے گا جس کے سامنے فطرت کی قوتیں مسخر ہو گئی ہوں۔ اور جب وہ ان قوتوں کو خدا کے قوانین کے مطابق صرف میں لاتا ہے تو اسے مقامِ مومن کہا جاتا ہے۔ مومن کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ پہلے آدمی کا مقام حاصل نہ ہو اور آدمی کا مقام یہ کہ فطرت کی قوتیں اس نے مسخر کر رکھی ہوئی ہوں۔ جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کر سکتی' وہ مقامِ آدم تک نہیں پہنچ سکتی' وہ مقامِ مومن تک کیسے پہنچ سکتی ہے وہ تو اگلی منزل ہے اس کی۔ مذہب کی دنیا میں تو سارے شریف ہو جاتے ہیں اور مذہب ہوتا ہی وہاں شروع ہے جہاں یہ فطرت کی قوتیں مسخر نہیں ہوئی ہوتیں۔ ایک اعتقادی' ذہنی' فریب خوردگی کا نام رکھ لیا جاتا ہے۔ ورنہ دین کے اندر فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قوانینِ خداوندی کے تابع وہ قوانین جو وحی کے ذریعے سے ملے ہیں' اس کے مطابق صرف کرنے کا نام مومن کی زندگی ہوگا۔ اب دیکھیے قرآنِ کریم دوسرا گوشہ جو ہے ملائکہ کا اسے کس طرح سے سامنے لاتا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ بنیاد ہے انسان کی خارجی کائنات کی' خارجی تغیرات کی اس کی داخلی تبدیلی کے اوپر۔ یہ دیکھیے کتنی بڑی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے اور اس تبدیلی کو کن قوتوں کی طرف قرآن منسوب کر رہا ہے۔

معاشی نظام کی بدحالی انسان کو انسان ہی کا غلام بنا دیتی ہے

ارشادِ ربانی ہے کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) وہ لوگ کہ جنہوں نے دل کے پورے سکون کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہاں رب کا لفظ قرآن لایا ہے۔ دنیا میں دوسرے انسان کو اپنی مرضی کے تابع کرنے کے لیے پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ آپ اس کے رزق کے سرچشمے کے اوپر قابو پالیں' آپ اس کے پروردگار بن جائیں' آپ اس کے اَن داتا بن جائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں راجہ کے لیے' بادشاہ کے لیے' اَن داتا کا لفظ تجویز ہوتا تھا

۔جھکتا ہی آدمی اس کے سامنے ہے جس سے اس کی کوئی نہ کوئی احتیاج وابستہ ہو جاتی ہے۔یہ بہت بڑا انقلابی اعلان ہے جو قرآن نے کہا ہے رَبُّنَا اللّٰهِ (41:30) وہ اس کا یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی اور قوت نہیں ہے کہ جس کے ساتھ میری احتیاج وابستہ ہے۔صرف خدا کا نظام ہے کہ جو پروردگاری کرتا ہے جو پرورش کرتا ہے، جو ربوبیت کا ضامن ہے۔

ملائکہ کا نزول انسان سے انقلاب آمیز دعوے کے لیے استقامت کا تقاضا کرتا ہے

جس نے اس امر کا اقرار کیا، اعتراف کیا، اعلان کیا اس انقلاب آمیز دعوے کا، ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) اور پھر اس پر جم کر کھڑا ہو گیا۔یہ ایمان اور ایمان کے ساتھ اس قسم کی استقامت ایسی ثابت قدمی، یہ ثبات کہ جم کر اس کے بعد کھڑا ہو گیا، کیا نتیجہ ہوا اس کا؟ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (41:30) ان پر ملائکہ کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں خصوصیت کچھ نہیں ہے ہر مومن پہ، ہر اس شخص کے اوپر جو اس انقلابی دعوے پہ یقین کامل رکھ کے جم کے کھڑا ہو جائے، فرشتوں کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔کوئی خاص گروہ نہیں ہے کوئی خاص جماعت نہیں ہے جس نے بھی کہہ دیا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) ان پہ ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔کیا کرتے ہیں ملائکہ آ کر؟ نزولِ ملائکہ سے مقصد کیا ہوتا ہے کیا کرتے ہیں یہ ملائکہ؟ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (41:30) وہ کیفیت پیدا یہ کر دیتے ہیں کہ کسی سے خوف نہ کھاؤ کسی قسم کا حزن تمہارے اندر نہیں آنا چاہیے۔خوف عام طور پر خارجی قوتوں سے ہوتا ہے، حزن انسان کی اندر کی تشویش ناک حالت کا نام ہوتا ہے۔افسردگی پژمردگی حزن ملال مایوسی یہ تمام کیفیات قلبی جو ہیں حزن کے اندر آ جاتی ہیں۔ملائکہ کہتے یہ ہیں (یوں کہیے ان الفاظ میں) کسی قسم کے خوف کی ضرورت نہیں ہے، کسی قسم کی افسردگی کی، دل برداشتگی کی ضرورت نہیں ہے، ایک سکون ایک یقین کامل حاصل ہوتا ہے۔

جنت کسی خاص مقام کا نام نہیں بلکہ یہ تو زمین و آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (41:30) اس جنت کی بشارت لو کہ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔آپ کو معلوم ہے جنت کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ جنت مرنے کے بعد ہی کسی مقام میں نہیں ہے۔ابھی ابھی وہ آیت سامنے آئے گی کہ جنت کے متعلق کہا ہے عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ (3:133) وہ تو زمین و آسمان کی وسعتوں پر پھیلی ہوئی ہے۔آسمان کی وسعتوں پہ پھیلی ہوئی جنت تو ہم بعد میں دیکھیں گے، قرآن نے کہا ہے نا زمین کی وسعتوں پہ پھیلی ہوئی جنت ہے۔یہاں اسی دنیا کے اندر یہاں کی زندگی اگر قوانینِ خداوندی کے تابع ہو جائے، یہیں وہ جنتی معاشرہ آپ کے ہاں قائم ہوتا ہے، اسی کا تسلسل

ہے جو آخرت میں جا کے مرنے کے بعد بھی سامنے آتا ہے۔عزیزانِ من! قرآن نے جنت کے عرض کو عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ ۙ (3:133) کہا ہے بڑی غور طلب چیز ہے یہ۔اگر اس ارض کے اوپر جنتی معاشرہ نہیں آپ قائم کرتے تو پھر اس جنت کی وسعتیں سمٹ کے سماوات تک صرف رہ جاتی ہیں۔ مذہب اس کو صرف سماوات تک رکھتا ہے' دین اس کو ارض وسماوات تک پھیلا دیتا ہے۔ کہہ میں یہ رہا تھا کہ وہ ان کو بشارت دیتے ہیں آ کر کہتے ہیں کہ ہاں لو بشارت اس جنت کی جس کی وسعتیں اس پورے ارض پر پھیلی ہوئی ہیں۔نَحۡنُ اَوۡلِيٰٓؤُكُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِى الۡاٰخِرَةِ ۚ (41:31) دیکھیے تشریح ہوگئی اس کی۔ہم تمہارے ساتھ ہیں' ساتھی ہیں' دوست ہیں' رفیق ہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی آخرت کی زندگی میں بھی ان کو رفاقت حاصل ہوتی ہے۔وَلَـكُـمۡ فِيۡهَـا مَـا تَشۡتَهِىۡۤ اَنۡفُسُكُمۡ وَلَكُمۡ فِيۡهَا مَا تَدَّعُوۡنَ (41:31) زندگی تمہیں وہ دیں گے ہم' وہ زندگی تمہیں حاصل ہوجائے گی اس کے بعد کہ جس میں جو کچھ تم مانگو گے' وہ ملے گا۔ جو چاہو گے' وہ ہوگا۔اللہ اکبر۔ جنت کی زندگی یہ ہے۔قَـالُـوۡا رَبُّـنَـا اللّٰـهُ (41:30) کوئی یوں ہی مذاق کا نعرہ نہیں ہے ربنا اللہ پہ یقین رکھنے والے کی کیفیت اپنی پھر یہ ہوتی ہے کہ جو چاہو گے' ہوگا جو مانگو گے' ملے گا۔

بے نیازی سے تیرے ناز اٹھائے کیا کیا
جو نہ مانگا وہ ملا اور جو مانگا وہ نہ ملا
مبدائے فیض سے بس اتنا گلہ ہے مجھ کو
جو نہ چاہا وہ ہوا اور جو چاہا وہ نہ ہوا

ایک یہ کیفیت ہوتی ہے ہر معاملے میں الٹ یہ ہے جہنم کی زندگی۔

یہ ہے جنت کی زندگی وَلَـكُـمۡ فِيۡهَـا مَـا تَشۡتَهِىۡۤ اَنۡفُسُكُمۡ وَلَكُمۡ فِيۡهَا مَا تَدَّعُوۡنَ (41:31) کیا بات ہے صاحب؟ جو چاہو گے ہوگا' جو مانگو گے ملے گا۔کس نتیجے میں؟ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) ایک دفعہ اس پہ یقین کر کے دیکھو تو سہی پھر تم دیکھو گے کہ یہ بڑی بڑی چوکھٹیں کتنی پست ہوجاتی ہیں تمہارے سامنے' کس طرح سرفرازی سے آزادانہ قلندرانہ گذر جاتے ہوان چوکھٹوں کے سامنے سے۔قَـالُـوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30)۔میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ ملائکہ کیا کرتے ہیں؟ اس ایمان اور استقامت سے انسان کے قلب کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے نفسیاتی کیفیت اندر یہ ہوجاتی ہے کہ اسے اندر کسی قسم کا حزن نہیں رہتا اور جب اندر حزن نہ رہے تو باہر ہر قسم کا خوف ختم ہوجاتا ہے' ایک جنت کی کیفیت حاصل ہوجاتی ہے۔ جو مانگو ملے' جو چاہو

وہ ہو۔ یہ قرآن نے بتایا ہے کہ انسان کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ جنہیں آپ نفسیاتی قوتیں کہتے ہیں یہ دوسری چیز ہمارے سامنے آ گئی ملائکہ کی۔ ملائکہ یہ کرتے ہیں یہ وہ نفسیاتی قوتیں ہیں جو انسان کے اندر ایک تبدیلی پیدا کر دیتی ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کی رو سے بھی اور علم النفس کی رو سے بھی باہر کی دنیا تو ساری کی ساری اس کا مدار ہوتا ہے' منحصر ہوتا ہے' انحصار اس کا ہوتا ہے' انسان کی اندر کی تبدیلی کے اوپر۔

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں' دنیا میرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر ایک چیز کا بدلا

قدرت خارجی کائنات کی مانند زندگی کے لیے دیئے گئے غیر متبدل اصول' دعا سے نہیں بدلا کرتی

یہ جو اندرونی تبدیلی ہوتی ہے انسان کی یہی بڑی چیز ہے۔ اقبالؒ نے بھی جو ایک بڑے اہم مسئلہ کو ایک شعر میں حل کر کے رکھ دیا ہے وہ یہی چیز اس نے کہی ہے جسے تقدیر کا مسئلہ آپ کہا کرتے ہیں کہ کیا یہ چیز تمہاری آرزوؤں سے تمہاری دعا سے یہ جو قانونِ فطرت ہے' خدا کے فیصلے جسے کہا جاتا ہے' کیا یہ بدل جائیں گے؟ تقدیر بدل جائے گی؟ وہ کہتا ہے بات کچھ اور ہے وہ کہتا ہے کہ

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تیری دعا ہے کہ تیری آرزو ہو پوری
میری دعا ہے کہ تیری آرزو بدل جائے

یہ آرزوؤں کا بدل جانا جو ہے جسے کہا ہے 'تو بدل جائے' یہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔ وہ قوتیں جنہیں ملائکہ سے تعبیر کیا گیا ہے' نفسیاتی قوتیں جس سے کہ تو بدل جاتا ہے اور تیرے بدل جانے سے باہر کی دنیا بدل جاتی ہے۔

نفسیاتی تبدیلی سے پیدا ہونے والی قوتیں (ملائکہ) انسان کو خوف و حزن سے محفوظ کر دیتی ہیں

جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر اندر تمہارے یہ تقویت پیدا ہو گئی ہے یہ یقین پیدا ہو گیا ہے' یہ توازن پیدا ہو گیا ہے' یہ اعتدال پیدا ہو گیا ہے تمہاری ذات کے اندر' باہر کی دنیا کی قوتیں ان چیزوں کو نقصان پہنچا سکیں گی کہ جسے تو میری کہتا ہے میرا امکان' میری دولت' میری اولاد حتیٰ کہ میرا جسم وہ کہتا ہے کہ حتیٰ کہ میری جان یہاں تک ان کی دسترس ہو جائے

گی جسے 'تو' کہا جاتا ہے' جسے 'تو' 'میں' کہتا ہے' اسے کوئی دوسرا نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اسے نقصان پہنچائے گا تو تو خود نقصان پہنچائے گا اور جسے تو خود نقصان پہنچائے گا اس کا مداوا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ یہ ہے نفسیاتی کیفیت جسے کہتے ہیں یہ ہے تبدیلی جسے آپ کہتے ہیں۔ اس طرح سے حزن دور ہوجاتا ہے۔ انسان کے اندر اگر یہ تقویت پہنچ جائے گی۔ یہ باہر کی قوتیں کیا نقصان پہنچا سکتی ہیں انسان کو۔ وہ کہتا ہے کہ ملائکہ یہ کرتے ہیں یہ ہیں وہ قوتیں جو انسان کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتی ہیں۔ اب آیے یہ جو میدانِ جنگ میں قرآن نے کہا ہے کہ تمہاری مدد کی تھی ایک ہزار ملائکہ سے تین ہزار ملائکہ سے پانچ ہزار ملائکہ سے۔ کیا کیا تھا ان ملائکہ نے؟ ایک آیت درمیان میں چھوڑ دیجیے اور (126) پہ آجایے تاکہ مضمون میں ربط قائم رہے۔ **وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ط** (3:126) ملائکہ نے صرف آکے یہ کیا تھا کہ تمہیں اس چیز کی خوش خبری دے دی تھی کہ تم جس راستے پہ چل رہے ہو' صحیح راستہ ہے اور تمہارے قلوب میں اطمینان پیدا ہوگیا تھا۔ بات تو وہی ہے جو ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ نزولِ ملائکہ سے ہوتا یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک اطمینان پیدا ہوجاتا ہے۔

فریبِ نفس سے ہمیشہ اضطراب پیدا ہوتا ہے

یاد رکھیے اطمینان اور فریبِ نفس میں بڑا فرق ہے۔ فریبِ نفس جھوٹے اطمینان کو کہتے ہیں اور یہ اطمینان جسے قرآن نے کہا ہے ذکر اللہ سے پیدا ہوتا ہے۔ قوانینِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھنے سے جو توازن پیدا ہوتا ہے' ایک BALANCED PERSONALITY پیدا ہوتی ہے۔ اپنے مقام پہ محکم بخود خزیدہ ہوجاتا ہے انسان' چھوٹے چھوٹے سے حادثے' چھوٹے چھوٹے سے واقعات' چھوٹی چھوٹی سی مصائب اس میں اضطراب نہیں پیدا کرتیں' اسے ہلاتی نہیں ہیں' اس کے پاؤں میں لغزش نہیں پیدا کرتی۔ یہ کیفیت حاصل ہوجاتی ہے اطمینانِ قلب سے جسے کہا گیا ہے۔ کہا کہ ملائکہ آکے کرتے یہ تھے کہ وہ تمہارے دل میں استقامت پیدا کرتے تھے۔ تو میدانِ جنگ میں جس سپاہی یا جس فوج کے دل میں یہ اطمینان پیدا ہوجائے' دوسری فوج اس کو شکست کس طرح سے دے سکتی ہے۔ شکست تو ہوتی یہاں ہے کہ جہاں سپاہی کے دل میں اضطراب اور خوف اور حزن پیدا ہوجائے۔ جہاں یہ کیفیت نہ ہو قرآن نے کہا ہے ناکہ تم میں سے اگر دس ہوں گے تو سو پہ غلبہ حاصل کرلیں گے۔ لیکن میں عرض کردوں کہ وہ دس کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ کوئی بھی نہیں ہوگا تو چلو سو پہ نہ سہی نوے پہ سہی' 'دس تہاڈے وچوں کڈ دتے تسی کوئی نہ جاؤ او تھے تے نوے اُتے تے ازخود تہانوں فتح حاصل ہوہی جائے گی' ' یہ ہمارے ہاں جو تصور ہے ناملائکہ کا وہ یہ ہے کہ تم تو بیٹھے رہو اور وہ آکے سارا کچھ کرتے رہیں صاحب۔ جن قوموں کے ذہن میں یہ چیز ہوتی ہے' وہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں کہ

ہاں صاحب! مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند' وہ ایک مرد کے انتظار میں ہوتے ہیں جو غیب سے آئے اور وہ ان کا کام کر کے چلا جائے' یہ بیٹھے رہیں وہ اِنَّـا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (5:24) جو میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا بنی اسرائیل کے ہاں سے' وہ حضرتِ موسیٰ نے کہا تھا کہ اٹھو کم بختو! انتقال ہو چکا ہے' قبضہ لے لو زمین کا۔ وہ کہتے تھے کہ نہیں صاحب! فَـاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ (5:24) تم اور تمہارا خدا جاؤ اور جا کے ان سے لڑ کے چلے آؤ۔ یہی ہے نا کہ فرشتے جا کے سب کچھ کر آئیں' ہم بیٹھے ہیں یہاں' چلے تھوڑے جا رہے ہیں یہیں بیٹھے ہیں صاحب آواز دیجیے' آئے ہم

بہشتے فی سبیل اللہ ہم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش

کہ ان سے کہو ان مسلمانوں سے کہ خوش ہو جا' ایک تو بہشت وہ ہے نا کہ جو تلواروں کے سایے میں ملتا ہے' ان سے کہا تھا کہ کیا

بہشتے بحرِ اربابِ ہِمم است
اور بہشتے بحرِ اربابِ کرم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

''نیاز ونڈی جا رہی ہیگی اے''۔

عزیزانِ من! بیٹھے رہنے سے نہیں۔ وہیں قرآن نے فیصلہ کر دیا اس بات کا' وہ تو یوں سمجھا جاتا ہے بات کو جب کہا ہے نا کہ تم بیس ہو گے تو دو سو پہ غلبہ پاؤ گے' دس ہو گے سو پہ غلبہ پاؤ گے ایک اور دس کی نسبت۔ وہیں کہا ہے کہ نہیں سرِ دست کمزور ہو' اس واسطے تم ایک ہو گے تو دو پہ غلبہ حاصل کرو گے' جوں جوں تمہاری اپنی قوت بڑھتی چلی جائے گی' یہ نسبت اسی طرح سے یہ بڑھتی چلی جائے گی وہ تو تمہاری قوت پہ نسبت کا دار و مدار ہے۔ وہیں کہہ دیا کہ چونکہ ابھی تم کمزور ہو' اس لیے ابھی دس گنا کے اوپر تو کامیابی نہیں حاصل کر سکو گے' ابھی دو گنے پہ کر سکو گے۔ جب سرحدوں پہ گھوڑے باندھ لو گے' جب تمہارے پاس اور ساز و سامان آ جائے گا' لشکر زیادہ ہو جائے گا پھر کیفیت یہ ہو جائے گی۔ لیکن کن کی؟ فاصبروا وہاں لکھا ہے اگر تم میں سے جو ایک آدمی بھی استقامت والا ہو گا تو دو کے اوپر غلبہ حاصل کر لے گا۔

ہمارے ہاں 1965ء کی جنگ کے افسانوں کی حقیقت

یہ دوگنوں پہ کم از کم غلبہ ہی سہی' کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اس لیے کہ ان کے دل کے اندر ایک توازن ہوتا ہے' اطمینان ہوتا ہے' توکل ہوتا ہے' یقین ہوتا ہے' خود اعتمادی ہوتی ہے' اپنے نصب العین کی صداقت پر ایمان ہوتا ہے' اس کے خوشگوار نتائج نکلنے پر یقین ہوتا ہے اور اس یقین کے ساتھ جب ایک سپاہی میدان میں آ جاتا ہے تو پھر پوچھو کیا؟ پھر تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ ملائکہ نے یہ کیا وَلِتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُکُمۡ بِہٖ ط (3:126) کہا وَ مَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ (3:126) یہ ہے جسے خدا کی نصرت کہا جاتا ہے۔ میدان میں جا کے اس یقین کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور اس کے بعد تمہارے دل کے اندر ایک اطمینان جو پیدا ہوتا ہے' اسے کہا گیا ہے کہ نصرتِ خداوندی ہے۔ پھر بار بار وہی 1965ء کی جنگ سامنے آ جاتی ہے۔ بار بار وہ حقیقتیں آتی ہیں سامنے۔ بار بار پھر وہ افسانے آتے ہیں ہمارے سامنے۔ حقیقتیں وہ کہ جو نہر کے اس پار بیٹھے رہنے والے مجاہدین کے ہاتھوں سے ہمارے سامنے آئیں۔

کلمہ جسے نظریہ زندگی کہا جاتا ہے اس کا تعلق ایک حقیقت سے اور اس کی قوت کے اظہار سے ہوتا ہے

عزیزانِ من! جیسا میں نے کہا تھا حق اور حقیقت کہتے ہی اسے ہیں جو ٹھوس شکل میں سامنے آ جائے۔ یہ ذہنی اور اعتقادی چیز نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ وہاں تو جسے ہم نظریہ کہتے ہیں' کلمہ جسے قرآن نے کہا ہے' ان مسلمانوں نے تو اسے بھی سمجھ لیا تھا۔ یہ بازنطینی ایک شخص تھا' اس نے یہ کہا تھا ایک مسلمان مجاہد سے کہ ہر شخص کا ایک کلمہ ہوتا ہے' ایک نظریۂ زندگی ہوتا ہے' تمہارا نظریۂ زندگی کیا ہے؟ اس نے کہا یہ جو چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کیے ہیں' یہ نظریۂ زندگی ہمارا نہیں تو اور کیا ہے۔ اس نے ایسی عجیب چیز کہی تھی کہ نظریہ ایسی چیز نہیں ہے جو ذہن کے اندر رہے' نظریہ تو وہ ہوتا ہے کہ جس کے عملی محسوس ٹھوس نتائج سامنے آ جائیں۔ ہمارا نظریۂ زندگی یہ ہے جو تمہارے سامنے پھیلا ہوا ہے' اسے حق کہتے ہیں۔ تو ایک حقیقت تھی جو نہر کے کنارے ہمارے سامنے تھی۔ ٹھیک ہے دس تھے سو پہ انہوں نے فتح حاصل کی لیکن وہ ان کی اپنی اندرونی تبدیلی اور خارجی جو ساز و سامان ان کے پاس تھا' دونوں کے مجموعے کا نام تھا۔ ان کے پیچھے ایک قوم یہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ مردے از غیب بروں آمد۔ وہ انہوں نے اپنے خون دے کر وہاں' اور ان کی داستانیں تو ابھی آئیں نہیں ہیں خدا کرے کبھی اس جنگ کی صحیح تاریخ آپ کے سامنے آئے تو معلوم ہو چھ چھ دن تک دن اور رات پانی میں اندر' جڑوں کے اندر وہ بیٹھے رہے ہیں۔ نہ کھانا نہ پینا نہ سونا نہ اٹھنا نہ بیٹھنا یوں لڑے تھے وہ۔

جوقوم اپنے تاریخی حافظے کوکم کردے‘وہ قوم تباہ ہوجاتی ہے۔اس سلسلے کی ایک گہری سازش

اُنہوں نے یہ کچھ وہاں کیا اور آپ کے ہاں کی یہاں مردِ ازغیب بروآمد والی قوم افسانے لے کے بیٹھ گئی کہ وہ صاحب سفید گھوڑیوں والے آئے تھے‘انہوں نے یہ کیا تھا اور سبز عماموں والے آئے تھے’’ کہ جی بم تے او مار دے ہیگے سن‘ اے گلی ڈنڈا کھیلدے سن او تھے‘‘۔سارا کریڈٹ جو تھا آپ کو معلوم نہیں کتنی گہری سازش تھی اس کے اندر‘ ایک ہسٹری میں آپ کے ہاں ہزار سال کے بعد ایک موقع ایسا آیا تھا جہاں مجاہد سامنے آئے تھے‘ آپ کے ہاں کا سپاہی سامنے آیا تھا جس نے کچھ کر کے دکھایا تھا۔ ورنہ ساری آپ کے ہاں کی جو پچھلی تاریخ تھی نا اس میں جتنے بڑے بڑے بڑے آپ کے ہاں مشاہیر بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں‘ وہی قلم والے‘ دوات والے‘ زبان والے‘ محراب والے‘ منبر والے‘ مصلے والے‘ تسبیح والے۔ یہ جتنے امام آپ کے ہاں سارے آتے ہیں‘ کسی نے کبھی میدانِ جنگ دیکھا ہی نہیں تھا۔قوم کی یہ کیفیت آپ کے ہاں کی ہوگئی کہ سائیں گھوڑے شاہ کے تو عرس کی تاریخ اور دن تک ان کو یاد ہے۔کسی کو معلوم نہیں کہ خالد سیف اللہ کی تاریخِ شہادت یا تاریخِ وفات کون سی تھی۔سائیں توکل شاہ جو ہے‘ توکل شاہ کے تو جہاں پاؤں لگے ہیں‘ قدم شریف کے میلے جو شروع ہوتے ہیں‘ کانگڑے سے تو چلا جاتا ہے ڈیرہ غازی خاں تک وہ قدم جہاں انہوں نے دیے ہیں۔ان سے پوچھیے کہ حضرتِ عمرؓ نے کہاں کہاں فتوحات حاصل کی تھیں‘ کسی کو علم اس کا نہیں ہوگا۔

1965ء کی جنگ کے شہدا کا خون اور وہاں کے مجاہدین کی فتح کے علاوہ فلسطین کی بربادی وتباہی ہمارے جواب کی آج بھی منتظر ہے

ہزار سال سے آپ کے ہاں یہ سازش ہوئی کہ جتنے لوگ یہ تھے کہ جنہوں نے اپنا خون دے کر اسلام کے پودے کو سینچا‘ ان کے نام آپ کے ہاں اوجھل ہوگئے اور پیچھے رہ گئے۔اور سارے نام آپ کے ہاں یا تو یہی اربابِ قلم جو آپ کے ہاں کوئی نکلے چلے جا رہے ہیں۔سوسو جلدوں کے اندر لکھتے ہوئے اور یا پھر سب سے بڑے یہ کہ وہ جو خانقاہوں کے اندر‘ مراقبوں کے اندر‘ جن کے افسانے حقیقتیں بنا کے آپ نے کرامات بنا دیں۔جن کرامات کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ان کے اتنے اتنے بڑے گنبد اور قبریں بنی ہوئی ہیں۔اگر کسی بزرگ کی قبر آپ کے سامنے نہ ہو‘ بزرگ کا نام تک نہیں معلوم ہوتا کسی کو۔ایک مقام ایسا آیا تھا کہ جہاں پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تھا اور ایک چیز آپ کی آنکھوں کے سامنے آئی ان لوگوں نے یہ دیکھ کے کہ اوہو! یہ تو صحیح شہرت اور عزت کا مقام جو ہے یہ تو یہاں سے محراب ومنبر سے اٹھ کے‘ میدانِ جنگ میں چلا گیا۔انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! وہ تو صرف کھڑ

پتلیاں تھیں جو وہاں ناچ رہی تھیں حقیقت میں یہ ساری چیز پھر وہی منبر ومحراب وخانقاہ والوں نے کر کے دکھائی کہ یہ سارے کے سارے اولیا اللہ قبروں سے نکل آئے تھے اور انہوں نے آ کے یہ سب کچھ کر کے دکھا دیا تھا۔ کہ صاحب یہ لاہور بچ گیا کیوں بچ گیا؟ صاحب! داتا صاحبؒ جو تھے۔ ان سے پوچھیے تو سہی کہ یہ فلسطین' یہاں تو آپ کے ایک ولی کا بقول آپ کے مزار ہے' آپ کے ہاں کے سینکڑوں پیغمبروں کے مزار وہاں ہیں' وہاں تو کوئی نہ پہنچا' نہ سفید گھوڑی والا' نہ سبز عمامے والا۔ اس لیے کہ وہاں کے خاکی وردیوں والے جو تھے وہ مجاہد نہیں نکلے تھے یہاں آپ کے خاکی وردیوں والے مجاہد تھے اس لیے یہ سب کچھ ہو گیا۔ آپ کو معلوم ہے قوموں کی تاریخیں کیسے بدلی جاتی ہیں؟ کتنی گہری سازشیں ہوتی ہیں اس چیز کے اوپر؟ یہ تھی سازش۔ بڑا گلہ تھا ان کو کہ صاحب! دیکھیے سارے ایوارڈ اور سارے تمغے ان کو مل گئے اور ہم یہاں مر گئے دعائیں کرتے کرتے ہمیں کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ ''لوکم دیکھو کم کرن ڈے پے سی اے وڈے''۔ کہ سارا کام تو ان عماموں والوں اور ان پگڑیوں والوں نے کیا۔ آپ کو معلوم ہے نا اس زمانے میں روز یہ داستانیں نکلا کرتی تھیں۔ عزیزانِ من! خود نہیں کچھ کہتا' کہتے تھے ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے وہ انڈیا کا کوئی پائلٹ ہے' اس کی شہادت لا رہے ہیں کہ صاحب! میں جو راوی کے دریا پہ پہنچا ہوں تو میں نے یہ دیکھا کہ میں بم ٹھیک ٹھکانے پہ مار رہا تھا اس پل کے اوپر اور نیچے جا کے بم جھٹ سے یوں ہو جاتا تھا اور پانی میں چلا جاتا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ ہو کیا رہا ہے؟ غور سے میں نے دیکھا تو وہاں ایک سبز پگڑی والا کھڑا تھا۔ بم میرا ٹھیک جاتا تھا جب اس کے قریب جاتا تھا ''تے ایووں کر دینداسی''۔ آپ دیکھتے ہیں؟

یہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو گرسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

ان کو اتنا ہی پتا تھا کہ نیچے وہ کھڑا ہوا یہ کر رہا تھا۔ عزیزانِ من! سنیے قرآن کیا کہتا ہے؟ یہ اس قسم کے کرنے والے یہ کہتے تھے یہ فرشتے آئے تھے خدا کی طرف سے یہ کرنے والے جو تھے فرشتے جو آئے تھے' ان کے متعلق سنیے۔

جنگِ بدر' جنگِ احزاب اور جنگِ اُحد کے مجاہدین کا ذکرِ خیر اور نزولِ ملائکہ کی کیفیت

معاف رکھیے گا آج سینے میں میرے درد سوا ہوتا ہے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ کوئی درجہ جو ہے مجاہد کے مقابلے کا نہیں ہو سکتا۔ عزیزانِ من! جو جان دینے کے لیے میدان میں آ گیا ہے اس سے بڑھ کے کس کا درجہ دنیا کے اندر ہو سکتا ہے۔ صرف یہ مجاہد اور شہید ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ اس کو مردہ کہو نہیں' مردہ سمجھو نہیں۔ ایک ایسا زمانہ آیا سارا کریڈٹ انہوں نے لے کے ان سے

چھین کے اور اُدھر دے دیا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ وہ آنے والے جو تھے ان کے متعلق کہا کہ ہم تو ایک طرف رہے' ہندو وہاں کا جو تھا پائلٹ وہ دیکھ رہا تھا اس کو کہ خدا کے فرشتے اس کے بم کو یہ کچھ کر رہے ہیں۔ میدانِ جنگ' بدر کا میدان احد اور احزاب کا جس میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نازل ہوتے تھے نبی اکرم ﷺ' صحابہؓ کبارؓ وہاں موجود ہیں۔ سنیے عزیزانِ من! انہیں یہ نظر آ رہے تھے گھوڑیوں والے اور عماموں والے۔ کہا ہے ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَعَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (9:26) خدا نے اس مقام کے اوپر ایک تسکین کا سامان بہم پہنچایا رسول کے لیے' مومنین کے لیے۔ سنتے ہیں کون ہیں یہ؟ خود رسول ﷺ اور صحابہؓ کی جماعت وہاں یہ نزولِ ملائکہ ہوتا ہے۔ کہا ہے وَ اَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡہَا (9:26) وہاں وہ لشکر نازل ہوئے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان غیب سے آنے والوں کو نہ رسول اللہ ﷺ دیکھ سکتے تھے نہ صحابہؓ کبارؓ دیکھ سکتے تھے۔ یہاں یہ غیب سے آنے والے کو ایک مشرک کافر جو ہے ہندوستان کا' وہ دیکھ سکتا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پاکستان کی نئی زیارت گاہوں کو جنم دینے والوں کی قربانی کو افسانوں میں بدل دینے کی کوشش

ان افسانہ نویسوں سے کیا کہا جائے یہ کم بخت ہماری جیتی ہوئی بازیاں ہار دیتے ہیں۔ میں نے اس زمانے میں خود اس میدانِ جنگ میں جا کے دیکھا میں نے لکھا تھا پاکستان کی نئی زیارت گاہیں۔ یہ زیارت گاہیں کہ سیالکوٹ کا میدان' یہ میدان یہاں کے جو آپ کے نہر کے پار تھے۔ میں نے جا کے دیکھا کہ وہ سپاہی جن کی داستانیں سن سن کر ایمان تازہ ہوتا تھا آخر میں وہ یہ کہتے تھے کہ صاحب! ہم سے تو کہا جاتا ہے کہ ہم نے تو کچھ نہیں کیا تھا یہ تو کوئی آسمان سے اترے تھے گھوڑیوں والے' انہوں نے کچھ یہ کیا۔ یعنی ان کے دل کے اندر یہ چیز پیدا ہو رہی تھی کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ یہ کچھ ہے جو ایک افسانہ یہاں تک پہنچا دیتا ہے یاد رکھیے۔ اور ساری تاریخ آپ کی ان افسانوں سے بھری پڑی ہے۔ عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ جنود وہ اترتے ہیں جن کو رسول ﷺ اور صحابہؓ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے قرآن کی شہادت ہے لَّمۡ تَرَوۡہَا (9:26)۔ یہاں جنود وہ اتارے جاتے ہیں کہ جن کو یہ خود بھی دیکھتے ہیں قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے ''جی اسی اپنی اکھاں نال تکیا ہیگا''۔ عزیزانِ من! نزولِ ملائکہ یہ ہوتا ہے' وہ آنکھوں سے نظر نہیں آتے' وہ قلوب کے اندر اترتے ہیں۔ اور آپ کو پتا ہے کہ دیکھا ہے آپ نے اس چیز کو قرآن نے یہاں ایک لفظ کہا ہے بِثَلٰثَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ (3:124) تین ہزار ملائکہ مُنۡزَلِیۡنَ (3:124) قلب کی گہرائیوں میں اتر جانے والے جو تھے یہ ہیں جو اطمینانِ قلب کا باعث بنتے ہیں ان کے لیے۔ یہ ہیں ملائکہ جو اترا کرتے ہیں ان کے اوپر جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) پھر جم کر کھڑے ہو گئے میدانِ جنگ کے اندر ان پہ ملائکہ اترتے ہیں اور وہ ملائکہ قلوب

میں اترتے ہیں، دلوں کے اندر۔ اترتے ہیں، وہاں اتر کر ایک اطمینان کی شکل پیدا ہوتی ہے، ایک نفسیاتی تبدیلی اندر پیدا ہوتی ہے۔ اور جب اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے، باہر کی دنیا بدل جاتی ہے اسے خدا نے اپنی نصرت کہا ہے، اپنی تائید کہا ہے۔

میدانِ جنگ میں مجاہدین کا ہر عمل خدا اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے

یہ وہ مقام ہے جہاں بدر میں کہا ہے کہ ایسا ہونے کے بعد پھر بظاہر تمہاری تلواریں چل رہی تھیں، ہم قتل کر رہے تھے۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم تیر چلا رہے تھے۔ وہاں مومن کا ہر کام خدا اپنی طرف منسوب کر کے کہتا ہے کہ یہ ہم کر رہے تھے۔ اللہ اکبر! کتنی بڑی چیز ہے صاحب۔ عزیزانِ من! یہ ہے نزولِ ملائکہ جسے قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ ملائکہ کا نزول بھی ہو رہا ہے ذہن میں ہمارے یہ ہوگا کہ ٹھیک ہے صاحب! اب انہیں تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کہا بَلٰٓی لا (3:125) کہ ٹھہرو سمجھو بات سمجھ لو یہی نہ سمجھ لینا کہ صاحب! ٹھیک ہے ملائکہ ہی سب کچھ کریں گے۔ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَ یَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِہِمۡ ھٰذَا یُمۡدِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ بِخَمۡسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیۡنَ (3:125) اگر تم ثابت قدم رہے اگر تم نے قوانین کی اطاعت ٹھیک طور پہ کی تو پھر یہ ملائکہ تمہارے اوپر نازل ہوں گے یہ شرط ہے اس کی تو پہلے۔ میدانِ جنگ میں جم کے کھڑے ہو جانے والی بات سے میدان میں استقامت ثبات کی کیفیت پیدا ہوتی ہے!!!

خدا تعالیٰ کی طرف سے بدر کے میدان میں صحابۂ کبارؓ کو وارننگ

پہلی جنگ، بدر کی جنگ جو ہے، نبی اکرم ﷺ اور صحابۂ کبارؓ وہ تین سو تیرہ کہ جن کے ایمان کے صدقے میں، ایمان دنیا میں قیامت تک باقی رہے گا۔ وہ وہاں کھڑے ہیں کسی کے ایمان میں کسی کے یقین میں شبہ نہیں ہو سکتا، سر بکف کھڑے ہیں، کفن بدوش کھڑے ہیں۔ عین اس وقت جب صفیں باندھی گئی ہیں جب ابھی حکم ملنے والا ہے حملہ کرنے کا، آخری آیت اس وقت نازل ہوتی ہے دیکھیے گا سورۃ انفال میں، وہاں کہا جاتا ہے کہ سن رکھو! آج اس میدان سے تم میں سے کوئی شخص جو دشمن کو پیٹھ دکھا کے بھاگ جائے گا بجز اس کے کہ اپنی جماعت سے ملنا ہو یا بحیثیت ایک سٹریٹجی کے کچھ کرنا ہو، پیٹھ دکھا کے تم میں سے جو اس میدان سے بھاگ جائے گا، سیدھا جہنم کے اندر چلا جائے گا۔ سوچتے ہیں کن سے کہا جا رہا ہے۔ یہ ہے ثبات جسے کہا ہے اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا (3:125) اگر ثابت قدم تم وہاں رہے اگر تم نے ان قوانین کی اطاعت کی تو پھر تم دیکھو گے کہ مقابل میں دشمن ہزار ہے تو ہزار فرشتہ آئے گا، تین ہزار ہے، تین ہزار آئے گا، پانچ ہزار ہے، پانچ ہزار آئے گا۔ وہ کیا کرے گا تمہارے دل کے اندر وَ مَا جَعَلَہُ اللّٰہُ اِلَّا

بُشْرٰى لَكُمْ (3:126) فتح اور کامرانی کی بشارتیں ہوں گی تمہاری آنکھوں کے سامنے۔وَ لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ط(3:126) تمہارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے گا۔وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (3:126) حقیقی نصرت جو ہوتی ہے وہ یوں آیا کرتی ہے اور خدا ہی کی طرف سے یہ آیا کرتی ہے کسی دوسرے کی طرف سے نہیں آ سکتی۔ یہ نصرت دلوں میں تقویت کا موجب بنتی ہے۔

میدانِ اُحد میں حضورﷺ کے حکم سے کوتاہی برتنے کا نتیجہ فتح شکست میں بدل گئی

قرآن نے کہا ہے کہ کسی قوم کی حالت بدل نہیں سکتی تاوقتیکہ اس کے اپنے اندر یہ نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ ہو۔عزیزانِ من! یہ ہے کام جو فرشتے کیا کرتے ہیں وہ آ کے خود بم ادھر نہیں کر دیا کرتے۔ اگر یہ کام فرشتے کرتے تو احد کے میدان میں جہاں کہا ہے تین ہزار فرشتے آئے ہوئے تھے' وہ جو پہاڑی کے ایک درے میں کچھ تیر انداز حضورﷺ نے کھڑے کیے تھے اور کہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے تم اپنی پوزیشن کو نہ چھوڑنا۔ میدان میں فتح حاصل ہو گئی تھی' دشمن بھاگ رہا تھا انہوں نے اپنے کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس درے کو چھوڑ دیا۔ جوں ہی اس درے کو چھوڑا دشمن پلٹا وہیں سے اس نے حملہ کیا' فتح کو شکست میں بدلا۔ رسول اللہﷺ گھرے ہوئے تھے زخم آ رہے ہیں' دانت ٹوٹ رہا' رخسار میں زخم آ رہا ہے' خون بہہ رہا ہے' صحابہؓ نے گرد ہالہ ڈالا ہے تو ان کی کمروں کے اوپر تیریوں تھے کہا جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے ہوتے ہیں' یہ کیفیت تھی۔ کہاں تھے وہ تین ہزار فرشتے؟ کہاں تھا وہ بابا جو بم کو ادھر سے یوں کرتا تھا؟ رسول اللہﷺ کی طرف آنے والے تیر کو وہ نہ ادھر سے اُدھر کر سکا۔ ان تیروں سے بچایا' انہی رفقانے ہی بچایا انہی مجاہدین نے ہی بچایا۔ اور جہاں سے کوئی تیر ان کے درمیان سے نکل گیا اس نے رسول اللہﷺ کے بھی زخم کر دیا۔ فرشتے اگر بموں کو یوں کرتے تھے تو اس وقت ان تیروں کو انہوں نے یوں کیوں نہ کر دیا۔

قوموں کی تقدیر افراد کے ہاتھوں ہی سے بدلتی ہے

عزیزانِ من! افسانے ہیں۔ حقیقت یہی ہے مومن کا ہی دست و بازو ہے' جو خدا کا ہاتھ بنتا ہے اس دنیا کے اندر' اسی سے دشمن کو شکست ملتی ہے' اسی سے تیروں اور بموں کے رخ بدلتے ہیں' فوجوں کے رخ بدلتے ہیں' قوموں کی تقدیریں بدلتی ہیں' ان ہی کے ہاتھوں سے تقدیریں بدلتی ہیں۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ ان کے قلوب کے اندر خدا کے قوانین کی صداقت سے اتنا یقین و توکل حاصل ہوتا ہے' خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے کہ پھر قوت اور اسلحے کی کمی جو ہے وہ یہ چیزیں پورا کر دیتی ہیں اس کو۔ یہ تھی جو نصرت ان

میدانوں کے اندر حاصل ہوئی تھی۔ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَائِبِينَ (3:127) کہ تا کہ اس نصرت سے فریقِ مخالف کا ایک گروہ کٹ کے الگ تم سے ہو جائے، وہ شکست خوردہ ہو جائے، نامراد واپس لوٹے، ناکام واپس میدانِ جنگ سے لوٹیں۔ اس طرح سے ہم نے تمہاری مدد کی تھی۔ مدد کی، کامیابی حاصل ہوگئی، دشمن قبضے میں آ گیا تو اس کے بعد تو آپ کو معلوم ہے نا پھر دنیا کی طاقتیں کیا کیا کرتی ہیں؟ یہ جو دشمن شکست کھانے کے بعد جب وہ قبضے میں آ جائے تو پھر کتنا بڑا انتقام ہوتا ہے جو انسان اس سے لیتا ہے۔ یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

شکست خوردہ قوم کے متعلق خدائے علیم وخبیر کی طرف سے وحی کا نزول

یہ کمانڈر ہے، یہ ہیڈ آف دی سٹیٹ ہے، شکست خوردہ دشمن، اس کی املاک مرد عورتیں، یہ سب اس کے قبضے میں آ گئی ہیں۔ اس مقام پہ یہ ہیں قرآن کے مقام جو غور طلب ہوتے ہیں۔ اس مقام پہ کہتا ہے لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ (3:128) دیکھنا ان کے معاملے میں تم کوئی اختیار نہیں رکھتے ہو کہ کیا فیصلہ تم کرو۔ آہاہا۔ اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہوئی ہے، اتنا بڑا غلبہ حاصل کیا ہوا ہے، قبضے میں ہیں وہ سارے آئے ہوئے اور یہاں آ کے کہا ہے ان کے متعلق تم نہیں کچھ فیصلہ کر سکتے۔ ہوسکتا ہے نا کہ ذاتی انتقام کا ایک جذبہ آ جائے اندر۔ تم نہیں فیصلہ کر سکتے۔ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ (3:128) یہ بات کہ جن کو احساناً چھوڑ دینا چاہیے۔ سورۃ محمد میں آپ دیکھیے قرآنِ کریم نے آپ کے ہاں جو غلامی اور لونڈیوں کا مسئلہ ہے، ایک آیت میں سارے مسائل حل کر کے رکھ دیے۔

غلام اور لونڈیوں کے متعلق پہلی تفسیر طبری اور آخری تفسیر تفہیم القرآن کا تفصیلی فتویٰ

بات میں سے بات نکل آئی۔ آپ کے ہاں یہ چیز عجیب بات ہے کہ جن چیزوں کے اوپر عام طور پہ آپ کے ہاں سارے ان مسلمانوں کا یا علمائے کرام کا یا مختلف فرقوں کا اتفاق ہوتا ہے، وہ ہمیشہ باطل ہوتی ہیں۔ یہ متفقہ علیہ آپ کے ہاں مسئلہ چلا آ رہا ہے کہ اسلام کے اندر غلام اور لونڈیاں جائز ہیں۔ غلام تو پھر بڑا کم کہتے ہیں، لونڈیوں کے متعلق آپ دیکھتے ہیں کہ پھر کس طرح سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہوتا ہے۔ پہلی تفسیر طبری سے لے کے آخری تفسیر تفہیم القرآن تک آپ دیکھ لیجیے گا۔ تفہیم القرآن کی پہلی جلد کے اندر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے جو لکھا ہے پورے کا پورا ایک صفحہ ہے سارا لونڈیوں کے متعلق کہ کس طرح سے ان کو (میری بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہیں لفظ استعمال ہوتا ہے وہاں)۔ عزیزانِ من! شرم کی آنکھیں گڑ جاتی ہیں زمین میں۔ وہاں یہ ہے یہ چیز کہ صاحب میدانِ جنگ میں دشمن کی جو عورتیں ہاتھ آئی ہوئی ہوں، ان کو بانٹا جاتا ہے سپاہیوں کو۔ یہ ساری تفصیل موجود ہے۔ ان

کو بانٹا جاتا ہے مالِ غنیمت کی طرح اور وہ لے جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ ہے کہ جب جی بھر جائے اس کو دوسروں کے ہاتھ بیچا جا سکتا ہے۔ تحفۂ عید شب برات پہ بھیجی جا سکتی ہیں۔ ان کی اولاد غلام کی غلام ہوتی ہے' وہ کہیں بھاگ نہیں سکتیں' رہائی نہیں حاصل کر سکتیں۔ عورت کی یہ کیفیت۔ ان کی تعداد کوئی نہیں ہے۔ ان کے ساتھ نکاح کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ان کی فقہ کی کتابوں کے اندر یہ جو باب آتا ہے اس کو ذرا پڑھ کے دیکھیے آپ۔ انہوں نے محلات کے اندر یہ کچھ رکھا ہوتا ہے یہ کم از کم یہاں تحریر تقریر کے اندر ذہنی عیاشی کا کچھ سامان بنا لیتے ہیں۔

ہارون الرشید کے ہاں تین تین ہزار لونڈیوں کا معاملہ اور یو این او چارٹر پر دستخطوں کا مسئلہ اور ہم

لونڈیوں کے مسائل آپ کے ہاں چلے آ رہے ہیں۔ بظاہر بڑے بڑے آپ کے ہاں کے یہ جو سلاطین' خلفا' وہ تو خلیفۃ المسلمین ان کو کہتے ہیں' سلاطین ان کو کہتا کون ہے۔ ان کے ہاں کی بھی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ ہارون رشید جیسا آپ کے ذہن میں آتا ہوگا کہ صاحب ایک آئیڈیل قسم کا یہ بتاتے ہیں' تین تین ہزار تو ان کے گھروں کے اندر تھیں۔ ''اپنیاں بکریاں نئیں سانبھی جاندیاں کسے کول''۔ فخر سے بیان ہو رہا ہے' آج بیان ہو رہا ہے یہ۔ یو این او نے چارٹر اپنا بنایا کفار اور مشرکین نے اکٹھے ہو کے' اس میں یہ چیز HUMAN RIGHT, BASIC HUMAN RIGHT یہ رکھا بنیادی حقِ انسانیت کہ کوئی کسی کو غلام نہیں بنا سکے گا۔ ان اقوام میں سے ہر ایک نے دستخط کیے۔ ایک اسلامی مملکت کا نمائندہ اسلامی مملکت تو مرکزی سب سے بڑی سعودی عرب کی ہے نا' جی حجاز کی۔ وہاں اگر کسی نے انکار کیا تو انہوں نے انکار کیا دستخط کرنے کے اوپر۔ کہ صاحب! تم نہیں دستخط کرتے؟ (بس اپنی ذات تک ہی رکھوں آپ دیکھتے ہیں کہاں کہاں اسلام کی یہ مٹی پلید کرتے ہیں) کہا کہ اس سے ہمارے دین میں مداخلت ہوتی ہے' اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم لونڈیوں کو ABOLISH کر کے رکھ دیں۔ اس لیے میں نہیں دستخط کرتا اس کے اوپر۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے کے تھپیڑوں نے بیس ہی برس کے اندر اندر وہاں یہ کیفیت پیدا کر دی کہ اس سے پہلے وہ جو تھا' جس کو نکال دیا گیا تھا اس نے پھر اس چیز کو منسوخ کیا اپنے ہاں۔ زمانے کے تھپیڑے سے یہ مانتے ہیں' قرآن سے نہیں مانتے۔ غلام اور لونڈیوں کے متعلق میں نے گذارش کیا ہے۔ میدانِ جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدیوں کے متعلق قرآن نے ایک آیت کے چار لفظوں میں بات بیان کر دی۔ آپ تو کہہ رہے ہیں کہ ان کو پکڑ کے' ان کو لونڈیاں بنا کے' اس طرح سے استعمال میں لائیے' ان کو استعمال کی شے بنا لیجیے' ان کو بیچ دیجیے' تحفے دے دیجیے' یہ سارا کچھ۔

جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآنِ حکیم کا حکم

دیکھیے کہ قرآن نے قیدوں کے متعلق کیا حکم دیا ہے؟ کہا کہ جب میدانِ جنگ میں تمہیں فتح حاصل ہو جائے اور پھر تم قوت سے ان لوگوں کو جکڑ بھی لو فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (47:4) اس کے بعد یہ جو قیدی ہیں یا تو ان کا معاوضہ لے کے' قیدیوں کے بدلے میں قیدی یا RANSOM لے کے' ان کو چھوڑ دو اور کہا کہ یہ بھی نہیں بہتر یہ ہے دوسری چیز کہ احساناً چھوڑ دو ان کو۔ کہا انسان ہیں۔ اس چھوڑنے کا نتیجہ کیا ہو گا؟ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (47:4) تم دیکھو گے کہ دشمن نے تو یوں ہتھیار رکھے تھے' یہ سلوک کرو گے تو جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے گی اس کے بعد۔ آ ہا ہا۔ عزیزانِ من! اس قرآن کی تعلیم والے۔ اب آپ کے ہاں یہ چیز بنی ہوئی ہے۔ عزیزانِ من! اس میں چار لفظ ہیں ابدی حقیقت ہے فیصلہ کر کے رکھ دیا ہے یہ ہے جنگ کے قیدیوں کے ساتھ جو کچھ کیا جائے گا۔ اور میں نے جب عرض کیا تھا بات یہاں سے چلی تھی کہ جنگ کے قیدی بھی ہیں اور یہ ابتدا کی بات ہے' شروع ہی کی بات ہے یہ۔ کہا یہ کہ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (3:128) تمہیں ذاتی طور پہ ان کے متعلق کچھ اختیار نہیں ہے کہ کیا فیصلہ کیا جائے۔ ان کے ہاں یہ چیز چلی آتی تھی' عربوں میں وہ یہ کرتے تھے۔ عزیزانِ من! قرآن میں جہاں بھی مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4:25) کا لفظ آیا ہے جہاں کہا جاتا ہے یہ لونڈیاں وغیرہ قرآن نے ان کے متعلق حکم دے رکھا ہے۔

جنگ کے بعد مالِ غنیمت کے متعلق قرآنِ حکیم کا حکم

عزیزانِ من! غور فرمایے عام دنیا کے قوانین و قواعد کے اعتبار سے بھی دیکھیے تو اتنا بڑا فاتح جو ہے اب اسے اتنا تو اختیار ہونا چاہیے نا کہ جو چیزیں ہاتھ میں آ گئی' ہیں ان کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے۔ پھر رسول اللہ ﷺ ہیں یہ سب کچھ لیکن قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اتنی بڑی فتح کے بعد جب یہ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں آ گیا ہے' ذاتی طور پہ تم ان کے متعلق فیصلہ نہیں کچھ کر سکتے۔ ہو سکتا ہے جب میں نے کہا ہے کہ کہیں دل کے اندر کچھ انتقام کا شائبہ بھی آپ کے ہاں آ جائے۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ (3:128) یہ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے زیادتی کی تھی لیکن اب یہ چیز کہ ان میں سے کون ایسے ہیں جن میں اصلاح کی صلاحیت موجود ہے' ان کو اسی طرح سے مَنًّا آپ چھوڑ دیں' کون ایسے ہیں کہ جن کے جرائم کی کوئی سزا بھی ان کو دی جائے' یہ فیصلہ ذاتی طور پہ کرنے کا نہیں ہے لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (3:128) یہ بات نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمارے قوانین ہیں انہی کے مطابق تم نے آ کے جنگ لڑی تھی' انہی کے مطابق اب اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔

جنگ کا جذبۂ محرکہ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

دیکھتے ہیں آپ۔عربوں کے ہاں تو یہ چیز جنگ جوتھی' لڑی مالِ غنیمت کے لیے جاتی تھی۔وہاں سٹینڈنگ آرمی نہیں ہوتی تھی یہ PAID سپاہی نہیں ہوتے تھے۔وہ سارے کے سارے سپاہی ہوتے تھے جیسے مومن ہر ایک مومن سپاہی ہوتا ہے۔وہ عرب جو تھے قبل از اسلام کے جنگ کے لیے جذبۂ محرک ہی غنیمت کا مال ہوتا تھا' اسی کے لیے وہ لڑتے تھے۔قرآن نے آ کر آپ اندازہ لگایئے کہاں سے کہاں لے گیا ہے یہ انسانوں کو' کتنی بڑی تبدیلی پیدا کی۔میدانِ جنگ میں جو مالِ غنیمت دشمن کا جو ہاتھ آتا ہے' اس کے متعلق یہ کہہ دیا سپاہیوں سے کہ یہ لوٹ کا مال نہیں ہے کہ جس کے ہاتھ میں جو آئے تم لے جاؤ' قطعاً کسی چیز کو تم نے چھونا نہیں ہے میدانِ جنگ میں۔جانیں تم نے دینی ہیں جو کچھ ہاتھ میں آتا ہے وہ سارے کا سارا ملت کی تحویل میں جائے گا' ضرورت مندوں میں بانٹا جائے گا۔یعنی ایک جذبۂ محرکہ جو تھا غنیمت کے لیے جنگ کرنے کا بنیادی' کس طرح اسے نکال دیا۔اب کہا کہ جنگ کا ہے کے لیے؟ کہا اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے۔خدا کا قانون بالا کرنے کے لیے دنیا میں جنگ لڑی جائے گی۔کتنا اونچا لے جاتا ہے قرآن۔اسی لیے کہا کہ میدانِ جنگ میں غنیمت کے مالوں میں ان کے ہاں غلام اور لونڈیاں آیا کرتی تھیں' اشیا جو آتی ہیں غنیمت کے مال میں' جب ان کے متعلق کہہ دیا کہ تم سوئی تک کو نہیں چھیڑ سکتے خود تو ان کے متعلق کہاں یہ کہا جائے گا کہ جاؤ جس کے قابو میں جتنی عورتیں آئیں' لے کے بھاگ جائے۔لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (3:128) اے فاتح و منصور اب تیرے اختیار میں نہیں ہے کہ تو فیصلہ کرے ان کے متعلق' خدا کے قوانین کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا۔اور سنیئے کہا یہ کہ یہ بات تمہیں ایسی نہ گذرے کہ صاحب! ہم نے جانیں دے کے یہ سب کچھ لیا اور اس پہ ہمیں اختیار ہی نہیں ہے وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ط (3:129) تمہارے اسی گوشے کے اوپر ہم نہیں کہہ رہے کہ ہمارا اختیار ہے' تمہارا نہیں ہے۔ساری کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اختیار ہمارا ہے' اس لیے یہاں بھی ہمارا ہی اختیار چلے گا۔یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ (3:129) کس کو ہم محفوظ رکھنا چاہتے ہیں' حفاظت کے اندر لانا چاہتے ہیں' کون ہے کہ جس کو اس کے جرم کی سزا مل کر رہے گی' یہ چیزیں ہمارے قانون کے مطابق ہیں اور ہم دیکھیں گے کہ کس کے متعلق کیا فیصلہ ہونا ہوگا۔وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (3:129) خدا کے قانون میں حفاظت دینا بھی ہے ان کے لیے اور صرف حفاظت ہی نہیں ہے' رحیم بھی ہے سامانِ نشوونما مہیا کرنا بھی اس کے اندر موجود ہے۔دشمنوں کے متعلق یہ سلوک کیا جا رہا ہے حفاظت کا سامان مہیا کیا جا رہا ہے' سامانِ نشوونما دیا جا رہا ہے ان کو۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نظامِ حیات کی ایک جھلک صلح حدیبیہ بھی ہے

عزیزانِ من! یہ چیز تھی جس سے چند ہی تصادمات کے بعد یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (110:2) کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ صلح حدیبیہ میں جب یہ شق رکھی گئی تھی کہ اس کے بعد مدینے سے جو لوگ تمہارے ہاں آئیں گے (مکے والوں سے کہا تھا) اگر تم ان کو کسی طرح سے پکڑ لو گے تو بے شک ٹھیک ہے' ان کو نہ چھوڑنا' ہمارے ہاں جو لوگ آئیں گے تمہارے ہاں کے' انہیں اجازت ہوگی ہمارے ہاں رہیں' جب جی چاہے واپس آ جائیں۔ سطح بیں نگاہوں نے یہ کہا کہ صاحب یہ تو بڑا جھک کر صلح کرنے والی بات ہے یہ شرط دیکھیے تو سہی اور شرطوں کے علاوہ یہ شرط بھی ان کے حق میں جاتی ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا کہ تھوڑے دنوں کے بعد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ شرط کیا ہے۔ اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیا۔ دیکھیے کتنا بڑا اعتماد تھا وہ لوگ مکے والے یہاں آتے تھے ان کو افسانے سنا سنا کے بھڑکا رکھا تھا کہ وہاں یہ ہو رہا ہے' عذاب ہو رہا ہے' بھوک سے مر رہے ہیں' ظلم ہے' استبداد ہے' یہ ہے وہ ہے۔ IRON CURTAIN یہاں لگی ہوئی تھی کوئی آنے نہیں پاتا تھا۔ حضورﷺ نے اس شق سے دروازہ کھول دیا جو مکے والا یہاں آتا تھا' آ کے اس جنتِ ارضی کو دیکھتا تھا وہ کہتا تھا اللہ اکبر اس نظام نے یہ کیفیت تمہارے ہاں پیدا کر دی ہوئی ہے' وہ جاتا ہی نہیں تھا واپس مکے میں' جاتا تھا تو دس کو لے کے ساتھ آتا تھا کہتا تھا او بھائیو! کس عذاب میں پھنسے ہوئے یہاں' چل کے دیکھو تو سہی کہ اس مملکت کے اندر انسانیت کی کیا کیفیت ہے۔ ایک سال کے بعد خود مکے کے قریش کو یہ کہنا پڑا کہ صاحب! یہ شق ہم منسوخ کرتے ہیں۔ اب منسوخ کرنے سے کیا ہوتا تھا۔ ان کے دروازے کھل گئے ہوئے تھے۔ کس چیز سے؟ آؤ تو سہی کہیں اس مملکتِ اسلامیہ کے اندر' آؤ تو سہی خدا کے نظام کے اندر۔

حج کا بنیادی مقصد قرآنی نظامِ حیات کی عملی شکل کو نوعِ انسانی کے سامنے پیش کرنا تھا

عزیزانِ من! بات میں سے بات یاد آ گئی یہی کل کو جو آپ کے ہاں حج ہونے والا ہے' اس حج کے اجتماع کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ تم اس کا انتظام کرو اور اس کے بعد کہا ہے کہ پوری انسانیت کو دعوت دو کہ یہاں آؤ لِّیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ (22:28) تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ تم اس انسانیت کے لیے کیا کچھ کر رہے ہو۔ دعوت دی جاتی ہے تمام انسانیت کو لِّیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ (22:28) تم ان کی منفعت بخشیوں کے لیے کیا کچھ کر رہے ہو وہ اپنی آنکھوں سے آ کے دیکھ لیں۔ یوں یہ آپ کا دین پھیلتا ہے۔ خود دیکھ لیں آ کر۔ پھر یہی وہ مقامات جس کے اندر پھر یہ چیز بین کر دیا کہ صاحب! کوئی یہاں حجاز کے اندر غیر آ نہیں سکتا۔ انہوں نے تو کسی اور نقطۂ نگاہ سے کہی تھی میں کہتا ہوں اللہ کا ہزار شکر ہے کہ انہوں نے پابندی لگا دی ورنہ اگر باہر

سے لوگ آتے ''تے اوو یکھدے تے پوچھونہ کی حال ہوندا'' اب تک یہ چیز چھپی ہوئی تھی اچھا ہی تھا۔معاف رکھیے گا حج کی بات تو آ گئی ہے' حضرات چاہیں گے تو اگلا درس ذرا ہی پہلے آتا ہے حج سے پہلے' کیا خیال ہے اسے مخصوص کر دوں میں آپ کے اس حج کے لیے اور قربانی کے لیے؟ اگلا درس جو ہے یہ ٹھیک ہے وقت کی بات آ گئی یوں ہی ذہن میں آ ئی شاید کسی فرشتے نے ہی دل میں ڈالی ہے یہ بات۔میں کہہ رہا تھا کہ یہ غنیمت ہے کہ کسی نے بین لگا دیا اس چیز کے اوپر ورنہ اب جو کچھ جسے حج کہتے ہیں '' پنجابی اچ بے حجی کیندے نیں او ہنوں''۔قرآن نے یہ کہا تھا کہ یہ تمام عالمِ انسانیت کے لیے ایک چیز دعوت کی ہے تم انتظام کرو اس کا اور ان سے کہو کہ آؤ بھئی دیکھو ہم تمہاری منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں۔اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے لِّيَشْهَدُوْا (22:28) مشاہدہ کریں اس چیز کا۔یہ جو شرط تھی صلح حدیبیہ کے اندر' یہ چیز تھی۔کتنا اعتماد ہے اپنے اوپر کہ دشمنوں کو بلایا جا رہا ہے کہ آؤ رہو ہمارے اندر آ کے' اجازت ہے پھر جب جی چاہے' واپس چلے جاؤ۔میں نے عرض کیا ہے نا کہ اس سال کے اندر کچھ تو وہ آئے جو آنے کے بعد انہوں نے جانا ہی نہیں چاہا اور جو کچھ گئے ہیں وہاں کچھ WINDUP کرنے کے لیے یا بال بچوں کو لانے کے لیے ایک ایک گیا دس دس لایا اپنے ساتھ۔ایک سال کے اندر اسلام کے اس نظام کے متعلق اتنا چرچا ہو گیا سارے عرب کے اندر اگلے سال جب یہ گئے ہیں بغیر کسی قسم کے تصادم کے مکے کے دروازے کھل گئے ان کے لیے۔یہ وہ جنت تھی جس کی وسعت قرآن نے کہا تھا ارض وسما پہ سمائی ہوئی ہے۔عزیزانِ من! کبھی دین کو اس طرح دکھا تو دو محسوس شکل کے اندر۔یہی چیز تھی جو اس نے کہی تھی کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظَر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

خدا کرے کہ دین کا یہ نورِ آفتاب ایک بار پھر اس کرۂ ارض کو منور کر دے

دین کی حقیقتِ منتظَر ہ کبھی لباسِ مجاز میں آ جائے پھر بات ہے کہ یہاں سے کوئی چلا جائے؟ کوئی پاگل کا ہی بچہ ہوگا جنت کو چھوڑ کے جہنم میں وہ چلا جائے' ہو نہیں سکتا۔اس لیے یہ کہا کہ یہاں اب اختیارات فاتح کے نہیں' کمانڈر کے نہیں' فوج کے نہیں' سربراہِ مملکت کے نہیں اتنا بڑا غلبہ اور قوت اور فتح حاصل کرنے کے بعد لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (3:128) عزیزانِ من! ہزار بار غور کیجیے گا اس آیت کے اوپر کیا کہا جا رہا ہے؟ بس تمہارا کام ہو گیا اب تمہیں کوئی اختیار اس میں نہیں ہے۔کہتے ہیں صاحب! اسلامی نظام کیا ہوگا سربراہِ مملکت کے فرائض کیا ہوں گے؟ کون بتائے؟

بیاں میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے

قندیلِ آسمانی سے ماروا تنہا عقلِ انسانی کے سہارے وضع کردہ نظام ہائے زندگی کی پسماندگی

تمہارا دماغ جب بھی سوچتا ہے، کہیں جمہوریت آتی ہے تو مغرب سے چلی آتی ہے۔ معیشت کا نظام آتا ہے تو ادھر سے چلا آ رہا ہے۔ کسی کے ذہن میں ہی نہیں۔ وہ اسے کہہ رہا ہے غیر اسلامی وہ اِسے کہہ رہا ہے غیر اسلامی۔ پوچھیے تو سہی جسے تم اسلامی کہتے ہو اس میں کیا چیز

آنکھ نرگس کی دہن غنچے کا حیرت میری
ان کی تصویر میں پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

کیا سیاست اور کیا آپ کے ہاں کی معیشت اور معاشرت جو ہے، سارے مستعار مانگے ہوئے نظریات و تصورات۔ جس نے پہلے اسلامی لکھ دیا اس کا اسلامی ہو گیا جس نے بعد میں لکھا وہ غیر اسلامی ہو گیا۔ چل بھئی ''آ فیصلہ ہون ڈیا ہے''۔ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (3:129)

میدانِ جنگ سے گرفتار ہونے والے دشمنوں کے ساتھ سلوک روا رکھنے کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی دو صفات قابلِ غور ہیں

جنگ کے بعد یہ کہنا وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (3:129) میں نے عزیزانِ من! کہا تھا قرآن کی آیتوں کے آخر میں جو خدا کی صفات آتی ہیں بڑی غور طلب ہوتی ہیں۔ میدانِ جنگ کے بعد دشمنوں کو پکڑا ہوا ہے، گرفتار ہوا ہوا ہے، یہاں خدا کی کس صفت کا ظہور ہونا چاہیے؟ صفتِ غفور و رحیمی کا ظہور ہونا چاہیے۔ پھیلا دو سائبان ان کے سروں کے اوپر، حفاظت کا سامان ان کے لیے بہم پہنچا دو، سامانِ نشو و نما بہم پہنچا دو۔ اور رحیم آیا ہے یہ سامان ایسا ہوتا ہے جو بڑی نرمی سے دیا جائے نا، مرحمت سے جس کو دیا جائے۔ رحمِ مادر میں جس طرح بچے کی پرورش ہوتی ہے، یہ لفظ وہاں سے آیا ہے۔ عزیزانِ من! اس طرح سے سامانِ نشو و نما ان کو دیا جائے کہ ان کی غیرت کو ٹھیس نہ لگے دشمن کی، اس محبت سے ان کی نشو و نما کا سامان پیدا کرو۔ دشمن کے قیدیوں کے متعلق غفور و رحیم آ رہا ہے۔ ایک تصادم میدانِ جنگ میں ہوتا ہے، ہم تو جنگ اسی کو سمجھتے ہیں جو کارزار کے میدان میں ہوتا ہے۔

کیا قرآنِ حکیم بے ربط کتاب ہے یا یہ ہماری بے نورِ عقل کا قصور ہے؟

غور فرمایئے میدانِ جنگ کا ذکر آ رہا ہے دشمنوں کے ساتھ مقابلہ ہو رہا ہے' آیتیں چلی آ رہی ہیں اور اس سے اگلی آیت ہے **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا** (3:130) اے جماعتِ مؤمنین! ربٰو کا نظام جسے سود آپ کہتے ہیں' یہ نہ اپنے ہاں کہیں جاری کر لینا۔ نظر نہیں آتا کہ صاحب! یہ ربط کیا ہے؟ میدانِ جنگ کے متعلق یہ آیتیں آ رہی ہیں اور فوراً یہ چیز آپ کے ہاں کی اس ربٰو کی درمیان میں آ گئی۔ تو آپ کے ہاں تو یہ مشہور ہے نا عام طور پہ کہ جی قرآن میں ربط وبط کچھ نہیں ہے۔ یعنی قرآن کے متعلق تو (معاذ اللہ) آپ کے ہاں بس بڑی تفصیل سے ہے نا کہ بڑا مجمل ہے' اس میں کوئی تفصیل نہیں' بڑا امبہم ہے' اس کی تشریح نہیں ہو سکتی' آپ باہر سے ہزار چیزیں لایئے تو قرآن کی ایک آیت کی تفسیر کہیں سے ہوتی ہے یعنی اتنا محتاج ہے دوسروں کا' بڑا تضاد ہے اس کے اندر' بڑا تخالف ہے اس کے اندر' مربوط نہیں ہے ابھی یہ بات ہو رہی تھی صاحب! جنگ کی ابھی صاحب اس میں سود کی بات ہو رہی ہے۔ کیا بتایا جائے ان کو؟ اس ربط کے متعلق پوچھیے باہر کی کائنات میں سائنٹسٹ سے ربط پوچھیے جو یہاں زمین کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے چاند کے اوپر گئے ہوئے جو ہیں' ان کا کنٹرول کر رہے ہیں یہاں سے بیٹھے ہوئے' ربط یہ ہے کائنات کے اندر۔

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

دشمن کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کے معاشی نظام کے ذکر کی وجہ ربٰو سے بچنے کی تاکید ہے

جس خدائے کائنات کی خارجی کائنات میں ربط کا یہ عالم ہے وہ اپنی تصنیف جو ہے وہ بے ربط دے گا دنیا کے اندر؟ عام مصنف کے متعلق کہہ دو کہ تمہاری تصنیف میں ربط نہیں ہے' میرے متعلق کہہ دے کتاب اٹھا کے پھینک دوں صاحب۔ لیکن یہاں تو وہ خدا ہے نا مذہب ہے نا ''غریب کی جورو سب کی بھابھی'' جو جس کا جی میں آئے کہہ دے۔ ربط نہیں ہے۔ ربط ہی تو ہے اس کے اندر۔ کہا یہ کہ یہ نہ سمجھ لینا میدانِ جنگ کے اندر اگر ہم نے کامیابی حاصل کر لی مقصد حاصل ہو گیا' اس کے بعد اب کوئی تصادم نہیں ہے۔ کہا حقیقی تصادم تو یہاں آئے گا تمہارے اپنے تمدن کی دنیا کے اندر' معیشت کی دنیا کے اندر' STRUGGLE FOR EXISTENCE کے اندر ہوتا ہے' ECONOMIC FIELD کے اندر تمہاری سب سے بڑی جنگ ہوتی ہے۔ فوراً یہ

لے آیا کہیں مطمئن ہو کے نہ بیٹھ جانا کہ صاحب! فتح حاصل کر لی' بس کام بن گیا۔ اب راوی عیش لکھتا ہے۔ فوراً وہ توجہ کو ادھر لے آتا ہے کہ دیکھو اصل جنگ اب شروع ہونے والی ہے۔ یہ جس زمانے میں بظاہر امن اور صلح ہوتی ہے۔ ECONOMICS کی جنگ چودہ سو سال پیشتر۔ عزیزانِ من! میں نے اس لیے کہا ہے قرآنِ کریم نے یہ جو میدانِ جنگ میں جنگیں ہوتی تھیں وہ تو ٹھیک ہے' وہ حرب کہا ہی ہے اس کو' ایک ہی اور جرم ہے جس کے متعلق یہ کہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر یہ کچھ تم نے کیا تو ہماری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ کس بات کے متعلق؟ ربٰو کے متعلق۔ ربٰو جس کا ترجمہ آپ نے سود کر کے پھر بیاج کر کے پھر اس کے ہاں کی موشگافیاں نکال کے پھر اس کے ہاں کی عجیب عجیب چیزیں' میں بیان کروں گا' آپ اس پہ سمٹا کے لے آئے۔ میں کہتا ہوں دیکھیے تو سہی کہ قرآن اس کو کتنا سنگین جرم قرار دیتا ہے؟ کسی اور جرم کے متعلق قرآن نے یہ نہیں کہا کہ ایسا کرنے والے جو ہیں ان کے خلاف الٹی میٹم دے دو جنگ کا۔ صرف اس کے متعلق یہ کہا ہے فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ج (2:279) اگر اس سے باز نہیں آؤ گے تو اعلانِ جنگ ہے تمہارے خلاف۔ تو قرآن نے دو جنگ جو ہیں وہ بتائے۔ ایک یہ جنگ جن کا ذکر آ رہا تھا جو بدر اور احد اور احزاب کے میدانوں میں لڑی گئی تھیں جنگیں اور دوسرا جنگ جو آپ کی تمدنی زندگی کے اندر آپ کے ہاں ECONOMIC کے فیلڈ کے اندر آتا ہے جنگ۔ یہ جنگ ہے جس کے متعلق فوراً اس کے ساتھ یہ ذکر شروع کر دیا کہ وہاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ نہ کہنا مسائل سارے حل ہو گئے۔ فتح پا لی' امن ہو گیا' موج ہو گئی اب۔ بالکل نہیں! جنگ یہاں اب شروع ہونے والی ہے تمہاری ECONOMICS کے فیلڈ کے اندر' معاشی نظام کے اندر۔ بڑا بنیادی مسئلہ ہے۔ لیکن آج وقت ہو گیا۔ سورۃ الِ عمران کی آیت 129 تک ہم پہنچے' 130 سے ہم اس کے بعد لیں گے۔ لیکن جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے اگلا درس تو ہم حج اور قربانی کے متعلق مختص کر دیں گے اور پھر اس کے بعد کے درس میں ہم سورۃ الِ عمران کی آیت 130 سے شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

اکیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 130 تا 134)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج فروری 1970ء کی 22 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ الِ عمران کی آیت 130 سے ہو رہا ہے:(3:130)۔

دیدۂ کور کی بجائے کوئی آنکھ والا ہی قرآن کے جوبن کا نظارہ کر سکتا ہے

آپ کو یاد ہو گا کہ سابقہ درس میں سابقہ سے مراد ہے آٹھ فروری کا درس کیوں کہ گذشتہ اتوار کا درس تو حج اور قربانی کے مسائل کے لیے مختص تھا اس سے پہلے جو درس تھا اس میں ذکر آ رہا تھا جنگِ بدر، احد، احزاب کا۔ اور جہاں وہ ذکر ختم ہوتا ہے اس سے اگلی آیت ہے جہاں سے آج درس کا آغاز ہو رہا ہے اور اس کا تعلق ہے ربوٰ سے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ص (3:130) سطح بین نظروں سے دیکھنے والوں کے لیے تو اس میں کوئی ربط نظر نہیں آئے گا کہ بات لڑائیوں کے متعلق چلی آ رہی تھی، جنگوں کے متعلق اور اس کے فوری بعد ہی معاشی مسئلہ وہ سامنے آ گیا۔ تو جیسا میں نے عرض کیا ہوا ہے ہمارے ہاں تو اس کتابِ عظیم میں (معاذ اللہ) ہر قسم کے نقائص بتائے جاتے ہیں ناا پنوں کی طرف سے۔ اس میں یہ بات بھی ہے کہ اس میں ربط نہیں ہے کوئی بات پہلے کسی مسئلے سے چلی آتی ہے، آگے کوئی اور شروع ہو جاتا ہے۔ ان سے اس سے زیادہ کیا کہا جائے جو غالب کہہ گیا تھا کہ

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ساز کے پردوں کے اندر چھپے ہوئے نغموں کو نگاہِ حقیقت شناس تو جان سکتی ہے، سطح بین نظروں سے ان میں کوئی ربط نظر نہیں آتا۔

دنیا میں ہر جنگ کے بعد سب سے زیادہ دقیق مسئلہ معاشی ہوتا ہے

ہمارے دور میں یہ بات سمجھنا کچھ زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہر جنگ کے بعد سب سے اہم سوال جس سے وہ قوم دوچار ہوتی ہے' معاشی مسئلہ ہوتا ہے۔ جنگ کے بعد CRISIS آتا ہے اس قوم کے اوپر مالیات کا' ایک بحران ہوتا ہے FINANCES کا اس لیے جنگ کے دوران میں تو اس کے سوا کوئی اور خیال ہی نہیں ہوتا قوم کو کہ جس طرح سے ہو سکے' وہ جنگ جیتی جائے یا اپنی مدافعت کی جائے۔ اس میں جتنا کچھ خرچ ہوتا ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یہ جو معاشی بحران آیا ہے FINANCIAL CRISIS آیا ہے قوموں کے اوپر' جنہوں نے وہ دن دیکھے ہیں ان کو معلوم ہو گا کہ کیا ہوا تھا؟ جنگ کے اندر قومیں اتنی تباہ نہیں ہوئی تھیں جو جنگ کے بعد کے FINANCIAL CRISIS سے تباہ ہوئیں تھیں۔ اور ابھی سنبھلنے نہیں پائیں تھیں کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی اور اس کے بعد جو قوموں میں FINANCIAL CRISIS شروع ہوئے ہیں یہ اس دور میں قوم کوئی سنبھل ہی نہیں رہی' اپنے پاؤں پہ کھڑی نہیں ہو رہی' یہ اس دوسری جنگ کا اثر تھا۔

جنگ کی کامیابی کے بعد فوری طور پر تعمیری پروگرام کی ضرورت

تو معاشی مسئلہ جو ہے اسے جنگ کے فوری بعد لانا آپ دیکھتے ہیں کہ کتنا اہم ربط ہے ان کے درمیان۔ اور پھر دوسری بات یہ کہ یہ جنگ وہ تھے جن میں انہیں کامیابیوں پہ کامیابیاں ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اس طرف بھی تو توجہ مبذول کرنی تھی کہ محض جنگ کے اندر کامرانی اور کامیابی ہی مقصود و مطلوب نہیں' جنگ تو یوں سمجھیے کہ جیسے آناً فاناً کسی بیماری کا حملہ ہو جائے' اس کا علاج نہایت ضروری ہوتا ہے اور اس دوران میں نگاہ کسی دوسری طرف اٹھتی نہیں ہے سوائے اس کے علاج کے۔ لیکن اگر مریض تندرست ہو جاتا ہے تو اسے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی کے مقاصد حاصل ہو گئے۔ سمجھنا یہ چاہیے کہ زندگی کے مقاصد کے لیے اب وہ دوبارہ تیار ہوا ہے۔ اس لیے جنگ میں کامیابی مقصود بالذات نہیں ہے۔ وہ تو جو بلند مقاصدِ انسانیت ہیں' ان کے حاصل کرنے کے لیے پھر دوبارہ انسان تیار ہو جاتا ہے۔ اور یہ وجہ ہے کہ قرآن کہیں جنگ کے بعد فوراً معاشرتی اصلاح کی آیات کو لایا ہے وہ اور کہیں وہ معاشی اصلاح کے لیے آیات کو لایا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ یہاں ربوٰ کے متعلق قرآن نے کیا کہا ہے

قرآنِ حکیم کے بلند حقائق کو سمجھنے کے لیے قرآنی اصطلاحات کو سمجھنا نہایت ضروری ہے

میں آگے چل کے بتاؤں گا کہ قرآن کی بلند حقیقتوں کو نگاہوں سے اوجھل کرنے میں ایک سب سے بڑی چیز جو حائل ہوئی ہے

وہ قرآن کی اصطلاحات اوراس کے الفاظ کے غلط ترجمے ہیں' غلط نہیں' یعنی وہ تراجم کہ جو خارجی حالات سے متاثر ہوکر ہم نے کیے ہیں۔ وہاں سے بات کہیں کی کہیں چلی جاتی ہے۔ اور قرآنِ عظیم کو سمجھنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس نے جو CONCEPTS اور تصورات اور اصطلاحات اور TERMS دی ہیں' ان کا قرآن سے مفہوم متعین کیا جائے۔ جب وہ مفہوم متعین ہو جائے گا تو پھر قرآن سمجھ میں آ جائے گا ورنہ قرآن کے الفاظ کے معنی اگر ہم نے اپنے ہاں سے جو مروج ہیں' وہی لیے تو پھر تو قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں رِبٰوا کی اصطلاح کو ذہن نشین کیے بغیر اصل حقائق سامنے نہیں آ سکتے

انہی اصطلاحات میں یا انہی تصورات میں ایک چیز ربٰو کی بھی ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ مادے کے اعتبار سے رِبــوا' کے معنی ہوتے ہیں بڑھوتی' INCREASE' زیادہ لینا۔ اب میں عرض کروں گا کہ یہ صرف سود نہیں ہے یہ کیا چیز ہے؟ اس مسئلے کی کتنی اہمیت ہے قرآن کے نزدیک؟ اسے سب سے پہلے بڑے غور و فکر سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جماعتِ مومنین کو جنگ کی اجازت لیکن کب اور کیسے؟

اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے۔ وہ خود امن میں رہنا چاہتا ہے۔ یہ امت جو اس دین کی حامل ہے' امن میں رہنا چاہتی ہے' دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ خود خدا کی ایک صفت اَلسَّــلٰـمُ ہے' وہیں سے اسلام ہے' وہیں سے مسلم ہے۔ خدا کی ایک صفت المومن ہے اس کے معنی ایمان لانے والا نہیں' خدا کے متعلق کہا جائے المومن تو وہ ایمان کس پہ لاتا ہے اللہ میاں؟ مومن کے معنی ہیں امن دینے والا' امن کی ضمانت دینے والا۔ اور اسی اعتبار سے یہ جو مومن کہا ہے جماعتِ مؤمنین کو یہ وہ جماعت ہے جو دنیا کو امن کی ضمانت دیتی ہے۔ تو یہ تو دنیا کو امن کی ضمانت دینے والے' دنیا میں سلامتی قائم کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ دین ان کا جو ہے اسلام ہے اس کے معنی ہی سلامتی اور امن کے ہیں۔ لیکن امن کے قیام کے لیے ہی بعض اوقات سرکش قوتوں کی سرکشی کی مدافعت کرنے کے لیے جنگ کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیں گے کہ جنگ کی اجازت وہاں دی گئی ہے جہاں کسی دوسری قوم نے ان کے خلاف جنگ کی۔ پہلی اجازت جو ملی ہے جنگ کرنے کی اُذِنَ لِلَّـذِیۡـنَ یُـقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا (22:39) یہ جماعتِ مؤمنین کہ جن کے خلاف مخالفین نے جنگ کی ہے' جنگ کرنے کو آ گئے ہیں انہیں اب اجازت دی جاتی ہے کہ یہ بھی اس جنگ کا جواب جنگ سے دیں۔ جن کے خلاف جنگ کی گئی ہے' جنگ کرنے کے لیے دوسری قومیں چڑھ دوڑی ہیں'

ان کے خلاف انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ یہ بھی اب مقابلے کے لیے باہر نکل آئیں۔ آپ نے دیکھا کہ جنگ کے لیے اجازت دی جاتی ہے اس وقت جب دوسری قومیں ان کے خلاف جنگ کے لیے ابھر آئیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ (2:190) جو لوگ تمہارے خلاف جنگ کرنے کے لیے ابھر آئیں' ان کے خلاف تم بھی جنگ کر سکتے ہو۔ اور آگے ہے وَ لَا تَعْتَدُوْا ط (2:190) اس سے آگے نہیں تم بڑھ سکتے۔ یعنی ان کے جنگ کو روکنے کے لیے تم جنگ کر سکتے ہو' اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی سلسلے میں آگے یہ کہا ہے فَاِنِ انْتَھَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (2:192) اگر وہ لوگ رک جائیں تو پھر تم بھی' رک جاؤ' آگے نہ بڑھو۔ حتیٰ کہ سورۃ انفال میں یہ کہا گیا ہے کہ جنگ کرو وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا (8:61) جس وقت وہ صلح کے لیے جھک جائیں تم فوراً صلح کے لیے جھک جاؤ۔ یعنی جنگ کی اجازت اس وقت ہے جب دوسرے جنگ کے لیے چڑھ دوڑیں۔ اتنی جنگ کرو جتنے سے ان کی سرکشی کی قوت ٹوٹ جائے اس کے بعد اور آگے قدم نہیں بڑھانا۔ اگر وہ صلح کے درخواست کریں' جھک جائیں' تم ان سے صلح کر لو۔

مسلمانوں کو خود مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ حکم ہے لیکن کیوں؟

جنگ کے متعلق یہ احکام ہیں قرآنِ کریم کے میں ان کی تفصیل میں اس وقت نہیں جا رہا' بات اور کہہ رہا ہوں میں۔ لیکن قرآنِ کریم میں ایک جنگ ایسی بھی ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ تم خود الٹی میٹم دو دوسروں کو جنگ کے لیے۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی چیز ہو گی یہ کون لوگ ہیں کہ پہل کی جا رہی ہے' الٹی میٹم دیا جا رہا ہے ان سے۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ کسی کے خلاف جنگ کرنے کا الٹی میٹم نہیں دیا جا رہا' جنگ مدافعانہ ہو رہی ہے۔ پہل دوسری کی طرف ہو رہی ہے۔ لیکن ایک جنگ ایسی ہے جس کے متعلق یہ کہا کہ الٹی میٹم دے دو ان کو جنگ کا۔ کون لوگ ہیں یہ؟ پہلے لوگ تو وہ تھے جو کفار تھے' مشرکین تھے' مخالفین تھے' بہر حال غیر مسلم تھے' مخالفت میں امڈے ہوئے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ لوگ ہیں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (3:130) ہے تعجب انگیز بات یا نہیں؟ خود مسلمانوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ ارے! مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جا رہا ہے۔ کفار کے خلاف جنگ نہیں' الٹی میٹم دے کے جنگ نہیں کیا جا رہا تھا' مدافعت ہو رہی تھی۔ یہاں ان کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جا رہا ہے' الٹی میٹم دیا جا رہا ہے۔ کہاں ہے یہ بات آئی؟ عزیزانِ من! سارے قرآن میں ایک ہی مقام ہے جہاں یہ کہا گیا ہے۔ سنیے کہ کہاں کہا گیا ہے؟

مومن کو مومن رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ربٰو کی بنیاد پر حاصل ہونے والی رقم کو چھوڑ دے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (2:278) اے جماعتِ مؤمنین اگر تم مومن رہنا چاہتے ہو تو ربٰو میں سے جو کچھ باقی ہے وہ سب چھوڑ دو۔ آئندہ کے لیے تو ربٰو کا خاتمہ ہی کر دیا گیا جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے ربٰو میں سے، وہ سب چھوڑ دو اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (2:278)۔ عزیزانِ من! بڑا غور طلب سوال ہے یعنی مومن رہنے اور نہ رہنے کا سوال یہ ہو گیا۔ پہلی بات تو یہ دیکھیے آپ اور اس کے بعد ہے فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا (2:279) اگر تم نے ایسا نہ کیا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (2:279) تو پھر تیار ہو جاؤ جنگ کے لیے خدا اور رسول کی طرف سے، اعلانِ جنگ ہے تمہارے خلاف۔ بڑی غور طلب چیز ہے۔ خود مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے اگر مسلمان رہنا چاہتے ہو تو تمہیں یہ کرنا ہوگا۔ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ (2:275) اس لیے کہ ربٰو کو ہم نے حرام قرار دیا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کو بھی حرام قرار دیا تھا قرآن نے۔ پہلی چیز تو یہ کہ وہاں یہ نہیں ہے کہ اگر کسی نے کھانے پینے کی چیزوں میں سے مثلاً اگر خنزیر کھا لیا ہے تو کہہ دیا ہے کہ ہاں! اس کے خلاف چڑھ دوڑو توپیں اور بندوقیں لے کر، اعلانِ جنگ کر دو اس کے خلاف یہ نہیں کہا گیا۔ بلکہ وہاں تو یہ ہے کہ اگر اضطراری حالت پیدا ہو جائے، جان بچانے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ بھی تمہارے لیے جائز ہے۔ لیکن یہاں ایک چیز حرام ایسی ہے کہ کہا یہ گیا ہے کہ آئندہ کے لیے تو حرام ہے۔ جو کچھ پیچھے کرتے چلے آ رہے تھے اگر اس میں سے بھی باقی رہ گیا ہے کسی کے ذمے، اسے اگر تم نہیں چھوڑتے، تو پھر اعلانِ جنگ ہے تمہارے خلاف۔

رِبٰوا کے جرم کی نوعیت نظامِ خداوندی کے خلاف کھلی بغاوت ہے

عزیزانِ من! یہ ہے رِبٰوا ۔ اس سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی اتنا بڑا سنگین جرم ہے جس کی مثال ہی قرآن میں دوسری نہیں ہے۔ پھر دہرا دوں کہ کسی کے خلاف اس طرح اعلانِ جنگ کر کے جنگ کی قرآن میں کہیں اجازت ہی نہیں۔ اور پھر یہ جنگ خود مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ (4:93) جس نے کسی ایک مومن کو بھی ارادتاً قتل کر دیا اس کی جزا جہنم ہے۔ اور یہاں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (3:130) کہہ کے کہا گیا ہے کہ تیار رہو پھر جنگ کے لیے مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ (2:279) اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے تمہارے لیے، تیار ہو جاؤ۔ گویا یہ کوئی ایسی چیز ہے کہ جو نظامِ خداوندی کے خلاف علی الرغم بغاوت ہے۔ اتنا ہی سنگین جرم ہوگا تو اس قسم کا

اعلانِ جنگ ہوگا نا ان کے خلاف۔عزیزانِ من! بات اگر اتنی ہی ہو جو ہم نے سمجھی کہ کسی نے قرضہ دیا اور اس کے اوپر اس نے پانچ سات روپے اس سے سود کے لیے' بیاج کے لے لیے' جسے عام طور پہ ہم یہ کہتے ہیں۔کیا یہ چیز اتنا سنگین جرم ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہاں صاحب! اسے چاہیے تھا وہ مدد کے لیے آیا تھا غریب تھا محتاج تھا' اسے چاہیے تھا اس کی مدد کرتا۔مدد کرنے کے ساتھ اس نے اس سے ساتھ کچھ پیسے لے لیے۔میں کہتا ہوں بنیادی چیز تو یہ کہہ رہے ہیں نا کہ اسے چاہیے تھا اس کی مدد کرتا۔یہ شخص اگر اسے انکار کر دے کہ میں نہیں تمہیں قرض دیتا' قرآن نے اسے کہیں جرم نہیں کہا۔یعنی یہ انکار کر دینا جو ہے ٹھیک ہے ایک اخلاقی مذموم چیز ہے۔چاہیے تھا کہ ذرا وسعت ہوتی تم میں یہ کر دیتے اس کی مدد۔یہ ٹھیک ہے کہ اخلاقی طور پہ ضروری چیز تھی لیکن میں کہہ یہ رہا ہوں کہ اگر یہ شخص انکار کر دیتا ہے' مدد نہیں کرتا۔قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو حالانکہ اس نے سرے سے مدد سے ہی انکار کر دیا ہے۔لیکن یہ شخص ہمارے اس مفہوم کے اعتبار سے اس کی مدد کرتا ہے' اتنا ہی ہے نا کہ اس سے دو چار پیسے زائد لے لیتا ہے۔کیا یہ چیز ایسی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہو رہا ہے جنگ کا اعلان خدا اور رسول کی طرف سے۔یہ کیا چیز ہے؟

خدا کی کتاب کے مطابق حکومت کا قیام ایک عملی پروگرام کا نام ہے جس میں معاشی سسٹم کو اولیت حاصل ہے

عزیزانِ من! سوچیے کہ قرآن کی رو سے یہ معاشی مسئلہ کتنا اہم مسئلہ ہے۔قرآنِ کریم نے ایک نظام دیا ہے اور اس میں معیشت کا بہت بڑا حصہ ہے۔جو اسلامی نظام ہے زندگی کا' اس میں معاشی نظام کا بہت بڑا حصہ ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ قرآن نے یہ اپنے نظام کے متعلق بنیادی طور پہ تو یہ کہا کہ وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ(5:44) مومن کافر میں حدِ تمیز یہ ہے کہ جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ہیں' یہ لوگ ہیں جو کافر ہیں۔پہلی چیز تو یہ ہے اسلامی نظام میں جسے کہتے ہیں حقِ حکومت صرف خدا کو ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ(12:40) خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت نہیں۔اور اس نے کہا کہ یہ کوئی نظری اور اعتقادی چیز نہیں ہے کہ تم یہ کہہ دو کہ ہاں صاحب! خدا کی حکومت قائم ہے' اس کا کوئی تصور ہی تمہارے ذہن میں نہ ہو۔عملاً یہ کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:44) خدا کی حکومت کے معنی یہ ہیں خدا کی کتاب کی حکومت یہاں ہوگی۔جو بھی اس کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ(5:44) یہ کافر ہیں یہ مسلمان نہیں ہیں۔ان کو تو اس نے دائرۂ

اسلام سے ہی خارج کر دیا۔اسلامی نظام کی بنیاد یہ ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے بالمقابل دوسرا معاشی نظام خدا اور رسول کے خلاف بغاوت ہے

اگلی چیز جو اس نے کہی ہے وہ یہ کہ مسلمان رہتے ہوئے اگر یہ نظام قائم کرلیا ہے تم نے یعنی یہ ایک معاشی نظام کا نام ہے جو اس نظام کی ضد ہے جو قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے نام سے ایک حکومت بھی تم قائم کرتے ہو' مملکت بھی تمہاری ہے اور کچھ اخلاقی باتیں بھی تم اپنے اندر رکھتے ہو' یہ نماز روزہ بھی قائم رکھتے ہو۔لیکن اگر تمہارا معاشی نظام اس نظام کی ضد ہے جو قرآن دینا چاہتا ہے تو پھر ان کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جائے گا۔عزیزانِ من! غور کیجیے میں بار بار کہہ رہا ہوں بڑی غور طلب چیز ہے کہ یہ معاشی مسئلہ کتنی اہمیت رکھتا ہے قرآن کی رو سے۔ وہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آتی تھی کہ جو قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا' ٹھیک ہے وہ مومن نہیں ہیں' وہ کافر ہیں۔ اگلی چیز یہ ہے کہ جو معاشی نظام وہ قائم نہیں کرتا اس کے علی الرغم' دوسرا معاشی نظام قائم کرتا ہے' وہ ایسے ہی ہیں جیسے کہ کسی مملکت کے خلاف کسی نے بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت ہے مملکتِ اسلامیہ کے خلاف' نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت ہے۔ اس نظام کے خلاف نظام قائم کرنا کہ جو قرآن نے قائم کیا یا بتایا ہے قائم کرنا۔ اب دیکھیے کہ پھر یہاں سے پتہ چلے گا کہ وہ نظام کیا ہے جو قرآن قائم کرنا چاہتا ہے؟ یہ ربوٰ یا جس کو آپ بڑھوتی کہتے ہیں یہ ہوتی کیا چیز ہے؟ انسانوں کی ابتدائی زندگی جو تھی تمدن کی' اس میں اشیا کا تبادلہ ہوتا تھا اسے BARTER SYSTEM کہا جاتا ہے۔ تمدنی زندگی میں ضرورت کی چیزیں ایک دوسرے سے بدلی جانی نہایت ضروری ہیں۔ تیلی تیل نکالتا ہے' موچی جوتا بناتا ہے۔ تیلی کو جوتے کی ضرورت ہوتی ہے' موچی کو تیل کی ضرورت ہوتی ہے' اس نے جوتا دے دیا۔ تیل لے لیا۔ اسے BARTER SYSTEM کہتے تھے چیزوں کا تبادلہ۔ یہ جو عربی زبان میں بیع اور شریٰ کے الفاظ ہیں اور قرآن نے بھی جو چیز کہی ہے اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ (2:275) یہ بیع کے معنی ہم تو اب یہی لیتے ہیں نا بیچنا اور شریٰ کے معنی خریدنا بیع اور شریٰ خرید وفروخت۔ یہ عربی زبان کی رو سے یہ بات نہیں عربی زبان کی رو سے بیع کے معنی بھی ہے خریدنا اور بیچنا اور شریٰ کے معنی بھی ہیں خریدنا اور بیچنا۔ یہ چیز جو ہے یہ صرف BARTER SYSTEM میں ہوسکتی ہے ایک چیز آپ دیتے ہیں' دوسری چیز لیتے ہیں۔ یہ آپ بیچتے ہیں تو اسی کے ساتھ ہی وہ دوسری خریدتے ہیں۔ یہ چیز ہے کہ جو یہ عربوں کے ہاں یہ الفاظ اس زمانے کے چلے آ رہے تھے جب دنیا میں BARTER SYSTEM تھا' چیزوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ جب تمدن آگے بڑھا تو اس میں کچھ دشواریاں پیش آئیں۔ گیہوں کسی جگہ ہے' نمک کسی اور جگہ ہے۔ وہ گیہوں والا وہاں سے گیہوں لاد کے یہاں لائے' یہاں سے نمک لے کے جائے' اس میں

بڑی دقت تھی تو کیا کیا جائے؟ اس دقت کو رفع کرنے کے لیے انسانوں نے سکہ ایجاد کیا COIN ۔انہوں نے کیا یہ کہ گیہوں وہاں کی وہاں بیچ دی' روپے لے لیے۔روپے لے کے شہر میں آ گئے یہاں روپیہ دیا اور نمک لے لیا۔بات تو وہی ہے گیہوں بیچ کے نمک لیا ہے لیکن درمیان میں ایک اور چیز آ گئی جسے آپ سکہ یا COIN کہتے ہیں۔

روپیہ کا استعمال ضروریاتِ زندگی کے علاوہ جمع شدہ سرمایہ ربٰو کی شکل اختیار کر لیتا ہے

یہ INTRODUCE تو ہوا تھا' ایجاد تو ہوا تھا اس دشواری کو رفع کرنے کے لیے لیکن آہستہ آہستہ اس سکے نے اتنی اہمیت حاصل کر لی کہ یہ بجائے خویش ایک مقصود بالذات چیز بن گئی۔ پہلے یہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا صرف ذریعہ تھا۔اگر کسی کے پاس اس زمانے میں روپیہ جمع ہو جاتا تھا' وہ جمع شدہ روپیہ اسے کچھ کام نہیں دیتا تھا۔وہ تو اس کے لیے تھا کہ اس روپے سے اس نے جا کے گیہوں خرید لیا' ضرورت پوری کر لی۔گیہوں بیچنے والے نے روپیہ لیا بازار سے کپڑا خرید لیا' ضرورت پوری ہو گئی۔اور اگر روپیہ رکھا رہے تو وہ تو کسی کام ہی نہیں آ سکتا لیکن یہی روپیہ اگر کسی کو اس طرح سے دیا جائے کہ اس سے کوئی چیز نہ اس کے بدلے میں خریدی جائے' روپے کا روپیہ اور کچھ عرصے کے بعد یہ روپیہ واپس آ جائے اور آپ کریں کچھ نہ اور یہ ساتھ کچھ اور روپیہ لے آئے' یہ اس سکے کا بے حد غلط استعمال ہو گیا۔یہ اس مقصد کے لیے بنا ہی نہیں تھا۔وہاں یہ صورت تھی کہ گیہوں بونے والے کو محنت کرنی پڑتی تھی' کپڑا بیچنے والے کو محنت کرنی پڑتی تھی وہ اپنی محنت کا ماحصل کچھ لیتے تھے۔یہاں یہ صورت ہو گئی کہ کسی طرح سے فاضلہ روپیہ رکھ لیا اور آپ محنت کچھ نہیں کی'اب محنت دوسرے کر رہے ہیں آپ صرف یہ روپیہ جو ہے اپنے گھر میں رکھنے کی بجائے اس کے گھر میں جا کے رکھ دیتے ہیں۔یہاں آپ کے گھر میں پڑا رہتا' سو برس تک سو روپیہ پڑا رہے ایک سوا ایک نہیں ہوتا۔اور یہی جو سو روپیہ آپ کے ہاں پڑا رہنا تھا اگر آپ نے کسی دوسرے کے ہاں رکھ دیا تو وہ سو کا ڈیڑھ سو ہو جاتا ہے۔یہ جو اس طرح سے سکہ جو ہے یہ خود بخود بڑھتا ہے' اسے ربٰو کہا جاتا ہے جس میں محنت کا معاوضہ نہیں کچھ ملتا۔کسی طرح سے آپ ضرورت سے زائد روپیہ اپنے پاس رکھ لیجیے بس وہ روپیہ جو ہے جہاں وہ روپیہ آپ نے جا کے رکھ دیا' اپنے پاس پڑا رہا پڑا رہا' کچھ نہیں دے رہا کسی دوسرے کے ہاں جا کے پڑا رہا' سو کا سوا سو آ رہا ہے۔

اصل بات تو کسی نظام میں محنت کے معاوضے کی ہے

یہ نظام کہ جس میں معاوضہ محنت کا نہیں ملتا۔یہ سکے کچھ دوسرے کی محنت سے لے کے چلے آتے ہیں۔یہ آپ نے اس سے جو

لے لیا ہے پچاس روپے زائد اس نے پچاس کہاں سے لیے؟ اس نے کی محنت اس محنت سے اس شخص کو معاوضہ پورا ملنا چاہیے تھا۔ اسے تو مل گیا پورا' اب اس معاوضے میں سے آدھا حصہ وہ آپ کو آ کے دے رہا ہے۔ یہ آپ اس سے کاہے کا لے رہے ہیں؟ اس میں کون سی منطق ہے؟ یہ روپیہ جو آپ کے ہاں پڑا رہتا تو ایک سوایک بھی نہ ہوتے' یہ اس کے ہاں پڑا رہا تو ڈیڑھ سو ہو گیا۔ اس کی محنت میں سے آدھا آپ نے لے لیا ایسی چیز کے عوض میں جو آپ کے ہاں رہتی تو بے کار تھی۔ اور آپ نے کام کرنا بھی چھوڑ دیا' محنت کرنا بھی چھوڑ دیا' کچھ پیدا کرنا چھوڑ دیا۔ یہ جو روپیہ دے کے دوسرے کی محنت سے کچھ لے رہا ہے' یہ معاشرے میں کوئی چیز جسے کہتے ہیں PRODUCTIVITY' کچھ پیدا نہیں کر رہا۔ گیہوں والا محنت کر کے پیدا کر رہا ہے' مزدور محنت کر کے کچھ بنا رہا ہے' وہ معاشرے میں کسی نہ کسی چیز کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہ بیٹھا ہوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا' کچھ کام نہیں کرتا' کوئی محنت نہیں کرتا' کوئی چیز پیدا نہیں کرتا اور محنت کرنے والوں کی محنت کی کمائی میں سے لیتا چلا جاتا ہے۔ یہ جتنا شر دنیا کے اندر پھیلا ہوا آپ کو نظر آتا ہے اس کی بنیاد اس پہ ہے کہ ایک شخص کسی نہ کسی طرح سے ضرورت سے زائد روپیہ اپنے پاس لے آئے۔ خواہ باپ کا دیا ہوا اور اثت میں کیوں نہ آ گیا ہو۔ اور اس کے بعد خود کوئی چیز ایسی پیدا کرنے والی دنیا میں نہ کرے اور جو دوسرے محنت کرتے ہیں ان کی محنت میں سے حصہ لیتا چلا جائے اس چیز کے بدلے میں جو جنسِ کاسد کچھ نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ اس نظام نے دنیا میں انسانوں کو دوسرے انسانوں کا شکاری بنا دیا ہوا ہے۔ پورا ایک گروہ درندوں کا گروہ' خون پینے والوں کا گروہ' پیدا ہو گیا ہوا ہے۔

دنیا بھر میں صدیوں سے اختیار کردہ معاشی نظام کی نوعیت اور قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی وضاحت

عزیزانِ من! یہ تھا نظامِ معاشی جو چلا آ رہا تھا اور جس نے اس دنیا کو جہنم بنا دیا تھا

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

امتے بر امتے دیگر چرد

دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

ایک قوم دوسری قوم کی کھیتی کو چر رہی ہے۔ بوتا بے چارہ یہ ہے' فصل وہ گھر میں لے جاتا ہے۔ یہ ہے وہ نظام جسے نظامِ ربوٰ کہتے ہیں۔ یہ بات صرف قرضہ دے کے پانچ روپے لینے کی نہیں ہے ایک مستقل نظام ہے جس میں یہ ہے کہ دانہ ایں می کارد آں حاصل برد۔ محنت یہ کرتا ہے اس کا ماحصل وہ لے جاتا ہے۔ کس چیز کے بدلے میں لے جاتا ہے؟ چند سکے بے کار کسی طرح سے ضرورت سے زائد اس نے اپنے پاس رکھ لیے۔ دوسرے کی ضرورت رکی ہوئی ہے' اسے یہ دے دیا اس نے بے کار شے اور اس کی محنت کا

ماحصل لیے چلا آرہا ہے۔

یہ ایک نظام تھا یہ نظام وہ تھا کہ جس کو مٹانے کے لیے اسلام آیا اور اس نے نظام جو قائم کیا اپنا' اس کی بنیاد اس پہ رکھی کہ **یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ ط** (2:219) یہ پوچھتے یہ ہیں کہ ہم اپنے پاس کتنا ایک رکھ لیں اور کتنا ایک دوسروں کی ضرورت کے لیے دے دیں؟ قرآن نے جو نظام دیا تھا اس نظام میں اس نے ایک بنیاد قائم کر دی تھی اور دیکھیے کہ اس ایک بنیاد سے یہ سارا نظام جو چلا آرہا تھا اس کی شاخ تراشی نہیں کی' جڑ کاٹ دی۔ کہا کہ پوچھتے یہ ہیں کہ **یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ ط** (2:219) یہ پوچھتے یہ ہیں کہ جتنا کچھ ہم کماتے ہیں اس میں سے کتنا اپنے لیے رکھیں اور کتنا دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے دے دیں؟ کہا **قُلِ الۡعَفۡوَ ط** (2;219) تمہاری ضروریات سے زائد جتنا ہے سب کا سب۔ عزیزانِ من! نہ رہے بانس نہ بجے بانسری جب فاضلہ روپیہ ہی آپ کے پاس نہیں رہا SURPLUS MONEY نہیں رہی تو اس کے بعد یہ اگلا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ کسی کو اپنا SURPLUS سرمایہ دے کر اس کی محنت کے ماحصل کو لے آئیں SURPLUS سرمایہ ہی قرآن نے نہیں چھوڑا۔ یہ ہے لم اس نظام کی' بنیاد اس نظام کی جو قرآن نے قائم کیا ہے۔ SURPLUS سرمایہ ہی نہیں۔ اور یہ جو چیز ربوٰ کی ہوئی اس کے لیے پہلے آپ کے پاس SURPLUS ہونا چاہیئے' فاضلہ سرمایہ ہونا چاہیے جو دوسروں کو دیں' فاضلہ آپ کے پاس ہونا چاہیے۔ یہ جو فاضلہ آپ کے پاس ہوا ہے یہ کہاں سے آیا؟ اپنی ضرورت سے کسی کے پاس کم ہوا ہے' ان کے ہاں جو کمی واقع ہوئی ہے وہ آپ کے ہاں آ کر اضافہ ہوا ہے۔ تو ایسا نظام جس میں کہ دوسروں کی ضروریات بھی پوری نہ ہوں ان میں کمی ہو جائے اور وہ جوان کا کم رہ جائے وہ کسی ایک جگہ آ کے زائد ہو جائے اور پھر جس کے پاس یہ زائد ہے یہ ان کو دے جن کی کمی سے اس نے اپنے ہاں یہ زائد رکھا تھا ان ہی کا اور ان سے کہے کہ تم جو محنت کرتے ہو اس میں سے مجھے دو آدھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ نظام' قرآن نے بنیادی طور پہ اس نظام کی جڑ کاٹ دی۔

ربوٰا کا نظام وہ معاشی نظام ہے جس کو قرآنِ حکیم نے اعلانِ جنگ سے تعبیر کیا ہے

عزیزانِ من! یہ سوال پھر دہرادوں کسی کو کچھ روپے قرض دے کے دو چار روپے لینے کا نہیں' پورا نظام ہے ایک جس کے خلاف یہ چیز قرآن نے کہی ہے' اسے نظامِ ربوٰا کہا ہے۔ محض روپیہ دے کے اس روپے سے زائد روپیہ لے لینا' خالی روپے کے اوپر کچھ معاوضہ لیتے چلے جانا۔ قرآن کے نزدیک معاوضہ محنت کا تھا **لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی** (54:39) انسان صرف اس کا حق دار ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے۔ محنت کوئی کرے اور یہ صرف سرمایے کے اوپر اس کی محنت میں سے کچھ لے لے' یہ ہے

ربٰو اور وہ ہے قرآن کا نظام۔ اور اب دیکھیے کہ اس نے اپنے معاشی نظام کو اہمیت اتنی دی ہے کہ جو لوگ اس نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرتے ہیں ان کے متعلق یہ کہہ دیا WARN پہلے تو یہ کیا کہ جو کچھ بھی پہلے کرتے آئے ہو اس کے بعد جو باقی ہے وہ چھوڑنا پڑے گا۔ یہاں بھی ایک بڑی عجیب چیز ہے قرآنِ کریم نے اور چیزوں سے بھی منع کیا ہے مثلاً یہ چیزیں جو ہیں یہ شراب پیتے تھے، یہ چیزیں جو حرام قرار دیں، وہ ان کا استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ وہ لوگ نکاح کر لیتے تھے لونڈیوں وغیرہ سے اس سے پہلے۔ قرآن نے جب ان چیزوں کو منع کیا ہے تو وہاں یہ کہا ہے کہ مَا قَدْ سَلَفَ ط (4:23) جو ہے جو پہلے کر چکے ہیں، یہ وہ قابلِ معافی ہے اس پہ مواخذہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی کہ جس کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ جس وقت یہ حکم دیا ہے اس سے پہلے بھی جو تم دے چکے ہو کسی کو اس طرح قرضہ اور ان کے ذمے تمہارا یہ سود چڑھ گیا ہے، کہا ہے یہ باقی جو رہ گیا ہے، اسے چھوڑو۔ حالانکہ قانون کا اطلاق اس دن سے ہوا کرتا ہے جس دن وہ قانون نافذ ہوتا ہے۔ یہ قانون ایسا نافذ کیا ہے کہ کہا جو اس سے پہلے کا بھی باقی کسی کے ذمے ہے، اسے بھی چھوڑنا پڑے گا تمہیں۔ اور اگر یہ نہیں کرتے تم تو خبردار ہو جاؤ، اعلانِ جنگ ہے تمہارے خلاف۔ اعلانِ جنگ ہے اس نظام کے خلاف جو اسلامی نظام کے علی الرغم قائم کیا گیا۔ عزیزانِ من! متعدد مقامات پہ اس تصور کو قرآن نے باطل کہا۔ کہا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ جو کچھ زیادہ آتا ہے، اس سے دولت بڑھتی ہے۔ قرآن کی ان چیزوں پہ جب غور کیا جاتا ہے تو واقعی روح وجد میں آجاتی ہے۔

ربٰوا کی بنیاد پر حاصل کردہ دولت انسانی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے

چودہ سو سال پیشتر اس CAPITALISTIC SYSTEM نے نظامِ سرمایہ داری نے یہ شکل نہیں اختیار کی تھی جو آج کی ہوئی ہے یہ تو AGE OF ECONOMICS ہے ہمارے ہاں کا عصرِ معاشیات اس کو کہتے ہیں۔ وہاں ابھی بڑا SIMPLE تھا یہ۔ لیکن قرآن نے اس زمانے میں یہ کہا کہ یہ ٹھیک ہے ایک شخص جو روپیہ دوسرے کو دے کے اس میں سے زائد لیتا ہے، اس کی دولت میں واقعی اضافہ ہوتا ہے۔ سو روپیہ دیا تھا، ڈیڑھ سو لیا، اضافہ ہوا، ہر شخص کہے گا اضافہ ہوا۔ قرآن نے اس دور میں یہ کہا کہ افراد کے لیے تو یہ اضافہ ہوتا ہے یاد رکھو! قومی دولت میں اس سے اضافہ نہیں ہوتا، اس میں کمی آجاتی ہے کیوں کہ محنت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ قوم جو ہے اس کا ایک طبقہ۔ یہ بڑھتا نہیں ہے یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ط (2:276) جسے تم کہتے ہو کہ اس سے دولت کی افزائش ہوتی ہے قوم میں افزائش نہیں ہوتی، اس سے قوم کی دولت مٹتی چلی جاتی ہے۔ بڑھتی ہے قوم کی دولت ان چیزوں سے کہ جو محنت کرنے کے بعد ان لوگوں کو دے دیا جائے جو محنت کرنے کے اہل نہیں رہے ہوئے ہیں یا

جن کے پاس ذرائع نہیں رہے ہیں محنت کرنے کے' سامان نہیں رہا ہے' آلات نہیں رہے ہیں' ان کو دیتے چلے جایئے۔ ساری قوم بجز ان کے کہ جو محنت کرنے سے متعرض ہیں کسی حادثے کی وجہ سے' کسی اور وجہ سے بے چارے INCAPACITATED ہو گئے ہیں' محنت کر نہیں سکتے' معذور ہو گئے ہیں' ان کو چھوڑ کے ساری قوم جو ہے وہ محنت کرنے والی قوم ہو گی۔ محنت کے معنی ہیں کچھ پیدا کرنا۔ جو قوم یہ کچھ کرے گی اس قوم کی دولت میں اضافہ ہوگا۔ اور اگر قوم کا بیشتر حصہ ایسا ہو جائے کہ وہ محض روپیہ دوسرے کو دے کے اس کی محنت میں سے آپ خود لیں اور خود کچھ پیدا نہ کریں کہا کہ اس سے یاد رکھو! قوم کی دولت جو ہے اس کے اندر کمی واقع ہوتی ہے' اس سے زیادتی نہیں ہوتی۔ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ (2:276)۔ اس سے بھی زیادہ دوسری جگہ اس کو اور واضح طور پہ کہا فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ؕ (30:38) دیے جانے کی بات ہے' جتنے جتنے محتاج ہیں' تمہارے ہاں ضرورت مند جتنے بھی ہیں' ان کی ضرورتیں پوری کرو۔ آگے یہ ہے وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ (30:39) یہ جو روپیہ تم INVEST کر دیتے ہو کہیں' وہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ خیر مجھے اتنا کیپٹل مل گیا ہے اس سے میں نے اتنا اپنا کاروبار بڑھا لیا' تم نے یہ سمجھ لیا کہ میں نے اتنی INVESTMENT کی ہے اس سے اتنا مجھے اور مل گیا۔ وہ کہتے ہیں بظاہر تم خوش ہوتے ہو کہ اس سے تو دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے اگر تم OVERALL کسی طرح سے اپنی نگاہ کو دوڑاؤ اور اس کو تم دیکھو تو قوم کی دولت میں اضافہ اس سے نہیں ہوتا۔ قوم میں ایک عنصر پیدا ہو جاتا ہے کہ جو کچھ پیدا نہیں کرتا' محنت نہیں کرتا۔ اتنے حصے تک دولت قوم کی کم ہو جاتی ہے۔ وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (30:39) دولت اس قوم کی بڑھتی ہے جو سامانِ نشو و نما کو اس طرح سے عام کرتی چلی جائے کہ اس میں ہر فرد محنت کے قابل ہو جائے۔

سامانِ نشو و نما کو عام کرتے ہوئے انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے بغیر وسائل میں اضافہ ممکن ہی نہیں ہوتا

عزیزانِ من! کیا نظام دے رہا ہے قرآن؟ آج کے ECONOMIST جو ہیں وہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ یہ جو نظام ہے کہ جس میں ایک طبقہ محنت کرنے کا اہل نہیں رہتا پھر محض دوسروں کی محنت کے اوپر پلتا ہے' پرورش پاتا ہے' عیش اڑاتا ہے' اس سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ قومیں آگے وہی بڑھتی ہیں کہ جس میں ہر فرد فردِ کاسب ہو۔ اور یہ چیز تھی جو نبی اکرم ﷺ نے فرمائی کہ

اَلْكَاسِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ خدا کا حبیب' خدا کا پیارا وہ ہے کہ جو محنت کر کے کماتا ہے۔ وہ پوری انسانیت کو اس قابل بنانا چاہتا ہے کہ ہر فرد اضافہ کرے اس کائنات کے حسن میں' قوم کی دولت میں' پیدا کرے کچھ۔ یہ ہے نظام جو قرآن نے دیا ہے۔ اس کے خلاف تھا جیسا میں نے عرض کیا وہ نظام کہ جس میں محض اس جنسِ کا سدّ یہ سکے جو ہیں' یہ سکہ شئے کیا ہے جیسا میں نے عرض کیا۔ اسی لیے قرآن نے کہا کہ جو لوگ سکوں کو جمع کر کے رکھتے ہیں کہ اس سے دوسروں کی محنت جو ہے اس کو خرید لیں فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (9:34) ان کو کہو کہ ان کا انجام دردناک سزا کی شکل میں قوم کو ملے گا۔ یہ سکے جہنم کی آگ میں تپائے جائیں گے اور ان سے داغا جائے گا ان کو اور کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے کہ جو تم نے اپنے لیے مخصوص کر کے رکھ لی تھی' نوعِ انسانی کی منفعت بخشیوں کے لیے عام نہیں کی ہوئی تھی (9:35)۔ یہ ہے وہ باطل نظام جس کے خلاف قرآن نے اپنا یہ نظام دیا تھا۔ اب اس نے کہا ہے کہ اگر تم مسلمان کہلانے کے باوجود نظامِ معاشی اپنا یہ رکھتے ہو تو پھر خدا اور رسول کی طرف اعلانِ جنگ ہے تمہارے خلاف۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے برعکس ربٰوا پر مبنی نظام کے خدوخال

اب یہ جو آیت ہمارے سامنے آئی اس ضمن میں بھی پہلے تھوڑا سا تمہیداً عرض کر دوں۔ یہ تو تھا نظام جو قرآن نے دیا۔ آہستہ آہستہ جب ہم قرآن کی پٹڑی سے ہٹے اور دوسری پٹڑی پہ گاڑی پڑی تو جس طرح سے باقی چیزوں کے اندر ہم نے تاویلات کیں اور تفسیریں کیں' اس ضمن میں بھی ہم آ گئے پھر اسی کے اوپر۔ آہستہ آہستہ ہم یہاں پہنچ گئے کہ اگر ایک کاشتکار وہ آپ کے پاس آتا ہے اور وہ یہ آپ سے کہتا ہے کہ صاحب! میری کچھ مدد کیجیے۔ ایک زمین کا ٹکڑا ہے وہ میں لے لوں اس میں میں محنت کروں گا' میرے اور میرے بیوی بچوں کا پیٹ پل جائے گا۔ تو اس میں اگر آپ اس کو دیتے ہیں ہزار روپیہ اور کہتے ہیں کہ صاحب جب واپس کرو گے تو گیارہ سو دینا تو کہا یہ سود ہے' حرام ہے۔ آپ اس سے کہتے ہیں کہ نہیں بھائی! میں تو نہیں حرام کھا سکتا۔ پھر کیا ہو؟ کہا کہ میں تمہیں ہزار روپے کا وہ کھیت خرید کے دے دیتا ہوں' کھیت میں خریدتا ہوں' تمہیں دے دیتا ہوں۔ اس نے کہا اللہ تمہارا بھلا کرے مجھے تو کھیت ہی لینا ہے۔ کہا بس اس میں یہ ہے کہ اس کھیت میں جتنا گیہوں ہوگا آدھا تمہارا آدھا میرا۔ یعنی وہ ہزار کے اوپر سو روپیہ جو تھا حرامِ مطلق اور پانچ سو روپے کا گیہوں جو ہے وہ شیرِ مادر اور پھر وہ چلتا ہے سلسلہ۔ یعنی وہ تو کھیت اس کا ہے' محنت اس پہ کیے چلے جا رہا ہے ہر سال۔ یہ سلسلہ ابدالآباد تک چلا جا رہا ہے سلسلہ۔ صاحب! یہ کیسے جائز ہے؟ کہا جی یہ ربٰو نہیں مزارعت ہے۔ اچھا جی۔ آپ کو معلوم ہے مزارعت آپ کے ہاں شیرِ مادر کی طرح حلال وطیب ہے۔ یہ تو تھا زمیندار۔ ایک دوکاندار آ گیا آپ کے پاس اس نے کہا کہ صاحب! آپ کے پاس کچھ فاضلہ پیسے ہیں' اگر کچھ اتنے سے مل جائیں تو میں اپنا کچھ

کاروبار بڑھالوں، بچوں کا پیٹ پال لوں اور اس میں سے آپ کو پانچ روپے سینکڑہ دوں گا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ، آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ مجھے حرام کھلا رہے ہیں آپ، سود بالکل حرام ہے، بنیا لیتا تھا سود یا ہمارے ہاں وہ کہتے ہیں وہ پٹھان لیتے ہیں وہ جو آیا کرتے ہیں، یہودی لیتے تھے سود۔ تم نے کیا سمجھا ہے مجھ کو؟ کہ جی معاف رکھیے گا۔ یہ لو ہزار روپیہ لو جاؤ تجارت کرو جتنا نفع آئے اس میں سے آدھا تمہارا اور آدھا میرا۔ یہ سودی کاروبار نہیں۔

مضاربت مزارعت کا سارا نظام ربٰوا پر مبنی ہے

مولانا صاحب سے پوچھا کہ صاحب! یہ کیا ہے؟ کہنے لگے مضاربت ہے۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (2:9) دھوکہ دینا چاہتے ہو خدا کو اور خدا کی اس جماعت کو۔ وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَھُمْ (2:9) اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہو، اسے کیا دھوکہ دو گے۔ نام رکھنے سے حقیقتِ اشیا بدل جائے گی؟ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ (53:23) قرآن کہتا ہے نام ہیں جو رکھ لیے، کچھ تمہارے بڑوں نے رکھ لیے کچھ تم نے رکھ دیے اور سمجھ لیا کہ حقائقِ اشیا بدل گئی۔ نام بدل دینے سے چیز کی حقیقت بدل جاتی ہے؟ کیا یہ ربوٰ نہیں ہے جس کو آپ نے مزارعت اور مضاربت یہ کچھ کہہ دیا ہے آپ نے؟ کیا ایسا کرنے والوں کے خلاف خدا اور رسول کا اعلانِ جنگ نہیں ہے؟ لیکن پرواہ کیا ہے اس قوم کو۔ یہ سارا کاروبار ہو رہا ہے۔ ہمارے دور میں پھر اور آگے باتیں چلیں کہ یہ ٹھیک ہے صاحب کہ یہ اس طرح سے یہ سود جو ہے حرام ہے۔ پھر اس کا ترجمہ وہی سود اس کا ترجمہ پھر وہی بیاج۔ یہ جو ہے وہ دست بدست قرضہ لینے کی بات ہے، یہ تو حرام ہے لیکن COMMERCIAL INTEREST جو ہے وہ جائز ہے۔ اب ایک اور اصطلاح وضع ہوئی صاحب یہاں۔ صاحب یہ کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ تو INVESTMENT ہوتی ہے یہ بڑی بڑی انڈسٹری ساری چلتی اسی طرح سے ہیں۔ کیوں کہ یہ اسی طرح سے چلتی ہیں ٹھیک ہے تم بھی چلو اسی طرح سے۔ مدت سے ہی بحثیں ہو رہی ہیں کہ وہ جو ہے نا روپے سینکڑے والا وہ تو حرام قرار دیا جائے، کمرشل انٹرسٹ جو ہے نا، یہ نہ حرام کیا جائے۔

بچوں کے نصاب میں سود مرکب اور سود سادہ کی بحثیں اور پھر کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کا معاملہ

پھر اس میں ایک اور چیز آئی وہ آپ نے بھی پڑھا ہو گا وہ پانچویں چھٹی جماعت تک وہ سود کے سوال آیا کرتے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے ہاں ابھی تک یہ نصاب میں ہیں۔ مسلمان بچوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ اتنا روپیہ حاصل ہو، اتنا سود ہو، سال کے بعد بتاؤ کتنا ہوا؟ یہ تعلیم دی جاتی ہے آپ کو۔ اس میں ایک آتا تھا سود سادہ، سو روپیہ دیا سال کے بعد پانچ روپے الگ

دوسرے سال پھر سو ہی کے اوپر سود پھر وہ سودا لگ ہوتا تھا یہ سود سادہ ہوتا تھا۔ ایک ہوتا تھا سودِ مرکب' سال کے بعد ایک سو پانچ اگلے سال ایک سو پانچ پہ سود لگے گا۔ بحث ہمارے ہاں یہ چلی کہ صاحب! سودِ مرکب جو ہے وہ تو حرام ہے' سادہ سود حرام نہیں ہے۔ یعنی اگر صرف خالص خنزیر کا گوشت ہو تو وہ تو جائز ہے' ہڈی والا جو ہے وہ حرام ہے اصل میں۔ بات میں سے بات یاد آ جاتی ہے کیا کیا تماشے ہمارے ہاں ہو رہے ہیں؟ ہمارے ہاں جو اسلامی نظام قائم کرنے کے مدعی ہیں نا انہوں نے یہ فتویٰ دیا کہ یہ INDUSTRIES یا یہ کارخانے جو ہیں ان کو NATIONALIZE کرنا قومی ملکیت میں لے لینا یہ از روئے شریعت یہ حرام ہے' جائز نہیں ہے۔ اب جو زمانے کا تقاضا بڑھنا شروع ہوا' آ گئے قریب انتخابات' ایک جماعت وہ اٹھی جنہوں نے یہ کہا کہ یہ ساری INDUSTRIES جتنی بھی ہیں ہم نیشنلائز کریں گے' قوم کی ملکیت میں رہنے دیں گے' اکیلے اکیلے ان افراد کی ملکیت میں نہیں ہوگی۔ بات یہ بڑی دل کو چھپنے والی تھی' اس سے نظر آتا تھا کہ ووٹ دوسری طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے' یہ جو حرام کہنے والے تھے' انہوں نے بھی اپنے منشور میں یہ داخل کیا کہ کلیدی INDUSTRIES جو ہیں ان کو قوم کی تحویل میں دیا جا سکے گا' ساری کی ساری انڈسٹری نہیں۔ یعنی سیر بھر خنزیر کا گوشت تو حرام ہے' پاؤ بھر کھا لیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ کیا تماشا ہو رہا ہے اس قوم کے ساتھ۔ اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (2:15) دیکھو کہ خدا کے قوانین ان کا کیسے مذاق اڑاتے ہیں اور جن اندھیروں اور تاریکیوں کے اندر یہ بہے جا رہے تھے' اور زیادہ بہے چلے جا رہے ہیں اس کے اوپر۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ انہوں نے کہا کہ صاحب! سادہ سود جو ہے وہ جائز ہے' سودِ مرکب جو ہے وہ ناجائز ہے۔ صاحب! کیسے آپ نے کہا؟ یہ ہے جی وہ آیت جہاں سے آج کا درس شروع ہوتا تھا۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (3:130) کہا دیکھیے صاحب (اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (3:130) کا ترجمہ کیا دوگنا چوگنا) یہ سود نہ کھاؤ۔ کہا جب ممانعت تو اس کی ہے نا وہ جو سادہ ہے اس کی تو ممانعت نہیں ہے۔ یعنی پہلے تو میں نے عرض کیا نا کہ مزارعت کی ممانعت نہیں ہے وہ اڑ گئی' مضاربت کی ممانعت نہیں ہے وہ اڑ گئی' کمرشل سود جو ہے وہ ٹھیک ہو گیا اب اس کے بعد یہ کہ سودِ مرکب جو ہے صرف وہ حرام ہے۔ قرآن کی آیتوں سے وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ز (2:231) قرآن نے کہا تھا خدا کی آیات کے ساتھ تو مذاق نہ کیا کرو۔ عزیزانِ من! یہ مذاق نہیں تھا تو اور کیا ہے۔

لفظ اَضْعَافًا اور مُضٰعَفَةً کا لغوی مفہوم

سنیے یہ کیا بات ہے جو قرآن کہہ گیا ہے؟ وہی جو میں نے عرض کیا تھا دو تین مرتبہ مختلف مقامات پہ کہا ہے کہ تمہارے ذہن میں

یہ ہے کہ اس سے دولت بڑھتی ہے' یہ بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ درحقیقت اس سے کمزوری واقع ہوتی ہے' کم ہوتی ہے۔ کیا بات ہے قرآنِ کریم کی؟ اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً (3:130) عربی جاننے والے جانتے ہوں گے یہ جو ہے 'ض ع ف' کا مادہ عربی قاعدے کی رو سے ضِعف ض کے زیر ساتھ جو ہے جس کی جمع اضعاف ہے اس کے معنی ہوتے ہیں دوگنا اور یہی ضِعف ہے' اگر ض کی زبر کے ساتھ ضَعف آ جائے اس کا مادہ جس سے مُّضٰعَفَةً (3:130) ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کمزور تر ہوتے چلے جانا۔ یہ ضعیف ہونا آپ جانتے ہیں نا ضعف تو آپ کو پتہ ہے نا کمزوری کو کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا یہ ہے کہ اپنے ہاں کہیں لَا تَاۡكُلُوا الرِّبٰٓوا (3:130) ربوٰ کا نظام نہ قائم کر لینا' اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اَضۡعَافًا (3:130) نظر ایسا آتا ہے کہ جیسے دولت دوگنی چوگنی ہو رہی ہے لیکن درحقیقت مُّضٰعَفَةً (3:130) دولت میں کمزوری واقع ہوتی چلی جاتی ہے اس سے۔ عزیزانِ من! پتہ نہیں یہ تو کتاب کیا ہے۔ ابھی میں نے وہ (30:38) میں کہا تھا نا کہ یہ سمجھتے یہ ہیں کہ اس سے دولت بڑھتی ہے لیکن درحقیقت دولت گھٹتی ہے۔ ابھی ابھی میں نے کہا تھا نا قرآن نے یہ کہا ہے یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ (2:275) یہ چیزیں ہیں جو بڑھتی ہیں' وہی یہاں کہا گیا ہے کہ بظاہر تمہیں یہ نظر آتا ہے کہ دوگنی چوگنی ہو رہی ہے لیکن درحقیقت مُّضٰعَفَةً (3:130) اس میں ضعف واقع ہوتا ہے قوم کے اندر' کمزوری پیدا ہوتی ہے قوم کے اندر۔ مصیبت آ جاتی ہے ان لوگوں پہ جب نظام اسلامی کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے محنت چھوڑ کر محض سرمایے کے زور کے اوپر اپنی زندگی کی تن آسانیاں قائم کی تھیں' ان کو موت نظر آتی ہے۔ اس میں اتنی کمزوری واقع ہو جاتی ہے ان کے اندر' ایک وقت کی روٹی کما کے کھانے کے قابل نہیں ہوتے وہ لوگ۔ کہا یہ چیز ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (3:130) خدا کے قوانین کی حفاظت اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری قوم کی کھیتیاں بھرپور نتائج پیدا کریں اور فصل دیں تو اس کے لیے یہ چیز ہے کہ یہ نظام نہیں' خدا کا دیا ہوا جو نظام ہے اس نظام کو قائم کرو۔

لفظ فساد کا لغوی مفہوم اور اس کی نوعیت

عزیزانِ من! اعلانِ جنگ تو ہم نے دیکھ لیا تھا نا۔ اور آگے ہے وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ ۚ(3:131) اس آگ سے ڈرو کہ جسے کافروں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ وہی آگ ہے کونسی آگ ہے یہ؟ جس کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کہا الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ (104:2) وہ نظام جس کے اندر مال کو جمع کرتے رہتے ہیں پھر وہ بینک بیلنس دیکھتے رہتے ہیں۔ کہا ان کی کیفیت یہ ہو گی کہ نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ۙ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَةِ (104:6-7) ایک آگ بھڑک اٹھے گی معاشرے میں جو دلوں کو لپیٹ لے گی۔ وہ آگ جو دلوں کو لپیٹ لیتی ہے' وہ جو میں نے ابھی سورۃ توبہ کی آیت (9:35) کہا تھا کہ یہ کہا کہ یہ سکے

تپائے جائیں گے‘ اس آگ کے اندر ان سے تمہیں داغا جائے گا۔ جب اس معاشرے کے اندر ایک STRETCHING POINT ہوتا ہے‘ جہاں جا کے کوئی چیز جو آپ کھینچتے چلے جاتے ہیں‘ اس سے زیادہ آگے نہیں کھنچ سکتی‘ پھر ٹوٹ جاتی ہے وہ چیز۔ عزیزانِ من! جن کی ضروریات رکی ہوئی ہوتی ہیں ایک حد تک تو ان کے اندر برداشت ہوتی ہے جہاں آ کر END ہوتا ہے‘ وہاں پھر یہ چیز ٹوٹتی ہے‘ اس کا نام فساد ہوتا ہے‘ معاشرے میں برپا ہوتا ہے۔ جب فساد برپا ہوتا ہے تو سب سے پہلے یہی جو سکے والے ہیں‘ ان کے اوپر تباہی آتی ہے دنیا میں۔ یہ ہے وہ جہنم کی آگ جس سے قرآن ڈرا رہا ہے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (3:131) ڈرو اس آگ سے کہ جو کفر کی بھڑکائی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی صحیح نظامِ زندگی سے انکار اور سرکشی برتنے والے‘ اس کے علی الرغم دوسرا نظام لانے والے جو ہیں‘ ان کی بھڑکائی ہوئی جو آگ ہوتی ہے‘ اس آگ سے خوف کھاؤ وہ معاشرے میں کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا کرتی۔ اس سے بچنے کے لیے وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (3:132) اطاعت کرو اس اسلامی نظام کی جو خدا نے دیا اور جسے اس کے رسول کے مقدس ہاتھوں نے متشکل کر کے دکھا دیا تاکہ تمہیں سامانِ نشوونما نہایت آسانی سے ملتا چلا جائے۔ آپ کو پتہ ہے کہ رحم کے یہ معنی ہوا کرتے ہیں۔ اس سے ہوگا کیا؟ آہاہاہا!

قرآنی نظامِ حیات کا ماحصل ارض وسما میں پھیلی ہوئی جنت کا ظہور ہے

عزیزانِ من! کیا آیت آئی ہے سامنے؟ کیا نتیجہ بتایا ہے خدا نے؟ اس نظام کو مٹا کے اس کی جگہ وہ نظام قائم کرنا کہ جس میں ہر محنت کرنے والے کی محنت اس کی ضروریات کے لیے‘ تمام انسانوں کی ضروریات کے لیے کھلی رہیں وَ سَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (3:133) چھوڑو اسے‘ دوڑ کے جاؤ تم‘ بھاگ کے جاؤ تم‘ خدا کی حفاظت کے سایے تلے آ جاؤ پہلے تو۔ یہ جو غلط نظامِ زندگی کے تباہ کن نتائج تھے‘ پہلے تو اس سے بچو مَغْفِرَةٍ (3:133)۔ لیکن صرف حفاظت اور بچ جانا ہی تو کوئی کامیابی نہیں ہے۔ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ (3:133) آؤ بھاگ کر اس جنت کی طرف کہ جو زمین اور آسمان کی وسعتوں پہ پھیلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آسمانوں کی جنتیں ہو سکتا ہے کہ اسی ارض پہ بیٹھے ہوئے بھی‘ ان میں سے کچھ آسمان جو ہیں‘ ان کے انکشافات سے یہ حقیقتیں سامنے آ جائیں۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

بڑھ رہا ہے انسان کا علم اور آگے جا رہا ہے۔ لیکن بہرحال اگر اس سے مراد مرنے کے بعد کی جنت بھی ہے جس پہ ہمارا ایمان ہے تو وہ تو وہاں ہوگی۔ الارض بھی تو یہاں کہا ہے اس جنت کی طرف بڑھو کہ جو ارض کے اوپر پھیلی ہوئی ہے اس زمین کے اوپر جو جنت ہے۔

جس کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا(39:69) یہ ارض تمہارے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ یہ کب ہوگا؟ کہا یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ(83:6) جس دن پوری انسانیت ربوبیتِ عالمینی کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ آ دوڑ کر سَارِعُوۡۤا (3:133)۔ قدم قدم آنے کے لیے نہیں کہا انقلاب بڑی تیزی سے لایا جاتا ہے یہاں سَارِعُوۡۤا کہا ہے قرآن نے اس نظام کو مٹا کر' نہایت تیزی سے آ و اس نظام کی طرف۔ کہ غلط نظام کے تباہ کن نتائج سے تمہاری حفاظت کا سامان بہم پہنچائے گا اور ایک جنت یہاں قائم کردے گا' پھیلی ہوئی ہوگی اس ارض کے اوپر۔ وہاں کہا تھا جہنم اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ(3:131) یہاں کہا ہے یہ جنت اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ (3:133) جو متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔

لفظ متقی کا مروجہ ترجمہ قرآنی مفہوم کی بجائے رہبانیت کا تصور پیش کرتا ہے

کون ہیں یہ متقی؟ آپ کے ذہنوں میں تو جب آج کل ہم کہتے ہیں بڑا متقی پرہیزگار ہے تو وہ تو آپ کو پتہ ہے نا کہ ہمارے ذہن میں کس قسم کا نقشہ آتا ہے یعنی اگلا لفظ جو ہے پرہیزگار' اسی سے پتہ چل جاتا ہے۔ یہ تصور جو ہے نا ہر چیز سے پرہیز کرتے چلے جانا' بچتے چلے جانا' ساری دنیا سے پرہیز کرتے چلے جانا' یہ تصور تھا نا آپ کے ہاں رہبانیت کا دیا ہوا ہر چیز سے اجتناب کرنا' دنیا کو قابلِ نفرت سمجھنا' ہمارے ہاں بعد میں یہ تصور آ گیا۔ دیکھیے قرآن یہ تقویٰ کہاں کہتا ہے؟ کیا ہے؟ الۡمُتَّقِیۡنَ الَّذِیۡنَ (3:133-134) یعنی وہ لوگ (اب یہاں تو بات صاف ہو جائے گی خود کہ یہ کون لوگ ہیں) الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ (3:134) کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ کشاد کے اندر تو بہر حال ٹھیک ہے دوسروں کے لیے زائد از ضرورت دیتے چلے جانا یہ تو ہوا وَ الضَّرَّآءِ (3:134) کیفیت یہ ہے کہ خود تنگی میں بھی رہتے ہیں تو پھر بھی دوسروں کی مدد کر دیتے ہیں۔ یہ جو قرآن نے کہا وَلَوۡ كَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ(59:9) دوسری جگہ سورۃ حشر میں ہے کہ خود اگر دیکھیں کہ دوسرے کی ضرورت میری ضرورت سے زیادہ ہے' زیادہ شدید ہے اس کی ضرورت وَیُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ كَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ (59:9) تو اپنی ضرورت پہ دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دے دیتے ہیں' خود تنگی میں گذارا کر لیتے ہیں۔ یہاں وہی کہا فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ (3:134) کشاد کی حالت' ہو تنگی کی حالت ہو وہ دیکھتے یہ ہیں کہ ضرورت کس کی زائد ہے۔ عزیزانِ من! متقی کی یہ DEFINITION دی ہے قرآن نے۔ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ (3:134)۔ اور بھی اب خصوصیات آگے چلی آرہی ہیں۔ اس معاشرہ کے افراد کی خصوصیات وَ الۡكٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ (3:134) کیا بات ہے صاحب؟ یہاں تو ضرورت سے زائد جو دولت ہے اسے دوسروں کے لیے کھلا رکھنا اس کے متعلق کہا' انفاق جسے کہا جا رہا ہے لیکن زائد از ضرورت صرف دولت

ہی نہیں ہوتی۔

نفسیات کی دنیا میں غصے کی قوت کو استعمال کرنے کا طریق اور قرآنِ حکیم

عزیزانِ من! قرآن ہے یہ اس MATERIAL چیز سے' دولت تو ایک مادی شے ہے لہٰذا اس سے فوراً وہ انسان کے اخلاقیات کی طرف آیا۔ وَ الْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ (3:134) ہمارے ہاں ترجمہ اس کا کیا جاتا ہے غصے کو دبانے والے۔ بڑا غلط ہے تصور یہ۔ غصہ ہوتا ہے انسان کے اندر زائد قوت' زائد حرارت۔ اعتدال کے اوپر تو حرارت نہایت ضروری ہے انسان کی زندگی کو قائم کرنے کے لیے۔ کسی وقت اشتعال میں آ کر تو اس سے زیادہ بھڑک اٹھتی ہے غصے کی آگ تو ہمارے ہاں بھی محاورہ ہے' نا آتشِ انتقام جسے ہم کہتے ہیں' یہ ایک آگ کی شکل ہوتی ہے انسان کے اندر اعتدال سے بڑھ کے ایک چیز اوپر ابھرتی ہے یہ بھی اب زائد از ضرورت ہوگئی ہے۔ اس کا ترجمہ جو کیا گیا ہے 'غصہ کو دبانے والے' جنہیں نفسیات کا کچھ علم ہے سائیکولوجی کا' انہیں معلوم ہے کہ انسانی جذبات' انہیں اگر دبایا جائے تو اس سے نفسیاتی عوارض' بیماریاں پیدا ہوتی ہیں' امراض پیدا ہوتے ہیں INHIBITIONS جسے کہتے ہیں COMPLEXES جسے کہتے ہیں آپ' یہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ اپنے نکلنے کے لیے غلط راستے تلاش کرتے ہیں۔ یاد رکھیے انسانی جذبات مر نہیں سکتے۔ یہ جو آپ کے ہاں تصوف کا ایک تصور آیا ہوا ہے نا رہبانیت کا' خانقاہیت کا' نفس کو مار رہے ہیں۔ نفس کے معنی ہوتا ہے جذبات۔ یہ چیز ایسی ہے ہی نہیں جس کو مار دیا جائے۔ فنائے نفس' ان کو فنا کر رہے ہیں۔ ان کو جتنا آپ دباتے چلے جائیں گے آپ دیکھیں گے کہ انسان کے اندر نفسیاتی عوارض پیدا ہو جاتے ہیں' بدنہادیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بڑی عجیب چیز وہ کہہ گیا ہے

پری رو تابِ مستوری نہ دارند

اس نے تو پری رو ہی کہا ہے کہ یہ لوگ جن کے اندر نمودِ حسن کا جذبہ ہوتا ہے ان کو اگر تم کہیں اگر بند کر کے رکھو تو یہ نہیں ہو سکتا

چو در بندی ز روزن سر برارند

دروازہ بند ہو تو وہ' روشن دان سے منہ نکال لیں گے صاحب۔

یہ روشن دان سے منہ نکالنے کے معنی ہوتے ہیں' غیر فطری طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ تو رک سکتے ہی نہیں ہیں۔ پانی کے چشمے کے اگر صحیح بہاؤ کا جو رخ ہو اس کا بند کر دیجیے تو پتہ نہیں کہاں کہاں کی درزوں سے پھر منہ نکالے گا۔ قرآن جو قلوب کی امراض کا علاج بتانے کے لیے آیا تھا' وہ کیا ایسا طریقہ بتائے گا اس قسم کے بڑھتے ہوئے جذبے کا بڑھتے ہوئے غصے کا' بڑھی ہوئی حرارت کا

کہ اس کو دبادو؟ تاکہ یہ اور راہیں تلاش کر کے نکالے۔عزیزانِ من! بڑی عجیب چیز ہے پہلے بھی آچکا ہے پھر دہرادوں کہ لفظ تو یہاں یہ پہلی دفعہ آیا ہے۔اس کے معنی غصے کو دبانے والا نہیں۔آج کی نفسیات میں ایک ان کے ہاں علاج کا طریقہ ہے جسے SUBLIMATION کہتے ہیں۔وہ کرتے یہ ہیں کہ کوئی قوت جو اعتدال سے بڑھ جائے کسی وقت اس قوت کا رخ دوسری طرف موڑ دیتے ہیں۔اس کے استعمال کے لیے ایک تعمیری سا گوشہ اس کے سامنے کر دیتے ہیں تاکہ وہ وہاں قوت جو ہے وہ نکلے اور تعمیری نتائج پیدا کرے۔بڑھی ہوئی قوت جو ہے وہ نکل بھی جائے اور نتائج تعمیری پیدا کرے۔مثلاً اگر کسی شخص کے اندر یہ غصہ زیادہ ہوتا ہے' کچھ شدت کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے' اسے آرمی میں بھیج دیتے ہیں۔وہی غصہ جو ہے دشمن کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔

غصے کی قوت کا رخ کسی بلند مقصد کی طرف موڑ دینے کا تعمیری انداز

یہ جو آپ کے ہاں روز چاقو اور گھونسے چلتے ہیں وہ اس لیے ہیں کہ یہ زائد از ضرورت حرارت جو پیدا ہوگئی ہوئی ہے' اس کے نکلنے کے لیے صحیح راہیں نہیں رہیں معاشرے کے اندر۔وہ جو دوسرے کے اوپر غلبہ پانا ہوتا ہے' وہ میچ جیتنے میں غلبہ پاتا ہے اور یہی غلبہ پانے والی قوم اعتدال کے اوپر ہوتی ہے اس کے بعد ان کی کیفیت۔یہاں جو میدان میں غلبے پاتے ہیں ان ہی کو قرآن پھر میدانِ جنگ میں بھیج دیتا ہے' وہ پھر دشمن کے اوپر غلبہ پاتے ہیں۔اس کو کہتے ہیں نفسیاتی طور پر SUBLIMATION یعنی وہ جو زائد از ضرورت قوت ہے' اس قوت کو بلند مقصد کے لیے اس کا رخ موڑ دینا کسی بلند مقصد کے لیے۔عربوں کے ہاں ایک طریقہ تھا۔پانی کی تو ان کے ہاں بڑی کمی ہوتی تھی۔کہیں کہیں ان کے ہاں پانی نیچے ہوتا تھا تو وہ کنواں کھودتے تھے' اس میں سے پانی نکل آتا تھا لیکن کیفیت یہ ہو جاتی تھی کہ گرمی کا مثلاً موسم آ گیا ہے وہ پانی کی سطح بڑی نیچے چلی جاتی ہے تو دشواری آ جاتی تھی۔تو وہ پاس پاس پانچ سات کنویں کھود لیتے تھے اب اس میں صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک کنویں کے اندر پانی زیادہ ہے دوسرے کنویں کے اندر پانی کم ہے تو وہ نیچے سے سرنگ لگا کے ان پانچ چار کنوؤں کے پانیوں کو ملا دیتے تھے ایک دوسرے کے ساتھ SUBTERRANEAN CHANNELS اندر اندر سرنگیں لگا کے تو ملا دیتے تھے ان کو۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی وقت ایک کنویں کے پانی کی سطح نیچے گئی ہے اور دوسرے میں پانی زیادہ ہے تو پانی تو اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔وہ زائد جو پانی ہوتا تھا سطح کے اوپر والا' وہ اس چینل کے ذریعے سے اس کنویں میں آ جاتا تھا اور یوں زائد از ضرورت یا سطح سے بالاتر کا پانی جو ہے اُس طرف

آ جاتا تھا رخ موڑ کر جہاں پانی کم ہے۔ یہ جو طریقہ تھا ان کے ہاں زائد از ضرورت پانی کو منتقل کرنے کا وہاں جہاں اس کی ضرورت زیادہ ہے اور سطح کم ہے' اسے کظامت کہتے تھے وہ لوگ۔

جنتی معاشرے میں متقیوں کی طرف سے زائد از ضرورت خواہ دولت ہو یا صلاحیتیں وہ دوسروں کی طرف منتقل کر دی جاتی ہیں

قرآن نے کہا وَ الْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ (3:134) جن کے اندر کوئی صلاحیت کوئی قوت کوئی حرارت ضرورت سے زائد ہو جاتی ہے وہ اس کو اس طرف موڑ دیتے ہیں جہاں وہ چیز تعمیری مصرف میں کام میں آ جائے۔ دولت زائد از ضرورت یہ پوری کی پوری اس نے دے دی منفعت بخشیوں کے لیے انسانیت کو' یہ بھی کظامت ہے۔ اور انسان کے اندر کی یہ قوتیں جو ہیں اگر یہ بھی کسی وقت کوئی قوت زائد ہو جاتی ہے تو معاشرے کے اندر اس قسم کا انتظام ہونا چاہیے کہ یہ جو قوتیں زائد کسی کے اندر ہیں' ان کو تعمیری مقصد کے لیے استعمال کرنے کے انتظام ہونے چاہئیں معاشرے میں۔ آپ دیکھیں گے افراد کے اندر اختلاف ہوتا ہے صلاحیتوں کا کسی میں ایک صلاحیت بڑھی ہوئی ہوتی ہے' کسی میں کوئی دوسری صلاحیت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ جو بڑھی ہوئی صلاحیتیں ہوتی ہیں ان کے استعمال کے لیے معاشرہ کے اندر صحیح نظام ہونا چاہیے۔ اب دونوں قسم کی بڑھی ہوئی چیزیں قرآن نے بیان کر دیں' دولت بڑھی ہوئی ہے زائد از ضرورت تو قل العفوٗ جتنی تمہیں ضرورت ہے اس سے زائد دوسروں کی طرف منتقل کر دو۔ تمہارے اندر کی کوئی قوتیں اس قسم کی ہیں کہ زائد از ضرورت ہیں ان کے لیے نظام ایسا قائم کرنے والے ہوتے ہیں' ان کو متقی کہتے ہیں۔ یہ نظام ہونا چاہیے اس کے اندر۔ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (3:134) عافین کا ترجمہ بھی معاف کر دینے والے کیا جاتا ہے۔ عفو کے معنی ابھی ہم نے دیکھا ہے وہی لفظ ہے جہاں سے عافین ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی سے آگے بڑھ جانا اس سے اور آگے چلے جانا۔

قرآنِ حکیم کے ہاں احسان کا مفہوم تو فریضۂ زندگی کا ادا کرنا ہے

ہمارے ہاں تو یہ چیز ہوگی نا کہ صاحب! میں اس کی کیوں مدد کروں اس نے میری مدد کی تھی؟ میں اس کے کیوں کام آؤں اس نے تو میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ یہاں ادلے کا بدلا جو ہے وہ ہوتا ہے۔ اور اگر آپ نے سلوک کیا ہے تو پھر وہی قرآن کی اس آیت کا غلط مفہوم هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60) آپ نے احسان کیا' اب اس کے بعد صاحب ساری

عمر آپ توقع کر رہے ہیں کہ وہ احسان کا بدلا آپ کو چکائے۔اور ساری عمر کے لیے آپ کا بے دام غلام بن جائے۔ ہر معاملے کے اندر آپ جاتے ہیں اس کو دباتے ہیں۔اور وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! دیکھیے نا میں تو ووٹ اس کو دوں گا جو زیادہ اہل ہے' ہاں بھئی! ٹھیک ہے''آج توں پاٹے خاں بن گیا ہیگا ویں' پتہ ہے لِلاں لیندا آیا سیں' ترلے لین ڈیا ہویا سیں' پیری پیندا سیں پیا' تے اوس دن اسی تیری مدد کیتی تے' آج توں اکھیاں متھے تے رکھ لیاں' طوطا چشم حرام خور احسان ناشناس''۔یعنی وہ جو اس وقت مصیبت پڑی تھی اور اس نے کبھی مدد کر دی تھی' اب ہر بات تمہاری مرضی کے تابع کرتا چلا جائے پھر تو احسان شناس ہے اور اگر کہیں یہ چیز کہے تو پھر ہزار ہزار گالیاں ہو جاتی ہیں۔اب وہ بے چارہ اس کے لیے؟ کہا احسان کا بدلا احسان ہے۔تو اب وہ انتظار میں ہو گا کہ اللہ کرے تجھ پہ بھی مصیبت پڑے''ہور تے موقع ای نئیں نہ آ سکدا'' کسی طرح سے یہ بوجھ میرے سر سے اترے۔اترنے کا طریقہ یہی ہے کہ تجھ پہ بھی وہ مصیبت پڑے''توں وی اوس طراں منتاں کردا آویں تے میں تیری مدد کراں تے کہاں الحمدللہ ''هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ''(55:60) ۔اس قوم کو کیا ہو گیا ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما دوسروں سے کسی قسم کی شکریہ کی متمنی نہیں ہوتی

ہمارے ہاں جو نیک سلوک بھی کیے جاتے ہیں ان کی یہ کیفیت ہے کہ یہ دیکھ کے کہ اس نے کیا کہا ہے۔قرآن کہتا ہے وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (3:134) وہ یہ کچھ کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے کہ انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا تھا وہ ان چیزوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔واہ واہ واہ۔اس کا خیال ہی نہیں ہوتا اس لیے کہ اس نے تو ایک فریضۂ انسانیت ہے اپنے اوپر عائد کیا ہوا کہ جس کنویں میں پانی کم ہے میں نے زائد پانی اس کی طرف پھیر دینا ہے۔سیدھی سی بات ہے مجھے تو انسانیت کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا ہے' مجھے تو ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرنا ہے مسلمان ہونے کی جہت سے جس کا میں نے اقرار کیا ہوا ہے اپنے خدا سے۔کہ جس کی نشوونما کی ضرورت ہو گی میرے پاس جو اپنی نشوونما سے زائد ہو گا' وہ دوں گا اگر اس کی ضرورت زائد ہے تو اپنی ضرورت کاٹ کے بھی دوں گا۔تم نے تو یہ کرنا ہے اس لیے کھڑے ہو کے یہ سوچنا کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا' یہ بات نہیں' متقی کا یہ فریضہ نہیں ہے۔وہ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ(3:134) ہے جتنی زائد ضرورت سے قوت اپنی ہے' دولت اپنی ہے' دوسرے کو دینا ہے۔دینے کے لیے کھڑے ہو کے یہ نہیں سوچنا کہ اس نے کیا کیا تھا وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (3:134) لوگوں سے ان جیسا برتاؤ نہیں کرتا ہے' آگے بڑھ جاتا ہے۔دیکھو کسی سے آگے بڑھ جانے کا کیا خوبصورت تصور ہے۔دولت زائد از ضرورت جو ہے وہ دے دی جہاں جانی چاہیے تھی' لیول قائم کر دیا۔اپنی صلاحیتیں جتنی زائد ہیں وہ منفعتِ عامہ کے لیے عام کر دیں' لیول پورا کر دیا۔یہ

نہیں کیا ہے کہ کس نے کیا سلوک میرے ساتھ کیا تھا اس نے تو یہ کچھ کرنا ہے' یہ کرتے چلے جایے۔ اس سے کیا ہوا؟ سب سے پہلے تو یہ کہ تمہارا اپنا توازن قائم ہوگیا۔ یہ جو ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی دولت' ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی اپنے اندر تیزی کی اشتعال انگیز قوتیں' توازن بگڑ جاتا ہے اس سے۔ تمہاری ذات کا توازن قائم ہوا اور جہاں جہاں کمی تھی معاشرے میں وہاں جب یہ پہنچی تو معاشرے کا توازن قائم ہوگیا۔ قرآن کہتا ہے وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ج (3:134) خدا انہیں پسند کرتا ہے جو توازن برقرار رکھتے ہیں۔ عزیزانِ من ! احسان کے معنی ہوتا ہے حسن پیدا کر دینا اور حسن نام ہی صحیح توازن کا ہے صحیح PROPORTION کا نام ہے۔ یہ لوگ حسین کہتے ہی اس کو تھے کہ جس کے خدوخال میں توازن صحیح ہوتا تھا توازن کا نام ہی حسن ہوتا ہے۔ جو لوگ اس طرح سے توازن برقرار رکھتے ہیں اپنی ذات کا' معاشرے کا' وہی ہیں جو حسنِ کائنات میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ کہا کہ وہ مال و دولت کی دنیا ہو یا صلاحیتوں کی دنیا ہو' سارا راز اس کے اندر ہے کہ ایک صحیح توازن ہو قائم۔ اور یہ توازن جو ہے اپنی PERFECTION میں پہنچا ہوا ہوتا ہے خدا کی ذات کے اندر اسی لیے خدا کی صفات کو الاسمآ ءالحسنٰی کہا گیا ہے وہ صفات جو اپنے توازن کے اعتبار سے بھی نہایت PERFECTION کو پہنچی گئی ہیں۔ مومن کے صحیح عمل کو بھی حسنِ عمل کہا گیا ہے' اسے حسنات سے تعبیر کیا گیا ہے' لفظ ہی حسن ہے قرآن نے جو استعمال کیا ہے۔ اور اسی لیے وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ج (3:134) اور یہی معنی ہیں هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60) کے کہ تم نے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر کے حسن پیدا کیا' حسن پیدا ہوگیا' یہی تو اس کا معاوضہ ہے جو تمہیں مل گیا' اس کا معاوضہ اور کیا کہتے ہو؟ حسن پیدا ہوگیا تمہاری ذات میں بھی ہوگیا وہاں بھی یہ چیز ہوگئی۔ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (3:134) دیکھتے ہیں کیا کیا چیزیں کہتا چلا جاتا ہے قرآن۔ سورۃ الِ عمران کی آیت 134 تک ہم آ گئے عزیزانِ من! یہی کچھ صفات ان متقین کی آگے چلی آتی ہیں اس کو ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

بائیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 135 تا 143)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1970ء کی پہلی تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۂ الِ عمران کی آیت 135 سے ہو رہا ہے:(3:135)۔

انسانی شخصیت کی نشوونما کا راز اپنی قوت کے استعمال میں ہے

سابقہ آیت میں مؤمنین کی نمایاں خصوصیات کا ذکر ہو رہا تھا' دو چار چیزیں اس میں آئی تھیں اور اس میں اب مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے دہرا دوں کہ وہاں کہا یہ گیا تھا کہ **الَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ**

وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (3:134) مومنین کی صفات میں یہ تھا کہ وہ تنگی کی حالت میں خوشحالی کی حالت میں دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہوئے جو کچھ بھی ان کے پاس ہوگا' اسے کھلا رکھیں گے' دبا کر نہیں بیٹھ جائیں گے۔ اس کے بعد یہ کہا گیا تھا کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ ان کو کسی بات پر غصہ آئے' حدت اور حرارت خون کی بڑھ جائے تو وہ اس زائد قوت کو کسی تعمیری مقصد کی طرف منتقل کر دیتے ہیں' تخریبی کاموں میں نہیں ان چیزوں کو لاتے۔ یہ صرف غصے کی بات ہی نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی زائد صلاحیت' زائد قوت اسے وہ ہمیشہ تعمیری کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ پھر جب لوگوں سے وہ حسن و خوبی اور حسنِ معاملہ سے پیش آتے ہیں تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ دوسروں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ یہ ادلے کا بدلا نہیں ہے بلکہ وہ ان سے آگے بڑھ جاتے ہیں' آگے گذر جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ تو انہوں نے اپنے فرائضِ زندگی کی حیثیت سے کرنا ہوتا ہے' کسی کے ادلے میں بدلا نہیں ہوتا۔ اور اس طرح سے ان کی ذات میں ایک توازن پیدا ہوتا ہے' وہ اپنا توازن بھی برقرار رکھتے ہیں اور معاشرے میں توازن بھی پیدا کرتے ہیں' یہی ہیں وہ محسنین۔ اب آگے آئے ہم۔ وَ الَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ (3:135) کہ کبھی بھولے بھٹکے سے ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی ہے جو معیوب ہے' مذموم ہے' معاشرے میں اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی۔ یہ فحش ہر قسم کی معیوب حرکت کو کہا جائے گا کیوں کہ بنیادی طور پر عربوں کے ہاں فحش تو بخل کو کہتے تھے اور اس سے نظر آتا ہے کہ ان کے ہاں بخل کتنی بڑی معیوب حرکت تھی۔ لیکن اس کے بعد ہر معیوب حرکت یا مذموم کام کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگا' کچھ بھی معنی اس کے لیجیے۔ ان سے اگر بھولے بھٹکے سے کبھی اس قسم کی کوئی حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔

انسان کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ چیز اس کا اپنی ذات کے ساتھ زیادتی کرنا ہے

اب یہاں دو چیزیں قرآن نے کہیں فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ (3:135) ایک تو وہ چیز کہی کہ جو وہ کر بیٹھتے ہیں یہ جو قرآنِ کریم میں یہ الفاظ آتے ہیں اور متعدد مقامات میں آتے ہیں کہ جو خود اپنے آپ کے خلاف کوئی زیادتی کر بیٹھتے ہیں' جو اپنی ذات کے خلاف زیادتی کر دیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے بڑی ہی معنی خیز ہے یہ بڑی ہی غور طلب چیز ہے۔ اور یہاں تو اس تقابل سے کہ فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ (3:135) بات کو بڑا ہی نکھار کر بیان کر دیا گیا ہے۔ معاشرہ کی نگاہ میں جرم وہ ہے جو قانون کے خلاف کوئی کام کر بیٹھے انسان' قانون کی شکنی قانون کی خلاف ورزی کرنا' اسی کو جرم قرار دیا جاتا ہے' اسی پہ معاشرہ گرفت کرتا ہے' اسی قسم کی حرکت یا فعل پر معاشرہ سزا دیتا ہے۔ لیکن قرآن اس سے بہت آگے جاتا ہے وہ اس قسم کے افعال کو بھی جرم قرار دیتا ہے لیکن وہ جرائم کو بند کرنے کے لیے جو علت اور اصل بنیادی سبب ہوتا ہے وہ اس پہ نگاہ رکھتا ہے اور بنیادی سبب ہوتا ہے انسان کی

نیت یا ارادہ۔ ایک شخص جیسا کہ میں عام طور پہ مثال میں کہا کرتا ہوں ایک شخص نے چوری کی یہ تو چوری کی اس نے۔ ٹھیک ہے یہ جرم ہے' اس جرم کی گرفت ہوسکتی ہے' اس پہ سزا بھی ہوگی۔ یہ ایک چیز عمل میں آ گئی' سرزد ہوگئی۔ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اور اس کی نیت میں ہے کہ اگر آپ کہیں اٹھ کے باہر چلے جائیں تو وہ آپ کی گھڑی جو میز پہ پڑی ہے' جیب میں ڈال کے چل دے' معلوم ہی نہ ہونے دے آپ کو۔ وہ اس کا ارادہ کرتا ہے بدقسمتی سے یا آپ کی خوش قسمتی سے آپ میز سے اٹھ کے جاتے نہیں ہیں کہیں اور وہ اسے چرا سکتا نہیں اور اٹھ کے چلا آتا ہے۔ معاشرہ کے قانون کی رو سے یہ کوئی جرم نہیں ہے اس پہ نہ مواخذہ ہوسکتا ہے' نہ گرفت ہوسکتی ہے' نہ سزا ہوسکتی ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے یہ اپنے خلاف جرم ہے جو تم نے کیا ہے۔ وہ جرم معاشرے کے خلاف تھا اور یوں بھی جو جرم معاشرے کے خلاف ہوگا' وہ تو بہرحال آپ کے خلاف ہوگا ہی' کیوں کہ آپ نے پہلے ارادہ کیا اس کے بعد وہ ارادہ عمل میں آیا۔ عمل میں آنے سے معاشرے کے خلاف جرم ہوا۔ آپ کا ارادہ جو تھا اس سے آپ کی ذات کے خلاف یہ جرم ہوا۔ لیکن اگر وہ آپ کا ارادہ عمل میں نہیں آسکا کسی طرح سے تو قرآن کہتا ہے کہ یہ بجائے خویش ایک جرم ہے۔ یہ جرم ہے جو تم نے خود اپنے خلاف کیا ہے۔ معاشرے کے خلاف جو جرم کیا جائے اس کی سزا معاشرہ دیتا ہے اور یوں وہ سمجھتا ہے کہ وہ جرم جو تھا' محو ہوگیا۔ جس جرم کی کسی کو سزا مل جائے وہ جرم معاشرے کی نگاہ سے باقی نہیں رہتا۔ لیکن یہ جو شخص اپنی ذات کے خلاف جرم کرتا ہے یہ تو معاشرے کی کسی سزا سے محو نہیں ہوسکتا' کسی کے معاف کیے سے' معاف نہیں ہوسکتا۔ اور یہ ہے بنیاد اصل میں جرائم کی اور علت کی' اخلاق کی خرابیوں کی نیت اور ارادہ۔۔ اس چیز کا نام قرآن کی رو سے اپنی ذات کے خلاف جرم یا ظلم ہے اور اس پہ وہ بے حد زور دیتا ہے۔

انسانی ذات کی آئندہ زندگی اعمالِ انسانی کے مجموعہ کی شکل وصورت کا ہی دوسرا نام ہے

آپ دیکھیں گے قرآنِ کریم میں عام طور پہ اس کا ترجمہ ہم یہ سمجھ کے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اپنے آپ پہ زیادتی کی۔ بات سمجھتے نہیں ہیں کہ یہ اپنے آپ پر زیادتی اور معاشرے پر زیادتی اس میں فرق کیا ہے۔ یہ اپنے آپ پر زیادتی جسے ہم کہتے ہیں وہ انسان کی اپنی ذات کے خلاف ایک جرم سرزد ہوتا ہے۔ اس سے اس کی اپنی ذات متاثر ہوتی ہے۔ معاشرہ کے جرائم جو ہیں' سزا بھی مل جائے' ہوسکتا ہے کہ انسان اس قسم کی تدابیر اختیار کرلے کہ پولیس کی گرفت میں نہ آئے' آئے بھی تو عدالت سے چھوٹ جائے' کئی طریقے ہوتے ہیں روز ہوتا ہے یہ سب کچھ۔ سوسائٹی کی نگاہ میں تو وہ مجرم نہیں رہتا لیکن انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے' اچھے کا بھی برے کا بھی اور اسی سے اس کی ذات کا مستقبل مرتب ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد آگے جو زندگی آتی ہے وہ زندگی انسان کی ذات کی زندگی ہے۔ اس ذات کی جو کیفیت ہے مرنے کے وقت وہ وہ ہے جو اس زندگی میں اس نے اعمال کیے

اوران کے اثرات اس کی ذات پر مرتب ہوئے ان جرائم کے کہ جو معاشرے کی گرفت میں آ گئے' ان جرائم کے بھی جو کسی کی گرفت میں نہیں آئے' جو کسی نے دیکھے تک نہیں ہیں' جو کسی نے محسوس تک نہیں کیے ہیں۔ لیکن اس کے اپنی ذات کے اندر اس کی نیت اور ارادے تک جو محدود رہے اس کا اثر اس کی ذات پر آ کے پڑا اور اس طرح سے اس کی اپنی ذات پہ ایک اثر مرتب ہو گیا۔ یہ جو مجموعہ ہے اس قسم کے اثرات کا' اسی سے انسانی ذات کا مستقبل مرتب یا تعمیر ہوتا ہے۔ ایسے کام جن سے انسان کی ذات میں استحکام پیدا ہوتا ہے' توازن پیدا ہوتا ہے' اس میں سے اچھی صفات کی نمود ہوتی ہے' اس سے ذات کا مستقبل ایسا عمدہ ہوتا ہے کہ وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ اسی کو جنت کی زندگی کہا جائے گا۔ اگر یہ چیزیں اس میں نہیں ہوتیں' وہ کمزور رہ جاتی ہے UNDEVELOPED ہو جاتی ہے' نشو و نما نہیں پاتی ہے تو اس سے اس کی ذات اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کر سکے' اسے جہنم کی زندگی کہا جائے گا۔ تو اصل چیز جو ہے وہ انسان کی ذات ہے جس کے اوپر کوئی اثر مرتب ہوتا ہے۔

معاشرتی زندگی کا ایک دوسرا رخ' اس کا نتیجہ اور اس کا سدِ باب

اب اس کے برعکس لیجیے۔ ایک شخص نہایت دیانت دار ہے ایمان دارانہ زندگی بسر کرتا ہے' نہایت پاک بازی کی زندگی ہے۔ غلط معاشرے کے اندر کسی سازش کا شکار ہو جاتا ہے' جھوٹے الزامات لگتے ہیں' بہتان تراشیاں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات بالکل بے گناہوں کو جرائم میں بھی ملوث کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو غلط معاشرے کی مشینری ہے وہ ایسا انتظام کرتی ہے کہ اس کو ثابت بھی کر دیتی ہے ان جرائم کو۔ معاشرے میں بدنامی ہوتی ہے' قانوناً سزا بھی مل جاتی ہے یہ سب کچھ ہو سکتا ہے' ہر قسم کا نقصان پہنچا سکتا ہے' غلط معاشرہ اس قسم کے لوگوں کو کہ جن سے کوئی جرائم سرزد نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن انہوں نے چوں کہ کوئی قانون شکنی نہیں کی ہے' کوئی معیوب بات نہیں کی ہے' ان کی ذات ان نقصانات سے محفوظ رہتی ہے۔ اور اصل چیز یہ ہے کہ غلط معاشرے میں نقصانات آدمی اٹھاتا ہے۔ یہ جو آئے دن ہمارے ہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاحب! دیانت داری' امانت داری' پاکیزہ زندگی قرآن نے یہ چیز کہی ہے کہ اس قسم کی زندگی کے بسر کرنے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور ہم روز دیکھتے ہیں کہ غلط معاشرے کے اندر زیادہ پٹتے یہی لوگ ہیں۔ وہ قانون شکن' وہ بددیانت جو ہے وہ تو یہ کچھ کرنے سے پیشتر جتنے رخنے ہوتے ہیں' ان کو پہلے بند کر دیتے ہیں وہ BATTLE OF WITS ہوتی ہے ان کے درمیان اور معاشرے کی یہ جو مشینری ہے جرائم کو DETECT کرنے کی' گرفت کرنے کی ان کے درمیان' قانون کے درمیان قانون شکنوں کے درمیان' پولیس کے درمیان عدالت کے درمیان۔

یعنی روز یہ جتنی چیزیں ہوتی ہیں' یہ ساری اس طریق پہ ہوتی ہے کہ قانون توڑنے کے بعد قانون کی گرفت میں کیسے نہ آئے' گرفت میں آ بھی جائے تو کیسے سزا نہ پائے۔ لیکن جو شخص دیانت دارانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ عام طور پہ وہ یہ چیزیں نہیں کرتا' اس کا ضمیر پاک وصاف ہوتا ہے۔ وہ جلدی گرفت میں آتا ہے' ہر قسم کا نقصان اسے اٹھانا پڑتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر یہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل جو صحیح ہے تو انہیں یہ نقصان کیوں پہنچ رہا ہے؟ عزیزانِ من! یہی ہے ہماری غلط نگہی جو قرآن کی اس چیز کو نگاہ میں ہم نہیں رکھتے اور اس قسم کے شکوک میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہ تو معاشرے کی اس وجہ سے ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ سڑک پہ جاتے ہوئے ایک حادثہ ہو جاتا ہے اس کے اندر آدمی ہلاک ہو جاتا ہے' موٹر سے' دیوار گر جاتی ہے' زلزلہ آ جاتا ہے اس میں بھی تو یہ سارے نیک لوگ' شریف لوگ' امن پسند لوگ وہ بھی اسی طرح سے اس مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں جیسے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ جتنے نقصانات ہیں یہ سارے طبعی زندگی سے متعلق ہیں۔ یہ چیزیں معاشرے کے اندر رہتے ہوئے معاشرے کے حالات کے مطابق ہوں گی۔ جس معاشرے نے مثلاً سیلاب کا انتظام کر لیا ہے' بند بنا لیے ہیں' اس کے اندر فاسق فاجر گناہ گار بے ایمان جتنے بھی ہیں' وہ سارے سیلاب سے محفوظ رہتے ہیں۔ جس معاشرے میں اس قسم کے انتظامات نہیں کیے ہیں' وہاں جب سیلاب آتا ہے تو کافر اور مومن نیک اور بد سب اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ نہ مندر باقی رہتا ہے نہ مسجد باقی رہتی ہے۔ خدا کا گھر کعبہ تک کئی دفعہ جل گیا اس سے بڑا پاک گھر اور اس سے زیادہ حفاظت کرنے والا تو دنیا میں کوئی نہیں ہے' سیلاب سے محفوظ نہیں رہتا' آگ سے محفوظ نہیں رہتا۔ یہ طبعی زندگی کی چیزیں ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ انسان کے اوپر اصلی نفع اور نقصان جو ہے وہ اس کی ذات کے اوپر جو مرتب ہوتا ہے' وہ ہے۔ اور یہ شخص جو پاک بازی کی زندگی بسر کرتا ہے' دیانت اور امانت کی زندگی بسر کرتا ہے' طبعی نقصانات تو اس کے ہو سکتے ہیں لیکن اس کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اپنی ذات کو نقصان انسان خود پہنچاتا ہے' کسی دوسرے کی دسترس انسانی ذات پر نہیں ہو سکتی۔ اور جس کی ذات محفوظ ہے نقصانات سے' یقین مانیے کہ وہ خدا کی میزان میں دنیا کے طبعی نقصان جو ہیں' اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی ذات کی اہمیت اور اس کے تحفظ کی تاکید

یہ جو چیز ہے کہ انسان خود اپنی ذات کو نقصان پہنچاتا ہے' کوئی دوسرا نہیں پہنچا سکتا' قرآنِ کریم نے نہایت حسین انداز میں اس بات کو بیان کیا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (5:105) بڑی عجیب آیتِ جلیلہ ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ ج (5:105) تم اپنی ذات کی نگہداشت کرو' اس کی حفاظت کرو۔ تم پر اس کی ذمہ داری ہے' اسے نگاہ میں رکھو کہ اسے

اپنے ہاتھ سے نہ تم کچھ نقصان پہنچاؤ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ج (5:105) ذمہ داری تمہاری صرف تمہاری ذات تک کی ہے' اسے نگاہ میں رکھو لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ط (5:105) اگر تم صحیح راستے پہ ہو تم اپنی ذات کو محفوظ کیے چلے جا رہے ہو اس قسم کی آلودگیوں سے اس قسم کے جرائم سے اس قسم کے نقصان سے تو جو شخص گمراہ ہو گیا ہے' غلط راستے پہ چلتا ہے' غلط معاشرہ ہے' وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا لَا يَضُرُّكُم (5:105)۔ اگر ہم اس نقصان یا ضرر کو طبعی نقصان دیکھیں۔ چوری ہو جاتی ہے' بدنامی ہو جاتی ہے' حتیٰ کہ سزا ہو جاتی ہے' بے گناہوں کو پھانسی بھی ہو جاتی ہے۔ ہماری نگاہیں تو یہ کہیں گی کہ صاحب اس سے بڑا نقصان اور کیا ہوگا؟ وہ کہتا ہے یہ نقصان کوئی نقصان نہیں ہے طبعی زندگی کا یہ نقصان ہے۔ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ (5:105) دیکھو یہ کہ تمہاری ذات کو نقصان تو نہیں پہنچ رہا۔ اور کوئی دوسرا یہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تمہیں اس کی دسترس ہوتی ہی نہیں ہے کسی ذات تک۔ تمہارے اپنے ہاتھوں سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (5:105) اگر تم صحیح راستے پہ چل رہے ہو تو غلط راستے پہ چلنے والا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اب اس سے یہ نظر آ گیا کہ قرآن کے نزدیک' خدا کے نزدیک میزانِ خداوندی میں نفع اور نقصان وہ ہے جو انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے' طبعی زندگی کا نفع نقصان نہیں ہے۔ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (5:105) ٹھیک ہے دنیا کی نگاہ میں تم مجرم بھی ہو سکتے ہو' سزا بھی پا سکتے ہو' بدنامی بھی ہو سکتی ہے' کوئی بات نہیں' آخر الامر خدا کے سامنے جانا ہے ہر ایک نے' وہ وہاں بتائے گا کہ تم میں سے کون مجرم تھا اور کون معصوم۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حضرت عمرؓ کی عدالت میں سال بھر کوئی مقدمہ بھی پیش نہ ہوا آخر کیوں؟

کتنی عظیم چیز ہے جو قرآن کہہ جاتا ہے بڑی عظیم چیز ہے۔ اور یہی معاشرے سے جرائم کو کم کرنے بلکہ جرائم کو ختم کرنے کے لیے بنیاد یہ ہے کہ ہر فرد اپنی ذات کے متعلق ذمہ دار ہے۔ سال بھر کے بعد انہوں نے کہا کہ صاحب! یہ پوسٹ ABOLISH کیجیے ایک بھی مقدمہ تو نہیں آیا جرم کا۔ حیرت ہوتی ہے لوگوں کو کہ جرائم اس طرح سے یہ مٹ گئے۔ کیوں یہ تبدیلیاں پیدا ہوئیں؟ تو ہم تو وہ معجزات کے قائل ہیں نا کہ ہاں صاحب! وہ رسول اللہ ﷺ موجود تھے' صحابۂ کبارؓ تھے صاحب وہ کیوں نہ یہ کچھ ہوتا۔ سوال یہ نہیں ہے۔ انسان ہی تھے یہ تبدیلی کس طرح سے آئی؟ نگاہیں ان کی اپنی نیت اور ارادے پر تھیں وہ جرم اسی کو جرم نہیں سمجھتے تھے کہ جو معاشرے میں محسوس طور پر سرزد ہو کے سامنے آ جائے' مرئی ہو' وہ دل میں گذرنے والے خیالات کو بھی جرم قرار دیتے تھے۔ اور وہ اس پر نگاہ رکھتے تھے کہ اس قسم کا کوئی خیال بھی نہ گذرنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ خدا تمہارے دل کے ارادوں اور نگاہ کی خیانتوں کو بھی جانتا ہے۔

جہانِ فردا کی نوعیت کے علاوہ ذاتِ انسانی کی اہمیت

یہ خدا کے جاننے کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہنے کی ضرورت کیا تھی خدا تو غیب السمٰوٰت والارض جو ہے وہ سب کو جانتا ہے' غیب و شہادت کو جانتا ہے۔ یہ بات خاص طور پہ کیوں کہی گئی؟ خدا کے جاننے کے معنی یہ ہیں کہ یہ وہ جرائم ہیں کہ دنیا تو ان کو نہیں دیکھتی' خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ان کا اثر تمہاری ذات پر مرتب ہوتا ہے اور ہمارے سامنے جب آئے گی مرنے کے بعد تو یہ طبعی قوانین کی رو سے دیے ہوئے ہیں' عذاب نہیں آئیں گے' سزائیں نہیں آئیں گی' نفع نہیں آئے گا' نقصان نہیں آئے گا' تم نہیں آؤ گے' تمہارا جسم نہیں آئے گا' جان نہیں آئے گی' تمہاری ذات ہمارے سامنے آئے گی اور اس میں جو خیانتیں کی ہوئی ہوں گی اس میں جو غلط ارادے کیے ہوئے ہوں گے ان کے اثرات سامنے آئیں گے اور تمہارے فیصلے نفع نقصان کے ان کی رو سے ہوں گے۔ عزیزانِ من! یہ تھی چیز ان لوگوں کی نگاہوں کے اندر۔ اور جب یہ چیز ہو کہ دل میں غلط خیال تک بھی نہ گذرے تو پھر اس معاشرے کے اندر جرائم کہاں ہوں گے۔ اور یہ چیز کہ جو چیز آپ کسی دوسرے کے خلاف کرتے ہیں' معاشرے کے خلاف کرتے ہیں' ٹھیک ہے ہوسکتا ہے کہ وہ معاف بھی کردے تم کو' قانون بھی آپ سے درگزر کردے لیکن اس سے جو نقصان آپ نے اپنی ذات کو پہنچایا ہے اپنے ہاتھوں سے' وہ تو کوئی شخص نہ معاف کرسکتا ہے' نہ اس سے درگزر کرسکتا ہے۔ وہ جو میں نیٹشے کا قول ایک دہرایا کرتا ہوں۔ جو اقوال بھی فکری طور پہ بھی قرآن کے مطابق ہوں گے اس میں صداقت ہوگی' بیان کرنے کا انداز ذرا مختلف ہوگا۔ اس نے یہ چیز کہی نیٹشے نے کہ جو جرم تم نے میرے خلاف کیا ہے' میں تو اسے معاف کردوں گا لیکن جو اس سے تم نے اپنے خلاف کیا ہے' اسے کون معاف کرے گا۔ عزیزانِ من! کوئی اسے معاف نہیں کرسکتا یہ ہے جو قرآنِ کریم نے یہاں کہا ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ (3:135) پہلے کے لیے ہے فعلوا جو فعل سرزد ہوگیا محسوس طور پہ عمل میں جو چیز آگئی' یہ وہ چیز ہے جو معاشرہ کے خلاف جائے گی اور معاشرہ اس کی گرفت کرے گا۔ اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ (3:135) یہ بھی نہیں دل میں خیال گذرے گا' اپنے آپ پہ بھی جو زیادتی کرے گا' یہ اگر ایسی صورت ان سے کبھی ہوجائے گی (یہ مؤمنین کی صفات آرہی ہیں) تو اس وقت کیا صورت ہوگی؟

انسانی اعمال کا تمام تر دارو مدار احساس کی آبیاری کا رہینِ منت ہے

آپ کے سامنے اگر قرآنِ کریم ہے تو چار لفظ چھوڑ کر آگے دیکھیے گا وَ لَمۡ یُصِرُّوۡا عَلٰی مَا فَعَلُوۡا وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ

(3:135) جوں ہی اس کا یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ بات کہ اس کے اوپر پھر وہ اصرار کریں گے یعنی کرتے چلے جائیں گے' اس کو چلو کوئی بات نہیں ہے۔ دیکھا تو کسی نے بھی نہیں ہے نا' پکڑا تو گیا نہیں ہوں' ٹھیک نہیں ہے۔ وَ لَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى (3:135) تو ان کے اندر فوراً ندامت آئے گی اور اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ غلطی ہوئی' اس کا ازالہ کریں گے۔ تو پہلے تو لَمۡ يُصِرُّوۡا (3:135) پہ غور کیجیے اس کے معنی یہ ہیں کہ بھولے بھٹکے سے نادانستہ کسی وقت کوئی لغزش اس قسم کی ہو جاتی ہے اور ہو سکتی ہے' انسان ہے غلط قدم اٹھ سکتا ہے۔ اس اٹھنے کے بعد وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ (3:135) جوں ہی اس کا علم ہوتا ہے انہیں (تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ چیزیں نادانستہ ہوئی تھیں) جوں ہی اس کا علم و احساس ہوتا ہے کہ او ہو مجھ سے یہ کیا ہو گیا' کیا کرتے ہیں وہ؟ سنیے کیا کرتے ہیں ذَكَرُوا اللّٰهَ (3:135)

صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی بنیادی وجہ قرآنِ حکیم کی پیش کردہ اصطلاحات کے مفہوم کو بدلنے کی بنا پر ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کو نہ سمجھ سکنے کی' اسلام کی حقیقت واضح نہ ہو سکنے کا' ایک بنیادی سبب یہ ہے اور ایک کیا میں کہتا ہوں' بنیادی سبب ہی یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے الفاظ اس کی اصطلاحات اس کے تصورات کے معنی اپنی زبان میں کچھ کر رکھے ہیں۔ جوں ہی وہ لفظ آتا ہے ہم اپنی زبان کے معنی اس کو پہنا دیتے ہیں اور پھر قرآن سے بھی الگ ہو جاتے ہیں' اسلام کے بھی خلاف چلے جاتے ہیں۔ ہم صحیح قرآن پہ آنے ہی نہیں پاتے۔ ان اصطلاحات میں ایک لفظ ذکر ہے اللہ کا۔ ان سے جب یہ ہو جاتا ہے (اب آ جایے مروجہ ترجموں کے اوپر اور ذکر کے مفہوم پہ) تو اللہ کا ذکر کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور ذکر آپ کو پتہ ہے کہ پھر وہ کیا ہوتا ہے؟ تسبیح پہ خدا کا نام گننا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تو ذکرِ خفی ہوتا ہے۔ اور ایک ذکرِ جلی ہوتا ہے صوفیا کی محفلوں کے اندر۔ یہ پیروں کے ہاں آپ دیکھتے ہوں گے۔ بیٹھے ہوئے ہیں اس کے بعد رات کو اور اس کے بعد اللہ کا ذکر شروع ہوا ہے وہ قلب کے اوپر ضربیں لگتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا پھر کہ وہ کس طرح سے یوں ہوتا ہے لا الہ الا اللہ ھوٗ یہ اس سے پھر قلب چلنے لگتا ہے۔ جس کو ڈاکٹر HEART FAILURE کہتا ہے ان کے ہاں چلتا ہے وہ۔ اس کا نام اللہ کا' ذکر ہو رہا ہے کہ جب یہ کچھ وہ کرتے ہیں تو اس کے بعد پھر کرتے کیا ہیں؟ وہ نماز کے بعد کبھی تینتیس دفعہ وہ اور تینتیس دفعہ وہ پڑھ لیتے ہیں اور کچھ بہت بڑا جرم ہو جاتا ہے تو پھر وہ وہاں اکٹھے ہو کے پھر اس قسم کی ضربیں لگانے لگ جاتے ہیں۔ اس کا نام ہے اللہ کا ذکر' اسی کو ذکر کہتے ہیں نا۔ کسی سے آپ

کہیے وہ آپ کو کہے گا کہ اللہ کا ذکر کیا ہے۔ کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ جرائم ہوں آپ کے معاشرے کے خلاف بھی' زیادتیاں ہوں آپ کی اپنی ذات کے خلاف بھی اور اس کے بعد آپ تسبیح لے کے اکیلے بیٹھ کے ایک سو دفعہ ایک سو ایک دفعہ خدا کا نام لے لیں یا اس طرح سے ذکرِ جلی کرنا شروع کر دیں تو ان کے اثرات محو ہو جائیں گے؟ کیا ذکر سے یہی مفہوم ہے؟ قرآن نے یہی طریقہ بتایا ہے اس چیز کا؟ پہلے تو مومن کے متعلق جو میں نے کہا ہے کہ وہ اصرار نہیں کریں گے

تقویٰ شعاری کا نتیجہ اور لفظ ذکر کا قرآنی اور لغوی مفہوم کسی چیز کو ہر آن سامنے رکھنے کے ہیں

اِنَّ الَّـذِيۡـنَ اتَّقَوۡا (7:201) تقویٰ شعار لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے (تقویٰ شعار: خدا کے قوانین کی نگہ داشت کرنے والے) اِذَا مَسَّـهُـمۡ طٰۤئِفٌ مِّنَ الشَّيۡطٰنِ (7:201) کیا بات قرآن کہہ رہا ہے؟ کہ اگر کہیں غلط خیال' قانون شکنی کا خیال' سرکشی کا خیال' گھومتے گھومتے بھی ان تک آ جاتا ہے' دانستہ نہیں طٰئف کا عجیب لفظ ہے گھومتے پھرتے کوئی خیال بھی ان کو چھو جاتا ہے تو وہ کیا کرتے ہیں؟ تَـذَكَّـرُوۡا (7:201) یہیں وہ ذکر آیا صاحب۔ خیال بھی ان کو اگر کوئی غلط آ جاتا ہے تو اسی وقت وہ قرآن کی ہدایت کو خدا کے قانون' اس کی طرف سے دی گئی ہوئی تعلیم کو فوراً وہ اپنے سامنے لاتے ہیں اور اس کے بعد فَـاِذَا هُـمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ (7:201) اور ان کے سامنے روشنی آ جاتی ہے' آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ ایک پردہ پڑ گیا تھا' جھٹ سے ہٹ جاتا ہے' وہ دیکھتے ہیں کہ او ہو یہ کیا ہو گیا۔ مُّبۡصِرُوۡنَ (7:201) ذکر کی پہلی چیز تو یہ ہے کہ جوں ہی یہ حرکت سرزد ہوا' اسی وقت خیال جب اس چیز کا آئے تو قرآن کی ہدایات نمایاں طور پر سامنے آ جائیں ان کے۔ ذکر کے معنی ہیں کسی چیز کو سامنے رکھنا اپنے۔ یہ کیوں حرکت سرزد ہوئی تھی؟ کہ خدا کی ہدایت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی' بھول گیا تھا۔ مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جوں ہی اس کا احساس بیدار ہوتا ہے' یہ کیا ہو گیا' فوراً اس کی ہدایت سامنے آتی ہے۔ عزیزانِ من! اس کا نتیجہ غور کیجیے کیا لفظ قرآن کہہ جاتا ہے هُـمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ (7:201) وہ بینا ہو جاتے ہیں' نگاہیں دیکھنے لگ جاتی ہیں ان کی' فوراً روشنی سامنے آ جاتی ہے' تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں' نگاہ دیکھ لیتی ہے کہ او ہو! مجھ سے یہ کیا ہوا۔ عزیزانِ من! پہلا مرحلہ تو یہ ہے ذکر یہاں آیا ہے۔ کس مقام پہ غلطی ہوئی ہے کیوں غلطی ہوئی ہے قرآن نے اس کے بارے میں کیا کہا ہے ساری چیزیں۔ وہ بات بھی خیال کی تھی کہ کوئی خیال گھومتا پھرتا بھی اگر چھو جاتا ہے تو اس کے بعد فوراً خدا کی ہدایت ان کے سامنے آ جاتی ہے۔

لفظ استغفار کی وضاحت

یہ تو چیز تھی ذہنی طور پہ سامنے آنے کی' اب اس کے بعد ہوتا کیا ہے؟ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ قف (3:135) اگلی بات چل بھئی! وہ ذکر ہی میں ہم کہہ رہے تھے آگے اب استغفار آ گیا صاحب' اس کا بھی آپ کو معلوم ہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔ اور ادھر بھی سوچ رہے ہیں' خیال وہاں جا رہا ہے دوکان کے اندر' وہ بزنس کے اندر' گھر کے اندر او ہو ہو بچے نے کیا کیا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ۔ اور وہ ایک تسبیح پھر دو تسبیحاں اس کے بعد چل رہے ہیں پھر رہے ہیں' تسبیح چل رہی ہے۔ اس کا نام ہے استغفار۔ جرم کے ارتکاب کے بعد ایک تو ہے وہ ذکر اور اس کے بعد ہے یہ چیز استغفار جسے ہم کہہ دیتے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ یہ کہا ہے' مغفرت کے اوپر درس کئی آ چکے ہیں ہمارے سامنے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں سامانِ حفاظت طلب کرنا۔ مغفر اس خود کو کہتے ہیں جو سپاہی لوہے کی ٹوپی پہن لیتا ہے کہ دشمن کی طرف سے کوئی بھی وار آئے' زخمی نہ ہونے پائے۔ سامانِ حفاظت طلب کرنا' جو نقصان پہنچ گیا ہے اس سے محفوظ رہنے کا سامان طلب کرنا' وہ یہ کرتے ہیں پھر۔ یہ سامان کس طرح طلب کیا جاتا ہے؟ عزیزانِ من! دیکھیے قرآن کی آیت اور اس میں دیکھیے ذکر کے معنی کیا ہیں؟ یہ نقصان ہو گیا' برائی ہو گئی' مذموم حرکت سرزد ہو گئی' جرم سرزد ہو گیا' قرآن نے ان چیزوں کو سیاٰت کہا ہے' ناہمواریاں پیدا کرنے والی چیزیں۔ وہ کہتا ہے یہ اگر سرزد ہو جائے تو اس کے دور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:114) کوئی خفیف سی اگر اس قسم کی لغزش ہو گئی ہے تو تم اس سے کہیں زیادہ اچھے کام کرو۔ وہ جو زیادہ اچھے کام کرنے کا منفعت بخش نتیجہ تمہارے لیے ہوگا POSITIVE (تعمیری) نتیجہ ہوگا وہ اس تخریبی نتیجے کو COMPENSATE کر دے گا۔ طریقہ یہ ہے سیاٰت کے مٹنے کا' مٹانے کا ان کے اثرات سے محفوظ رہنے کا' استغفار۔ طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ حسنات کا ارتکاب کرو۔

کسی غلطی کے ارتکاب کے سلسلہ میں استغفار اور لفظ ذکر کے قرآنی مفہوم کو عملی شکل دینا ہوگی

بیماری کی وجہ سے کمزوری آ گئی ہے تو اس کے بعد جب یہ علاج ہو جائے' بیماری چلی جائے تو پھر اس کے بعد آپ کو CONVALSCENCE کے اندر تقویت بخش دوائیاں دی جاتی ہیں اور زیادہ پرہیز کرائے جاتے ہیں' ساتھ اس قسم کی چیزیں دی جاتی ہیں کہ جن سے آپ کی گئی ہوئی صحت کمزوری جو واقع ہو گئی ہے' دوبارہ حاصل ہو جائے تمہیں۔ عام معمول میں جو

آپ غذائیں کھاتے ہیں' اس سے زیادہ تقویت بخش چیزیں دی جاتی ہیں تاکہ روزمرہ میں جو پیدا ہونی تھی تقویت وہ بھی ہو اور وہ جو گڑھا پیدا ہوگیا ہے آپ کے ہاں' وہ بھی پُر ہو جائے۔ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (11:114) اسے کہتے ہیں استغفار اور زیادہ بہتر کام کرو تاکہ وہ جو غلط کام سے ایک نقصان رساں نتیجہ مرتب ہوگیا ہے' اس کا ازالہ بھی ہو جائے اور روزمرہ کی جو چیز ہونی ہے' وہ بھی ساتھ ہو جائے۔ اور سنیئے کیا چیز کہی؟ ذٰلِکَ ذِکۡرٰی لِلذّٰکِرِیۡنَ (11:114) یہ ہے ذکر ذکر کرنے والوں کے لیے۔ غور فرماتے ہیں آپ کہ ذکر کیا ہے پھر۔ ذہنی طور پہ تو یہ چیز ہے کہ غلط خیال آیا ہے تو اس کے مقابل میں فوراً وہ چیز آجائے کہ قرآن نے اس کی بابت کیا کہا ہے اور عملاً یہ ہے کہ ایک سیئہ کی کوئی چیز اگر اس کا ارتکاب ہوگیا ہے تو اس کے بعد اس سے کہیں زیادہ حسنات کا ارتکاب کرتے چلے جایئے تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے' ازالہ ہو جائے۔ ذٰلِکَ ذِکۡرٰی لِلذّٰکِرِیۡنَ (11:114)۔ اب آیئے اس پہ۔ وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ قف وَ مَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ قف (3:135) ان کی حفاظت کا سامان خدا کے سوا کون بہم پہنچا سکتا ہے۔ معاشرہ COMPENSATE کر سکتا ہے آپ کو' کہیں آپ کو جرمانہ ہوا ہے' آپ نے کچھ اور مال ناجائز طریقے پہ حاصل کیا جرمانے کی رقم بھی دی اور اس کے بعد اپنے ہاں پھر اور بھی لے آئے' نقصان بھی پورا ہوگیا۔ دوست یار مل کے کردیں گے پورا' گھر بار والے آپ کو پورا کردیں گے۔ یہ کونسی چیز ہے کہ جسے کہا گیا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کے سوا کوئی اس کی حفاظت کا سامان نہیں دے سکتا؟ یہ وہ نقصان ہے جو انسان نے اپنی ذات کو پہنچایا ہے اور وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ آپ سے جو اس قسم کی حرکت سرزد ہوئی ہے جس سے آپ کی ذات کو نقصان پہنچا ہے' اس کے مقابل میں اس قسم کے تعمیری کام کیجیے کہ ان کے تعمیری منفعت بخش نتائج اس کا بھی ازالہ کردیں اور آپ کے کریڈٹ سائیڈ میں بھی کچھ اور جمع ہو جائے۔ وَ مَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ قف (3:135)۔

دین فکرِ انسانی کو اگر جلا بخشتا ہے تو مذہبی تصورات عقلِ انسانی کو پست ترین سطح پر دھکیل دیتے ہیں۔

آگے اس کے ہے وَ لَمۡ یُصِرُّوۡا عَلٰی مَا فَعَلُوۡا وَ هُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ (3:135) میں نے پہلے کہا ہے کہ احساس آنے کے بعد یہ نہیں ہے کہ وہ کرتے چلے جایئے' کرتے چلے جایئے کوئی بات نہیں ہے صاحب! آخر میں زندگی میں ایک دفعہ حج کرآئیں گے اور یہ سارے جتنی بھی آپ کے ہاں کی غلاظتیں ہیں' وہ زم زم کے پانی میں دھو آئیں گے۔ واپس آئیں گے جیسے ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوئے۔ یہ نہیں ہوگی تو بہرحال توبہ کرلیں گے اللہ کے پاس' مرنے سے پہلے توبہ کرلی جائے گی۔ ان چیزوں کے اندر اس فریب کے اندر گرفتار ہو چکی ہوئی ہے یہ قوم۔ عزیزانِ من! حیرت یہ ہے آپ دیکھیے' دین کتنی بلندیوں پہ پہنچاتا ہے' مذہب کتنی

پستیوں پہ لے جاتا ہے۔ جتنی قومیں مذہب کو چھوڑے ہوئے ہیں' دین پہ نہیں بھی آئے' خالی اپنی فکر سے بھی جب وہ کوئی باتیں کرتے ہیں تو کبھی یہ نہیں وہ کہتے کہ اگر کسی سے کوئی جرم ہو گیا ہے تو اس کے بعد وہ یہ کہے کہ صاحب! اس کی سزا سے بچنے کے لیے مجھے چاہیے یہ کہ میں ایک کونے میں اندر بیٹھ کے چند الفاظ کو دہراتا رہوں' وہ کبھی یہ نہیں کرتے یعنی غلط ہی سہی کوئی عملی قدم اٹھاتے ہیں اس سے بچنے کے لیے۔ لیکن مذہب کے اندر جو قوم گرفتار ہو جاتی ہے وہ عمل سے بے گانہ ہوتی ہے۔ بیمار ہوتی ہے تو تعویذوں کی طرف' مقدمے ہوتے ہیں' تو مزاروں کی طرف' بزنس میں نقصانات ہوتے ہیں تو پیروں کی طرف۔ اور اگر خدا کی طرف آتے ہیں تو وہاں بھی الفاظ دہراتے ہیں وہ۔ یاد رکھیے قرآن ہو' اسلام ہو' دین ہو' نہ یہ پڑھنے کی چیز ہے نہ یہ ورد وظیفے کی چیز ہے۔ یہ کرنے کی چیز ہے۔ اس میں جو لکھا ہے' وہ اس لیے لکھا ہے کہ اس کے مطابق کرو تم۔ پڑھتے چلے جاؤ ساری عمر پڑھتے چلے جاؤ علمی طور پہ تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ سنکھیا اس قسم کا ہوتا ہے' اس کی خاصیت ہلاکت ہوتی ہے۔ پڑھتے چلے جاؤ اور اس کے ساتھ سنکھیا پھانکتے چلے جاؤ۔ یہ علم اس لیے حاصل کیا تھا کہ آپ کو سنکھیے اور مصری میں تمیز آ جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ سنکھیے سے محتاط رہیے۔ مذہب میں انسان اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ کچھ الفاظ ہیں جن کو دہرایا جائے گا۔

انسانی زندگی کے آغاز میں فطرت کی مہیب قوتوں کے سامنے عقل انسانی کا کردار

بات پھر دوسری طرف چلی جائے گی میں نے جیسا عرض کیا تھا انسان کی پہلی جہالت کی زندگی میں ایک MAGIC AGE آئی تھی جب یہ بے بس تھا' نہتا تھا۔ فطرت کی مہیب قوتیں اس کے سامنے آتی تھیں' ان سے بچنے کا کوئی سامان اس کے پاس نہیں تھا۔ تو پہلی چیز تو اس کے سامنے تھی جسے پرستش کہتے ہیں۔ بجلی کڑکی اور اس نے ہاتھ جوڑ دیے' بادل گرجا اور یہ سجدے میں گر گیا' گنگا کا سیلاب آیا اور اس نے مائی کہا۔ سانپ اور شیر سامنے اور اس کے حضور میں اس نے کچھ پیش کیا۔ یہ ہے پہلا تصور جو WORSHIP کا آتا تھا انسان کی اپنی بے بسی کے لیے فریبِ خویش۔ اس سے ذرا اور آگے بڑھے تو کچھ ان میں سے لوگ ایسے زیادہ سمجھ کے پیدا ہوئے' انہوں نے لوگوں کو فریب دینا چاہا۔ انہوں نے کہا کہ نہیں! ان کے سامنے جھکو گے تو یہ اوپر چڑھ آئیں گی قوتیں۔ ایسا انتظام کیا جا سکتا ہے جس سے ان کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ ہماری مرضی کے مطابق یہ کچھ کریں۔

فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں الفاظ اور کچھ لکیروں کے سہاروں کی غلط سوچ اور اس کا نتیجہ

جی کیسے مجبور کیا جا سکتا ہے؟ علم سے تسخیرِ فطرت سے تو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ ان قوانین کو STUDY کرو اور پھر ان

قوتوں کو مسخر کرو تو وہ تو ابھی یہ انسان جانتا نہیں تھا۔ انہوں نے کہا' اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ چند الفاظ ہیں' ان کو اس طریقے سے دہراؤ۔ یہ چند رسومات ہیں اس طرح سے ان کی ادائیگی کرو' اس طرح سے کوئی ورد کرو' اس طرح سے کوئی وظیفہ کرو' ان الفاظ میں یہ تاثیر ہے کہ وہ ان چیزوں سے تمہاری مدافعت کر دیں گی۔ چیچک آئی اور انہوں نے چار لکیریں اس طرح سے کھینچیں کہ یہ باہر رہے گی۔ وبا پھیلی انہوں نے تعویذ دیا۔ بارشیں نہیں ہو رہی ہیں انہوں نے کسی قسم کے ورد بتا دیے۔ یہ اسے AGE OF MAGIC کہتے ہیں۔ اس کے اندر تصور یہ ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے اندر اس قسم کی تاثیر ہوتی ہے کہ ان سے یہ باہر کی قوتیں جو ہیں وہ مغلوب ہو جاتی ہیں' مرادیں بر آنے لگ جاتی ہیں' ان کے اندر یہ اثر ہے۔ یہ تھی AGE OF MAGIC۔ آپ کو معلوم ہے کبھی کوئی تعویذ جو ہے وہ تو وہ حکم لگا دیتے ہیں نا کہ کھولنا نہیں اس کو۔ وہ کھلنے سے یہ نہیں کہ ان کا پردہ کھلتا ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ اس میں سے اثر اڑ جاتا ہے اور بعض اوقات تو پھر الٹا پڑ جاتا ہے۔ اس کو کھول کے دیکھیے اس میں ہوتا کیا ہے؟ اس میں ہندسے لکھے ہوئے ہوتے ہیں اس ترتیب سے کہ اِدھر سے اُدھر پڑھیے تو میزان ویسی ہے۔ اُدھر سے اِدھر کیجیے تو میزان ویسی ہے اِدھر سے اُدھر پڑھیے تو میزان ویسی ہے۔ بالکل ایک MECHANICAL سی چیز ہوتی ہے۔ لیکن ان ہندسوں کے اندر وہ کہتے ہیں یہ اثر ہوتا ہے کہ یوں آپ نے لپیٹا دروازے پہ لگایا اب کوئی جن اندر نہیں آ سکتا۔

قرآنِ حکیم کے ہاں تلاوت کا مفہوم تو اتباع کرنے یا پیروی کرنے کا ہے۔

انسان AGE OF MAGIC کی ان جہالتوں میں چلا آ رہا تھا کہ قرآن آیا اور اس نے آ کے کہا کہ فطرت کی قوتوں کو روکنا چاہتے ہو' ان ملائکہ کو اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھنا چاہتے ہو؟ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ (2:31) فطرت کے قوانین کا علم حاصل کرو' یہ جن تمہارے قابو آ جائیں گے۔ الفاظ کے متعلق اس نے کہا کہ الفاظ جو ہیں' وہ معنی رکھتے ہیں' ہر لفظ کا معنی ہوتا ہے' اس کی رو سے وہ مطلب سمجھا جاتا ہے۔ اور مطلب اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ اس کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں قرآن نے جو تلاوت کا لفظ استعمال کیا ہے اس کے معنی ہیں پیروی کرنا' اتباع کرنا' کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ پہلی چیز جسے آپ قرأت کہتے ہیں اس کے معنی ہیں اعلان کرنا PROCLAIM کرنا' دنیا کے اندر اعلان کر دو کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ظالم کی کھیتی نہیں پنپا کرتی اور اس کے بعد وہ کر کے دکھاؤ کہ کسی ظالم کی کھیتی نہ پنپ سکے۔ یہ قرأت ہے وہ تلاوت ہے صاحب۔ لیکن دین جب مذہب میں آتا ہے تو وہی MAGIC AGE جو ہے ان کے اوپر پھر آ جاتی ہے کہ ان الفاظ کے اندر یہ برکت ہے۔ الٓمّٓ پڑھا اور تیس نیکیوں کا ثواب کیوں کہ ہر حرف سے دس نیکیوں کا ثواب ہوتا ہے نا۔ باندھتے رکھے چلے جایے گٹھڑیوں کی گٹھڑیاں ثواب کی۔ ہوتا

کیا ہے؟ یہاں تو کچھ ہوتا نہیں ہے، دن بہ دن حالت خراب ہوتی چلی جاتی ہے، ثواب کی گٹھڑیاں آگے جا کے کھلیں گی۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوتا چلا جا رہا ہے کچھ نہیں نہ کوئی لیتا ہے، نہ دیتا ہے

تیری چشم مست کے سامنے مے ناب یوں ہی دھری رہی
نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی جو بھری تھی خم میں بھری رہی

پڑھتے جائیے تلاوتیں ہو رہی ہیں قراءتیں ہو رہی ہیں۔

مذہب نے ہمارے ہاں قراءت کا لفظ ہو یا مغفرت کا، جزا کا ہو یا ثواب کا، یا برکت کا، ہر لفظ پر عجمی رنگ کی تہیں جما رکھی ہیں

اب تو قراءت وہ فن ہوگئی ہے کہ آپ کے ہاں کھیپ پہ کھیپ چلی آتی ہے ان کی۔ وہ آپ دیکھیے پھر محفلیں جو منعقد ہوتی ہیں، اس طرح گا گا کے قرآن پڑھا جاتا ہے۔ اول و آخر یہ کہہ کے کہ موسیقی حرام اور ساری قراءت موسیقی میں ہوتی ہے۔ حجاز سے جتنے آتے ہیں وہ بھیروں میں قرآن گاتے ہیں، جتنے مصر سے آتے ہیں وہ بھیر دین میں گاتے ہیں اور جہاں یوں جھومتے ہیں نا وہ وہاں موسیقی کی لذت ہوتی ہے۔ MAGIC AGE الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے۔ استغفر اللہ کے معنی ہوئے کہ چند الفاظ دہرا لیجیے۔ عزیزانِ من! یہ ہے مذہب۔ دین یہ ہے جس میں بتا دیا کہ ذکر اللہ کے معنی کیا ہیں؟ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ (11:114)۔ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ مَّغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط (3:136) یہ ہے جزا بدلا (بدلا تو کسی کام کا ہوتا ہے) مغفرۃ یہ ہے سامانِ حفاظت جو ان کے رب کی طرف سے ملتا ہے۔ زندگی پریشانیوں کی نہیں، خوشحالیوں کی جنتیں شادابیوں کی کامرانیوں کی ہمیشہ رہنے والی جب تک یہ اعمال اس طرح سے سرزد ہوں گے، یہ جنتیں اسی طرح سے پھل دیے جائیں گی۔ دوسری آیت میں یہ ہے کہ یہ شجرِ طیب وہ ہوتا ہے کہ جو ہر موسم میں اپنا پھل دیتا ہے

بہار ہو کہ خزاں لا الـــــــہ الا الـــلـــــــہ

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نزدیک ''اعمالِ قرآنی'' میں قرآنِ حکیم کی آیتوں کی تاثیر قابلِ غور ہے

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (3:136)۔ ملتا کیسے ہے؟ ان الفاظ کے دہرانے سے؟ تلاوت کرنے سے؟ قراءت سے؟ ذکر سے؟ (ان مفہوم میں میں لے رہا ہوں جن میں لیا جاتا ہے) کچھ پڑھنے سے؟ یہ جنت یوں ملتی ہے؟ وہ کہتا ہے

وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (3:136) کام کرنے والوں کا اجر کتنا اچھا ہے یہ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (3:136) ہے۔لیکن مجھے تفسیر بھی آتی ہے انہوں نے کہا عامل ہے نا''تہانوں پتہ اے ناعامل کون ہوندے نیں'' یہ اخباروں میں آپ نے اشتہار پڑھا ہوگا نا' چوک مکی کے اندر وہ عامل ہے جی قرآن شریف کا''جن کڈ دا اے آن کے''۔عزیزانِ من! آپ سوچیے کیا کچھ ہوا ہوا ہے آپ کے ساتھ۔یہاں پہنچ کے تو اگر ذرا بھی کہیں قسمت بیدار ہوتی ہے' تو یہیں پہنچ کے ذہن میں آجاتا ہے کہ یہ تو کچھ کرنے کی چیزیں ہیں جو اوپر کہی گئی ہیں۔اس نے کہا نہیں نہیں' تمہیں پتہ نہیں ہے۔عامل وہ ہے وہ پھر وہ جن نکالتے ہیں صاحب۔پھر آپ کو پتہ ہوگا کہ عمل اب کیا ہوا؟ عملیات کی کتابیں آپ کے ہاں ملتی ہیں نا۔دیکھتے ہیں کدھر سے کدھر لے جاتے ہیں توجہ؟ یہ ہے سازش جو ہوتی ہے دین کے ساتھ' بڑی گہری سازش۔''اعمالِ قرآنی'' کتابوں کے نام ہیں مولانا اشرف علی تھانوی اندازہ لگایے کتنے بڑے عالم ہیں لیکن چونکہ اتنے بڑے پیر بھی ہیں' اعمالِ قرآنی ان کی کتاب کا نام ہے قرآن کی آیتوں کی انہوں نے تاثیرات لکھی ہوئی ہیں۔سورۃ بقرۃ کی آیت فَذَبَحُوْهَا (2:71) وہی جو گائے کے ذبح کرنے میں ہے لکھا ہوا ہے کہ اس آیت کو پڑھ کے چھری پھونکیے تو خربوزہ کاٹیے تو میٹھا ہو جاتا ہے۔''ایویں سکرین لبھدے پھردے نیں خربوزے ویچن والے''۔عزیزانِ من! کیا چیزیں ہنسنے کی ہیں؟ خون کے آنسوں رونے کی چیزیں ہیں۔اس نے کہا اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (3:136) انہوں نے کہا کوئی بات نہیں گھبراؤ نہیں ہم بتاتے ہیں عمل کیا ہوتا ہے' عامل کون ہوتا ہے' پھر عملیات کیا ہوتی ہیں' اعمالِ قرآنی کیا ہوتے ہیں' سارے آپ کے دیے ہوئے ہیں۔جہلا نے نہیں دیے ہوئے وہ جاہلوں کا عمل تو اور ہوتا ہے''عامل جنوں کیندے نیں او عمل کردا اے تہانوں پتہ اے کی ہوندا ہیگا؟'' خیر کچھ تو ہیں جن کو پتہ ہے۔ہیں ابھی قوم میں عمل کرنے والے بھی''آ بھنگ' چرس' افیون' ڈوڈے آ عمل اے ہوندا ہیگا''۔کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں کتنی بڑی حقیقت ہے۔

صداقتوں کی حقیقت اور حقائق کی اہمیت کی بجائے اعتقادات کو اپنانے کا نتیجہ

جس قوم نے عمل کو یہ کچھ سمجھ لیا جو قوم پھر سے عمل کی دنیا سے اسی الفاظ کی دنیا میں چلی گئی' ذہنی سحر کی دنیا میں' اعتقادات کی دنیا میں' نظریات کی دنیا میں' خالی الفاظ کی دنیا کے اندر چلی گئی۔دیکھنا چاہتے ہو کیا ہوتا ہے؟ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ لا (3:137) تم سے پہلے بھی گذرے ہیں اس قسم کے۔یہاں سنن کہا ہے امم نہیں کہا ہے کیا بات ہے قرآن کی؟ قومیں نہیں کہا۔کہا مسالک و مشارب اس قسم کے پہلے بھی گذر چکے ہیں' طریقے اس قسم کے پہلے گذر چکے ہیں۔ان طریقوں کی حامل قوموں کو جا کے دیکھو فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ (3:137) جاؤ چلو پھرو نظری بات نہیں میں کہتا' میں نے کہا' تم نے ذہن سے ہی کچھ سمجھ لیا اپنے اپنے

ذہن سے فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ (3:137) جاؤ چلو پھرو زمین کے اندر' جاؤ اور کھودو ان زمینوں کو ان کھنڈرات کو پھر پڑھو کہ ان کھنڈرات کی ٹھیکریوں کے اوپر ان قوموں کی داستانیں لکھی ہوئی ملیں گی تمہیں۔

حجروں میں بیٹھ کر سیر وا فی الارض کے وظیفے کرنے والی قوم کی داستان کا نتیجہ ہمیشہ بے چراغ بستیوں کی شکل ہوتا ہے

عزیزانِ من! آج علم کی دنیا میں سب سے زیادہ مستند علم جو ہے آرکیالوجی کو گنا جاتا ہے۔ پرانے کھنڈرات کو کھودتے ہیں' اس کے اندر سے جو آپ کے ہاں یہ ٹھیکریاں نکلتی ہیں ان کو پڑھتے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار سال دس دس ہزار سال پہلے کے زمانے کی چیزوں پہ اتنی محنت کرتے ہیں TIME DETERMINE یا AGE DETERMINE کرتے ہیں ان کی کہ کب کی بات ہے یہ۔ وہ جو ان کے اوپر حروف لکھے ہوئے ہوتے ہیں' اس زبان کا علم حاصل کرتے ہیں پھر تاریخ مرتب کرتے ہیں پھر وہاں سے بتاتے ہیں۔ کیا بتاتے ہیں؟ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ (3:137) جن قوموں نے ان صداقتوں کو جھٹلایا تھا ان کا انجام کیا ہوا' وہ یہ بتاتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اور پھر دہرا دوں اس ہر بار کے دہرانے میں ایک عبرت ہوتی ہے۔ ایک ہمارے ہاں ''سیر وا فی الارض'' ہوتا ہے وہ جو حجرے میں بیٹھے ہوئے مصلے پہ بیٹھے ہوئے حضرت صاحب ورد کر رہے ہوتے ہیں' سیر وا فی الارض کا وظیفہ ہوتا ہے وہ۔ پتہ ہے خصوصیت اس کی کیا ہوتا ہے؟ چالیس دن تک وہاں سے باہر نہیں نکلنا سیر وا فی الارض ہے۔ پتہ نہیں آپ میں سے کوئی ان آستانوں پہ کبھی گیا ہے یا نہیں ورنہ آپ کو یہ معلوم ہو جاتا۔ بہت ہی مقرب ہیں آپ جا رہے ہیں حضرت صاحب کو ملنے کے لیے' وہ روک دیتا ہے کہ نہ نہ اندر نہ ابھی جانا۔ بیٹھ گئے باہر کہ اچھی بات وہ تشریف لائیں گے تو پھر' کہنے لگے کہ نہیں! ابھی تشریف نہیں لائیں گے۔ ابھی آج کل آپ چلے جایئے' وہ مہینہ بھر کے بعد پھر آیئے گا پھر وہ آئیں گے۔ کہنے لگے کیوں کیا ہوا' خدانہ کردہ طبیعت خراب ہے؟ کہنے لگے نہیں! وہ حضور آج کل ''سیر وا فی الارض'' کے وظیفے میں لگے ہوئے ہیں باہر نہیں نکلیں گے۔ ''سیر وا فی الارض'' بیٹھے ہوئے ہیں ''سیر وا فی الارض'' ہو رہا ہے۔ پتہ ہے ایک تو یہ فلک سیر ہیں نا یہ جو خلانورد ہیں امریکہ کے۔ وہ گئے ہیں آسمانوں کے اوپر وہاں انہوں نے فلک کی سیر کی ہے۔ ایک آپ کے ہاں معجونِ فلک سیر ہوتی ہے' وہ بھنگ سے برفی بنائی ہوئی ہوتی ہے ایک۔ عزیزانِ من! یہ سب چیزیں برگِ حشیش کی ہیں۔ کبھی اس کے کھانے سے وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کبھی اپنے آپ کو فریب دینے سے ہوتی ہے۔ فریب ہی دونوں صورت میں ہوتا ہے' وہ طبعی طور پہ فریب ہوتا

ہے' یہ ذہنی طور پہ فریب ہوتا ہے۔ بیٹھے ہیں فلک سیر ہو رہا ہے۔ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ (3:137) اللہ اکبر! کافرین نہیں کہا ایک تو وہ ہے کہ جو انکار کر دیتا ہے۔ تکذیب یہ ہوتی ہے کہ زبان سے ان چیزوں کو مانتا ہے عملاً اس کے خلاف کرتا ہے' اسے تکذیب کہتے ہیں۔ اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يُكَذِّبُ بِالدِّيۡنِ ؕ(107:1) تم نے اس کی حالت پہ غور کیا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ تو وہ تو ہم سمجھتے تھے کہ صاحب غیر مسلموں کی بات ہے' مانتا ہی نہیں ہے' نہ۔ آ گے ہے۔

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۙ‏. الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۙ (5-107:4) نظر آیا کہ کچھ نمازیوں کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ تکذیب یہاں لایا ہے قرآن۔ یہ کافر تو نہیں ہوتے۔ تکذیب ایک عمل کی چیز ہے عملاً اس کو جھٹلاتے چلے جانا' اس کی خلاف ورزی کرنا۔

کیا پاکستان میں آنے والے اس موجودہ تاریخی سیلاب کی تباہی ہماری مذہبی اور سیاسی تفرقہ بازی کی عملی تفسیر نہیں؟

عزیزانِ من! جو حالت آج اپنی ہے غور تو کیجیے گا' مکذبین کے اندر آتی ہے یا نہیں آتی۔ باقی رہا یہاں كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ (3:137) تو اس کے لیے تو کھنڈرات کھودنے کی ضرورت نہیں ہے ہم چلتی پھرتی لاشیں سامنے ہیں ان کے۔ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ (3:137)۔ کہا هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (3:138) بیان کے معنی ہوتا ہے کسی بات کو ابھار کے سامنے لے آنا۔ تاریخ کے یادداشتوں سے جو نتائج استنباط کیے جاتے ہیں' وہ ہیں جسے قرآن کبھی تذکرہ کہتا ہے' کبھی بیان کہتا ہے۔ ابھی ابھی یہ کہا ہے نا کہ جاؤ چلو پھر وان پرانی بستیوں کے کھنڈرات کو پڑھو پھر دیکھو کہ ان کا انجام کیا ہوا۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (3:138) عام لوگوں کے لیے ایک بات ہے جو وضاحت سے ہم نے بیان کر دی ہے۔ ٹھیک ہے یہ علمی چیز ہوئی۔ وَ هُدًى وَّ مَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ (3:138) اور جو پھر ان قوانین کی نگہداشت کرنے والے ہیں ان کے لیے یہ کشادگی راہیں سامنے لاتی ہے اور مستقل اقدار جو ہیں' اخلاقی اقدار جو ہیں' وہ ان کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اور یہ کہنے کے بعد کہا کہ وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ (3:139) یہ چیز آئی تھی نا پہلے کہ نقصان پہنچتا ہے طبعی طور پر' ہو سکتی ہیں ایسی چیزیں۔ وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا (3:139) دو باتیں یہاں کہی ہیں تَهِنُوۡا (3:139)' وھن تو یہ ہوتا ہے یہ افراط سے جو مل جاتی ہیں نا خوشحالیاں' خوشحالیوں کے زمانے میں پھر کام کاج چھوڑ دیتا ہے آدمی کام کاج دوسرے کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم اور اقبالؒ کے الفاظ میں مقامِ آدم کے بعد مقامِ مومن کی پہچان

آپ کو پتہ ہے ربوا کی بات چلی آ رہی تھی ربٰو سے قوم میں یہ وھن پیدا ہوتا ہے۔ روپیہ انوسٹ کیا' آپ بیٹھے ہوئے ہیں' عیاشیاں کر رہے ہیں۔ کام مزدور کر رہے ہیں وہاں۔ خوشحالی کے زمانے میں جو سستی اور کاہلی پیدا ہو جاتی ہے وہ ہوتی ہے وھن۔ اور حزن ہوتا ہے کہ وہ جونہ ہونے کے زمانے میں افلاس کی وجہ سے جو حزن غمگینی افسردگی پیدا ہوتی ہے' وہ حزن ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ اگر افراط سے کچھ مل رہا ہے تو اس میں یہ صورت نہیں ہے کہ کام کاج چھوڑ کے قوم بیٹھ جائے۔ لوٹ کے اوپر جب قوم آتی ہے وھن ہوتا ہے اس میں۔ اور یہ بھی نہیں ہے کہ کبھی اگر کسی حادثے سے ہنگامی حادثے سے ایسی صورت ہو سکتی ہے کسی قوم کے اوپر زلزلہ آ جاتا ہے تہس نہس ہو جاتی ہے جنگ ہوتی ہے' اس کے بعد کچھ کمی آ جاتی ہے اس کمی کے اندر افسردگی نہیں آنی چاہیے۔ **نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ** (3:136) آپ دیکھتے ہیں کہ کہاں آیا ہے یہ؟ خوشحالیوں کے زمانے میں بھی کام کرتے چلے جانا ہے اور اگر کبھی ناداری کا وقت آ گیا ہے قوم پہ کوئی حادثہ آ گیا ہے اس میں بھی کام نہیں چھوڑنا ہے۔ **وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ** (3:139) عزیزانِ من! **اعلون** : سب پہ غالب سب سے اونچے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

مومنے بالائے ہر بالا ترے

پیچھے رہ جانا تو ایک طرف

غیرتِ او بر نہ تابد ہمسرے

اس کی غیرت تو اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی اس کے ہم دوش چلے' دنیا میں وہ سب سے آگے ہوتا ہے **اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ** (3:139)۔

عزیزانِ من! یہ روز آپ کے ہاں کفر کے فتوے فتوے لگتے ہیں' لگ رہے ہیں۔ یہ کافر ہو گئے ہیں یہ مومن ہیں۔ قرآن نے بھی بتائی ہے ایک تمیز کافر و مومن کے اندر۔ ذہنی اعتقادی نہیں ہے' عملی چیز ہے' مرئی چیز ہے' مشہود چیز ہے' دیکھنے کی چیز ہے' سامنے آ جانے والی چیز ہے۔ غور کیجیے گا کہ اس بارگاہ سے کیا فتویٰ ملتا ہے؟ نکالیے آیت اور کپکپا کے رہ جایے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں مومن کا مقام کافر کا مقام۔ **وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** (4:141) یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کافر مومنوں کے اوپر غالب آ جائیں **لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ** (4:141)۔ لیجیے فتویٰ ملا آپ کو اس بارگاہِ عظیم سے فتویٰ ملا کہ جس کو فتویٰ دینے کا حق حاصل ہے۔ پہچان لیا آپ نے کیا مقام ہے۔ **وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** (4:141)

نہیں ہوسکتے۔ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) کی تفسیر ہوگئی۔ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (3:139) سیدھی سی بات ہے مومن پر کوئی غالب نہیں آ سکتا جماعتِ مؤمنین پر۔یعنی ہنگامی طور پر یہ ٹھیک ہے میدانِ جنگ میں شکست بھی ہوسکتی ہے' وقتی طور پہ احد کے میدان میں ہوئی تھی شکست' ابھی آتی ہے وہ بات۔ یہ کسی ہنگامی یا عارضی طور پہ کسی چیز کا ایسا ہوجانا نہیں ہے بلکہ یہ مستقل روشِ زندگی ہے۔تو یہ نہیں ہوگا کہ یہ قوم جو ہے جماعتِ مؤمنین' قوم مؤمنین دنیا میں موجود ہو اور کفار کی قوم ان پہ غالب آئی ہوئی ہو۔ یہ ان کے ماتحت ہوں' ان کے محکوم ہوں' چہ جائیکہ کفار کی محکومی کو ہی عینِ اسلام بتادیا جائے' ہو ہی نہیں سکتا وہ۔ پرکھتے چلے جایے دیکھ لیجیے فتویٰ کہاں لگتا ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔اب یہ رہی بات کہ صاحب! وہاں احد کے میدان کے اندر تو شکست ہوئی تھی۔کہا ٹھیک ہے اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ط (3:140) میدانِ جنگ کے اندر تو یہ ہوتا رہتا ہے تمہیں یہاں شکست ہوئی تھی اس سے پیشتر بدر کے میدان میں تم نے دیکھا ہے کہ ان کو کتنی بڑی شکست ہوئی تھی۔اور یہ شکست تو تمہاری یوں ہی چند ساعت کی شکست تھی۔ یہ چیزیں جو ہیں اس قسم کی یہ اتفاقی اور ہنگامی جو ہوجاتی ہیں زندگی کے اندر جیسا میں نے ابھی عرض کیا تھا' باطل کے معاشرے کے اندر یہ چیز ہنگامی طور پر ہوسکتی ہے کہ ایک نہایت باعزت نہایت معزز نہایت پاکیزہ زندگی بسر کرنے والے کے اوپر بھی کیچڑ اچھال کے پھینک دیا جائے۔ہنگامی طور پہ کسی قوم کے اوپر اس قسم کے حوادث بھی آ سکتے ہیں۔کہا وَتِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیۡنَ النَّاسِ ج (3:140) یہ حوادث کی گردشِ دولابی ہے ایک چکر ہے یہ بھی کبھی وہ اوپر ہوسکتے ہیں' کبھی یہ اوپر ہوسکتے ہیں۔ نُدَاوِلُهَا (3:140) کبھی ہنگامی طور پہ یہ اگر آ گئے ہیں اوپر تو وہ فوراً نیچے چلے جائیں گے' مستقل روشِ زندگی یہی رہے گی کہ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139)۔ نُدَاوِلُهَا (3:140) کیا بات قرآن کہہ گیا ہے؟ یہ مستقل روش نہیں ہوگی۔

زندگی میں پیش آنے والے مختلف حوادث انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا ذریعہ ہوتے ہیں

اگر کوئی قوم یہ سمجھ لے کہ صاحب! اس دنیا کے اندر محکوم مفلس نادار ضعیف کمزور ناتواں عاجز رہنا' یہ تو ہے خدا کے مقربین کی نشانی مستقلاً اور یہ دنیا جتنی ہے یہ کفار کے لیے مستقلاً۔تو نُدَاوِلُهَا بَیۡنَ النَّاسِ (3:140) تو ختم ہوگئی بات۔وہ کہتا ہے ہم گردش دیتے ہیں یہ کہتے ہیں نہیں صاحب! ''او گردش دین والی مشین جیہڑی سی ٹٹ گئی ہیگی اے ہن جتھے کوئی ہے او تھے ای ہے''۔ نُدَاوِلُهَا (3:140) یہ بات بتا رہا ہے کہ زندگی میں اگر جمود آ گیا ہے کہیں بھی کسی قوم میں کہ جس حالت کے اندر ہے' اس حالت کے اندر وہ قناعت کر گئی ہے۔گڑھے میں گر جانا اور بات ہے' اتفاق سے گرنے کے بعد قناعت کرنے کے بیٹھ جانا کہ اصل سطحِ ارض ہی یہ ہے جس پہ میں ہوں' یہ ہے وہ فریب' نُدَاوِلُهَا (3:140) نہیں اس میں رہتا۔اچھا یہ کاہے کے لیے یہ کبھی ایسے ایسے

ہنگامے آجاتے ہیں؟ اس قسم کے حادثے آجاتے ہیں جس میں شکست بھی ہوجاتی ہے؟ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ (3:140) ایسے ہی مواقع کے اوپر تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایمان دار کون ہیں اس میں۔ صحیح ایمان کے مظاہرے کے یہ مواقع ہوتے ہیں جس میں کبھی کوئی چیز ناساعد بھی آتی ہے حالات کی۔ ٹکراؤ کے اندر یہ چیز بھی ہوتی ہے وہیں تو پرکھ ہوتی ہے آکے۔ عزیزانِ من! ابھی دیکھیے گا اگلی آیت میں کیا بات کہی گیا ہے قرآن؟ وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ (3:140) اور پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اپنے ایمان کی شہادت دیتا ہے اس عمل سے۔ یہ جو ہمارے ہاں شہید کہا جاتا ہے اس کے لیے قرآن نے ان معنوں میں نہیں وہ لفظ استعمال کیا۔ شہدا ایک چیز تو ہے نا ذہنی طور پہ آپ نے ایک عقیدہ رکھا ہوا ہے وہ تو ٹھیک ہے' مومن مغلوب نہیں ہوسکتا۔ اس نظریے اس عقیدے کی شہادت جسے آپ کہتے ہیں EVIDENCE پیش کرنا یہ ہوتا اس کے معنی' شہید کے معنی گواہ ہوتا ہے۔ پھر عملاً گواہی تم سے لی جاتی ہے تمہارے ایمان کی' دیکھا جاتا ہے۔ جسے آپ مشہود کہتے ہیں نا ایک چیز MANIFEST ہوکے سامنے آجانا VISIBLE وہ ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ تمہارا اعتقادی تھا اس شکست کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ اس دعوے کی عملی شہادت کون بہم پہنچاتا ہے۔ اور اگر صورت یہ ہے کہ تم نے اپنے اس اعتقادی چیز کو ہی سمجھ لیا ہے کہ یہی ہے سب کچھ؟ قرآن کہتا ہے وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (3:140) جو ہر چیز کو اپنے مقام پہ نہیں رکھتا وہ ہمارے ہاں پسندیدہ نہیں ہے۔ اب کاہے کے لیے یہ ہم ایسے ایسے مواقع بہم پہنچاتے ہیں؟ وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ (3:141) مَحَّصَ کا لفظ کیا آیا ہے یہاں؟ کہتا ہے وہ سونے کو بھٹی میں جب ڈالا جاتا ہے اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ اگر آمیزش اس میں ملاوٹ ہوگئی ہے تو اس سے وہ الگ ہوجائے اور سونا کندن بن کے نکلے۔ اس قسم کے حوادث میں جو تم آتے ہو (فتنے کا لفظ یہیں سے ہی ہے) تو یہ تو وہ بھٹیاں ہوتی ہیں جس میں تم اگر پڑتے ہو تو کندن بن کے نکلتے ہو۔ اور اس آگ میں اگر کسی چیز کو ڈالا جائے اور وہ راکھ ہوجائے وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ (3:141) کافر راکھ ہوجاتا ہے اس میں مومن' کندن بن کے باہر نکل آتا ہے۔ حادثے دونوں پہ آتے ہیں۔

جنت کے حصول کا طریق اور اس کا معیار (2:214;29:2;3:142)

عزیزانِ من! سنیے وہ آیت آگئی جس کی تمہید تھی یہ سارا کچھ۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (3:142) اچھا! یوں سمجھے ہوئے ہو' مصلے پہ ورد کرلیا' کچھ قرآن کی تلاوت کرلی' کچھ قرأت کرلی' اپنے طور پہ کچھ اچھے کام کیے' جنت کے مستحق ہوگئے صاحب۔ کہتا ہے تم یہ اَمْ حَسِبْتُمْ (3:142) کیا یہ خیال کیے بیٹھے ہو اپنے دل کے اندر' یہ عقیدہ ہے تمہارا جنت میں داخل

ہوجائیں گے یوں ہی۔ وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ جٰھَدُوْا مِنْکُمْ وَ یَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ (3:142) تا نکہ ابھی موقع ہی ایسا نہیں آیا دیکھنے کا کہ تم میں سے کون ہے جو میدانِ جنگ میں سربکف آ جاتا ہے' کون ہے جو مصائب کے سامنے استقلال و استقامت سے جم کے چٹان کی طرح کھڑا ہوجاتا ہے۔ کہتا ہے اس کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ جنت کا حق دار کون ہے جنت کا مستحق کون ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ (3:142) اپنے ذہن میں تم عقیدے کچھ رکھ لو سوال ہی نہیں ہے' وہ تو یہاں آ کے پتہ چلتا ہے۔ یہ آیہ مبارکہ ایک ہی جگہ نہیں آئی قرآنِ کریم میں۔ عزیزانِ من! بڑی اہم چیزیں ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ جنت کے مستحق کون ہوتے ہیں؟ اَمْ حَسِبْتُمْ (2:214) وہاں بھی یہی ہے اور یہاں ذرا تفصیل دی گئی ہے اس کی۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ (2:214) کیا تم اپنے ذہن میں خیال کیے بیٹھے ہو کہ بس یوں ہی جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ امتِ محمد ﷺ میں شمار ہوا' جنت کے دروازے کھل گئے۔ وَ لَمَّا یَاْتِکُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ ط (2:214) ابھی تو اس قسم کے حادثات آئے ہی نہیں' تصادمات تمہارے سامنے آئے ہی نہیں جن سے پہلے وہ لوگ گذرے ہیں کہ جو جنت کے مستحق ہوئے تھے۔ مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا (2:214) مخالفتوں کے ہجوم آئے شدائد اور مصائب کے انبار آئے ان کے سامنے زُلْزِلُوْا (2:214) ہلا دیا انہوں نے ان کو پاؤں سے' زلزلہ پیدا ہوگیا۔ کیا بات ہے صاحب؟ اس قسم کے حوادث آئے۔ حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ط (2:214) ایسی کیفیت پیدا ہوگئی کہ بے ساختہ زبانوں پہ یہ بات آ گئی کہ وہ اللہ کی مدد کہاں ہے' کب آئے گی مَتٰـــی (2:214)۔ یعنی اتنا نازک وقت آ گیا کہ یہ ہوگیا کہ اب بھی اگر نہ آئی تو پھر کب آئے گی۔ یہ کیفیت پیدا ہوئی۔ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ (2:214) ہماری نصرت نے پکارا کہ آفرین ہے تم پر' بڑی ثابت قدمی سے تم نے مقابلہ کیا وہ دیکھو آ ئی ہماری مدد جو ہے۔ کن کو مل رہی ہے؟ یہ ان کو مل رہی ہے کہ اس قسم کا تزلزل پیدا ہو رہا ہے پھر بھی ہمت نہیں ہارتے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ (2:214) تو تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ یہ کچھ نہیں ہوگا اور جنت کا ٹکٹ تم کو مل جائے گا؟ اس خیالِ خام کو دل سے نکال دیجیے۔ ایک اور حوالہ لے لیجیے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ (29:2) وہی اَمْ حَسِبْتُمْ (2:214) آ رہا ہے صاحب۔ یہ عقیدہ رکھے ہوئے ہو تم اپنے ذہن میں۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (29:2) کیا تم سمجھے ہوئے ہو کہ یہ کہہ دینا کہ صاحب الحمدللہ ہم مسلمان ہیں یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے یَّقُوْلُوْٓا کیا بات کہی ہے قرآن نے؟ محض زبان سے یہ چند الفاظ ادا کرنے سے تم سمجھتے ہو ان یتــرکوا کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے کہ بس ٹھیک ہے چلو بھئی جنت میں چھوڑ دیے جاؤ گے۔ وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (29:2) اور تم ان کٹھالیوں میں سے نہیں گذارے جاؤ گے؟ لوگ یہ سمجھتے

ہیں کہ وہ ان کٹھالیوں میں سے نہیں گذارے جائیں گے۔ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ (29:3) زبان سے کہہ دینے والا جو ہے وہ تو ایک اپنے آپ کو کہتا ہے کہ صاحب! ایمان لائے۔ کہتا ہے اس سے پیشتر بھی اس قسم کی بھٹیاں جو تھیں بھڑکائی گئی تھیں اس میں سے گذارا گیا تھا قوموں کو تاکہ معلوم ہو جائے سچا کون ہے جھوٹا کون ہے۔

جنت کے حصول کا فیصلہ میدانِ جنگ میں نکھر اور ابھر کر سامنے آ جاتا ہے (33:10)

عزیزانِ من! سچ اور جھوٹ کی نکھار تو میدانِ جنگ میں ہوتی ہے جا کر' مصائب کے مقابلے میں ہوتی ہے جا کر۔ یہ ہے جس طریق سے جنت میں جانے کی بات ہوتی ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ میدانِ جنگ میں ہوتی ہے' اپنی طرف سے نہیں کہا (9:16)۔ اور جنگ سے مراد صرف وہی جنگ نہیں ہے ہتھیاروں سے جو لڑی جاتی ہے' حق اور باطل کا تصادم تو ہر قدم قدم پہ ہوتا ہے انسان کے' یہ ساری جنگ ہوتی ہے جس میں سے انسان گذرتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ اگر میں نے حق اور صداقت کا ساتھ دیا تو یہ یہ نقصانات معاشرہ پہنچا دے گا مجھے۔ پرواہ نہ کرے ان معاشرے کی' خیال رکھے کہ میری ذات جو ہے اس پہ تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا (9:16) وہی حسب کا لفظ ہے۔ عزیزانِ من! قرآن ہے جو آیت آئے گی اس میں آپ دیکھیں گے ذہنی اعتقاد اور عمل کے اندر فرق کرتا چلا جاتا ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوْلِهٖ وَ لَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَةً ؕ (9:16) یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے تا آنکہ یہ چیز تم عملاً ثابت نہ کر دو کہ تم میں سے کون ہے جو جہاد کے لیے نکلتا ہے۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ پھر خدا اور اس کے رسول اور جماعتِ مؤمنین کے سوا کسی اور کو اپنا ولی اور دوست اور سرپرست نہیں تصور کر سکتے۔ دوسروں کی AIDS کے اوپر بھروسے نہیں کر کے بیٹھ جاتا۔ خود اپنے آپ پہ بھروسہ کرتا ہے۔ یہ ابھی دیکھا ہی نہیں ہے اس کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ جنت کا مستحق کون ہے اور کون نہیں ہے۔ حوالے کے لیے آپ ایک (33:10) ایک اور آیت بھی لکھ لیجیے۔ عزیزانِ من! بہت سی آیات ہیں میں تو چیدہ چیدہ چیزیں پیش کرتا ہوں کہ وہ کیفیت تمہارے اوپر آ گئی یہاں اس آیت میں یہ ہے (33:10) میں' اوپر سے بھی مصیبتیں' نیچے سے بھی دائیں سے بائیں سے' کیفیت یہ ہوگئی تھی وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (33:10) آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا تمہارے' دل بلیوں اچھل رہے تھے حلق تک آ پہنچے ہوئے تھے تمہارے دل۔ یہ کیفیت پیدا ہوگئی ہوئی تھی تب کہیں جا کے وہ جنت کی عروس کھڑکی میں سے جھانکتی ہے جب یہ کیفیت کہیں پیدا ہو جاتی ہے۔ کہا یہ ہے۔ تم سمجھے ہوئے ہو کہ بیٹھے ہیں اور یوں

جنت مل جائے گی۔

جنت کے حصول کے لیے عملی تگ وتاز کے خلاف ایک گہری سازش

عزیزانِ من! سارے قرآن میں یہ بتایا ہے کہ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (3:136) کہ کام کرنے والوں کا نتیجہ کتنا عمدہ ہے۔ اور پھر عمل جسے ہم کہتے ہیں اس کی تفصیلات بھی قرآن نے بتا دیں۔لہٰذا اب یہ بھی پتہ چل گیا کہ اعمالِ قرآنی کیا ہیں' عملیات کنہیں کہا جاتا ہے۔کام کرنے والا عامل کون ہوتا ہے' جنت کس طرح سے ملتی ہے۔لیکن جب پھر اس قوم کے خلاف سازش ہوئی اور دین مذہب میں بدل گیا' سب سے منتہا جو ہے تگ وتاز کا ایک مومن کی جنت کا حصول ہے۔اب جنت کے حصول کے لیے پھر دیکھیے کتنے شارٹ کٹس ہیں' کیا کیا راہیں اس کے لیے بتائی گئی ہیں اور جو قرآن نے کہا ہے ان میں سے کسی چیز کا ذکر نہیں ہے۔وقت رہ گیا ہے تھوڑا اور وہ جو دورا ہے ہیں وہ اتنی زیادہ بکھری ہوئی ہیں کہ آپ کو کہیں نہ ڈھونڈنے جانا پڑے' نہ تلاش کرنا پڑے وہ ہر جگہ۔ مثلاً جب دو مسلمان ملتے ہیں اسلام علیکم کر کے مصافحہ کرتے ہیں تو وہ دونوں بخشے جاتے ہیں۔ یہ تفصیلات آپ نے دیکھنی ہوں تو یہاں ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے ''مقامِ حدیث'' اس میں ایک باب ہے حصولِ جنت کے طریقے۔ملا ملانوں کی باتیں نہیں ہیں ایک ایک چیز اس میں احادیث کی رو سے' روایات جنہیں کہتے ہیں وہ بتایا گیا ہے اس کے اندر کہ قرآن نے یہ بتائے تھے یہ جنت جو ہے اور اس کے بعد جب پھر آپ کے ہاں سازش ہوئی تو پھر یہاں سے آپ کو بہکا کے کن طریقوں کی طرف لے گئے۔ جنت ہی لینی ہے او جسے یوں مل جائے اس کی مت ماری ہوئی ہے کہ خوامخوہ کے لیے تکلیفیں اٹھاتا پھرے۔پاک باز زندگی' کرداری زندگی' مجاہدانہ زندگی' سپاہیانہ زندگی' ایک ایک سانس کے اندر حق وباطل کے تصادم کی زندگی' یہ کاہے کے لیے۔وہ کچھ آپ دیکھیے گا اور پھر دیکھیے گا کہ اس کے بعد پھر کوئی بھی ایسا ہے جو دوزخ میں جانے والا رہ جائے؟ صاحب کاہے کے لیے! وہ تو کافروں کے لیے ہے۔

خود ساختہ روایات کے تحت جنت کے حصول کا طریق

اتنے سے وقت میں صرف ایک چیز اس میں سے میں آپ کو بتاتا ہوں۔ جنت کے متعلق یقینی طور پہ قرآن نے جو بتایا ہے جس میں کوئی کسی قسم کا یوں کہیے نہ حساب نہ کتاب نہ میزان نہ قیامت وہ وہ ہیں' جنہیں شہدآ کہتے ہیں' شہادت جسے کہتے ہیں۔ قرآن نے شہادت کے لیے کہا تھا مقتولین فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ خدا کی راہ میں جنگ کر کے جان دینے والے۔تو یہ بات تو بڑی

متعین تھی۔اب ہمارے ہاں آ گے ہوا کہ شہدا کون ہیں؟ سیدھی سی بات ہے کہ یہی ہیں۔انہوں نے کہانہیں۔یہ حدیث ہے مسلم کی' بخاری اور مسلم' احادیث کی کتابوں میں صحیح ترین گنی جاتی ہیں' صحیحین ان کو کہتے ہیں' دوصحیح ترین کتابیں' یہ اس کی حدیث ہے۔ میں پہلے سے ہی یہ عرض کردوں کہ یہ اس قسم کی چیزیں جو ہیں یہ کبھی بھی نبی اکرم ﷺ کے ارشادات نہیں ہوسکتے۔حضور ﷺ کی وفات کے کچھ اڑھائی تین سو سال بعد سنی سنائی ہوئی باتیں کچھ لوگوں نے اپنے طور پر یہ جمع کر لیں' ان کو منسوب کر دیا رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ورنہ یہ چیزیں بتا دیتی ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ہوسکتی ہیں؟ قرآن جس رسول ﷺ نے دیا ہو ہمیں اور جس نے اپنی ساری عمر میں حصولِ جنت کے لیے یہ عملی کوشش کی ہو خود رسول ﷺ نے جن کے متعلق ایمان یہ ہے یعنی ویسے اگر کہا جائے کہ ان کو کچھ کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی' ساری عمر میدانِ جنگ میں گذری' کوئی بیاسی کے قریب ہیں چھوٹی بڑی لڑائیاں۔اور میدانِ جنگ میں احد کے میدان میں وہ جس طرح سے حضور ﷺ نے زخم اٹھائے اور جن بھٹیوں میں سے خود رسول اللہ ﷺ گذرے ہیں' وہ یہ باتیں کہہ سکتے تھے؟ مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو؟ حاضرین نے کہا کہ جو خدا کی راہ میں مارا جائے۔بات تو ٹھیک کہی تھی۔حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح تو میری امت میں شہدا کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔''آ ووٹر بنان ڈے ہوئے ہیگے'' معاذ اللہ معاذ اللہ معاذ اللہ۔کبھی حضور ﷺ کی طرف اس کی نسبت بھی کی جاسکتی ہے؟ کہا اس طرح تو میری امت میں شہدا کی تعداد کم رہ جائے گی۔لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہیں؟ فرمایا ﷺ جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید ہے ٹھیک ہے۔جو طاعون سے مرگیا وہ شہید' جو دستوں کی بیماری سے مرگیا' وہ شہید' جو پانی میں ڈوب کر مر گیا وہ شہید' جو مکان کے گرنے سے دب کر مر جائے وہ شہید۔اسی طرح سے ابوداؤد اور نسائی میں دو اور ADITIONS اس میں ہوئی ہیں۔جو نمونیے سے مرجائے وہ شہید ''اے مرض بعداچ آیا ہونا نا'' جو آگ میں جل کر مر جائے وہ بھی شہید' جو عورت وضع حمل میں مرجائے وہ بھی شہید۔غور فرمایا آپ نے شہید وہ ہے جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ اس کو سمجھو بھی نہیں کہ وہ مر گیا ہے' سیدھا جنت کے اندر گیا ہے۔

شہدا کو اپنے خویش واقارب میں 70 افراد کے لیے شفاعت کے حق کی سہولت

شہدا کی فہرست کے اندر یہ چیزیں داخل ہو رہی ہیں۔اچھاجی! ایک تو یہ جنت میں چلا گیا۔آپ کو پتہ ہے یہ ریلوے کے جو ملازم ہوتے ہیں' ایک پاس تو ان کو اپنا ملتا ہے اور اس کے ساتھ فیملی کا بھی ملتا ہے' وہ انہیں بھی لے جاتے ہیں۔اسی میں یہ چیز بھی ہے ابوداؤد کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ شہید کو اپنے خویش واقارب میں سے ستر آدمیوں کی شفاعت کا حق دیا جائے گا۔

عزیزانِ من! غور فرمایے ضرورت ہی نہیں قیامت کے انتظار کی ''کسے ڈوب کے مرجان والےنوں نال کہہ دینا بھئی بھرا میرا وی بک کرلئیں''۔ میرے بھائیو کیا چیزیں کہہ رہے ہو؟ ان چیزوں کو آپ کے رسولِ گرامی ﷺ کے ارشادات کہہ کے دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سازش نہیں ہوئی اس قوم کے ساتھ تو اور کیا ہوا ہے؟۔ وہ اسے کہہ رہا ہے **اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَ يَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ** (3:142) کیا سمجھتے ہو کہ جنت میں یوں ہی داخل ہو جاؤ گے؟ انہوں نے کہا کہ سمجھنا کیا ہے ہم بتاتے ہیں کہ شہدا کی فہرست کس طرح سے بنتی ہے۔ اسی لیے تو یہ ساری جنتیں آپ کو پتہ ہے کہ وہ بخشش میں ملتی ہیں آپ کو۔ بیرے کو یہ ٹپ جو دیا جاتا ہے' بخشش میں ملتی ہے یا اللہ بخش دے جنت۔

اقبالؒ تو بخشیش کی جنت کو قبول ہی نہیں کرتا

اقبالؒ نے اسی لیے کہا تھا نا کہ

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است
بہشتے اربابِ ہمم است

ان لوگوں کے لیے بھیجتا ہے پاکیزہ زندگی بسر کرنے والے باہمت انسان۔

بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش

ان کو جا کے کہو کہ مزے لو

بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

''اللہ واسطے وی ملدی ہیگی اے جنت''۔

وہ آگے بات نہیں انہوں نے سمجھی ''او اللہ واسطے وی اک ملی ہوئی سی نا اور روٹی دا اک ٹکر کھا بیٹھا آدم باہر کڈ دتا اوہنوں چل اوئے''۔ اور اس جنت کے متعلق یہ کہا ہے کہ ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ جنت ہے کہ جس کا تمہیں وارث بنایا گیا تمہارے اعمال کی وجہ سے **خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا** (98:8) تمہیں کوئی یہاں سے نہیں نکال سکتا۔

دین کی بنیاد کے برعکس مذہبی تصورات کی حاصل کردہ جنت کا حشر

عزیزانِ من! WELL EARNED ہے یہ چیز جو ہے۔ جس نے صحت کے قوانین کی رو سے اپنی صحت بنائی ہوئی اس کی

صحت کو کون بگاڑ سکتا ہے۔ وہ تو سہاروں کے ذریعے سے جو دوسروں کے کہیں کچھ صحت کا رنگ آ جاتا ہے' تھوڑا سا سنکھیے کا کشتہ آیا' چہرے پہ سرخی آ گئی' اس سے کیفیت ہوتی ہے کہ ذرا سا دھچکا لگا' ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ جو جنت یوں عمل کے بدلے میں حاصل کی جاتی ہے خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَاۤ اَبَدًا (98:8)۔عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔کہا وَ لَقَدۡ کُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡہُ ۪ (3:143) مومن کی کیفیت یہ ہے' کہا یہ ابھی مواقع جنگ کے یا اس قسم کے تو روز نہیں آتے ہیں' کہا تمہاری کیفیت یہ تھی اس طرح جنت حاصل کرنے کی کہ تم تمنائیں دل میں لیے ہوئے تھے کہ یا اللہ آئے اس قسم کا موقع' شہادت دیں ہم اپنے ایمان کی صداقت کی۔تمنائیں موت کی۔جس موت سے اتنا گھبراتا ہے آدمی' ڈرتا ہے آدمی' لرزتا ہے

نشانِ مردِ مومن باتو گویم

موت کے سلسلہ میں مومن کی پہچان

اقبالؒ کہتا ہے بتاؤں تمہیں مردِ مومن کا نشان کیا ہے؟

چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

موت سامنے آتی ہے' مسکرا اٹھتا ہے کہ خوش آمدید! میں تو تمہارے انتظار میں آج تک تھا آؤ۔ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡہُ ۪ (3:143) یعنی موت آنے سے پہلے ہی تم موت کی آرزو کیا کرتے ہو۔ فَقَدۡ رَاَیۡتُمُوۡہُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ (3:143) جنگِ احد کا یہ واقعہ ہے یا جنگِ احزاب کا کہ لو تمنا کرتے تھے تم وہ آ گیا موقع' وہ دیکھو سامنے کھڑی ہے موت' اٹھو آغوش میں لے لو اس کو۔مومن کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔قرآنِ کریم نے یہودیوں سے یہ کہا تھا کہ تم جو کہتے ہو کہ ہم بڑے خدا کی چہیتی اولاد ہیں اور ہم جنت میں جائیں گے سب سے پہلے۔کہا فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (2:94) اگر یہی کیفیت ہے تو پھر موت کی تمنا کرو۔یعنی اس جنجال کی زندگی وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡھِمُ الذِّلَّۃُ وَ الۡمَسۡکَنَۃُ ۬ (2:61) مارے مارے پھر رہے ہو اگر مرنے پہ ہی یہ ہے کہ تم مرے اور جنت میں گئے تو پھر مرنا کیوں نہیں چاہتے' مرنے سے بھاگ کیوں رہے ہو؟ کیا بات کہی ہے؟ دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ موت کی تمنا کرو۔

مومن کسی فرد کا نام نہیں بلکہ یہ تو کریکٹر کے مجموعہ کا نام ہے

عزیزانِ من! دنیا میں زندہ رہنے کا حق اسی قوم کو ہے جو موت کی تمنا کرتی ہے'اس سے ڈرتی نہیں ہے۔ جیتا وہی ہے جو مرنا جانتا ہے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ(2:94) کہا یہ کیفیت پیدا ہونی چاہیے تمہارے ہاں۔لو وہ آ گیا تمہارے سامنے موت کا سامان۔ یہ ہے مومن کی زندگی۔ یہ تھے وہ مومن جن کے متعلق کہا تھا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139)تم پہ کون غالب آ سکتا ہے۔عزیزانِ من! اس قوم پہ کون غالب آ سکتا ہے جو مرنے کی تمنائیں لیے پھر رہی ہو ہر وقت۔ یہی تھا جن کے لیے کہا تھا کہ یہ فیصلہ ہے ہمارا کہ کافر مومن پہ کبھی غالب نہیں آ سکتا۔عزیزانِ من! یہ ہیں مومن۔ یہ کسی کا نام نہیں ہے یہ کچھ کریکٹر کی خصوصیات ہیں جو پیدا ہوتی ہیں'اس کا نام مومن ہوتا ہے۔اور اس کے بعد بات درمیان میں ایک ایسی لایا ہے قرآن وہ تفصیل طلب ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اس میں وہ کتنا عظیم ایک بنیادی اصول دے گیا ہے اس نظامِ اسلامی کے قیامت تک جاری رہنے کا۔لیکن یہ چیز آئندہ درس پہ ہم اٹھا رکھتے ہیں کیوں کہ اب وقت ہوگیا ہے۔سورۃ الِ عمران کی آیت 143 تک ہم آ گئے۔ عزیزانِ من! 144 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ(2:127)

❀......❀......❀

تئیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیت 144)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے کی گہری سازش کی نشاندہی اوراس کا علاج

عزیزانِ من! آج مارچ 1970ء کی 8 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ الِ عمران کی 144 ویں آیت سے ہو رہا ہے: (3:144)۔

اس آیۂ جلیلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اتنا اہم اور بنیادی ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق مجھے بڑی تفصیل میں جانا ہوگا اور آپ کو بھی نسبتاً زیادہ غور وفکر سے اسے سننا ہوگا۔اور بدقسمتی ملاحظہ فرمایئے آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا لاؤڈ سپیکر فیل ہو گیا لیکن خیر ہمارا ابھی تو ہاتھ اٹھتا ہے گریباں تک ۔ بڑی اہم چیز ہے بڑی عظیم انقلابی چیز ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں بات چلی آ رہی تھی جنگِ احد کے متعلق جہاں اسلامی لشکر کے تیراندازوں کے ایک دستے کی ذراسی غلطی سے فتح مبدل بہ شکست ہوگئی۔خود نبی اکرم ﷺ تیروں کی بوچھاڑ کے سیلاب میں گھر گئے اور اگر صحابہ کبارؓ اس قدر جاں فشانی سے کام نہ لیتے تو امکان تھا کہ حضور ﷺ وہاں شہید ہو جاتے ۔ بعد میں جنگ میں تو کامیابی ہوگئی لیکن فطرتاً یہ سوال دلوں میں بیدار ہو گیا کہ اگر رسول اللہ ﷺ شہید ہو جاتے تو پھر کیا ہوتا؟ بڑا NATURAL تھا اس سوال کا سامنے آنا۔اور قرآنِ کریم نے یہاں اسی چیز کو بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ اگر شہید ہو جاتے پھر کیا ہوتا؟

قرآنِ حکیم کے نزدیک نظامِ زندگی کا دارومدار شخصیت کی بجائے غیر متبدل اصولوں کا رہینِ منت ہوتا ہے

اس لیے کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ج قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ج اَفَائِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰٓى

اَعۡقَابِكُمۡ ؕ (3:144) محمدﷺ بجز ایں نیست کہ خدا کے ایک پیغامبر ہیں آپﷺ سے پہلے بھی اس قسم کے رسول آئے' اپنے وقتوں پر آئے' اپنی عمر پوری کر کے یہاں سے چلے گئے۔ تو کہو کہ اگر یہ کل کو مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم یہ سمجھو گے کہ بس معاملہ ختم ہو گیا اور پھر تم اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ دین کا معاملہ ختم ہوا اس لیے کہ اس میں ایک شخصیت باقی نہیں رہی اور تم پھر پیچھے کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ وَ مَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـئًا ؕ وَ سَيَجۡزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ (3:144) جو کسی شخصیت کے نہ رہنے کی وجہ سے اس طرح پھر سے نظامِ کہن کی طرف پلٹ جائے تو پھر وہ خدا کا تو کچھ نہیں نقصان کرے گا' اپنا ہی کچھ نقصان کرے گا۔ جو لوگ اس کی ہدایات کے مطابق بھر پور محنتیں کرتے ہیں' ان کا تو نتیجہ ان کے سامنے آ ہی جاتا ہے اور جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ وابستہ تھا ایک شخصیت کے ساتھ' وہ شخصیت نہیں رہی' اس لیے معاملہ ختم ہو گیا ہے' وہ اپنا ہی کچھ نقصان کرے گا' ہمارا کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ بڑی عظیم چیز ہے جس میں قیامت تک کے لیے ہمارے لیے ہدایت ہے ساری دنیا کے لیے ہدایت ہے۔ مجھے اس کی تفصیل میں جانے سے پیشتر ذرا چند الفاظ تمہیدی طور پہ گذارش کرنا ضروری ہیں وہ اس کا پسِ منظر بن جائے گا اس بات کے سمجھنے کے لیے کہ یہاں کہا کیا ہے قرآنِ کریم نے۔ انسانی بچہ جب اپنے عہدِ طفولیت میں ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کو قدم قدم پر کسی سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذرا کہیں گر پڑتا ہے تو بے کسی کے عالم میں چاروں طرف دیکھتا ہے' روتا ہے' آوازیں دیتا ہے تا آنکہ کوئی آنے والا آئے اور اس کو پکڑ کے اٹھائے۔ چلنا سیکھتا ہے تو کسی کی انگلی کے سہارے سے چلتا ہے چار قدم چلتا ہے' گر پڑتا ہے پھر کوئی انگلی پکڑنے والا آتا ہے تو پھر اٹھتا ہے۔ آگے بڑھتا ہے اندھیرے سے گھبراتا ہے' تنہا باہر نہیں جاتا اگر کسی وقت باہر نکل جاتا ہے تو گھر والے' چلا اٹھتے ہیں' دوڑتے ہیں' بھاگتے ہیں' اس کو پکڑتے ہیں اور روز اسے کہتے ہیں کہ تنہا باہر نہیں آیا کرتے سڑک پہ۔ پھر رفتہ رفتہ وہ زندگی کی ان شاہراؤں سے مانوس ہوتا ہے۔ بڑا ہو جاتا ہے پھر بھی آپ اسے کچھ وقت تک ساتھ رکھتے ہیں' راستے بتاتے جاتے ہیں۔ راستے کے خطرات جہاں جہاں ہیں اس سے اسے آگاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے جوان ہو جاتا ہے تو اسے نہ یہ خطرات اس کے سامنے باقی رہتے ہیں اور نہ پھر اسے اس طرح کسی سہارے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ وہی بچہ کہ جو ہر قدم پر آپ کی انگلی کو تلاش کرتا تھا اس کے سہارے کے بغیر دو قدم نہیں چلتا تھا' اٹھارہ بیس برس کا جوان بچہ ہوا سے آپ ساتھ لیں انارکلی کے بازار میں' اس کی انگلی پکڑ کے ذرا چلنا شروع کریں' آپ دیکھیے وہ کس طرح سے انگلی چھڑاتا ہے' اسے شرم آتی ہے وہ جھینپتا ہے جھجکتا ہے وہ کہتا ہے ابا جان! کیا کر رہے ہیں آپ؟ میں بچہ ہوں اب؟ آپ اسی طرح سے مجھے TREAT کر رہے ہیں۔ کسی جوان کو بچے کی طرح TREAT کر کے دیکھیے سہی' اس کا ری ایکشن

کیا ہوتا ہے۔

زندگی کی شاہراہوں پر نشاناتِ راہ کی تکمیل کی ضرورت اور ان کی اہمیت

یہ جو اس دور میں نئی نسل کی سرکشیاں آپ دیکھ رہے ہیں' اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ آپ انہیں ابھی ہنوز بچہ TREAT کر رہے ہیں ۔لیکن اس کو ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے ہی نہیں ہوتی' بڑے بڑوں کو بھی ہوتی ہے ۔اور وہ یہ کہ زندگی کی شاہراہوں پر سڑکوں پر جہاں جہاں دوراہے آئیں' وہاں کوئی سائن پوسٹ لگا ہوا ہونا چاہیے کہ یہ راستہ شہر کی طرف جاتا ہے' یہ گل برگ کی طرف آتا ہے۔ یہاں ذرا خطرہ ہے' یہاں شور نہ مچایئے' کراسنگ آ گیا ہے ریلوے کا احتیاط سے چلیے ۔ یہ سائن پوسٹ لگے ہوئے ہونے چاہئیں سڑکوں پہ' ہر آدمی کو ان کا علم ہونا چاہیے۔اور یہ اگر کچھ ہو جائے تو پھر اس کے بعد اس بچے کے لیے نہ کسی انگلی پکڑنے والے کی ضرورت ہوتی ہے' نہ اسے سہاروں کی تلاش رہتی ہے۔ یہ فطرت کے آئین کے بالکل مطابق ہے۔آسمانی رشد و ہدایت کا جو سلسلہ شروع ہوا' وہ فطرت کے اسی قانون کے مطابق چلا۔قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ ایک ایک قریہ میں خدا کا رسول آتا تھا۔ایک ایک بستی میں پیامبر آتے تھے ہر قوم کی طرف ۔ ہر زمانے میں ایک ہی وقت میں ایک ہی بستی میں ایک چھوڑ کر دو دو تین رسول' ایک ہی قوم کے اندر قدم قدم کے اوپر ہادیانِ طریقت کے نقوشِ پا نظر آ رہے ہیں۔قرآن بتاتا ہے کہ یہ سلسلہ آتا چلا گیا اس لیے کہ انسانیت ابھی عہدِ طفولیت میں تھی۔اسے زندگی کے ہر سوال کے لیے کسی استادِ مشفق' رہبر کی ضرورت تھی۔ جوں جوں انسانیت بڑھتی چلی گئی عمر میں' یہ ضرورت کم ہوتی چلی گئی تآنکہ انسانیت اپنے سنِ بلوغ کو پہنچ گئی۔زندگی کی شاہراہوں پر سائن پوسٹ لگا دیے گئے ۔ ہر شاہراہ پر ہر موڑ پر جتنی جتنی بھی علامت دینے کی ضرورت تھی' جہاں جہاں راہنمائی کی ضرورت تھی' وہ راہنمائی مکمل شکل میں نقش کر کے رکھ دی جیسے چٹانوں پہ نقش کی جاتی ہے۔مکمل کیا اسے محفوظ کیا اور انسان سے کہا کہ اب تم بالغ ہو گئے ہو اب تمہیں کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے' یہ سائن پوسٹ تمہاری راہنمائی کے لیے کافی ہیں۔اب جاؤ اور زندگی کے راستوں کو خود طے کرو۔ یہ سائن پوسٹ قرآنِ کریم کی دفتین کے اندر مکمل کر دیے وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًاؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ج (6:115) تیرے خدا نے جو کچھ ہدایات کے طور پر دینا تھا' مکمل ہو گیا صدق و عدل کے ساتھ۔اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گا۔اور اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم نے یہ سائن پوسٹ لگائے ہیں۔ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

ختمِ نبوت دراصل انسانیت کی بلوغت کا اعلان تھا

جیسا میں نے عرض کیا ہے' انسانیت بالغ ہوگئی۔ اتنی ہی ضرورت تھی ان کو۔ یہ ضرورت ان کی پوری کر دی گئی اور اس کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ عین فطرت کے مطابق تھا یہ ختمِ نبوت' بڑا عظیم انقلاب ہے انسانیت کی زندگی کے اندر۔ جیسا انبیائے کرامؑ کا آنا' وحی کے ذریعے سے رشد و ہدایت کا ملنا' یہ ایک عظیم انقلاب تھا۔ اسی طرح سے عین اس وقت پہ آ کے نبوت کے سلسلے کو ختم کر دینا بھی بہت بڑا عظیم انقلاب تھا اور عین مطابق تقاضائے فطرت۔ اور ختمِ نبوت کے معنی یہ ہوگئے کہ اب انسان شخصیتوں کے سہارے کے اوپر آگے نہیں چلیں گے۔ انہیں اصولی راہنمائی کی ضرورت ہوگی۔ اصولی راہنمائی قیامت تک کے لیے آخری بار مکمل شکل میں قرآن میں دے دی۔ اور ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے معاملات طے کرنے کے لیے کہہ دیا گیا کہ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ص (42:38) تم جوان ہو گئے ہو سمجھ دار ہو اب تم باہمی مشاورت سے اپنے معاملات ان اصولوں کی روشنی میں خود طے کیا کرو۔

زندگی کے معاملات میں عام سطح سے لے کر مقامِ نبوت تک باہمی مشاورت کی اہمیت اور اس کا حکم

یہ جو طریق تھا معاملات کے طے کرنے کا خود نبی اکرم ﷺ سے بھی یہ کہا گیا کہ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ ج (3:159) ذرا ذرا سی بات جو ہے وہ نہیں وحی کے ذریعے بتائی جائے گی تم بھی ان کے لیے آمرِ مطلق ڈکٹیٹر نہیں ہو۔ ان کے باہمی مشورے کے ساتھ' ان جزئیات کو ان تفصیلات کو طے کیا کرو۔ یہ ایک نظام تھا جو بنایا۔ اور ان سے بھی یہ کہہ دیا گیا کہ جو باتیں جو چیزیں' اس میں نہیں دی گئیں' خواہ مخواہ اس کے متعلق سوال نہ کرتے رہا کرو کہ یہ بھی آسمان سے تمہیں ملنی چاہئیں' یہ بھی وحی کے ذریعے ملنی چاہئیں۔ اب تم بچے ہو کہیں؟ بتا تو دیا کہ باہمی مشورے سے یہ کچھ کیا کرو۔ انہیں کہہ دیا گیا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡيَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَـكُمۡ تَسُؤۡكُمۡ ج وَ اِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡهَا حِيۡنَ يُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَـكُمۡ ط عَفَا اللّٰهُ عَنۡهَا ط وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ (5:101) اے جماعتِ مؤمنین! جن چیزوں کو وحی کے ذریعے سے نہیں دیا گیا تمہیں خواہ مخواہ وہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں جو ہیں' وہ یوں نہ پوچھا کرو قرآن جب نازل ہو رہا ہے تو اس کے اندر اگر ان کا جواب دے دیا گیا تو مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ اب دیکھا یہ کیا بات کہہ دی قرآن نے؟ وہاں صورت یہ تھی کہ ذرا ذرا سی بات کے لیے وحی آتی تھی۔

قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ حیات زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل شکل میں ہر لحاظ سے محیط ہے

حضرتِ نوحؑ سے جب کہا کہ طوفان سے بچنے کے لیے کشتی کی ضرورت ہوگی تو آپ کو معلوم نہیں تھا انسان کو اس سے پہلے پتہ نہیں تھا کشتی کیا ہوتی ہے' کیسے بنائی جاتی ہے۔ قرآن میں یہ ہے کہ ہم نے وحی کے ذریعے سے نوحؑ کو کہا کہ کشتی بناؤ اور وہ ہماری زیرِ نگرانی کشتی بناتے تھے۔ انسانیت کے بچپن کے زمانے میں کیفیت یہ تھی کہ اسے ان امور کے لیے بھی ضرورت تھی کسی خارجی ہدایت کی۔ اور یہاں پہنچنے کے بعد ان سے کہا گیا کہ اب خوامخوہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں نہ پوچھتے رہا کرو۔ ہم نے قرآن نازل کردیا ہے تمہارے لیے۔ کہ صاحب! اس میں جو چیزیں تفاصیل سے نہیں کہی گئیں؟ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ۚ (3:159)' وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ۖ (42:38) بیٹھو باہمی مشورہ کرو' مشورے کر کے اپنے معاملات طے کرو۔ آپ نے دیکھا کہ یہ نظام کتنا حسین نظام ہے۔ قرآنِ کریم قیامت تک کے لیے مکمل غیر متبدل محفوظ۔ اس کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے تمام معاملات باہمی مشورے سے طے کرو۔ اور باہمی مشورے کے تو معنی پھر یہ ہیں کہ اگر اس میں ایک شخصیت نہیں بھی رہی تو کچھ نہیں بگڑتا۔ شخصیت کے جانے سے تو بگڑتا اس وقت تھا جب یتیم بچے کا باپ مر جائے' کوئی سہارا نہ رہے۔ بچہ بالغ جب ہوگیا' اپنے پاؤں پہ چلنے کے قابل ہوگیا' انسانیت یہاں آ گئی اور معاملات جو تھے کسی ایک فرد کی رائے اور فیصلے کے اوپر ان کا انحصار نہ رہا' کہا باہمی مشورے سے یہ کچھ کیا کرو۔ یہ ایک نظام تھا جو دیا قرآن نے' اس نظام کے بعد قرآن کو مکمل اور محفوظ کرنے کے بعد اب شخصیتوں کی ضرورت نہ رہی۔ بڑی عجیب چیز تھی جو کہی گئی۔ کارلائل نے اس نقطے کو سمجھا تھا کہ ختمِ نبوتﷺ کے معنی کیا ہیں؟ کہتا ہے عظیم انقلاب آفریں تھی یہ چیز جسے ختمِ نبوتﷺ کہا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا یہ ہے کہ اب AGE OF PERSONALITIES نہیں رہی' اشخاص کا زمانہ اب ختم ہوگیا ہے۔ اب انسانوں کا زمانہ آ گیا ہے۔

نبی اکرمﷺ کی وفات کے فوراً بعد حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک عظیم حقیقت کشا اعلان

کتنا عظیم انقلاب تھا جو قرآنِ کریم نے اس سے دیا۔ کوئی بات نہیں محمدﷺ اگر کل کو تمہارے اندر نہیں بھی رہتے تو جب تک تمہارا یہ نظام قائم رہے گا' تمہیں کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ اور اس کے بعد اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ نہیں! یہ سب کچھ ایک شخصیت کے ساتھ وابستہ تھا اب تو ہم چل ہی نہیں سکتے' ٹھیک ہے پلٹ جاؤ پھر' پلٹ جاؤ گے تو ہمارا کیا نقصان کرو گے' تمہارا ہی کچھ نقصان ہوگا۔ یہ تھی وہ حقیقتِ کبریٰ جس کے لیے اس مقام پہ جب ذرا نازک وقت آ گیا تھا اور ذہنوں میں یہ سوال ابھرا تھا کہ اگر کل کو نبی

اکرم ﷺ وفات پا گئے یا اس طرح سے کسی جنگ میں شہید ہو گئے تو پھر کیا ہوگا؟ کہا کچھ نہیں بگڑے گا اس سے۔اور یہی تھی وہ حقیقتِ کبریٰ کہ جس کا اعلان نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد جب کہرام مچ گیا صحابہؓ کے اندر کہ اب کیا ہوگا تو آپ ﷺ کے پہلے جانشین صدیقِ اکبرؓ انہوں نے اس کہرام کے عالم میں منبر پہ کھڑے ہو کر یہ بات کہی کہ کیوں گھبراتے ہو' کیوں پریشان ہوتے ہو۔ سن لو وہ عجیب فقرے ہیں آپؓ کے جو آپؓ نے اس خطبے میں کہے تھے اور دیکھیے وقت کتنا بڑا نازک تھا۔اس قدر غم آلود وہ ATMOSPHERE تھا۔ایسے ہی وقت کے اندر یہ چیز سامنے آتی ہے کہ کوئی کتنا اپنے آپ کے اوپر ضبط رکھتا ہے۔کہا کہ اے لوگو سن لو جن کا معبود محمد ﷺ تھا وہ آج سمجھ لیں کہ ان کا معبود مر گیا ہے اور جو خدائے حی و قیوم کی محکومیت اختیار کیے ہوئے تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ قیامت تک نہیں مرتا۔کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں دیکھی وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج(3:144) یہاں وہ قرآن کی آیت پڑھی تھی آپ نے۔کیا تفسیر سامنے آتی ہے قرآن کی؟ کچھ نہیں بگڑتا۔عزیزانِ من! یہی وجہ تھی یہ اہمیت تھی کہ ایک سانس کے لیے بھی یہ نظمِ امت جو ہے بغیر مرکز کے نہیں رہنا چاہیے۔اس میں انتشار نہ پیدا ہو جائے کہ انہوں نے (تاریخ کا اگر یہ واقعہ صحیح ہے اور اس کی صحت میں شبہ نہیں ہو سکتا) رسول اللہ ﷺ کے دفن کرنے کے پیشتر اس نظام کو استوار پہلے کیا کہ ہر معاملے کا فیصلہ تو نظام نے کرنا تھا' اتنا بھی توقف نہیں کیا۔اور کتنی تھی صحیح بصیرت ان دست پروردگانِ رسالت ﷺ کی کہ واقعی ایک معاملہ سامنے آ گیا جس میں آپس میں اختلاف پیدا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو کہاں دفن کرنا چاہیے۔نظام اگر نہ ہوتا تو بھانت بھانت کی بولیاں سامنے آتیں۔ہمارے ہاں جب قبرستان میں مردے کو لے جاتے ہیں تو آپ کو معلوم ہے نا' نظام نہیں ہوتا وہ کیسی کھینچا تانی وہاں ہو رہی ہوتی ہے؟ ہر شخص اپنی اپنی رائے دیتا ہے اور رائے پہ مصر ہوتا ہے۔اور وہاں تو عظیم مسئلہ سامنے پیش آیا تھا اس عظیم مسئلے کے لیے مختلف باتیں سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ خلیفۃ الرسول صدیقِ اکبرؓ سے پوچھیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ پہلا فیصلہ جو دیا تھا وہ وہی تھا جب حضور ﷺ ابھی دفن بھی نہیں کیے گئے تھے نظام قائم ہو چکا ہوا تھا۔انہیں معلوم تھا کہ اب اختلافی معاملات کے فیصلے ہم نے کیسے کرنے ہیں۔نظام قائم ہو گیا قرآن ان کے پاس تھا حضور ﷺ کے جانشین خلیفہ کی شکل میں موجود ہو گئے۔امت مشورے کے لیے موجود تھی۔کوئی کمی واقع نہ آئی اسی طرح سے سلسلہ چلتا رہا کوئی اپنے پچھلے قدم پہ لوٹ کے نہیں گیا۔کسی نے اس شخصیت کی کمی کو محسوس نہیں کیا۔

انسانی دنیا میں اختیار کردہ اجتماعی نظام کی اہمیت اور اس کے نتائج اور اثرات

دیکھا آپ نے کیسے وہ سمجھے تھے ختمِ نبوت ﷺ کو؟ یہ نظام آگے کیسے چلا تھا؟ بات کیا انہوں نے سمجھی تھی؟ بات انہوں نے

سمجھی یہ تھی جو قرآن نے کہا تھا (3:149) میں۔ یہاں یہ کہا ہے کہ شخصیت کے چلے جانے سے کچھ نہیں بگڑتا اگر تم اپنے پچھلے پاؤں پہ پلٹ جاؤ گے تو اپنا ہی کچھ نقصان کرو گے۔ کہا کہ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَرُدُّوْکُمْ عَلٰۤی اَعْقَابِکُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ (3:149) بگڑے گا اس صورت میں کہ تم نے اس اسلامی نظام کو چھوڑ کے کفر کا نظام اختیار کر لیا تو پھر تباہ ہو جاؤ گے اگر نظام یہی قائم رہا تو پھر کچھ نہیں بگڑے گا۔ یہ نظام کیا تھا؟ جس سے کفر لازم آجاتا تھا وہ یہ تھا وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) یاد رکھو! کفر یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے مطابق اپنے معاملات کے فیصلے نہ کیے جائیں۔ اور یہ جماعتِ مؤمنین ہی سے نہیں کہا گیا تھا خود نبی اکرم ﷺ سے بھی یہ کہا گیا تھا وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْکِتٰبِ وَ مُھَیْمِنًا عَلَیْہِ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰہُ (5:48) یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے تمہاری طرف حق کے ساتھ اس کتاب کے مطابق معاملات کے فیصلے کیے جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ سے بھی یہی ارشاد تھا کہ قرآن کے مطابق فیصلے کیے جاؤ اور ان اصولوں کی روشنی میں وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ج (3:159) ان سے مشورہ کیا کرو اور فیصلے کیے چلے جاؤ۔ جماعتِ مؤمنین سے بھی یہ کہا کہ یاد رکھو! ایمان یہ ہے کہ قرآن کے مطابق فیصلے کرے جاؤ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ ص (42:38) اور باہمی مشاورت سے ان جزئیات کو طے کرتے چلے جاؤ۔ تو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کمی کس چیز کی آئی ان میں۔ وہی قرآن وہی مشاورت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضور ﷺ کا ایک جانشین وہی مرکزِ ملت، وہی قرآن، وہی مشاورت کے لیے امت موجود۔

نبی اکرم ﷺ کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد قرآنی نظام کی شکل وصورت کو ہی بدل دیا گیا لیکن کیسے؟

آپ نے دیکھا کہ اس کے بعد ختمِ نبوت ﷺ سے کچھ کمی نہیں واقع ہوئی۔ شخصیت کے سہاروں سے انسانیت بے نیاز ہوگئی۔ اب دورِ اجتماعیت کا آ گیا۔ اس طرح سے یہ چیز چلتی گئی آگے۔ کوئی کمی محسوس نہیں کی ہے اس دور میں انہوں نے کسی قسم کی بھی۔ ان کے سامنے بھی قرآن کی یہ آیت تھی وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (5:92) (میں آگے چل کے عرض کروں گا پھر اس کے بعد کیا ہوا انہی آیات کو کس چیز کے لیے شہادت میں پیش کیا گیا) ان کے سامنے بھی تھا کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ رسول تو موجود نہیں تھے ان میں، اگر یہی مفہوم ہوتا جیسا آگے چل کے ان آیات کو ہم نے پہنایا ہے تو وہیں کھڑے ہو جاتے کہ قرآن کا حکم ہے اس آدھے حکم کی تعمیل یہاں نہیں ہو رہی۔ رسول کی اطاعت کیسے کی جائے، رسول تو ہے نہیں ہم میں؟ اور آج ہی نہیں ہے، رسول تو ایک قیامت تک نہیں آنا تو اطاعت کیسے کی جائے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں نے آدھے

اسلام پہ عمل کیا تھا؟ انہیں معلوم تھا کہ اس سے مراد کیا ہے؟ شخصیت کے متعلق تو قرآن نے یہاں کہہ دیا جو ابھی میں نے کہا ہے کہ رسول کے وفات پا جانے سے' دنیا سے چلے جانے سے' کچھ نہیں بگڑے گا اس نظام کا۔

رسول کی اطاعت کا مفہوم نیز باہمی مشاورت کا طریقِ کار

اطاعتِ رسول جسے کہا گیا ہے یا اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت جسے کہا گیا ہے' یہ کسی فرد کی اطاعت نہیں تھی ورنہ سیدھی سی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد' یہ اطاعت ختم ہو جاتی۔ اطاعت تو اللہ ہی کی ہے' رسول سے بھی یہ کہا گیا تھا کہ قرآن کے مطابق تم احکام کے فیصلے کرو' اطاعت تو ہے ہی خدا کی۔ کہا یہ گیا تھا کہ خدا کی اطاعت اپنے اپنے طور پر انفرادی طور پر تم الگ الگ نہیں کر سکتے تم نے خدا کی اطاعت کرنی ہے اس نظام کی رو سے جس کا مرکزِ اول خود رسول ہے۔ ہر اختلافی معاملے میں ان کی طرف رجوع کرو' وہ تمہیں قرآن کے مطابق فیصلے دے گا اس نظام کے تابع جو ہم نے بتایا ہے باہمی مشاورت سے طے کر کے۔ اپنے اپنے طور پہ فیصلے کرنے نہ بیٹھ جاؤ اس نظام کی طرف ہر اپنا معاملہ ریفر کرو۔ وہ نظام اسی طرح سے انہوں نے قائم کر لیا اب اس نظام کی اس مرکز کے فیصلے جو تھے قرآنِ کریم کے مطابق باہمی مشاورت سے' یہ ہوگئی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت جسے کہا گیا ہے۔ رسول کی اطاعت کی قائم مقام ہوگئی رسول کے جانشین کے احکام کی اطاعت جو وہ قرآن کی روشنی میں باہمی مشاورت سے فیصلے نافذ کرتا تھا۔ کسی نے اس دور میں یہ بات نہیں کہی کہ صاحب! کہ اس کے بعد اب رسول کی اطاعت کیسے کی جائے؟ یہ نظام آگے چلتا گیا جب تک یہ نظام قائم رہا ہے کسی کو کسی اور چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ انہوں نے کمی محسوس نہیں کی۔

مرکزِ ملت کی جگہ بادشاہت اور مذہبی پیشوائیت کے باہمی گٹھ جوڑ کی ابتدا اور اس کا نتیجہ

مجھے اب آگے بڑھ جانا چاہیے۔ ملوکیت کا زمانہ آ گیا عباسی دور آ گیا عجمی اثرات اسلامی ذہنیتوں پہ غالب آ گئے۔ ملوکیت کی سیاست کا تقاضا ہوا کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ کر دیا جائے سیاسی امورِ مملکت کی تحویل میں آ جائیں۔ جنہیں اب یہ PERSONAL LAWS کہا جاتا ہے' شخصی قوانین وہ پیشوایانِ مذہب کے سپرد کر دیے جائیں۔ یہ کفر تھا یہ وہی چیز جو قرآن نے کہی تھی کہ کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے تو پھر نقصان اٹھاؤ گے۔ زندگی کے حصے بخرے کر دینا اس وحدت کو ثنویت اور DUALISM میں تبدیل کر دینا ایک چیز سیکولر ہو جائے سلطنت اور مذہبی پیشوائیت آپ کی PERSONAL LAWS کی تابع ہو جائے' یہ کفر تھا' یہ شرک تھا۔ یہ تھی ملوکیت جو کچھ ملوکیت نے کیا ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوا کہ سلطنت تو

اپنے معاملات طے کرتی ہے' ہم ان معاملات کو کیسے طے کریں؟ اب ان کے پاس تو وہ رسول تھا نہیں نا وہ نظامِ مملکت وہ مرکزِ امت' مرکزِ امت تو وہ تھا جس کو اب سلطان کہہ دیا' جو بادشاہ بن بیٹھا۔ جس نے خود ہی دین کو سیاست سے الگ کر دیا' وہ تو اب جانشینِ رسول رہا ہی نہیں۔ یہ جوان کا گروہ تھا مذہبیت کا یہ اگر اپنے ہاں الگ نظامِ مملکت قائم کرتے تو مملکت اس کی اجازت کبھی نہ دیتی۔ تو اس کے لیے اب انہوں نے کیا کیا؟ اب انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اطاعت تو کرائی نہیں جائے گی (کرانی تو اپنی ہی اطاعت تھی کس نام سے کرائی جائے) اب ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ خدا کی اطاعت تو سمجھ لیا قرآن کی رو سے' رسول کی اطاعت کیسے کرائی جائے؟

احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ابتدا اور قرآنِ حکیم کی نشر و اشاعت کی نوعیت اور سعی و کاوش

یہ تھا وہ زمانہ جو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ اب اس کے لیے یہی صورت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جو باتیں تھیں ان کو کسی طرح سے اکٹھا کیا جائے' انہیں جمع کیا جائے تو ان کی اطاعت کا نام رسول کی اطاعت رکھا جائے۔ جب یہ نظام بگڑ گیا ہے آپ کے ہاں ختم ہو گیا ہے آپ کے ہاں اسلام' یہ اس وقت پہلی دفعہ خیال پیدا ہوا۔ آپ کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اس سے پہلے صحابۂ کبارؓ کے زمانے میں نبی اکرم ﷺ کی احادیث کا کوئی مجموعہ انہوں نے جمع نہیں کیا۔ میں کہتا ہوں ویسے عقیدتاً ہی کچھ کر لینا چاہیے تھا۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ بات بڑی اہم سامنے آ رہی ہے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ شاید پھر وقت نہیں آئے دوبارہ کہ یہ آیتیں سامنے آئیں۔ اس لیے جو کچھ بھی میں سمجھا ہوں اپنی بصیرت کے مطابق مجھے تفصیل سے اور اعلانیہ طور پہ آپ حضرات کے سامنے پیش کر دینا چاہیے۔ اس سے پہلے یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوا کہ احادیث کے مجموعے مرتب ہمیں کرنے چاہئیں۔ سوچنا چاہیے بیٹھ کر کہ سب سے پہلے سب سے پہلا کام کرنے کا یہ تھا ان کے لیے' اگر یہی مراد تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کے مطابق ہی ہم نے اطاعت کرانی ہے تو ان کو سب سے پہلے مملکت قائم ہوئی تھی۔ قرآنِ کریم کی حفاظت اور نشر و اشاعت کا تو اتنا اہتمام انہوں نے کیا کہ امام ابن حزم کے قول کے مطابق حضرت عمرؓ کے زمانے میں' حالانکہ چھاپے خانے نہیں تھے' انہوں نے گنایا ہے کہ قریباً ایک لاکھ نسخہ قرآنِ کریم کا مملکت کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ یہ جو وہ کہتے ہیں نا کہ حضرتِ عثمانؓ کے زمانے میں یہ قرآن کے اتنے نسخے بنے پہلے تو وہی چیز جو ہے وہ غلط ہے کہ جامع القرآن تھے حضرتِ عثمانؓ۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں خود قرآن جمع ہو گیا ہوا تھا' تدوین ہو چکا تھا' اسی کتابی شکل میں موجود تھا۔ وہ جو آپؐ کے نسخے ہیں وہ یہ ہیں کہ مرکز نے سنٹرل گورنمنٹ نے اپنے ذمے یہ لیا تھا کہ AUTHENTICATED COPIES (مصدقہ نسخے) قرآن کے مملکت کے

مختلف گورنریوں کے اندر جانے چاہئیں۔ وہ ان کے ہاں کا ضابطہ قانون تھا' وہ اس کو انفرادی شکل میں رہنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ مملکت کی طرف سے مرکزِ امت کی طرف سے یا سنٹرل گورنمنٹ کی طرف سے مصدقہ نسخے قرآن کے گورنر کے پاس بھیجے جاتے تھے' صوبوں کے کیپٹل CITIES میں۔ یہ تھے وہ نسخے جو حضرتِ عثمانؓ نے بھیجے تھے ورنہ قرآن کے قریباً لاکھ نسخے انہوں نے تقسیم کر دیے تھے' مختلف جگہ موجود تھے۔ لیکن کیا یہ چیز حیرت انگیز نہیں ہے کہ ساری مملکت میں آپ کو کوئی مجموعۂ احادیث نہیں مل رہا۔ عزیزانِ من! اس چیز کو ذہن سے نکال دیجیے ایک سیکنڈ کے لیے یہ منکرِ حدیث ہے' یہ انکارِ حدیث ہے' واقعات کو صرف سامنے لیجیے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ ان میں سے کسی سے بھی پوچھیے یہ حقیقت ہے کہ آپ کے سامنے پہلا مجموعۂ حدیث مکمل مدون شکل کے اندر جو آ رہا ہے امام بخاری کا جسے یہ صحیح ترین صحیفہ کہتے ہیں امام بخاری کا مدون کردہ ہے جن کی وفات اڑھائی سو سال بعد رسول اللہﷺ کے 256ھ میں ہوئی ہے۔

امام مالکؒ کا مرتب شدہ چھوٹا سا مجموعہ جو صحاح ستہ میں شامل نہیں

اس سے پہلے ایک چھوٹا سا مجموعہ موطا امام مالک اسے کہتے ہیں' ان کی وفات بھی قریباً 179ھ میں ہوئی ہے۔ اس کے اندر کوئی تین سے پانچ سو تک احکام ہیں' وہ بھی احادیث نہیں ہیں بلکہ انہوں نے لکھا یہ ہے کہ مدینے میں صحابہؓ کس طرح سے عمل کرتے تھے بس اس میں یہ ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ اس موطا کو ان لوگوں نے صحاح ستہ جو کہتے ہیں نا حدیث کی چھ صحیح ترین کتابیں' اس میں شامل نہیں انہوں نے کیا۔ کیا یہ سوچنے کی بات نہیں ہے کہ اس سے پیشتر آپ کے ہاں کی اسلامی مملکت موجود ہے' اتنا اہتمام کیا جا رہا ہے قرآنِ کریم کی نشر و اشاعت میں۔ اس دور کا اور کوئی احادیث کا مجموعہ ہمارے ہاں نہیں ملتا۔ یہ جو بعد میں مجموعے مرتب ہوئے ہیں اس میں بھی کوئی ریفرنس نہیں ہے کہ پہلے ایک فلاں مجموعہ تھا اس دور کا ہم نے اس میں سے نقل کیا ہے۔ ہر جامع حدیث نے کہا یہ ہے کہ میں نے یہ باتیں زبانی سنی ہیں WRITTEN RECORD کوئی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! سوچنے کی بات ہے۔ اتنی ہی بات نہیں ان کے ہاں کی تاریخ میں اس سے آگے باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ صحیح مسلم کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز نہ لکھنا جس نے کچھ لکھا ہو وہ مٹا دے جا کے۔ یہ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کی مرتب کردہ مستند کتاب ہے کہ حدیث اور کتاب اللہ کو ستھری اور خالص رکھو

اور آگے چلیے۔ خود صحابہؓ کا عمل دیکھیے ذرا۔ مسند امام احمد بن حنبل میں لکھا ہے (بڑی مستند کتاب ہے احادیث کی امام احمد بن

حنبل کی مرتب کردہ) یہ روایت موجود ہے کہ صحابہؓ نے کہا کہ ہم لوگ جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنا کرتے تھے، اسے لکھ لیا کرتے تھے تب ایک دن رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیا کرتے ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ حضور ﷺ سے جو کچھ ہم سنتے ہیں اس کو لکھ لیا کرتے ہیں۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب' تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کہا کتاب اللہ کو ستھری اور خالص رکھو۔ اللہ کی کتاب کو ہر قسم کے اشتباہ سے پاک رکھو۔ صحابیؓ کہتے ہیں تب ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک میدان میں اکٹھا کیا پھر اس کو ہم نے جلا دیا۔

حدیثوں کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کا فرمان

عزیزانِ من! یہ اس دور کی وضع کردہ باتیں نہیں ہیں ان مستند کتابوں کے اندر یہ لکھا ہوا ہے۔ امام ذہبی میں تذکرۃ الحفاظ کے اندر حضرتِ ابوبکر صدیقؓ کے متعلق لکھا ہے کہ حضرتِ ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ ﷺ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔ پس چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات بیان نہ کیا کرو پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے پس چاہیے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کا بیان کردہ ایک اہم واقعہ

پھر انہی امام ذہبی نے یہ لکھا ہے کہ حضرتِ عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے والد حضرتِ ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو جمع کیا اور ان کی تعداد پانچ سو تھی۔ پھر ایک شب میں دیکھا گیا کہ وہ یعنی حضرتِ صدیقِ اکبرؓ بہت زیادہ کروٹیں بدل رہے ہیں میں نے عرض کیا آپؓ یہ کروٹیں کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا کوئی خبر آپؓ تک پہنچی ہے جسے سن کر آپؓ بے چین ہو رہے ہیں؟ آپؓ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ جب صبح ہوئی تو آپؓ نے فرمایا بیٹی ان حدیثوں کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں پھر آگ منگائی اور اس نسخے کو جلا دیا۔

روایات کے سلسلہ میں حضرت عمر بن خطابؓ کی بلند نگہی

عزیزانِ من! میں دہراتا چلا جاؤں کہ یہ اس دور کی وضع کردہ باتیں نہیں ہیں یہ اس زمانے کی ان مستند کتابوں کے اندر یہ

واقعات لکھے ہوئے ہیں۔حضرتِ عمرؓ آگے آتے ہیں ان کے متعلق یہ لکھا ہے علامہ عبدالبر نے' کتاب ان کی ہے جامع بیان العلم' اب اس کا ترجمہ بھی اردو میں ہوگیا اس کتاب کا' بڑی مستند سمجھی جاتی ہے ان کے ہاں۔اس میں لکھا ہے کہ عمر بن خطابؓ نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جائے تب انہوںؓ نے رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے کہا کہ حدیثیں لکھوا لی جائیں۔لیکن اس مشورے سے حضرتِ عمرؓ کا دل مطمئن نہ ہوا وہ ایک مہینے تک اس معاملے کو سوچتے رہے پھر ایک دن جب صبح ہوئی تو اس وقت حق تعالیٰ نے فیصلے میں یکسوئی کی کیفیت ان کے قلب میں عطا کردی۔حضرتِ عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تھا پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا جو تم سے پہلے گذری ہیں کہ انہوں نے کتابیں لکھیں اور ان پر ٹوٹ پڑے اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں اور قسم ہے اللہ کی کہ میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا اس لیے حدیثیں جمع نہیں کی جائیں گی۔طبقات ابن سعد میں اس سے اور ایک قدم آگے لکھا ہے کہ آپؓ نے کیا اٹھایا؟ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں حدیثوں کی کثرت ہوگئی عام طور پہ لوگ بیان کرنے لگ گئے تو آپؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں۔حسب الحکم لوگوں نے اپنے مجموعے حضرتِ عمرؓ کے پاس پیش کردیے تب آپؓ نے انہیں جلانے کا حکم دے دیا۔

جامع البیان میں ایک اور حدیث کا ذکر

جامع البیان میں ہی ایک دوسری حدیث ہے کہ حضرت عمر ابنِ خطابؓ نے پہلے تو یہ چاہا کہ حدیثوں کو قلم بند کرلیا جائے مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلم بند کرانا ان کا مناسب نہ ہوگا۔تب چھاؤنیوں میں اور دیگر اضلاعی شہروں میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس حدیثوں کے سلسلے کی کوئی چیز ہو چاہیے کہ اسے محو کردے یعنی ضائع کردے۔عزیزانِ من! آپ سن رہے ہیں خلافتِ راشدہؓ کے زمانے کی یہ باتیں آپ کے ہاں کی مستند تاریخوں کے اندر یہ لکھی ہوئی آج موجود ہیں۔اور یہ نہ بھی ہوتیں تو یہ واقعہ تو موجود ہے نا کہ اس دور کا کوئی مجموعۂ احادیث امت کے پاس' یہی نہیں کہ آج نہیں' جس زمانے میں حدیثیں مدون ہوئیں' اس زمانے میں بھی نہیں تھا۔اس کی کوئی ریفرنس ان کے ہاں نہیں آتی کہ کبھی تھا کوئی مدون ہوا تھا۔

امام مالکؒ کی کتاب موطا میں مختلف واقعات کا ذکر ہے

جیسا میں نے عرض کیا ہے پہلا مجموعہ امام مالک کی موطا ہے اس میں مختلف ان کے ہاں کے جسے ایڈیشن کہتے ہیں' ہم ان میں پانچ سو سے تین سو تک کے درمیان میں یہ ہیں چیزیں کہ مدینے کے صحابیؓ کیا کیا کرتے تھے۔اور یہ جو احادیث ہیں ان کو کہا جاتا ہے

صحاح ستہ چھ حدیث کی صحیح کتابیں۔ یہ چھ کتابیں سنیوں کی ہیں اسی قسم کی صحیح حدیثوں کی کتابیں شیعوں کی الگ ہیں چار اور دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ وہ بھی صحیح حدیثوں کی کتابیں ان کے ہاں بھی صحیح حدیثوں کی کتابیں۔ پھر خود سنیوں کے ہاں کی جو صحیح حدیثوں کی کتابیں ہیں ان میں سے کتابیں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ پھر ایک ہی کتاب کے اندر متضاد حدیثیں لکھی ہوئی۔

سنیوں اور شیعوں کے الگ الگ حدیثوں کے مجموعوں کی تاریخی حیثیت کا تفصیلی ذکر

یہ چھ کتابیں جو سنیوں کی ہیں ان میں سے دو صحیحین یعنی ان چھ میں سے سب سے اونچی' ان دو میں سے بھی سب سے اونچی امام بخاری کا مجموعہ۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کی وفات 256ھ میں ہوئی تھی' بخارا کے رہنے والے تھے۔ دوسرا امام مسلم کا مجموعہ' وہ نیشا پور کے رہنے والے تھے 261ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ تیسرا ان کے ہاں ترمذی کا مجموعہ ہے' وہ ترمذ کے رہنے والے تھے ایران میں واقع ہے۔ 279ھ میں ان کی وفات ہوئی تھی۔ چوتھا مجموعہ امام ابوداؤد کا ہے۔ وہ سیستان کے رہنے والے تھے۔ 275ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ پانچواں ہے ابنِ ماجہ کا قزوین کے رہنے والے تھے ایران کے شہر کے' 273ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ اور چھٹا ہے امام نسائی کا' خراسان کا ایک گاؤں تھا نساء' اس کے رہنے والے تھے۔ 303ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ خود شیعوں کے ہاں کا بھی جو مجموعہ سب سے اونچا ہے' وہ کلینی کا الکافی جسے کہتے ہیں۔ ان کی وفات بھی 239ھ میں ہوئی تھی۔ اور اس سے آگے جو ان کے ہاں کے مجموعے ہیں شیخ محمد ابنِ علی کا مجموعہ جو ہے۔ 381ھ میں ان کی وفات ہوئی تھی۔ دو مجموعے محمد بن حسن کے ہیں' 460ھ میں ان کی وفات ہوئی تھی۔ آپ نے دیکھا شیعہ حضرات کے مجموعوں کو میں الگ رکھتا ہوں۔ سنی حضرات کے یہ چھ مجموعے آپ دیکھ رہے ہیں ان میں کوئی جامع حدیث عرب کا رہنے والا نہیں ہے' یہ سارے ایران کے رہنے والے تھے۔ شیعہ حضرات کے مجموعوں کے جامعین بھی ہیں' وہ بھی سب ایران کے رہنے والے تھے۔ اڑھائی سو سال کے بعد مجموعے مرتب ہوتے ہیں بغیر کسی قسم کے پہلے WRITTEN RECORD کے۔ اور پھر یہ نہیں ہے کہ انہوں نے بس جتنے ان کے مجموعوں میں احادیث ہیں' ان کو اتنی ہی احادیث ملی تھیں۔ وہ میں نے عرض کیا ہے نا پھر تفصیل سے سینے کیسے یہ جمع ہوتی تھیں؟ وہ کہتے تھے فلاں شخص سے میں نے پوچھا' انہوں نے کہا کہ ہاں مجھے معلوم ہے رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ 250ھ کے قریب میں ایک شخص نے مل کے ان سے کہا۔ بھئی! تم تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود نہیں تھے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے والد سے سنا یا اپنے استاد سے سنا۔ انہوں نے کہا وہ کہاں ہیں؟ کہنے لگے وہ وفات پا گئے ہیں۔ بھئی! وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تو نہیں تھے؟ انہوں نے اپنے والد یا اپنے شیخ سے سنا تھا' انہوں نے اپنے والد یا اپنے شیخ سے سنا تھا۔ عزیزان! اڑھائی سو سال کے

عرصے میں جتنے درمیان میں آتے ہیں پانچ چھ تو درمیان (جنوں پیڑیاں کیندے نیں) اتنی تو آتی ہیں نا درمیان میں۔اور یہ ساری زبانی باتیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ صحیح تریں جو کتاب کا مجموعہ ہے ان کے ہاں اس میں بھی اور ہر مجموعے کی ہر حدیث کے شروع میں لکھا ہوا ہوتا ہے قال رسول اللہ ﷺ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔اس کے بعد ہوتی ہے وہ حدیث یا قول کہ یہ فرمایا۔آخر میں ہوتا ہے اوکما قال رسول اللہ ﷺ یہ یا جیسا آپ ﷺ نے فرمایا ہو۔ہر حدیث کے بعد یہ لکھا ہوا ہوتا ہے۔بالکل ٹھیک بات ہے انہوں نے ٹھیک بات لکھ دی تھی'یقین ہو ہی نہیں سکتا تھا۔اب یہ بات آگے چلی۔

شروع میں حدیثوں کی جو تعداد جمع کیں ان کی تفصیل اور پھر جو باقی رکھیں ان کی تعداد

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انہوں نے یہ جو جمع کریں' یہ نہیں کہ جتنی ان کو ملیں جمع کر دیں۔امام بخاری نے لکھا ہے کہ مجھے چھ لاکھ حدیثیں ملی تھیں۔انہوں نے اپنے مجموعے میں جو جمع کیں یوں تو اس کی تعداد قریباً چھ ہزار کے قریب آتی ہے لیکن ایک حدیث کو وہ دو دو تین جگہ لکھ جاتے ہیں۔اگر ان مکررات کو جو دو دو تین جگہ لکھی ہیں' نکال دیا جائے تو وہ ساری حدیثیں کوئی 2630 کے قریب باقی رہتی ہیں۔چھ لاکھ اکیلے امام بخاری کو ملیں۔اب سوچیے کہ یہ کتنی پھیلی ہوئی تھیں۔امام بخاری کی اپنی فراست کے مطابق' اپنی بصیرت یا معیار کے مطابق' چھ لاکھ میں سے 597000 کو تو انہوں نے ہی DISCARD کر دیا۔انہیں منکرِ حدیث نہیں کہا جاتا۔پانچ لاکھ ستانوے ہزار کا انکار انہوں نے خود کر دیا اور ایسا انکار کہ ان کو کہیں ریکارڈ نہیں کیا' وہ تلف ہی ہو گئیں۔امام مسلم نے لکھا ہے کہ مجھے تین لاکھ حدیثیں ملیں اس میں سے انہوں نے چار ہزار تین سو کے قریب لیں۔ترمذی نے لکھا ہے کہ ان کو بھی تین لاکھ کے قریب حدیثیں ملیں اس میں کوئی تین ہزار کے قریب اس میں سے چنیں۔ابوداؤد نے لکھا ہے کہ پانچ لاکھ مجھے ملیں' چار ہزار آٹھ سو اس میں سے لیں۔امام ابنِ ماجہ نے کہا ہے' چار لاکھ مجھے ملیں' چار ہزار انہوں نے لیں۔نسائی نے لکھا ہے کہ دو لاکھ مجھے ملیں' چار ہزار اس میں سے انہوں نے لیں۔آپ سوچیے تو سہی یہ جو ان لوگوں کو ملیں حدیثیں' کتنے لاکھ ان کی میزان ہو جاتی ہے اور کتنے لاکھ انہوں نے خود ہی ان کو DISCARD کر دیا' مسترد کر دیا' یہ رکھیں۔

ان پیش کردہ حدیثوں کے سلسلہ میں پرکھ اسمآء الرجال کے مراحل

اب آگے ایک اور ہمارے ہاں گروہ پیدا ہوا انہوں نے کہا کہ ان لوگوں نے تو کہا ہے' مجھے فلاں نے یہ بتایا فلاں نے یہ بتایا پتہ تو لیں کہ وہ بتانے والے قابلِ اعتماد بھی تھے یا نہیں۔یہ جو فن ہے کہ راویوں کی پرکھ کی جائے' اسے اسمآء الرجال کہتے ہیں۔بڑی

بڑی کتابیں اس پہ لکھی ہوئی ہیں۔لیکن ذرا سوچیے کہ کس طرح سے یہ بیٹھے ہیں طے کرنے کے لیے کہ یہ جوراویوں کے نام اس میں آتے ہیں، وہ قابلِ اعتماد بھی ہیں یا نہیں۔ان کی وفات کے بعد یعنی یہ تو پھر بھی اڑھائی سو سال کے بعد مدون ہوئے یہ اسمآ ءالرجال والے۔ان سے بھی دوتین سوسال بعد بیٹھے۔پانچ چھ سوسال بیٹھ کے یہ ان لوگوں کے متعلق فیصلہ کرنے بیٹھے کہ اس میں سے قابلِ اعتماد کون کون سا ہے۔اب وہ آپ سوچیے تو سہی کہ کیا یہ HUMANLY POSSIBLE ہے کسی کے لیے کہ پانچ چھ سو سال بعد بیٹھ کے اس دور کے لوگوں کے متعلق اڑھائی سوسال میں جو گذرے ہیں یقینی طور پہ یہ کہہ سکے کہ یہ کس حد تک قابلِ اعتماد تھے اور کس حد تک نہیں تھے۔

اسمآ ءالرجال کے مابین اعتماد اور عدم اعتماد کی شکل وصورت اور راوی کے لیے ثقہ کی شرط کا جواز

اور پھر یہ اعتماد اور عدمِ اعتماد جو تھا اس کے بنیادی اصول کیا تھے۔اس راوی میں کچھ شیعیت کے عقائد میں شیعیت کی جھلک ملتی ہے اصول قرار پا گیا کہ سارے ایسے راوی جو ہیں وہ جھوٹے ہیں یعنی پورے کا پورا گروہ ہی اس قسم کا جھوٹا ہے۔شیعہ حضرات کے نزدیک سنیوں کا پورا گروہ جھوٹا، اِن کے نزدیک اُن کا گروہ جھوٹا۔اب اس کے بعد ان میں سے بھی امام بخاری کے نزدیک امام ابوحنیفہ جھوٹے، نا قابلِ اعتماد ان کی کوئی حدیث نہیں لینی چاہیے۔بھئی کیا جرم انہوں نے کیا؟ کہ جی ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ایمان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے عمل کی بنا پر۔نا قابلِ اعتماد، کوئی نہیں حدیث لی جائے گی۔فلاں صاحب نا قابلِ اعتماد، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ گرم پانی سے وضو کرنا جائز ہے۔اس قسم کی چیزیں اور پھر آپ سوچیے کہ اس کے اس معیار اور تحقیق کے بعد فیصلے کیے کہ یہ یہ راوی جو ہیں ثقہ ہیں۔آپ نے دیکھا کہ ثقہ کا ایک لفظ آتا ہے۔جو حدیثیں یہ روایت کردیں وہ قابلِ اعتماد حدیثیں ہیں۔میرے بھائیو یہ ہے جو چیز اس طرح سے طے پائی۔ایک تو وہ ضرورت پیش آئی وہ جو ثنویت آئی سیاست الگ ہوئی، ان کے حصے میں یہ شعبہ آیا۔یہاں یہ بات اپنی منوا نہیں سکتے تھے، حکومت تو منوا سکتی ہے۔ان کے پاس تو وہ اقتدار اور قوت نہیں تھی ان کے پاس نبی اکرم ﷺ کے اسمِ گرامی کی عقیدت اور ارادت جو مسلمانوں کے دل میں تھی وہ تھی جس کی بنا پہ یہ چیزیں انہوں نے اپنی منوائیں۔چلیے صاحب! کوئی نہیں نسبت ہی صحیح حضور ﷺ کی طرف، اس میں انہوں نے کیا تو یہ کہ ایسا کچھ جمع کر دیا یہ ہوا۔نتیجہ کیا ہوا؟

خلافتِ راشدہ کے بعد پیدا ہونے والی سیاست کے اثرات جو فرقہ بندی کی شکل اختیار کر گئے

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں، خلافتِ راشدہؓ میں آگے چلنے کے بعد بھی یہ سیاست کے طور پہ جو چیز ہمارے ہاں ہوئی ہے نا

یہ شیعانِ علی جن کو کہتے ہیں یا ایک پارٹی۔ پہلے زمانے میں پہلے دور میں یہ ایک عقیدتاً بات نہیں ہوئی تھی' ایک سیاسی چیز تھی اس سارے دور میں۔اس سے پہلے مسلمانوں کے اندر کوئی مذہبی فرقہ تھا ہی نہیں۔ یہ سارے فرقے آپ کے ہاں اس دور کے بعد پیدا ہوئے ہیں جب یہ حدیثیں مدون ہوئی ہیں۔اختلاف کن کن چیزوں میں ہے؟ اور چیزیں تو چھوڑ دیجیے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھیے آپ۔نماز کی تمام جزئیات میں اختلاف ہے۔اچھے بھلے لوگ پھر رہے ہوں گے جیسا میں نے عرض کیا ہے انارکلی کے اندر یا یہاں آپ احباب بیٹھے ہوئے ہیں' کسی کے ماتھے پہ نہیں لکھا ہوا دیوبندی اہل حدیث بریلوی شیعہ سنی کچھ نہیں' ٹھیک بیٹھے ہوئے ہیں۔نماز کی اذان ہو جائے اٹھ کے یہ نمازیں پڑھنے لگ جائیں ایک ایک کے متعلق پتہ چل جائے گا کہ کس فرقے کو BELONG کر رہا ہے۔ ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ میں اس طریقے پہ نماز پڑھ رہا ہوں جس پہ رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے۔عزیزانِ من! سوچیے کہ کیا رسول اللہ ﷺ ایک وقت میں ایک نماز کی ایک رکعت میں ہاتھ اٹھاتے تھے دوسری میں چھوڑتے تھے' ایک میں یہاں باندھتے تھے' دوسری میں یہاں باندھتے تھے' تیسری میں بالکل چھوڑ دیتے تھے؟ یعنی کیا یہ سارے طریقے جو ہیں یہ سارے ہی رسول اللہ ﷺ کے ہو سکتے تھے؟ ان کی سند کیا ہے؟ حدیث کی کتابیں۔

صدیوں سے ملت اسلامیہ کی حد تک فرقہ بندی کی پیدا کردہ مایوس کیفیت اور آئین کی پاسداری

ہر فرقے کے اپنے عقائد کی اپنے مسلک کی اور اپنے ارکان کی سند کوئی نہ کوئی حدیث کی کتاب ہے۔اس سے پہلے کوئی فرقہ نہیں آپ کے ہاں۔آج مایوس ہو گیا ہوا ہے آپ کا مسلمان' آپ نے ان کے ہاں سنا ہوگا' لکھا ہوا دیکھا ہوگا کہ صاحب! مذہبی فرقے تو نہیں مٹ سکتے۔عزیزانِ من! فرقہ بندی کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے بہ نصِ صریح۔اور اس کے لیے کہا یہ ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا (30:31-32) اقامتِ صلٰوۃ کرو مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ کہ فرقوں میں بٹ جاؤ اور ہر فرقہ پھر یہ کہے کہ سچائی پہ ہوں' دوسرے فرقے جھوٹے ہیں۔ایسا نہ کہیں کر لینا۔رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ جو لوگ دین میں فرقہ بندی پیدا کر لیں اے رسول لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ (6:159) تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔خدا سے تعلق چھوٹا کہ مشرک ہوئے۔رسول اللہ ﷺ سے تعلق چھوٹا خدا کے اس فیصلے کے مطابق۔ آج مسلمانوں میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی فرقے کے ساتھ متمسک ہونا پڑتا ہے۔ انہوں نے زور دے کر بضد CONSTITUTION میں یہ شق رکھوائی تھی یہ 1962ء کی CONSTITUTION میں یہ شق نہیں تھی پہلے فرقوں کی۔ ایک عالم گیر تحریک چلائی گئی کہ اس میں یہ شق رکھنی چاہیے کہ PERSONAL LAWS یا شخصی معاملات کے فیصلے ہر فرقے

کی فقہ کے مطابق ہوں گے۔اب آپ وہاں جائیں عدالت میں اگر اپنا کوئی مقدمہ لے کر PERSONAL LAWS کے متعلق، آپ کو بتانا پڑے گا کہ صاحب! میں کس فرقے کو BELONG کرتا ہوں۔آپ کو اعلان کرنا پڑے گا کہ میں مشرک ہوں رسول اللہ ﷺ کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور شریعتِ حقہ کے مطابق میرا فیصلہ کر دیجیے۔

ہر فرقے کا الگ امام اس کی اپنی فقہ اور پھر وحی کی دو قسموں کا عقیدہ

عزیزانِ من! یہ کیا ہوا؟ ایک بنیادی چیز مرکزیت کا تصور اٹھ گیا، نظام مملکت کا ختم ہو گیا، انفرادیت آ گئی اجتماعیت کی جگہ۔ سلطنت اپنے فیصلے کرتی چلی گئی۔انہوں نے اپنے اپنے فیصلے کیے ہر ایک کا الگ الگ امام۔آگے پھر فقہ مرتب ہوئی فقہ کی بنیاد حدیث کے اوپر۔الگ الگ امام کی فقہیں ہوئیں۔اب ہمارے ہاں جو اپنے آپ کو غیر مقلد کہتے ہیں کہ اماموں کی تقلید نہیں ہم کرتے، وہ احادیث کے مطابق، جو مقلد کہلاتے ہیں وہ اماموں کی فقہ کے اوپر مبنی رکھتے ہیں اور فقہ کے متعلق کہتے ہیں وہ حدیثوں کے اوپر مبنی ہیں صاحب۔اور اگر آج کوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ صاحب! میں قرآنِ خالص کو مانتا ہوں تو وہ منکرِ حدیث، منکرِ رسالت، اسلام سے باہر، مرتد واجب القتل۔وہ سچ کہتے ہیں کہ فرقے نہیں مٹ سکتے انہوں نے اس کی بنیاد ایسی رکھ دی ہے جس کا تعلق عقیدت مندی سے ہے، جذبات سے ہے۔کوئی چیز نہیں ملی، اللہ کا احسان ہے، پرویز کے خلاف کہنے کے لیے لیکن جو چیز منسوب کر دی وہ ایسی تھی کہ اس کے بعد پھر کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے "منکرِ رسالت ہے" اللہ اکبر۔کسی مسلمان سے جب یہ کہہ دیا جائے تو اس کے بعد وہ اس کی بات سننے کے لیے تیار بھی ہوگا؟ خود اعتراف کرتے ہیں کہ فرقے نہیں مٹ سکتے۔یہاں پہنچ گیا آپ کا اسلام۔جسے شرک قرآن قرار دیتا ہے، وہ چیز نہیں مٹ سکتی جس سے رسول اللہ ﷺ کو کوئی تعلق نہیں باقی رہ سکتا، وہ کہتے ہیں وہ نہیں مٹ سکتی اب۔نبوت ختم ہوگئی یہ شرک اور کفر مٹ نہیں سکتا۔چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما۔اب تو کسی نبی نے بھی نہیں آنا کہ آ کے وہی مٹا دے، یہ کچھ کر دے۔ہوا کیا؟ وہ چیز جو کتاب اللہ اور اس کے ماتحت نظام تھا جو آپ کے ہاں کا اسلامی نظام جسے کہا جائے گا، کتاب اللہ یوں پسِ پشت چلی گئی۔نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔نظام پھر آپ کے ہاں آیا ہی نہیں ہے۔دین مذہب کی سطح پہ اتر آیا انفرادی چیز بن گیا۔انفرادی چیز پر سندیں ان چیزوں کے ہاں سے آپ کو ملنی شروع ہو گئیں۔اب اس کی اہمیت پھر قرآن کو پیچھے چھوڑیے، ان کی اہمیت پہ زور دیجیے۔کہا کہ صاحب! قرآنِ کریم تو وحی ہے خدا کی طرف سے اور یہ جتنی آپ احادیث کہتے ہیں، روایات کہتے ہیں، یہ تو اب وحی نہیں تھی۔ایک عقیدہ آپ کے ہاں اور وضع ہوا۔وضع نہیں ہوا، مستعار لیا گیا۔یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا پہلے سے کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ایک ہوتی ہے وحی شب کتب جو لکھی جاتی ہے اس کی تلاوت کی

جاتی ہے ایک ہوتی ہے وحی شبعلفہ وہ وحی کہ جو وحی تو ہوتی ہے خدا کی، وہ لکھی بھی نہیں جاتی، اس کی تلاوت نہیں کی جاتی، زبانی روایت کے ذریعے سے آگے چلتی ہے۔ ان کے ہاں تورات الگ ہے خدا کی وحی، وحی کی ایک قسم اور ان کے ہاں مشنا الگ ہیں حدیث کی کتابیں وحی کی دوسری قسم۔ اس دور سے پہلے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ہمارے ہاں کے اسلامی لٹریچر میں کہیں بھی یہ دو قسمیں نہیں ملتیں۔ یہ پہلی دفعہ جب احادیث کو اہمیت دی تو یہ عقیدہ آپ کے ہاں آ گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں قرآن اور مثلہ معہ قرآن اور اس کی مثل اس کے ساتھ۔ وہ کونسی چیزیں ہیں؟ یہ جتنی حدیثیں ہیں۔ جن کے ظنی ہونے کی کیفیت یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ہر حدیث کے آخر میں کہا جاتا ہے ''اوکما قال رسول اللہ ﷺ'' یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے کہا ہو، یہ وحی ہے؟ اب جسے وحی کہا جائے تو پھر؟ حدیثیں ایسی موجود ہیں جو قرآنِ کریم کی تعلیم کے کھلے ہوئے طور پر خلاف جاتی ہیں، ٹکراؤ دونوں میں ہو رہا ہے۔ کیا کیا جائے؟

مسلمانوں میں Personal Laws الگ اور پبلک لا الگ یہ مذہب کی پیداوار ہے دین کی نہیں

آپ کو معلوم ہے کہ عقیدہ یہ ہے کہ اگر ان دونوں میں ٹکراؤ ہو، پہلے تو کوشش یہ کرو کہ کسی طرح سے قرآن کی آیت کی تاویل ایسے کرو جو حدیث کے مطابق ہو جائے اور اگر ایسے نہ ہو تو سمجھ لو کہ قرآن کی آیت منسوخ ہے، عمل حدیث کے اوپر ہوگا۔ میں پوچھتا یہ ہوں ان چیزوں کی موجودگی میں وہ جو کہتے ہیں فرقے نہیں مٹ سکتے، میں پوچھتا ہوں کوئی اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے؟ کوئی اسلامی قانون ایسا بن سکتا ہے جو تمام مسلمانوں کے اوپر یعنی ہر فرقے کے مسلمان کے اوپر یکساں طور پہ APPLY کیا جا سکے۔ انہوں نے بڑی دور کی کوڑی لائے کہہ دیا کہ صاحب PERSONAL LAWS جو ہیں وہ ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔ یہ PERSONAL LAWS اور PUBLIC LAWS میں پوچھتا ہوں اسلام میں اس تفریق کی کہیں گنجائش بھی ہے؟ کیا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ قوانین کی دو قسمیں ہوتی تھیں؟ پھر میں پوچھتا یہ ہوں کہ یہ جو PUBLIC LAWS جنہیں آپ کہتے ہیں، کیا وہ مجموعہ ایسا آپ بنا سکتے ہیں کہ اس کے ہر قانون کو آپ کا ہر فرقہ جو ہے اسلامی اپنے نقطۂ نگاہ سے سمجھے؟ PERSONAL LAW کو چھوڑیے PUBLIC LAW کے ضمن میں سوال یہ آیا کہ زمین بٹائی پہ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ یہ تو PERSONAL LAW نہیں ہے یہ تو ملک کا قانون بننا ہے جسے ہر ایک کے اوپر APPLY ہونا ہے۔ بحث چلی ہوئی ہے اُدھر اور اِدھر سے دونوں طرف سے حدیثیں پیش کی جا رہی ہیں بٹائی پہ دی جا رہی ہے، بٹائی پہ دینا حرام ہے۔ عزیزانِ من! کون سا قانون بنائے گی کوئی اسلامی مملکت جو ACCEPTABLE ہوگا قابلِ قبول ہوگا ہر فرقے کے مسلمان کی رو سے اسلامی۔ عزیزانِ من! کوئی بیٹھ کے سوچتا نہیں سوچنے کے قابل ہی نہیں رکھا ہوا اور قومیں تو تباہ ہی اس وقت ہوتی ہیں جب وہ سوچنے

کے قابل نہ رہیں۔اوران کی ایسی کیفیت کردی جائے EMOTIONALISM کے اندر جذباتی طور پہ کہ وہ سوچ سکے نہیں بیٹھ کے۔ یہ سوالات اٹھانے والا جو ہے اس کو نکو بنا دیا جاتا ہے۔عزیزانِ من! کوئی شکل باقی نہیں ہے ان عقائد کی موجودگی کے اندر۔سوچ لیجیے آپ۔

ختمِ نبوت کے بعد ہر صدی کے آخر میں ایک مجدد کے آنے کا عقیدہ

یہ تھا مایوسی کا عالم کہ جس میں پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کی تو کوئی شکل ہے نہیں صاحب کہ مسلمان کسی طرح سے بھی صحیح دین پہ آئیں۔اس مایوسی نے یہ تصور پیدا کیا کہ اب خدا کی طرف سے ہی کسی کو آنا چاہیے۔نبوت تو ختم ہوگئی' خدا کی طرف سے اب کسے آنا چاہیے؟ اب انہوں نے الفاظ بدلے اور یہ سمجھ لیا کہ صاحب! گنجائش نکل آئی ہے۔خدا کی طرف سے نبی یا رسول نہیں آئے گا' ہر صدی کے آخر کے اوپر ایک مجدد آئے گا۔وہی اشخاص اب آنے شروع ہوگئے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ذات خود اپنے آئینہ میں

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے' میں قرآن کے ارشاد کے مطابق اور نبی اکرم ﷺ کے اتباعِ سنت کے مطابق صرف مسلمان ہوں۔ میرا نہ کسی کی طرف نہ میلان ہوتا ہے' نہ کسی کے خلاف تعصب ہوتا ہے۔ میرے نزدیک دین کے معاملے کے اندر ہر حقیقت کا معیار خدا کی کتاب قرآنِ کریم ہے۔ میں نے اپنے بیسیوں سینکڑوں عقائد وہ چھوڑے جو اس سے پیشتر میں رکھا کرتا تھا۔کوئی بھی عقیدہ کوئی بھی خیال کوئی نظریہ جو میرے سامنے آئے گا' میں اسے قرآن کی کسوٹی پہ پرکھوں گا۔کسی کے خلاف جاتا ہے تو ٹھیک ہے جائے' میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔قرآن ہے میرے سامنے۔ عزیزانِ من! قرآن نے نبوت کا خاتمہ اس لیے کیا تھا کہ اشخاص کی طرف نگاہیں نہ اب اٹھانا شروع کردو' تم بالغ ہو چکے ہوئے ہو۔ قرآن کو محفوظ اس لیے رکھا گیا تھا کہ اب اس کے بعد کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔ جب کتاب کی ضرورت نہ ہو تو آسمان سے کسی آنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ خالی ہاتھوں کوئی نہیں آتا' نام کچھ بھی رکھ لیجیے۔

اگر انسان کے لیے دو قسم کا علم ہے تو پھر دو قسم کے ہی مختلف ذریعے ہیں

اب میں بتاتا ہوں فرق کیا ہوتا ہے؟ علم حاصل کرنے کی صلاحیتیں وہ تو یہ ٹھیک ہے ہر بچہ پیدائش سے اپنے ساتھ ایک دماغ لاتا ہے' آنکھیں لاتا ہے' کان لاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہیں جسے کہیے یہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ہیں' کسی کی خریدی ہوئی نہیں ہوتیں۔

ان کے ذریعے سے انسان معلومات حاصل کرتا ہے' ان معلومات سے کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے' اس کے بعد علم حاصل کرتا ہے' مطالعہ کرتا ہے' مشاہدہ کرتا ہے خود' پھر کسی بات پہ پہنچتا ہے' اسے کہتے ہیں انسان فکری طور پر کوئی چیزیں ہیں جن کو حل کرتا ہے۔ یہ تو عام علم کا طریقہ ہے۔ ایک عقیدہ اس کے خلاف تھا کہ جو انسان کی اپنی فکر کی پیدا کردہ نہیں بلکہ خدا اس کو براہِ راست ایک چیز کا علم دیتا ہے یعنی ایک علم تو یہ ہے نا کہ آپ نے تجربے سے مشاہدے سے یہ دیکھ لیا کہ سنکھیا زہر ہے۔ اس کے لیے آپ اس سے پوچھیے تو آپ کو وہ دلائل دے گا' آپ کو مشاہدہ بتائے گا' کر کے دکھائے گا۔ یہ انسان کی فکری تحقیق ہے۔ ایک یہ چیز ہے کہ خدا کسی انسان کو براہِ راست یہ بتا دے کہ اس چیز کے قریب نہ جانا' یہ زہر ہے۔ یہ اس کی اپنی فکر کی پیدا کردہ چیز نہیں ہے' اسے کہتے ہیں خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنا قرآن کی رو سے اسے وحی کہا جاتا ہے۔ ختمِ نبوت ﷺ کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو طریقہ ہے نا علم کا' یہ طریقہ خدا نے بند کر دیا۔ بچہ باپ سے جو کچھ لیتا ہے' وہ اس کا اپنا فکری پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ جب ہم بچے سے کہتے ہیں نا کہ بیٹا! یہ آگ کے قریب نہ جانا تو بچے نے سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ نہیں کیا ہوتا' وہ ہم سے یہ چیز لیتا ہے اس کا اپنا فیصلہ نہیں ہوتا۔ وحی کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ خدا براہِ راست کسی کو معلومات بہم پہنچاتا ہے' وہ معلومات اس کے اپنے ذہن کی پیدا کردہ نہیں ہوتیں' اسے کہتے ہیں وحی۔ خدا نے ختمِ نبوت سے کہا کہ اب ہم نے یہ طریق بند کر دیا ہے' اب تمہارے لیے طریقِ عمل یہی ہے۔ مطالعہ کرو' مشاہدہ کرو' علم حاصل کرو' خود حواس کے ذریعے سے DATA اکٹھا کرو' فکری طور پہ کسی نتیجے پہ پہنچو' اسے پھر آزما کے دیکھو' یہ ہے طریقہ' اس کے معنی ہیں ختمِ نبوت' خدا کی طرف سے علم ملنے کا یہ طریقہ ختم کر دیا۔

الہام اور کشف کے علاوہ مجدد وغیرہ کی اصطلاحات کا مفہوم نیز حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تعارف

عزیزانِ من! اب اگر اس کو وحی کی جگہ آپ الہام کہہ دیں تو اس سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ وہ جو اندر ایک گھٹن تھی کہ ختمِ نبوت ﷺ کے بعد وحی کا دعویٰ کس طرح سے کر دیا جائے تو مسلمان ماننے کو تیار ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس کی جگہ انہوں نے الہام اور کشف اور اس قسم کی اصطلاحیں وضع کیں۔ اس کا نام نبی نہیں رکھا' اس کا نام کہیں اولیا کرام رکھا (چھوٹے درجے پہ) آگے آگے بڑھے تو اس کا نام مجدد رکھا۔ یہ اصطلاح بھی ہمارے ہاں پہلے نہیں ملتی۔ تاریخ میں ہوا یہ تھا' بنی امیہ کے زمانے میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز جو تھے انہوں نے بہت سی ایسی چیزیں جو اس دور میں خلافتِ راشدہؓ کے خلاف جا رہی تھیں' وہ رائج ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ان چیزوں کو مٹایا اور ان کی جگہ پہ خلافتِ راشدہؓ کے زمانے کی چیزوں کو از سرِ نو ان کا احیا کیا۔ لوگوں نے جب یہ چیز ان میں دیکھی تو ان کے متعلق یہ کیا کہ یہ تو مجدد ہے اس مسلک کا کہ جو خلافتِ راشدہؓ کے زمانے میں تھا۔ انہوں نے پھر سے تجدید کی ہے اس

کی۔ یہ لفظ یوں INTRODUCE ہوا آپ کے ہاں۔ نہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ دعویٰ کیا کہ میں مامور من اللہ ہوں' خدا کی طرف سے مجھے یہ علم ملتا ہے' نہ لوگوں نے ہی ان کے متعلق یہ سمجھا تھا۔ اتفاق سے حضرتِ عمر بن عبدالعزیز پہلی صدی کے آخر میں ہوئے 101ھ میں ہوئے۔ اس کے بعد کسی کے ذہن میں یہ بات آئی اور ایک فقرہ عربی کا آپ کے ہاں آ گیا کہ ہر صدی کے آخر میں ایک مجدد خدا کی طرف سے مامور من اللہ آیا کرے گا جو یوں علم حاصل کرے گا خدا سے براہِ راست۔ وحی نہیں کہا پیغمبر نہیں کہا' بات وہی کہی اور اس کو MECHANICAL بنا دیا یعنی سو سال۔ اس سے پیشتر کتنی ضرورت کیوں نہ محسوس ہو' وہ نہیں آئے گا اور اس وقت خواہ ضرورت ہو یا نہ ہو آئے گا کیوں کہ سو ہی سال کے بعد آنا ہے۔ عزیزانِ من! دیکھیے کیا عقائد آپ کے ہاں آئے ہیں؟ یہ تصور میں نے عرض کیا ہے اس مایوسی کا پیدا کردہ ہے۔ فرقے نہیں بند ہو سکتے پھر ایک مرکز پہ نہیں آ سکتے' اسلام کا احیا نہیں ہو سکتا۔

مذہب کے نام پر پیدا کردہ غلط تصورات کو ختم کرنے کا طریق

ان چیزوں کی موجودگی میں نہیں ہو سکتا تھا۔ فکرِ صالح اگر ہوتی تو یہ ہوتا کہ یہ جو چیزیں بعد میں ہمارے ہاں آئی ہیں' ان کو ہٹا دیا جائے وہی نقشہ پھر پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کو تو ہٹایا نہیں جائے گا' ان کے رکھتے ہوئے کوئی طریقہ نہیں تھا۔ مجدد آئیں گے صاحب۔ ایک تصور وہ آیا کہ صاحب! ان سے بھی کچھ نہیں بنتا' آخرالزمان ایک امام آئیں گے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مجھے شیعہ حضرات کے اس عقیدے سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ ان کے ہاں یہ چیز جزوِ ایمان ہے۔ سنیوں کے ہاں تو آنے والے کا تصور تھا ہی نہیں' ان کے ہاں بھی وہ تصور آیا۔ یہ تصور نیا نہیں ہے جو انسانوں میں پیدا ہوا۔ دنیا کی ہر قوم میں رسول آئے' رسولوں کے جانے کے بعد وہی کیفیت ان کے ہاں پیدا ہو گئی جو ہمارے ہاں پیدا ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے کیا کیا؟ ہر ایک نے یہ عقیدہ نکالا کہ صاحب! ایک آئے گا آنے والا۔ ہر مذہب نے دنیا کے یہ عقیدہ نکالا مایوسی کے زمانے میں کہ آئے گا آنے والا۔ بچہ جب تک کھیلتا پھرتا رہتا ہے' اس کو ضرورت بھی نہیں ہوتی' تصور بھی نہیں آتا کہ ماں کو آواز دوں یا ماں آئے گی۔ گرتا ہے جس وقت' اُس وقت اس کو یاد پڑتا ہے کہ کوئی آئے مجھے اٹھانے والا۔

ہر مذہب پرست قوم میں ایک آنے والے کے تصور کا عقیدہ موجود ہے

عزیزانِ من! گری ہوئی قوموں کا تصور ہے ''مردے از غیب بروں آید و کارے بکند'' ''اساں ای نئیں کجھ کر سکدے''

مایوسی کی پیدا کردہ ہے یہ چیز۔ جب تک قومیں اپنے زورِ بازو سے آگے بڑھتی ہوئی چلی جاتی ہیں' کبھی ان کے ذہن میں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ ''مردے از غیب بروں آید و کارے بکند'' وہ اپنی قوتِ بازو سے ہر کام کرتے ہیں۔ دنیا کے ہر مذہب نے مایوسی کے عالم میں یہ عقیدہ پیدا کیا۔ یہودیوں کے ہاں آنے والے مسیحا کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ عیسائیوں کے ہاں پھر آنے والے حضرتِ عیسیٰؑ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ بدھوں کے ہاں آخری زمانے میں ایک مسیحا کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اوتار کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ مجوسیوں کے ہاں آنے والا ایک مترا ہے جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ہر مذہب ایک آنے والے کا انتظار کر رہا ہے مایوسی کے زمانے میں۔ اسلام آیا اس نے آ کے کہا کہ جس نے آنا تھا آخری مرتبہ' وہ آ گیا خدا کا مکمل ضابطۂ حیات تمہیں دے گیا۔ اب یہ ضابطۂ حیات اور یہ امت یہ چلے گی آخر تک اب کوئی آنے والا نہیں آئے گا۔ ہر قوم کے آنے والے کے تصور اور عقیدے پہ اس نے لکیر پھیر دی۔ اب کوئی آنے والا نہیں آئے گا۔ انسانیت بیدار ہوگئی ہے۔ گرتے ہو خود اٹھنا ہوگا تم کو' مت بلاؤ ماں کو۔ عزیزانِ من! کوئی بالغ بچہ گرنے کے بعد ماں کو آواز نہیں دیتا۔ یہ قوم جب گری ہے' گری ان وجوہات سے تھی لیکن اِدھر کو توجہ ان کی یہ موڑ نہیں سکتے تھے کہ ان کے ہاں کی اپنی جو بادشاہت آدھے درجے کی ہے مذہبی پیشوائیت کی' وہ چلی جاتی ہے اگر یہ چیزیں بیچ میں سے چلی جائیں۔ عزیزانِ من! قرآن ہو ضابطۂ نظام ہو امت میں۔ مذہبی پیشوائیت کی ضرورت ہی نہیں رہتی' نہ ملوکیت کی ضرورت رہتی ہے۔

مذہبی پیشوائیت اور ملوکیت کا پروگرام اور اس کا نتیجہ

دونوں کی ضرورت کا تقاضا یہ تھا کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اٹھنے نہ دو ان کو ان میں سے ہلنے نہ دو۔

دونوں کی ملی بھگت تھی کہ رکھو ان کے اندر الجھا کے' ان کا تضاد نہ مٹے' اختلاف نہ مٹے' تفرقے نہ مٹیں' مایوس ہو جائیں اپنے مستقبل کی طرف سے' نہیں مٹ سکتے۔ کیا ہوگا؟ آنے والا ایک آئے گا۔ مجدد کے عقیدے' مہدی کے عقیدے حتیٰ کہ انتہائی مایوسی کے اندر نبوت کا بھی عقیدہ۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ نام ہے صرف بدلا ہوا' اصل وہی ہے کہ امت اپنے نظام کی رو سے اب نہیں سنبھل سکتی۔ کوئی آنے والا آئے گا خدا کی طرف سے' وہ ان کو آ کے سنبھالے گا۔ تصورات کے مطابق آنے والوں کو

انہیں کہہ بھی دیا اور اس کے بعد امت کا نقشہ پہلے سے بھی زیادہ بگڑتا چلا گیا۔عزیزانِ من! تشخیص ہی غلط تھی' علاج ہی غلط تھا۔ان آنے والوں نے بھی اپنی دلیل میں (قرآن تو آ نہیں سکتا تھا) وہی احادیث جو ہیں پھر وہ وہاں سے آئیں' وہاں سے ہر چیز مل سکتی ہے۔ساری سر پھٹول وہ جو آنے والا آ کے بیٹھتا ہے' یہ جو دوسرے ہیں وہ جیسے یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ آنے والا مسیحا آئے گا مسیحا آیا' انہوں نے دعویٰ کیا انہوں نے پکڑ کے (ان کے عقیدے کے مطابق) پھانسی دے دی۔ان کے عقیدے کے مطابق میں عرض کر رہا ہوں۔یعنی آنے والے کا عقیدہ بھی موجود ہے آنے والا آ کے جب کرسی پہ بیٹھتا ہے تو اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں یہی آپ کے ہاں ہو رہا ہے۔عقیدہ ہی باطل ہے اس سے بنتا کچھ نہیں ہے۔مایوسی کے بعد جب دیکھتا ہے کچھ نہیں ہوتا ''اوجنوں کیندے نیں چھِتا پے جیندا ایہگا اے''۔

انسانیت کی دنیا میں ختمِ نبوت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اور اس روشن مینار کی حیثیت

عزیزانِ من! مایوسی کی انتہا یہ ہوتی ہے۔اس سے اطمینان نہیں ہو رہا' مقدر کے ستارے بدل نہیں رہے ورنہ بات تو کچھ مشکل نہیں تھی کہ قرآن نے جو کہا تھا کہ یہ مکمل کر کے دے دیا تمہیں ضابطۂ حیات اور اس کے بعد اب شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا۔سب سے عظیم ترین شخصیت دنیا کی جو تھی جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' اس کے متعلق کہہ دیا وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط (3:144) عزیزانِ من! اس کے بعد کون آئے گا اس کا نظیر اور اس کے مقابل؟ اس عظیم ترین شخصیت کے متعلق یہ عقیدہ دیا' یہ مانو۔خدا کا پیغامبر یہاں رسول کہا ہے کتنی عظیم چیز ہے وہ پیغامبر تھا' پیغام تمہارے پاس چھوڑ گیا محفوظ کر دیا ہم نے' تبدیل نہیں ہو گا' مکمل ہو گیا۔اب شخصیتوں کے کیا تم سہارے ڈھونڈ رہے ہو اب آنے والے کے کیا معنی۔آ گیا۔اب اس کے بعد جن کا انتظار ہے دنیا کو وہ تم ہو امتِ مسلمان وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاس (2:143) نبوت تو نہیں مل سکتی یعنی خدا کی طرف سے وحی' وحی تو محفوظ ہے وہ جو فریضۂ رسالت تھا نا اس وحی کے مطابق ایک نظام کر کے پھیلانا اس چیز کو وہ اس امت کے سپرد ہو گیا۔اسی لیے اس امت کو قرآنِ کریم نے کہا تم اس کتاب کی وارث ہو اب (35:32)۔کتاب محفوظ' وارث اس کی موجود اب اور آنے والا کونسا ہو گا۔

مذہب کی جگہ دین کا احیاء ختمِ نبوت کے بغیر ممکن ہی نہیں

عزیزانِ من! یہ تھا قرآنِ کریم نے جو نظام پیش کیا۔یہ ہے وہ چیز جو میں کبھی کبھی پھر یہ کہہ دیا کرتا ہوں کہ جب تک یہ عقائد

آپ کے ہاں موجود ہیں' اس وقت تک آپ کے ہاں دین کا احیا تو نہیں ہو سکتا۔ یہ آنے والے بھی جو جو مانتے ہیں ان کو' جو آئے ہیں انہوں نے مذہب کے اندر کوئی تبدیلیاں آپ کے ہاں یہ کسی قسم کی اصلاح کی ہوگی' دین کا تصور ہی ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ اس آنے والے میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ ایک نظام ہے جو قائم کرنا پڑے گا تمہیں' ثنویت مٹانی پڑے گی آپ کو اس قسم کی۔ ایک ہی ضابطہ ہوگا سیاست بھی معیشت بھی معاشرت بھی مذہب بھی جسے آپ کہتے ہو وہ بھی شریعت بھی انہی کے ہاں کی ہوگی جو اس نظام کی رو سے حکم آئے گا۔ نظام یہ ہوگا کہ یہ قرآن اور وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص (42:38) امت کی باہمی مشاورت سے سارے معاملات طے ہوتے چلے جائیں گے۔ اور جب آپ ایک نظام دیں گے' ایک مملکت ہوگی' ایک ضابطۂ قانون ہوگا' ایک فیصلہ ہوگا' فرقے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ عزیزانِ من! یہ تھا وہ اعلانِ عظیم جو قرآن نے کیا۔ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط (3:144) یہ دیکھیے وارننگ کتنی بڑی تنبیہ تھی کہ کیا اس کی وفات کے بعد تم پھر اسی نظامِ کہن کی طرف لوٹ جاؤ گے جس میں سیاست الگ ہوتی تھی' مذہب الگ ہوتا تھا' جس میں خدا کی وحی کو متلو کہا جاتا تھا' اسی کی مثل ایک اور وحی تراشی جاتی تھی۔ جس میں مذہبی پیشوائیت کے الگ دائرے تھے اور بادشاہوں کے الگ دائرے تھے۔ ابھی جو میں نے کہا ہے نا کہ تم پلٹو گے تباہ ہو گے تو اس صورت میں کہ کفر کا نظام اختیار کرو گے۔ عزیزانِ من! کفر کا نظام یہ ہے کہ خدا کی کتاب نہ ہو آپ کے ہاں معیار' نظام نہ ہو آپ کے ہاں' وحدتِ ملت نہ ہو آپ کے ہاں' مرکزیت نہ ہو آپ کے ہاں۔ مذہب پرائیویٹ معاملہ بن کے رہ جائے' فیصلے اس کے فتوؤں کی رو سے ہونے شروع ہو جائیں' سندیں اس کی انسانوں کی جمع کردہ' انسانوں کی وضع کردہ' انسانوں کی تخلیق کردہ' یا روایات ہو جائے یا فقہ ہو جائے۔ اس کے دینے والے مذہبی پیشوا الگ ہوں' سیاست کے احکام مملکت کی طرف سے ہوں۔ امت میں انتشار ہی انتشار ہو۔ عزیزانِ من! کوئی وجۂ جامعیت ہی نہیں رہتی امت کے اندر آپ کے ہاں' آپ کسی ایک نقطے پہ جمع ہی نہیں ہو سکتے۔ یہ ہے کفر کا نظام۔ کہا تباہ ہو گے اس سے تم' شخصیت کے چلے جانے سے کچھ نہیں بگڑے گا تمہارا۔ ہم بجائے اس کے کہ اس نظام کی کسی طرح سے نئے سرے سے پھر تشکیل کرتے اور یہ احیائے دین کرتے' ہم نے وہی شخصیتوں کے وہی قبل از اسلام تصور کی طرف ہم چلے۔ ہم نے شخصیتوں کا ہی انتظار کیا' شخصیتیں ہی بنانی شروع کر دیں۔ کسی نے مسجد کے امام کی صورت' کسی نے مرشدِ طریقت کی شکل کے اندر' کسی نے مجددیت کے اندر' کسی نے پھر نبوت ہی تراش لی صاحب اس کے اندر۔ اشخاص اشخاص۔ اور ادھر سے بھی نہیں ہوئے تو باقی

معاملات میں بھی جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ مردے از غیب بروں آید و کارے بکندے ۔عزیزانِ من ! یہ ہے ۔ جب تک یہ بنیادی تصور آپ کے ذہن میں نہیں آئے گا کہ دین اس نظام کے تابع چلے گا اس وقت تک آپ کے ہاں دین کا احیا نہیں ہوسکتا ۔ اور پھر مجھے بھی آپ کہیں گے کہ شاید مایوسی کی ایک آواز دے رہا ہے' مایوسی کی نہیں ایک حقیقت کہہ رہا ہوں ۔ جو قوم مذہب میں اس درجہ گڑ جائے جس درجہ ہمیں گاڑ دیا گیا ہے ۔ یہاں سے اس کا نکلنا مجھے بہت ناممکن نہیں تو بڑا دشوار نظر آتا ہے ۔ مذہب میں گڑی ہوئی قوم نے دین کی زندگی کو کبھی قبول کیا نہیں ہے ۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی ایک گروہ عظیم تھا نصاریٰ کا یہودیوں کا مجوسیوں کا اہلِ مذہب کا' اس کے مقابلے میں یہ عرب کے جن کو مشرکینِ عرب کہتے ہیں (یہ لوگ تھے جن کی طرف قرآن کہتا ہے کوئی کتاب تھی ہی نہیں) یعنی وہ مذہب میں تھے ہی نہیں' زیادہ سے زیادہ جہالت تھی ان کے ہاں کچھ' مذہب نہیں تھا ان کے ہاں ۔ نبی اکرم ﷺ کی اس دعوت کے اوپر شروع سے آخر تک آپ دیکھیے انہوں نے تو لبیک کہا ان اہلِ کتاب میں سے کوئی نہیں آیا بجز دو چار کے ۔ وہ گئو سالے کی محبت اتنی دل کی گہرائیوں میں اتر چکی ہوتی ہے' شخصیتوں کا احترام اتنا بڑا دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہوتا ہے' یہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے ۔ ان کے ہاں معیارِ حق و باطل شخصیت بن جاتی ہے ۔ جہاں شخصیت بنی معیارِ حق و باطل' پھر آپ کے ہاں حق نہیں آسکتا' شخصیت معیار ہو جاتی ہے ۔

انسانیت کو آخر کار شخصیتوں کی بجائے خدا کی کتاب کو ہی معیار تسلیم کرنا پڑے گا

قرآن نے جب کہا تھا کہ نبوت ختم ہوگئی تو اس نے کہا تھا' معیار شخصیتیں نہ بنانا اس کے بعد' معیار خدا کی کتاب بنانا ۔ عزیزانِ من ! جب تک یہ قوم یا دنیا کی کوئی قوم جو ہے' وہ اس پہ نہیں آئے گی کہ معیار خدا کی کتاب اور اس کے بعد نظام امت کا باہمی مشاورت سے' وہاں سے فیصلے' شریعت ایک' مرکز ایک' ضابطۂ قانون ایک' نظام ایک' امت اس وقت تک اسلام پہ تو نہیں کوئی قوم چل سکتی' مذہبوں کے اوپر چلے گی خواہ نام اپنا کچھ بھی کیوں نہ رکھ لے اور اپنی نسبتیں کسی کی طرف کیوں نہ کر دے ۔ ایک آنے والا چھوڑ کر اپنے ذہن کی تخلیق کردہ سینکڑوں بلا بھیجئے' ہزاروں بلا لیجیے' دن بہ دن حالت ابتر سے ابتر ہوتی چلی جائے گی ۔ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق آج عرض کیا اسلام کیا تھا' کیا سے کیا ہم ہوگئے' آج شکل کیا ہے' پھر سے زندگی کس طرح سے واپس آسکتی ہے ۔ مجھے معلوم ہے کہ اس میں یہ چیزیں جو میں نے کہی ہیں پھر وہی عقیدت کے جو تار ہیں ان کو چھیڑ رہی ہیں دلوں کے اندر ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ میری بات مانیں میں یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے خالی الذہن ہو کر ٹھنڈے دل سے اس کو غور کریں کبھی'

پھر سوچیں کہ آپ کے ہاں کی خود حقیقتیں کیا کہتی ہیں اس کے لیے پھر اس کے بعد کسی نتیجے پہ خود پہنچئے کہ کیا چیز ہے پھر اس چیز کو مانیے۔ ورنہ اگر آپ وہی شخصیتوں کی عقیدت مندیوں میں آ گئے تو پھر تو دین کی طرف نہیں آ سکتے۔ خدا کا یہ آخری پیغمبرﷺ شخصیتوں کو ختم کرنے کے لیے آیا تھا، شخصیتیں بنانے کا پیغام دینے کے لیے نہیں آیا تھا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

چوبیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 144 تا 150)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1970ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الِ عمران کی 144 ویں آیت سے ہوتا ہے:(3:144)۔

سابقہ درس کے متعلق پیدا ہونے والے تاثرات کی نوعیت

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سابقہ درس میں میں نے جو قرآنی بصائر پیشِ خدمت کیے تھے' انہوں نے بہت سے احباب میں ایک فکری انگیخت کی' انہوں نے سوچنا شروع کیا۔ اس میں اکثر ایسی چیزیں تھیں جو متوارث عقائد کے خلاف جاتی تھیں اور پہلے تو ان چیزوں کا ردِعمل یا ری ایکشن یہ ہوتا تھا کہ لوگ ہمیشہ دل برداشتہ ہو جاتے تھے اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے درس میں ہی آنا چھوڑ دیا۔ لیکن مجھے یہ خوشی ہوئی کہ اب اس ردِعمل کی بجائے' ردِعمل یہ تھا کہ سوچنا چاہیے واقعی قرآن کو سمجھ کے پڑھنا چاہیے۔ اور اگر کوئی چیز قرآنِ کریم سے ایسی ملتی ہے جو ہمارے متوارث عقیدے کے خلاف جاتی ہے تو ہمیں وہ عقیدہ بدلنا ہوگا تا کہ ہمارا مسلک' ہمارے عقائد قرآن کے مطابق ہو جائیں۔ یہی مقصد ہے میرا جو میں قرآنی فکر قریب تیس سال سے مسلسل اور متواتر پیش کیے چلا آ رہا ہوں' یہی منتہا ہے میرے اس درس کا بھی۔ یہ نہیں کہ جو میں کہتا ہوں' اسے آپ آنکھیں بند کر کے مانتے چلے جایے۔ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں اپنی بات کسی سے عقیدتاً منواؤں میں تو قرآن کا طالب علم ہوں' قرآن پیش کرتا ہوں۔ میں نے اس پہ غور و فکر کیا

ہے اور مقصد میرا بھی یہی ہے کہ آپ اس پر خود غور وفکر کرنا شروع کریں۔ واقعی وہ نکات ایسے تھے کہ جس سے ذہنوں میں کچھ ہیجان اور اضطراب پیدا ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ اس ہیجان سے کیفیت آپ کے ہاں ردِعمل آپ کے ہاں جو تھا' وہ اس کو یوں ہی مسترد کر دینے کا نہیں تھا' سوچنے کا ردِعمل تھا۔ یہ اچھی علامت ہے۔ مجھ سے ہفتے کے دوران میں دو تین باتیں اس میں پوچھی گئیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسی ہیں کہ آپ احباب کے بھی علم میں لے آؤں۔

ختمِ نبوت کا اعلان اس بات کی شہادت کہ اب انسانیت کے لیے ہدایت کو مکمل کر دیا گیا ہے

بات یہ تھی ایک لفظ میں دہرادوں کہ قرآنِ کریم نے بات جو پیش کی وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط (3:144) اس میں کہا یہ گیا تھا کہ اب شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس سے پیشتر انبیائے کرام کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر امت میں رسول' ہر بستی میں رسول' ہر قریہ میں رسول' ہر زمانے میں رسول۔ اب دین مکمل کر دیا گیا جو کچھ خدا نے اصولی طور پر انسانیت کی ہدایت کے لیے دینا تھا' قرآن میں منضبط کر دیا۔ غیر متبدل ہے اور محفوظ کر دیا قیامت تک کے لیے۔ اب انسانوں کی راہنمائی کے لیے اصولی ہدایت کی ضرورت ہے' اشخاص کی ضرورت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جو نظام دین نے قائم کیا ہے ایک امت' امت کے پاس ایک ضابطۂ قوانین ضابطۂ ہدایت ایک نظام' اس ہدایت کو عملاً متشکل کرنے کے لیے ان قوانین کو نافذ کرنے کے لیے۔ اب یہ نظام جاری رہے گا اور یہ قائم مقام ہو جائے گا اس منصب' ان فرائض کی ادائیگی کے لیے جو انبیائے کرامؑ کیا کرتے تھے۔ اس لیے اب نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ انسانیت بالغ ہو گئی ہے' بچہ جوان ہو گیا ہے اب اسے صرف اصولی ہدایت کی ضرورت ہے' کسی انگلی پکڑنے والے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اسی سے میں نے عرض کیا تھا کہ جب یہ تصور نگاہوں سے اوجھل ہوا ہمارے' تو ہم نے پھر وحی کا لفظ تو نہیں اس کے بجائے اپنی طرف سے کچھ اصطلاحات وضع کیں۔ کہیں الہام لائے' کہیں کشف لائے اور ان چیزوں کو اس کا SUBSTITUTE مقرر کر کے یہ سلسلہ ہم نے جاری کیا۔ عزیزانِ من! یہ تصورات ختمِ نبوت کے منافی ہیں۔ خدا کی طرف سے براہِ راست جو علم ملنا تھا' مل چکا ہے۔ اب علمِ انسانی کے ذرائع خدا کی یہ وحی فکرِ انسانی' علم بصیرت فکر تدبر غور تعقل' یہ ہے APPROACH اب زندگی کے لیے۔ معاملات زندگی باہمی مشاورت سے طے کیجیے قرآن کے اصولوں کی چار دیواری میں رہتے ہوئے' عقل وفکر کی رو سے' غور و تدبر کی رو سے' ایک نظام کی شکل میں۔ یہ ہے اسلام۔ یہ سارے خیالات تصورات پیدا ہوئے جب آپ میں یہ نظام باقی نہ رہا۔ اسلام کے از سرِ نو احیا کے لیے اس نظام کو از سرِ نو قائم کرنے کی ضرورت ہے' آسمان کی طرف تکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی کو اب

خدا کی طرف سے براہِ راست کوئی علم نہیں مل سکتا کیوں کہ نبوت ختم ہوگئی' وحی کا سلسلہ بند ہوگیا۔ کوئی آنے والا اب آئے گا نہیں' آخری آنے والا آچکا۔ اوراس کی آمد جو تھی اب قیامت تک کے لیے پھیلی ہوئی ہے' نبوتِ نبی اکرم ﷺ کسی دور میں ختم نہیں ہوسکتی' وہ قیامت تک کے لیے پھیلی ہوئی ہے۔ اسی سلسلے میں کہا کہ صاحب! ہمارے ہاں یہ ایک بحث جاری ہے کہ نبی اکرم ﷺ زندہ ہیں وہ مرے نہیں ہیں۔ یہ چیزیں عقیدت ارادت مندی کی ایجاد کردہ ہیں۔ قرآنِ کریم واضح الفاظ میں یہ چیز کہتا ہے نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی' جسمانی زندگی انسان کی طبعی قوانین کے مطابق یہ زندہ رہتی ہے' طبعی قوانین کے مطابق ختم ہوجاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق اس آیۂ جلیلہ کے اندر بھی تو یہ چیز ہے اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ (3:144) کل کو یہ مرجائے یا قتل کردیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ سارا نظام دین کا ختم ہوگیا؟ یہاں خود موجود ہے یہ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (39:30) تو نے بھی مرنا ہے' ان لوگوں نے بھی مرنا ہے۔ کتنا واضح ہے جو کچھ بھی ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ط (3:185) قرآن نے یہ کہہ دیا ہے ہر فرد کے لیے طبعی جسم جو ہے طبعی زندگی جو ہے اس کا ایک دن خاتمہ ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق ابھی میں نے عرض کیا ہے نا کہ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (39:30) ایک ہی لفظ دونوں کے لیے ہیں انہوں ﷺ نے بھی کل کو مرنا ہے تم نے بھی مرنا ہے۔ آپ ﷺ کی طبعی موت اسی طرح سے ہے جیسے کہ باقی انسانوں کی طبعی موت ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کی قرآن کے ذریعے سے نبوت زندہ ہے۔ دین حضور ﷺ کا زندہ رہے گا اس نظام کے ذریعے سے جو حضور ﷺ نے قائم فرمایا تھا۔ یوں یہ نبوتِ محمد ﷺ قیامت تک کے لیے جاری وساری رہے گی' طبعی موت وحیات کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

موت کے سلسلہ میں جھوٹے نبی اور سچے نبی کے سلسلہ میں ایک غلط تصور

طبعی موت تو قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے حضور ﷺ کو بھی یہ موت آئی۔ پھر یہ کہا گیا ہمارے ہاں یہ ایک بڑی عجیب چیز چلائی ہوئی ہے کہ صاحب! جھوٹا نبی جو ہوتا ہے' وہ قتل ہوجاتا ہے سچے اور جھوٹے نبی کی پہچان یہ ہے۔ یہ بھی قرآنِ کریم کی صریح تعلیم کے خلاف ہے۔ قتل ہونا پہلے تو خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہی یہ آیت دیکھیے تو اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ (3:144) حضور ﷺ کے متعلق ہے کہ اگر کل کو یہ مرجائے یا قتل کردیا جائے تو کیا تم اپنے پچھلے پاؤں پہ لوٹ جاؤ گے؟ تو اگر ہم معیار یہ لے لیں کہ جھوٹا نبی قتل کردیا جاتا ہے' سچا جو ہے اپنی موت مرتا ہے تو یہ حضور ﷺ کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔ تو معاذ اللہ معاذ اللہ یہاں کیا سمجھا جائے اور کہنے والا خود خدا ہے۔ اور اتنی سی بات نہیں یہیں سورۃ الِ عمران میں ذرا اور آگے چلیے مَا قَالُوْا وَ قَتْلَھُمُ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ لا (3:181) ان بنی اسرائیل نے انبیا کو ناحق قتل کردیا۔ قرآن کہہ رہا ہے یہ۔ صرف انبیا ہی نہیں یہ 181

ہے 183 بھی ہے قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡهُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (3:183) تمہارے پاس خدا کے رسول اس سے پہلے آئے تم نے انہیں کیوں قتل کر دیا اگر تم سچے ہو تو۔ خدا خود شہادت دے رہا ہے اس چیز کی' الزام عائد کر رہا ہے بنی اسرائیل کے خلاف کہ تمہاری کیفیت یہ تھی کہ ناحق انبیا کو قتل کر دیتے تھے۔ کسی کو قتل کر دیتے تھے' کسی کے درپے قتل ہوتے تھے۔ رسول الگ کہا ہے نبی الگ کہا ہے قرآن نے۔ لہٰذا یہ چیز بھی غلط ہے کہ یہ CRITERION ہے' یہ کوئی معیار ہے اس چیز کے پرکھنے کا کہ جھوٹا نبی جو ہے' وہ قتل کر دیا جاتا ہے اور سچا نبی جو ہے' وہ قتل نہیں کر دیا جاتا۔ قرآن نے تو انبیا اور رسل دونوں کے متعلق یہ چیز کہی ہے۔ طبعی زندگی کے متعلق سوال ہی نہیں ہے کسی کی صداقت اور کسی کے کذب کا۔ جھوٹے اور سچے ہونے کا معیار طبعی زندگی پہ ہے نہیں' طبعی زندگی تو ایک حادثے سے ختم ہو جاتی ہے' چلتے چلتے ختم ہو جاتی ہے۔ احد کی جنگ میں جہاں یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی ہے' نبی اکرم ﷺ تیروں کے برسات کے اندر آ گئے ہوئے تھے تو صحابہؓ نے دیوار کھڑی کر دی اور اس طرح سے آپ ﷺ بچے ہیں۔ ورنہ اگر اس میں ذرا بھی رخنہ پڑ جاتا دیوار کا' تیر ہی تو تھا یہاں آ کے جو لگا تھا ذرا یہاں نیچے لگ جاتا' وہیں اس تیر سے آپ ﷺ کی شہادت ہو جاتی۔ تو یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ خود نبی اکرم ﷺ نے جو فرمایا اپنی موت کے متعلق وہ خیبر میں ایک یہودیہ عورت نے اس کے بعد آپ ﷺ کی دعوت کی تھی' اس دعوت میں زہر ملا دیا تھا اس نے سالن میں۔ آپ ﷺ تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ ایک دوسرے صحابیؓ کھا رہے تھے تو انہوں نے بھی ایک لقمہ لیا ایک روٹی لی' وہ کھا گئے آپ ﷺ نے بھی لیا آپ ﷺ نے اس کو چبایا تو احساس ہو گیا آپ ﷺ نے اس کو باہر پھینک دیا نوالے کو۔ وہ صحابیؓ جو تھے ان کی تو موت جلدی واقع ہو گئی اسی زہر سے۔ نبی اکرم ﷺ کی عمرِ گرامی بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ اتنی پاکیزہ زندگی بسر کرنے والے' اعتدال کی زندگی بسر کرنے والے نہایت عمدہ صحت والے۔ تریسٹھ سال کی عمر کوئی عمر ہوتی ہے۔ تو حضور ﷺ نے اپنے مرض الموت میں یہ کہا تھا کہ وہ جو یہودیہ نے زہر دیا تھا اس کا فوری اثر تو نہیں ہوا مجھ پہ لیکن SLOW POISONING اس سے ضرور ہوتی رہی۔ اور یہ جو میرا بخار ہے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اس زہر کا اثر تھا اس کے اندر۔ عزیزانِ من! جسمِ انسانی کسی کا بھی کیوں نہ ہو' وہ خدا کے طبعی قوانین کے تابع چلتا ہے۔ مومن اور کافر دونوں کا ایک نظام ایک ہوتا ہے' بدپرہیزی کرنے سے دونوں پہ بیماری آتی ہے۔ علاج دونوں کا ایک ہوتا ہے۔ یہ کبھی ڈاکٹر صاحب یہ نہیں کہتے کہ وہ جب نسخہ لکھنے لگیں تو پوچھ لیں کہ ہاں بھئی! ہندو ہو یا مسلمان ہو؟ ہندو کے لیے الگ کونین رکھی ہوئی ہو اور مسلمان کے لیے الگ رکھی ہوئی ہو۔ طبعی قوانین دونوں پہ یکساں عائد ہوتے ہیں۔ اس لیے موت اور زندگی کا تعلق خدا کے طبعی قوانین سے ہے۔ اور یہاں سے بات اگلی آیت شروع ہوئی۔ کیا کہتے ہیں قرآن کے الفاظ؟ وَ مَا کَانَ

لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (3:145) موت اور حیات: موت تو خدا کے قانون کے مطابق وارد ہوتی ہے۔

کیا موت کا ایک دن مقرر ہے نیز تقدیر کے سلسلہ میں مجوسیوں کی سازش کا ذکر

اب جس طرح سے پچھلی آیت جو تھی وہ تفصیل طلب تھی یہ آیت بھی تفصیل طلب ہوگئی۔ آیت تو کچھ ایسی نہیں تھی کہ جس کے معنی کے اندر کچھ زیادہ طوالت کی ضرورت پیش آتی۔ وہی جو غلط عقائد ہمارے ہاں کے چلے آرہے ہیں ان کو رفع کرنے کے لیے تفصیل کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ آیت پیش کی جاتی ہے' موت کا ایک دن مقرر ہے۔ چل بھئی! غالب صاحب لکھ گئے۔ اور وہ نہ بھی لکھتے تو ہمارے ہاں یہ طے ہے ''موت دا اک دن مقرر ہے بھائی' اوا گے پچھے ہو ہی نہیں سکدا''۔ مقرر کی بات میں نے آپ سے کہا تھا کہ پہلی تباہی جو اس قوم کے اوپر آئی ہے' وہ تقدیر کے عقیدے سے آئی ہے۔ یہ جبر یہ عقیدہ جو تھا ایران کے مجوسیوں کے ہاں تھا۔ قرآن اسے مٹانے کے لیے آیا تھا' مٹا کے دکھا دیا قرآن نے۔ لیکن جب پھر سازشیں ہوئی ہیں آپ کے خلاف تو سب سے بڑی سازشیں تو یہی تھیں کہ جو غلط عقائد قرآن نے دور کیے تھے انہی کو دوبارہ تمہارے ذہنوں کے اندر پیوست کر دیا جاتا۔ انہی میں عقیدۂ جبر تھا تقدیر' قسمت۔ وہ جو شبِ برات میں وہ عقیدہ ہے کہ اس رات کو وہ درخت ہوتا ہے' اس کے نیچے فرشتہ ہوتا ہے' تھال لے کے کھڑا ہوا۔ تو وہ ہوا تیز چلتی ہے۔ درخت پہ ایک ایک انسان کا پتا الگ الگ وہاں ہوتا ہے تو اس ہوا سے جس جس کا پتا جھڑ جاتا ہے' وہ تھال میں اکٹھا کر کے لے جاتا ہے اور ملک الموت کے حوالے کر دیتا ہے۔ تو وہ سال بھر میں ان پتوں کے مطابق وہ موت وارد کرتا چلا جاتا ہے' کبھی ایک ایک پتے کی شکل میں اور کبھی جلدی ہو تو تھال ہی ''الٹ دیندا اے''۔

شبِ برات کی حقیقت کے برعکس ہمارے ہاں پائے جانے والے تصورات اور مکافاتِ عمل کا قانون

یہ آپ کو معلوم نہیں شاید یہ مجوسیوں کے ہاں کے نوروز کا عقیدہ ہے بعینہٖ اسی طرح سے۔ سال بھر کی قسمت اس رات میں لکھی جاتی ہے ان کے ہاں نوروز تھی آپ کے ہاں شبِ برات آ گئی۔ اور برات بھی تو یہ شبِ برات جو آپ کے ہاں کا یہ خود یہ تقریب آپ کے ہاں کی ہے یہ تو عباسیوں کے جو وزیر تھے برامکہ وہ ایرانی مجوسی مسلمان ہوئے ہوئے' یہ انہوں نے INTRODUCE کی تھی آپ کے ہاں' یہ پہلے ہوتی نہیں تھی۔ بہرحال یہ عقائد آپ کے ہاں آئے اور اس میں عقیدۂ تقدیر قسمت یا جبر کا عقیدہ جو ہے نا' اس قوم کو تباہ کر گیا۔ ہر بے عملی کا بہانہ بن گیا تقدیر کا' او جی لکھا ہی ایسے تھا ''اللہ دے لکھے نوں کون موڑ سکدا ہیگا' بندہ بشر کی کر سکدا اے ہدے وچ'' ہر چیز تقدیر کے حوالے کر دی آپ نے۔ بے عملی یہاں ہوگئی۔ ذمہ داری سے بچ گئے یعنی جب ہر چیز خدا

کے لکھے کے مطابق ہو کر رہنی ہے تو انسان ذمہ دار ہی نہیں رہتا ۔ تمام آپ کے ہاں کا جتنا نظام ہے LAW OF RETRIBUTION (مکافاتِ عمل کا قانون) سارے کا سارا ختم ہو جاتا ہے اس چیز سے کہ جو کچھ ہوتا ہے' خدا کے لکھے کے مطابق ہوتا ہے' انسان اس میں کچھ نہیں کرسکتا ۔ جب یہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تو سوال ہی نہیں' نہ اچھے عمل کی کوئی جزا' نہ برے کی کوئی سزا۔ پہلی چیز اس ہمہ تن عمل قوم کو یکسر خاکستر بنانے کے لیے پہلی سازش آپ کے خلاف جو ہوئی ہے' عجم کی سازش وہ جبر کا عقیدہ تقدیر اور قسمت کا عقیدہ آپ کے ہاں ہے ۔ اور اسی عقیدے میں ایک چیز یہ ہے موت کا ایک دن مقرر ہے صاحب ۔ صاحب! کیسے یہ چیز ہوئی؟ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (3:145) چل بھئی! اذن کا ترجمہ ہوا حکم کہ موت تو صاحب آتی ہے خدا کے حکم سے ۔ جب وہ حکم دیتا ہے موت آجاتی ہے پھر جو مرضی کرلے آدمی کچھ نہیں ہوسکتا ۔ اور آگے ۔

كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (3:145) کے علاوہ خدا کا امر' حکم' اذن یا خدا کے ارادے کی تفصیلی وضاحت اور ہمارے ہاں لکھی گئی تفاسیر کا مقام

كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط (3:145) ہو گیا ترجمہ' یہ تو اجل لکھی ہوئی ہے مُؤَجَّلًا کے معنی اجل کتاب کے معنی لکھی ہوئی' اجل تو لکھی ہوئی ہے ۔ ہزار برس سے آپ کے ہاں یہ چلا آرہا ہے ۔ اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں ۔ وہ جو عقیدہ آگیا ہے آپ کے ہاں جبر کا اس کے تابع پھر ہم نے قرآن کو ڈھالنا شروع کیا ۔ یہ ساری تفسیریں آپ کی ان عقائد کے آنے کے بعد کی لکھی ہوئی ہیں ۔ پہلی تفسیر آپ کے ہاں کی امام طبری کی تفسیر یہ خود ایرانی تھے ۔ آپ کے ہاں کوئی محدث حدیث کا جامع جو ہے' کوئی ان میں سے عربی نہیں ہے' سارے ایرانی تھے ۔ امام بخاری' مسلم' ابن ماجہ' ترمذی' نسائی سارے کے سارے ایرانی تھے ۔ پہلا مفسر آپ کے ہاں کا امام طبری ایرانی ۔ یہ تفسیر لکھی گئی تین سو سال کے بعد حضورﷺ کی وفات کے ۔ پہلی تاریخ وہ بھی انہوں نے لکھی ۔ اس وقت یہ سارے عقائد آپ کے ہاں آگئے ہوئے تھے ۔ یہ ایرانی چھا گئے ہوئے تھے عباسیوں کی حکومت کے اوپر ان ہی کی مدد سے یہ حکومت انہیں ملی تھی اور وہ ان کے ہاں یہ عقائد پھیل چکے تھے ۔ یہ جو قرآن کی آپ کے ہاں تفاسیر لکھی گئی ہیں ان عقائد کے آنے کے بعد لکھی گئی ہیں ۔ اور ترجمے آپ کے ان تفاسیر کی روشنی میں کیے گئے ہیں ۔

لفظ اذن کے لغوی اور قرآنی مفہوم کا تفصیلی ذکر

اذن کے معنی حکم خدا کا ۔ اب بات ہوگئی کہ صاحب وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (3:145) خدا کے

اذن اجازت یا حکم کے بغیر موت ہی نہیں ہوسکتی تو پھر تو اس کے حکم کے ساتھ ہوئی۔ میں اس سے پیشتر اس لفظ کے متعلق تفصیل سے ایک پورا درس عرض کر چکا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کائنات کا خالق وہ ہے۔اس کائنات کے سلسلۂ کارگاہ کو چلانے کے لیے پھر اس نے قوانین مقرر کیے اپنے حکم سے' اپنے ارادے سے' اپنے پروگرام کے مطابق۔ وہ کسی دوسرے نے نہیں بنائے تھے' نہ ان کے بنانے میں اس نے کسی سے مشورہ لیا تھا۔ یہ ہے جو چیز خدا کا امر یا حکم یا اذن یا ارادہ جہاں تک وہ چیز کہتا ہے۔لیکن اس نے جب یہ قوانین بنا دیے تو اس کے بعد یہ کہا کہ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) WORKING OF THESE LAWS جو ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اذن کا لفظ آپ دیکھیے میں کہتا ہوں آپ کے ہاں بھی ایک ORDER ہوتا ہے ایک STANDING ORDER ہوتا ہے نا وہ STANDING ORDER کیا ہوتا ہے؟ کہ وہ ایک دفعہ کا سوچ سمجھ کے حکم دیا ہوا' وہ حکم قائم رہے گا۔ کیوں کہ یہ انسانی ہوتا ہے STANDING ORDER اس لیے بعد میں بدلا جاسکتا ہے۔ خدائے علیم کا STANDING ORDER جو ہوگا وہ کہتا ہے اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ ہمارے علم کی کیفیت یہ نہیں ہے کہ آج کے حالات کے مطابق' ہمیں کچھ علم ہوا' کل کو حالات بدل گئے نئی معلومات ہمارے سامنے آ گئیں اور ہمیں ضرورت پیش آئی کہ اچھا! پہلا جو ہم نے آرڈر دیا تھا اس کو ذرا چینج کر دیا جائے۔ وہ تو خدائے علیم ہے۔تو یہ جو الفاظ آتے ہیں جن کا ترجمہ ہم صرف حکم کرتے ہیں یہ سٹینڈنگ آرڈر ہے اور سٹینڈنگ آرڈر کو قانون کہتے ہیں اگر اس کو کبھی نہ بدلا جائے تو۔ قانون کا لفظ اس زمانے میں رائج نہیں تھا عربوں کے ہاں' قرآن میں بھی یہ لفظ نہیں آیا۔لیکن ہر حکم جو مستقل طور پہ دیا جائے اور وہ غیر متبدل قرار پا جائے' اسے ہماری اصطلاح میں قانون کہتے ہیں' اس کا ترجمہ ہی قانون ہے۔ دیکھیے قرآن کہاں استعمال کرتا ہے اس کو۔ وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (58: 7) زرخیز زمین سے پیداوار ہوتی ہے۔ زرخیز زمین اپنی پیداوار دیتی ہے خدا کے اذن سے' اس کے اذن کے مطابق۔ اب اگر اس کے معنی یہ ہو جائیں حکم جسے آپ کہتے ہیں کہ اس کا حکم ہوتا ہے تو ہوتی ہے' حکم ہوتا ہے نہیں ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زراعت کے متعلق ایک قانون ہے خدا کا۔ اس طرح زمین کو سنوارو' اس طرح اس میں بیج ڈالو' ایسے کھاد ڈالو' یوں پانی دو پھر اس کی نرائیاں کرو۔ اس قانون کے مطابق جو شخص بھی کرتا چلا جائے گا اس کو اس میں سے کھیتی ملتی چلی جائے گی۔ یہ قانون جو ہیں فطرت کے قانون' خدا کے مقرر کیے ہوئے' ان کا علم ان کا انکشاف' انسانی تجربے مطالعے مشاہدے سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تین برس پہلے ہماری یہ زمینیں یہاں کی بڑی محنت کرتا تھا کسان' پندرہ بیس من گیہوں دیتی تھیں۔ اسی قانونِ فطرت کا مطالعہ کیا مغرب والوں نے۔ ان کے طریقے کے مطابق ہم نے انہی زمینوں میں سے سو سو من گیہوں نکالا۔ اور

جو اپنی زمین کو ویسے ہی چھوڑ دیتا ہے' نہ اس میں ہل چلاتا ہے' نہ اس میں بیج ڈالتا ہے' نہ اس میں کھاد ڈالتا ہے۔ کہیے نا خدا کے حکم سے اس زمین کے اندر سے پیدا ہو جائے کچھ۔ یعنی جو ایسا نہیں کرتا اس کی زمین سے کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ جو ایسا کرتا ہے اس کی زمین اس کے قانونِ زراعت کے مطابق کھیتی دینا شروع کر دیتی ہے۔ جس وقت اس کے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے' وہیں وہ کھیتی بند ہو جاتی ہے۔ یہاں اذن کا لفظ میں نے کہا ہے کہ آپ دیکھیے کہاں استعمال کرتا ہے قرآن اذن کا لفظ۔ یا آگے چلیے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ (22:65) غور نہیں کیا تم نے کہ خدا نے جو کچھ زمین میں ہے' تمہارے لیے تابعِ تسخیر کر دیا۔ وَ الْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ (22:65) اور جہاز سمندروں پر خدا کے امر کے مطابق چلتے ہیں۔ کشتیوں اور جہازوں کے چلنے کے لیے ایک قانون مقرر ہے۔ اس کے مطابق جہاز بنایا جاتا ہے' اس قانون کے مطابق جہاز کو لوڈ کیا جاتا ہے' اس میں وزن رکھا جاتا ہے۔ اگر وہ جو قانون ہے اس قانون کے خلاف کوئی کشتی یا جہاز کوئی بنائے تو تیرتی نہیں ہے وہ۔ اور اگر اس کو OVER LOAD کر دیا جائے' وہ ڈوب جاتا ہے۔ یہ دیکھیے بامرہ کے کیا معنی یہاں ہو گئے؟ یہ نہیں ہے کہ جس کشتی کے متعلق خدا کہتا ہے کہ چل بھئی تو وہ چل پڑتی ہے جس کے متعلق کہتا ہے کہ نہیں ٹھہری رہو' وہ ٹھہری رہتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے کائنات میں طبعی قوانین کے مرتب کرنے کی اہمیت اور ان کا نتیجہ

بِاَمْرِهٖ ؕ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ (22:65) اور یہ جو SPACE کے اندر فضا کے اندر یہ جو کُرّے ہیں' تم دیکھتے ہو کہ کس طرح سے اپنی جگہ کے اوپر معلق ہیں۔ ان میں سے کوئی کرہ زمین کے اوپر گر نہیں پڑتا۔ یہ سب خدا کے قانون کے مطابق ایسا ہوا ہے۔ آج کششِ ثقل کا قانون جو ہے وہ ہر ماہرِ فلکیات کے قبضے میں آ گیا۔ اسی قانون کے علم کا نتیجہ ہے کہ یہاں سے بیٹھا ہوا انسان کنٹرول کرتا ہے چاند پر پہنچنے والوں کے جہازوں کو۔ عزیزانِ من! لہٰذا اصولی اور بنیادی بات یہ سمجھ لیجیے کہ خدا نے اس کائنات کو بنایا تو اس کے بعد اس کے چلنے کے لیے PHYSICAL LAWS (طبعی قوانین) مرتب کیے ہیں۔ ان ہی قوانین کو کہیں وہ امر کہتا ہے' کہیں وہ اذن کہتا ہے' کہیں وہ اپنا ارادہ کہتا ہے' کہیں مشیت کہتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ان قوانین کے بنانے کے اندر خدا کسی کے مشورے کا محتاج نہیں تھا۔ جہاں اس نے کہا ہے نا يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (22:14) ہم نے اپنے ارادے کے مطابق یہ کیا ہے۔ مَا يَشَآءُ جہاں آتا ہے ہم نے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق یہ سب چیزیں بنائی ہیں۔ تو یہ چیزیں ہیں خدا کے اس قانون بنانے کا اختیار جو اسے حاصل ہے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم میں یہ اذن اور امر اور یشآء اور مشیت یہ الفاظ جو ہیں ان کے ترجمے آپ یہ نہ کہیں کیجیے کہ جیسے خدا چاہتا ہے۔ اور چاہتا کہ معنی کہ ہر آن اس کا

چاہنا بدلتا رہتا ہے۔ میرے لیے کچھ اور چاہتا ہے۔ آپ کے لیے کچھ اور چاہتا ہے۔ آج کچھ اور چاہتا ہے' کل کچھ اور چاہتا ہے۔ نہ عزیزم یہ بات نہیں ہے۔ خدا کے ہاں تو قانون کے مطابق ہر چیز چلتی ہے۔

لفظ اذن کے کیے گئے غلط تراجم' لفظ رجس کا مفہوم اور پھر خودکشی کا معاملہ

اذن کے لفظ کے متعلق ایک بات میرے سامنے آ گئی۔ وَ مَا كَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تُؤۡمِنَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ (10:100) کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا (اذن کا ترجمہ اگر ان کا کیا جائے) خدا کے حکم کے بغیر۔ تو اس کے بعد ''اے کافراں نوں جہنم کیوں بھیجیا جاندا ہیگا''۔ اگر کوئی شخص اس کے حکم کے بغیر ایمان ہی نہیں لا سکتا تو پہلی تو چیز ایمان لانے والے کا کوئی کریڈٹ نہیں اور جو نہیں لاتا اس کا کوئی جرم نہیں۔ اِلَّا بِـاِذۡنِ اللّٰـهِ (10:100) کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا بجز خدا کے قانون کے۔ اور قانون کیا ہے؟ آیت پوری نہیں ہوئی ابھی دیکھیے اذن کا ترجمہ۔ وَ يَـجۡعَلُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ (10:100) قانون یہ ہے کہ جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتا' اس پہ معاملہ الجھاؤ میں پڑا رہتا ہے CONFUSION میں رہتا ہے' صاف نہیں ہوتا۔ رجس' گدلے پانی کو کہتے ہیں۔ کیا بات کہہ دی؟ اس پہ معاملہ مشتبہ رہتا ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتا۔ اس لیے کوئی شخص بھی خدا کے قانون کے بغیر ایمان لا نہیں سکتا اور قانون یہ ہے کہ عقل و فکر سے کام لیجیے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس آیت کے اندر بھی جو کہا گیا کہ وَ مَـا كَانَ لِـنَـفۡـسٍ اَنۡ تَـمُوۡتَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ (3:145) تو یہ نہیں ہے کہ موت پہلے سے لکھی گئی ہے اس نے فلاں دن فلاں گھڑی فلاں وقت کے اوپر مر جانا ہے جو جی میں آئے کر لے' بچ نہیں سکتا۔ عزیزانِ من! اگر یہ چیز ہو تو پھر خودکشی جرم کیوں ہے؟ جسے خودکشی کہتے ہیں وہ لفظ ہی غلط ہے' وہ تو خودکش ہوتا ہی نہیں ہے' وہ تو وہ کش ہوتا ہے یعنی کشتہ آپ ہے یعنی آپ مارتا ہے اور کہتا ہے تو نے خودکشی کیوں کی؟ ارے صاحب! وہ تو آپ کے حکم کے مطابق میری جان نکلی۔ غور فرمایا کبھی آپ نے۔ لیکن ان کے ہاں خودکشی جرم بھی ہے۔ بیماری آتی ہے تو اس میں خدا کے حکم سے آتی ہے۔ اس وقت اتنے وقت کے اوپر بخار ہوگا اس کو' اتنے دن رہے گا اتنے دن کے بعد بخار ختم ہو جائے گا۔ اگر یہ چیز پہلے سے معین ہے تو یہ ساری دوڑ دھوپ علاج کی کاہے کے لیے؟ یہ کیوں کیا جاتا ہے؟ خدا کے خلاف لڑائی ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ چوتھے دن بخار ٹوٹے گا۔ آپ اور ڈاکٹر دونوں مل کے کہتے ہیں کہ نہیں شام تک توڑ کے بتائیں گے صاحب۔ اور اگر آپ نہیں توڑ سکتے تو کاہے کے لیے ہو رہا ہے؟ اور پھر علاج کیوں ہو رہا ہے' چوتھے دن تو ٹوٹ ہی جانا ہے اس نے؟ اور اگر اس کے حکم کے مطابق اس نے چوتھے دن مر جانا ہے ''تے لالوٹلاں جنیاں مرضی''۔ ان سے کبھی پوچھ کے بتایے۔ کہتے ہیں جی! تقدیر تو ٹھیک ہے خدا کے ہاں کی لکھی ہے ''آ تدبیر وی فرض ہیگی اے کرنی''۔ خدا کے حکم کے

خلاف تم چیلنج کر رہے ہو اس کو' تدبیر کے تو یہ معنی ہو جائیں گے۔کبھی بیٹھ کے سوچتا نہیں' دو چیزوں کو آپس میں ملاتا نہیں ہے مسلمان۔تدبیر بھی فرض ہے جناب۔قرآن نے کہا ہے وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (2:195) اپنے ہاتھوں ہلاکت میں اپنے آپ کو نہ ڈالو بِـاَيْـدِيْـكُـمْ ۔وہ خود ہلاکت میں ڈالنے سے یوں منع کر رہا ہے۔ہم کہتے ہیں کہ ہم کون ہیں ہلاکت میں ڈالنے والے؟ تیرا حکم ہوتا ہے ہم گلے پہ چھری پھیر لیتے ہیں۔اور پھر چلا جب تصوف اور اس کی شاعری

اوندا اے آپ ناں رکھدا اے تاپ

یہ ملیریا کے جراثیم جو ہیں اللہ میاں انہیں خود بخود (معاذ اللہ معاذ اللہ) ''اوندا اے آپ''۔

آپے دھیاں تے آپے ماپے

آپے مارے آپے کرے سیاپے

''آپ ای مارن ڈیا اے تے سیاپے کردا پیا اے''۔

غلط عقائد کی پیدا کردہ غلط سوچ کا نتیجہ متضاد خیالی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا

کیا باتیں پھر مسلمانوں کے ہاں۔جھوم جھوم کے پڑھتے ہیں پھر اس پہ وجد آتے ہیں پھر یہ معرفت کی باتیں ہیں' اوپر سے لاتے ہیں۔عزیزانِ من! یہ ہیں وہ عقائد کہ جنہوں نے اس ہمہ تن عمل قوم کو یکسر راکھ بنا کے رکھ دیا۔اگر یہ موت جو ہے اسی کے حکم سے آتی' قرآنِ کریم نے یہ چیز کہی جرم قتل کی سزا قرآن نے خود تجویز کر دی۔اور تجویز بھی کی اس انداز سے' پہلے تو یہ دیکھیے کہ انسانی جان کا احترام کتنا ہے اس کے نزدیک؟ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط (5:32) یاد رکھو! جس کسی نے بھی کسی ایک جان کو تلف کر دیا ناحق' قانون کے بغیر یوں کہیے کہ اس نے پوری انسانیت کو تلف کر دیا۔اور جس نے ایک جان کو بچا لیا یوں کہیے کہ اس نے پوری انسانیت کو زندگی بخش دی۔قرآن کی آیت ہے۔یہ مَن قتل جو ہے جس نے ایک جان کو تباہ کر دیا قتل کر دیا کسی ایک کو۔اگر یہ خدا کے حکم سے ہو رہا ہے تو اتنا بڑا جرم اور وہ فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ (5:32) کہ جس نے ایک کی جان بچا لی تو اس کے یہ معنی ہیں نا کہ جان بچا سکتا ہے انسان' اس نے گویا پوری انسانیت کی جان بچا لی۔یہ جان بچا لی کے کیا معنی ہیں؟ جان جانے کا خطرہ ہو گیا تھا نا اور اگر اس کا حکم تھا کہ جان جائے گی نہیں' بچانے والا یہ کون ہے۔اور اگر اس نے یہ جان جو تھی بچانی تھی اس کو بچانے کے لیے کہا ہی کیوں گیا۔دیکھ رہے ہیں دو دو چیزوں کو ملانے سے بات صاف ہوتی چلی جاتی ہے۔اور اس کے بعد پھر جرم قتل کی سزا وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ

يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَئًا ج وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا (4:92) کسی مومن کو کوئی مومن قتل نہیں کرتا' خطا سے سہو سے ہو سکتا ہے' غلطی سے ہو جاتا ہے اور غلطی سے اگر کوئی قتل کر دے تو اس کے لیے یہ یہ کفارہ مقرر ہے۔ وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ (4:93) جو کسی ایک مومن کو بالارادہ قتل کرتا ہے' سیدھا جہنم کے اندر چلا جاتا ہے۔ یہ خطا اور بالارادہ کے معنی کیا ہو گئے جی؟ اگر دونوں صورتوں میں جرم اس کا ہے ہی نہیں' خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے تو یہ قتلِ خطا کیا اور قتلِ بالارادہ کیا؟ خود یہ بتا رہا ہے ذمہ داری کا بھی درجہ قرآن نے خود مقرر کر دیا' ڈگری مقرر کر دی RESPONSIBILITY کی کہ اگر یہ خطا ہے سہواً ایسا ہو گیا ہے' وہ صرف کفارہ دیا جائے گا۔ ارادتاً کسی نے ایسا کیا ہے' جہنم میں چلا جائے گا۔

زندگی کے معاملہ میں زندہ قوموں کے ہاں عمر کا بڑھنا یا دوسری طرف عمر کا گھٹنا کیا معنی؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کیا چیزیں قرآن کی آ رہی ہیں۔ اس لیے یہ چیز غلط ہے کہ یہ چیزیں پہلے سے مقرر ہیں اور وہ اٹل ہے' تقدیر بدلی نہیں جا سکتی۔ دنیا کی قوموں نے خدا کے ان قوانینِ طبعی کا مطالعہ کیا' مشاہدہ کیا' تجربے کیے' انہوں نے اپنے ہاں کی AVERAGE عمر بڑھالی ہے' اوسط عمر بڑھ گئی ہے ان کے ہاں کی۔ بیماریوں کی اوسط اتنی کم ہو گئی ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہو گئی ہے۔ تندرستیاں ان کے ہاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ انہیں دیکھ کے رشک آتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ خدا کے قوانین کا مطالعہ ہے' اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ یہاں مرض بھی تقدیر میں لکھی ہے' شفا بھی تقدیر میں لکھی ہے۔ کمزور و نحیف ہونا بھی اس کے حکم سے ہے' توانا ہونا بھی اس کے حکم سے ہے۔ موت بھی اس کے حکم کے مطابق ہوتی ہے' زندگی بھی ویسے ہی ملتی ہے۔ یہاں تک تو ہوا باذن اللہ اور اس کے بعد ہے كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (3:145) مرے کو مارے شاہ مدار۔ اگلی چیز آئی انہوں نے اور پہلا جو عقیدہ تھا اسی کے غلط مفہوم سے اس میں اور ایک پختہ گرہ دے دی۔ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط (3:145) کتاب کے معنی لکھی ہوئی چیز مؤ جلا کے معنی اجل كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط (3:145) اجل لکھی ہوئی ہے چل بھئی۔

لفظ کتاب اور اجل کے قرآنی مفہوم کی وضاحت

عزیزانِ من! شروع میں ہی میں نے کتاب کے متعلق یہ عرض کیا تھا اس کے معنی ہی ہوتے ہیں کسی بات کا قانون ہونا' قانون ہی کے لیے کتاب کا لفظ ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (2:216) (قرآن کے اندر ہے) اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے سے یہ لکھی گئی بات ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ فرض قرار دے دیا گیا تمہارے اوپر۔ کتاب

ضابطۂ قوانین کو ہی کہا جاتا تھا۔ اب اسی طرح یہ جو چیز ہے مؤجل جس کے معنی ہمارے ہاں اجل، اجل کے معنی موت۔ اجل کے معنی معیاد ہوتا ہے، وقفہ ہوتا ہے، پیریڈ ہوتا ہے۔ پیدا ہونے اور مرنے کے درمیان کا جو پیریڈ ہے یہ ایک قانون کے مطابق چھوٹا اور بڑا ہوتا ہے۔ آپ کہیں چھوٹا اور بڑا آپ نے یہ کہہ دیا۔ عزیزم! میں تو اپنی طرف سے ایک لفظ نہیں کہتا قرآن ہی کی آیت ہوتی ہے۔ پہلے میں نے یہ عرض کیا ہے کہ اجل کے معنی وہ پیریڈ ہوتا ہے درمیانی کسی چیز کا۔ ہمارے ہاں یہ لفظ ہی موت کے لیے استعمال ہوتا ہے، اجل آ گئی۔ کہا کہ یہ جو چیز ہے موت خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ پیدائش اور مرنے کے درمیان کا وقفہ جسے آپ عمر کہتے ہیں وہ ایک قانون کے مطابق طے ہوتا ہے۔ یہ جو ہے کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط (3:145) دونوں لفظ آپ دیکھیے قرآنِ کریم میں یہ آئے لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ. يَمۡحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثۡبِتُ (13:38-39) ہر معیاد کے لیے ہر وقفے کے لیے ایک قانون مقرر ہے۔ زمین میں بیج ڈالنا، اس بیج کا پک کر کھیتی بننا، یہ درمیان کا جو عرصہ ہوتا ہے، اسے اجل کہتے ہیں۔ کہا اس کے لیے ایک قانون مقرر ہے۔ قانون یہ ہے کہ پانی جو ہے ٹھنڈا، وہ سو درجے سینٹی گریڈ کی حرارت پر پہنچ کے ابلے گا، اس وقت کھولے گا۔ یہ جو ہے اس کو حرارت پہنچانے کی ابتدا اور کھولنے تک کا وقفہ، اس کو اجل کہتے ہیں۔ اور یہ کہ سو درجے پہ پہنچ کے کھولے گا اسے کتاب کہتے ہیں۔ یہ جو ہے اتنے وقت کے بعد اس نے ضرور کھولنا ہے یہ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط (3:145) ہے۔ عربی زبان میں استعمال اس طرح کرتے ہیں، قرآن میں استعمال اس طرح کیا ہے ان کو۔ جسے آپ عمر کہتے ہیں وہ کیا چیز ہوتی ہے؟ ایک پیریڈ ہوتا ہے پیدائش اور آخری سانس تک کے درمیان کا۔ جیسے مثال میں میں نے ابھی عرض کیا ہے پانی کو حرارت دینے اور اس کے کھولنے کے درمیان کا وقفہ جو ہے اسے اجل کہتے ہیں، مؤجل ہوتا ہے وقفہ پیریڈ اس کے لیے۔ قانون کی رو سے پیریڈ مقرر کیا ہے ہم نے اتنا اسے تم کم بیش نہیں کر سکتے۔ یہ ہے وہ چیز قانون کے مطابق پیریڈ۔ پیریڈ کیا ہے؟ عمر کے متعلق اگر آپ پھر بات وہ ہو جائے کہ صاحب وہ پیریڈ جسے کہتے ہیں اتنے سال اتنے مہینے کی عمر یہ پہلے سے مقرر ہے یہ نہیں مقرر، پیریڈ آپ گھٹا بڑھا سکتے ہیں خدا کے قانون کے مطابق۔ اور دیکھیے قرآن کی آیت۔ پہلے ہے کہ خدا نے اس طرح سے پیدائش کی ابتدا کی پھر تمہیں اس طرح سے بچہ بنایا اور اس طرح سے نطفے سے پیدائش ہوئی۔ پیدائش کے مدارج طے کر کے لکھا ہے وَ مَا يُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ ط (35:11) جس کسی کی عمر گھٹتی ہے یا جس کسی کی عمر بڑھتی ہے، یہ ساری چیز قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں یہاں گھٹنے اور بڑھنے کا قرآن نے ذکر کر دیا ہے۔ پہلے سے مقرر ہے اگر تو گھٹتی اور بڑھتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کیا چیز قرآن کہہ گیا ہے عمر کا گھٹنا اور بڑھنا؟ ایک تو NORMAL AGE ہوتی ہے عام عمرِ طبعی جسے کہتے ہیں ہم کہ عام طور پہ اتنا

انسان زندہ رہتا ہے۔ کہا ہے کہ اس کے لیے عمر بڑھنا اور عمر کا گھٹنا اس طبعی اور نارمل عمر سے یہ قانون کے مطابق ہوسکتا ہے۔ اور سیدھی سی بات ہے جب جی چاہے آپ سنکھیا پھانک لیجیے اسی وقت عمر آپ کی گھٹ گئی۔ حفظانِ صحت کے مطابق چلتے چلے جایئے آپ کی عمر بڑھ جائے گی۔ جن امراض کو مہلک پہلے تصور کیا جاتا تھا ان امراض کو بھی اگر شروع میں ہی DETECT کر لیا جائے اور ان کا علاج شروع کر دیا جائے اس سے بھی ہلاکت نہیں ہوتی۔ اور اب تو امراض پہ اتنا کنٹرول کیا ہے انہوں نے۔ یہ سب ان قوموں نے کیا ہے تقدیر کا عقیدہ جن کے ہاں نہیں تھا۔

مذہب پرست قوم جو تقدیر کے چکروں میں الجھ کر رہ چکی ہو اُن کی نفسیاتی کیفیت

تقدیر کا عقیدہ رکھنے والی قوم نے دنیا میں کوئی کسی قسم کا قانون انکشاف وغیرہ نہیں کیا نہ کوئی ایجاد کیا کر ہی نہیں سکتی وہ تو البتہ یہ قوم ان کا مذاق اڑاتی ہے۔ اَللّٰہُ یَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ وَ یَمُدُّ هُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ (2:15) وہ کہتا ہے یہ کیا ان کا مذاق اڑائیں گے خدا ان کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کو توہمات کی تاریکیوں میں چھوڑتا ہے کہ بڑھتے چلے جاؤ بڑھتے چلے جاؤ۔ ہمارے ہاں یہ چیز ہے اور ہمارے ہاں نہیں ہر مذہب پرست قوم کے ہاں یہ چیز ہے۔ مذہب پرست کے معنی تقدیر پرست ہوتا ہے کہ کوئی چیز جو نئی ایجاد نئی انکشاف کی چیز وہاں سے آتی ہے ان قوموں کے ہاں سے ہمارا پہلا ری ایکشن عوام کے ہاں سے تمسخر ہمارے ہاں کے علمائے کرام کے ہاں سے کفر کا فتویٰ۔ پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہی قومیں جو ہیں جھک مار کے وہیں آ جاتی ہیں۔ سب علاج کراتے ہیں اپنا یہ۔ یہ جتنے کہتے ہیں نا یہ وعظوں میں اور فتوؤں میں موت کا مقرر دن ہے خدا کے حکم بغیر کچھ نہیں ہوتا آپ دیکھیے گا کیسے بھاگے بھاگے پھر رہے ہوتے ہیں۔ عملاً جھٹلاتے ہیں اپنے ان عقائد کو۔ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ (3:145) یہ وقفہ جو ہے اس کے لیے بھی قانون مقرر ہے۔ اور یہ چیز کہ یہ گھٹ بڑھ سکتا ہے وقفہ جسے تم عمر کہتے ہو اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ قانون کے مطابق ایسا ہوسکتا ہے ایسے ہی نہیں کہ تم عمر کو یوں ہی چھوڑ دو اور اس کے بعد یہ کچھ ہو جائے۔ جب جی چاہے تم اس کو گھٹا سکتے ہو اور اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کرو تو بڑھا سکتے ہو۔

طبعی قوانین کی دو قسموں کی وضاحت، لفظ ثواب کا حقیقی مفہوم اور ہماری پریشاں نظری کا نتیجہ

طبعی قوانین جو ہیں میں نے عرض کیا تھا کہ خدا کے قوانین کی دو شقیں ہیں ایک یہ NATURAL LAWS ہیں LAWS OF NATURE طبعی قوانین ہیں اس میں کافر اور مومن کا کوئی فرق نہیں کوئی تمیز نہیں جو بھی ان کے مطابق زندگی

بسر کرتا ہے' اس کو طبعی یا PHYSICAL نتائج مل جاتے ہیں اس کے' نتائج بھی فزیکل ہوتے ہیں اس کے طبعی ہوتے ہیں۔ اور جو ان قوانین کے بعد وحی کی رو سے عطا کردہ قوانین کے مطابق پھر زندگی بسر کرتا ہے وہ انسانی زندگی ہوتی ہے۔ اس کے نتائج بھی اس کو اور اس کا حصہ بھی اس کو مل جاتا ہے۔ یہ ہے قرآن جو یہاں ایک اصول آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ دیکھیے اعجاز قرآن کا کس انداز سے بات بیان کر رہا ہے؟ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ط وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ط (3:145) جو صرف طبعی قوانین کے مطابق طبعی زندگی کے اندر ہی نتائج لینا چاہتا' ہے اس کو ملتے چلے جاتے ہیں اور جو اس کے ساتھ یہ چاہتا ہے کہ نہیں! انسانیت کی زندگی جس نے اس کے بعد بھی چلنا ہے' اس کا بھی ساتھ کچھ ملے' اس کو بھی مل سکتا ہے۔ یہ ثواب الدنیا پھر بات وہی آ گئی پھر ثواب کا لفظ ایک آ گیا۔ یہ موجودہ غلط عقائد کی خاردار جھاڑیاں قدم قدم پہ دامن کو الجھا کے رہ جاتی ہیں' آگے چلنے ہی نہیں دیتیں۔ دین کا تصور محو ہوا' مذہب کا تصور آیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کچھ کرتے رہو' سو دفعہ یہ پڑھو' ایک تسبیح اس کی پڑھو' دس دفعہ قرآنِ کریم ختم کراؤ اس کے بعد یہ۔ اس سے پوچھا کہ صاحب! اس سے ہوتا کیا ہے؟ کہا ثواب ہوتا ہے۔ ''اوہناں نوں کہو جی پنجابی اچ سمجھاؤ کی ہونداا ے؟ تسی دیکھو گے گھوڑا مک جائے گا''۔ ثواب ہوتا ہے جی۔ او بابا! بتایئے تو سہی؟ کہ صاحب! ثواب ہوتا ہے۔ پتہ کیسے چلے گا؟ قیامت میں جا کے۔ اور یہ ہے قرآن یہ تو چلنے ہی نہیں دیتا کسی کو' وہ کہتا ہے ثواب الدنیا۔ چلیے جناب بھاگئے کہاں بھاگتے ہیں' نکلئے کدھر سے نکلتے ہیں۔ ثواب الدنیا یہاں لکھا ہوا ہے۔ مذہب کی سطح پہ ہر ثواب آخرت میں جا کے ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ذہنی عقیدہ ہوتا ہے۔ نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی۔ حقیقتاً ایک چیز ہے نا۔ ٹھیک ہے انہوں نے کہا کہ یہاں تو ان کو یہ الجھالیں گے کہ باطل پرست ہیں۔ وہ کہتا ہے ثواب الدنیا بتایئے یہاں کیا ہوتا ہے؟ ثواب کا صحیح ترجمہ ہے انگریزی میں ایک لفظ ہوتا ہے کاروباری اصطلاح ہے وہ۔ INVESTMENT کچھ آپ کرتے ہیں' روپیہ لگاتے ہیں' وقت لگاتے ہیں' محنت لگاتے ہیں' اس کے بعد آپ کہتے ہیں کہ صاحب! اس کی ریٹرن کیا ہوئی پھر؟ EXACTLY یہ ترجمہ ہے اس کا ثواب کا۔ ثاب کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کا لوٹ کے واپس آنا۔ جو کچھ آپ صرف کر رہے ہیں' اس کا مجھے واپس کیا ملا؟ یہ ریٹرن سے آپ سمجھے ہوں گے' اس کی ریٹرن کتنی ہے؟ بالکل ان معنوں میں یہ ہوتا ہے یہ لفظ کہ جو کچھ صرف ہوا ہے' اس سے واپس کیا ملا ہے' ریٹرن اس کی کیا ہے؟ یہ ہوتا ہے ثواب کا ترجمہ یہ ہے۔ اب ثواب الدنیا جو ہے وہ ریٹرن تو یہیں ملنی ہوگی جناب اس لیے کہ آگے ثواب الآخرت جو ہے وہاں اٹھا رکھیے۔ آپ ثواب

الدنیا تو یہیں ہے' یہیں ملے گی۔اور اس کے لیے اس نے بتا دیا کہ اس میں کافر اور مومن کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ جو کاشت کار اپنی زمین کو اس کے قانون کے مطابق درست کرتا ہے' سنوارتا ہے' بیج ڈالتا ہے' پانی دیتا ہے' وہ عبدالرحمٰن ہو یا گنڈا سنگھ ہو یا ہر نام داس ہو' اس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ رب العالمین ہے' رب المؤمنین ہی نہیں ہے۔ اس قسم کی رعایتیں یا تعصّبات انسانوں کی تنگ ظرفی سے تو ہوتی ہیں خدا کے ہاں یہ چیز نہیں ہے۔ سنیے کیا کہتا ہے؟ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعَاجِلَۃَ عَجَّلۡنَا لَہٗ فِیۡہَا (17:18) جو سودا یہاں کرنے کے بعد' کام کرنے کے بعد کہتا ہے کہ فوری کچھ مل جانے چاہیئے' مجھے اسی زندگی میں مل جانا چاہیئے' یہیں مل جانا چاہیے۔ دیتے ہیں ہم اس کو یہاں جو کچھ ہے۔ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَہٗ جَہَنَّمَ ج (17:18) لیکن اس کے بعد چونکہ اس نے سارا کچھ یہیں معاملہ اپنا طے کر لیا اس کے بعد کی جو آگے زندگی پھر چلتی ہے اس میں اس کا حصہ نہیں ہوتا۔ اس نے یہیں کے لیے صرف قانونِ طبعی کے مطابق یہ سارا کاروبار کیا تھا' طبعی قوانین کی رو سے طبعی دنیا کے اندر طبعی نتائج اس کو مل گئے۔ دولت لینا چاہتا تھا' مل گئی۔ صحت لینا چاہتا تھا مل گئی' لمبی عمر کرنا چاہتا تھا مل گئی' یہ دے دیتے ہیں ہم۔ وَ مَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَۃَ وَ سَعٰی لَہَا سَعۡیَہَا وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعۡیُہُمۡ مَّشۡکُوۡرًا (17:19) اور جو اس کے ساتھ مستقبل کے اندر بھی اپنا حصہ چاہتا ہے صرف ایمان سے نہیں وَسَعٰی لَہَا سَعۡیَہَا (17:19) جتنی جیسی کوشش کا حق ہے پھر ویسی کوشش کرتا ہے اس کے لیے' اس کو ہم اس کے مطابق دے دیتے ہیں۔ اور سنیے یہ خدا ہی کہہ سکتا ہے کُلًّا نُّمِدُّ ہٰۤؤُلَآءِ وَ ہٰۤؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ ؕ (17:20) ہم ان دونوں گروہوں کو جو اس دنیا کے اندر یہ لینا چاہتے اور جو اس میں بھی اور اُس میں بھی لینا چاہتے ہیں' ان دونوں گروہوں کو ہم مدد دے کے آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ خدا کی مدد دونوں کے ساتھ شامل ہوتی ہے کُلًّا نُّمِدُّ ہٰۤؤُلَآءِ وَ ہٰۤؤُلَآءِ (17:20) ۔آ ہا ہا! ''رب بنا اینوں ای چجد اہیگا جناب'' کُلًّا نُّمِدُّ ہٰۤؤُلَآءِ وَ ہٰۤؤُلَآءِ (17:20) کافر اور مومن دونوں کو نُمِدُّ عربی جاننے والے جانتے ہیں ہم ان کو مدد دے کے بڑھاتے چلے جاتے ہیں انہیں بھی اِنہیں۔ ٹھیک ہے کوشش کر رہے ہو اس لیے کہ خدا ہی کے قوانین ہیں جن کے مطابق یہ کوشش کر رہے ہیں۔ کُلًّا نُّمِدُّ ہٰۤؤُلَآءِ وَ ہٰۤؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ ؕ (17:20) یہ تو اس کی بخشش عام ہے دونوں کی مدد کرتے ہیں۔ اور آگے ہے وَ مَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا (17:20) جو رب بننے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے لیے یہ کہیں جچتا نہیں ہے کہ کسی کے راستے میں پھاٹک لگا دے کہ تو آگے نہیں جا سکتا ''تو لنگ جاوئے''۔ آ ہا ہا۔ وَ مَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا (17:20) آ ہا ہا۔ رب جس نے ربوبیت کی ذمہ داری لی ہوئی ہے' می نہ سزد خدائے را کہ ایک کے راستے میں پھاٹک لگا دے کہ تو

آ گے نہیں جا سکتا اور دوسرے کو کہے کہ تو اس کے قانون کے خلاف بھی کر محنت بھی نہ کچھ کر اور چلا جا آ گے یہ نہیں ہو سکتا۔

مقامِ آدم اور مقامِ مومن کی بنیادی خصوصیات اور ان ہر دو مقامات تک رسائی کا طریق

عزیزانِ من! یہ ہے ثَوَابَ الدُّنۡیَا ثَوَابَ الۡاٰخِرَۃ (3:145)۔ دین سمٹ کے جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے ایک فقرے میں آ جاتا ہے۔ فطرت کی قوتوں کو قوانینِ فطرت کے مطابق مسخر کرنا یہاں تک مومن اور کافر دونوں برابر ہوتے ہیں، یہ مقامِ آدم ہے۔ اور ان قوتوں کو وحی کے قوانین کے مطابق صرف کرنا، یہ مقامِ مومن ہے۔ ان دو ٹکڑوں میں سے ایک بھی نہیں ہے، مومن کے مقام پہ آ ہی نہیں سکتے۔ یعنی پہلے آدم کے مقام کے اوپر ہونا ضروری ہے مومن کے مقام پہ جانے کے لیے۔ اور مقامِ آدم یہ ہے کہ اس کے سامنے ملائکہ سجدہ ریز ہوں۔ یہ ہے پہلا STEPING STONE اس کے بغیر مومن کے مقام پہ آ ہی نہیں سکتا انسان۔ اسی لیے اقبالؒ نے کہا ہے

به آدم نه رسیدی خدا چه می جوئی

تمہیں تو آدمی کی مقام بھی نصیب نہیں ہے تو خدا کیا تلاش کر رہا ہے۔ انہیں خدا کیا مل سکتا ہے جس کو مقامِ آدم بھی نہیں ملا۔

اسی لیے کہا کہ مومن کی دعا یہ ہونی چاہیے کہ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (2:201)۔ وَ مَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا (17:20) اور اسکے بعد کہا اس کی دلیل چاہتے ہو اُنۡظُرۡ کَیۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ (17:21) دیکھو اقوامِ عالم کو، کس طرح ایک قوم دوسری قوم سے آ گے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں بھی کہا فَضَّلۡنَا (17:21) ہم کس طرح سے ایک قوم کو دوسری قوم کے اوپر تفضیل دیے چلے جا رہے ہیں۔ طبعی زندگی کے اندر جنہیں ہم کافر کہتے ہیں، وہ بھی جو آ گے بڑھ رہی ہوتی ہیں، خدا کہتا ہے ہمارے ہی قانون کے مطابق وہ بڑھ رہی ہیں، ہم بڑھا رہے ہیں ان کو۔ لیکن وَ لَلۡاٰخِرَۃُ اَکۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَکۡبَرُ تَفۡضِیۡلًا (17:21) لیکن مستقبل کے اندر جو زندگی ہے وہاں کیفیت پھر دوسرے پیمانے کے مطابق ہوتی ہے اور وہی افضلیت جو ہے حقیقت میں بڑی افضلیت کہلا سکتی ہے۔ میں نے کہا یہ تھا کہ ساری آیت وَ مَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ (3:145) کو پڑھیے بات صاف ہو جاتی ہے۔ پیچھے سے بات آ گئی نا یہ کہ محمد ﷺ بجز ایں نیست خدا کے ایک رسول ہیں کل کو اگر مر جائیں، قتل کر دیے جائیں تم کہو گے کہ ہمارا نظام ختم ہو گیا، ہم لوٹ جائیں پچھلے پاؤں پہ اپنے؟ جو ایسا کرے گا اپنا ہی نقصان کرے گا خدا کا کچھ نہیں بگاڑ دے گا۔ اگلی آیت۔ موت، موت تو خدا کے قانون کے مطابق ہر ایک کو آتی ہے۔ اب رہا یہ زندگی بھر کا مسئلہ تو اس کے اندر بھی دو طرح کی کوششیں ہیں۔ صرف اس دنیا کی اس زندگی کی چیزیں جتنی

بھی ہیں' صرف وہ لینا چاہتے' ہو قوانینِ طبعی کے مطابق کام کرتے چلے جاؤ' ملتا چلا جائے گا ثَوَابَ الدُّنۡيَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا (3:145) وہاں بھی اپنی طرف کہا ہم دیتے ہیں ان کو۔ اور جو ان کے علاوہ یہاں بھی لینا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ وہ بھی لینا چاہتا ہے نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا ؕ وَ سَنَجۡزِی الشّٰكِرِيۡنَ (3:145) کوشش کرنے والوں کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں' ہم بھرپور نتائج پیدا کراتے ہیں۔ دیکھیے کہاں ہم آ رہا ہے؟ کر رہا ہے وہ اس کے قانون کے مطابق' بھرپور نتائج ہم دونوں کو دیتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بات نہ کہو کہ طبعی قوانین کے مطابق طبعی زندگی اگر ختم ہو جاتی ہے رسول کی' خواہ طبعی موت سے ہو یا میدانِ جنگ میں شہادت سے ہو تو اس سے یہ نظام بگڑ جائے گا۔ موت تو ہر ایک کو آنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یہ بات ہو جائے' رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ بات ہو جائے۔ وفات کے بعد کا ذکر بھی قرآن نے کیا ہے (13:40)۔

غیر متبدل قرآنی احکام وقوانین کی اہمیت اور نبی اکرم ﷺ کی جفاکش زندگی کا ایک ایک مرحلہ نیز آپ ﷺ کی ایک معصوم سی خواہش کا تذکرہ

میں نے یہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ کے دل میں یہ بات تو یہ آرزو معصوم سی' دل میں آئی تھی کہ کیا میری ساری زندگی اس تگ وتاز ہی کے اندر گذر جائے گی یا میں اپنی محنت کے نتائج اپنے سامنے بھی دیکھ لوں گا؟ اب دیکھیے اور کچھ نہیں تو اتنی سی رعایت کے لیے جی چاہتا تھا نا کہ خدا یہ کہہ دیتا کہ نہیں! کوئی بات نہیں ہم تمہاری عمر اتنی بڑھا دیں گے کہ وہ نتائج تمہارے سامنے ہی برآمد ہو جائیں۔ یعنی جب موت اسی کے حکم کے مطابق آنی ہے عمر بھی بڑھنی ہے تو یہ آرزو یہ خواہش یہ التماس یہ اس قسم کی التجا' کوئی بے جا نہیں تھی۔ سوچیے تو سہی نبی کی زندگی کتنے فرائض کا بوجھ ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ وہ فرائض جس نے تیری کمر توڑ دی ہے۔ پہلے دن سے آواز برآمد کی ہے تیرہ سال مکے کی زندگی کے مسلسل مصیبتوں کے تکالیف کے مشقتوں کے اذیتوں کے یہ اس شخص کو مل رہے ہیں جس کا مقام معاشرے میں یہ ہے کہ وہ آ کے کہتے ہیں کہ بابا! تم چاہتے ہو تو پوری مملکت ہم تمہارے حوالے کر دیتے ہیں' عرب کی سرزمین لے لو۔ اس ﷺ کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اسے نہیں لیتا پسند نہیں کرتا۔ پسند کیا کرتا ہے؟ گالیاں پڑ رہی ہیں' طعن وتشنیع ہو رہی ہے' مار پڑ رہی ہے' گھر سے نکال دیا گیا ہے' مدینے میں آ گئے۔ سن 9 , 8 ھجری تک مسلسل جنگیں چلی جا رہی ہیں ایک دن بھی تو نصیب نہیں ہوا جسے ہم کہتے ہیں اطمینان اور چین کا (ہمارے نقطۂ نگاہ سے) مسلسل اذیتوں کی زندگی۔ تو زندگی کے آخری دنوں کے اندر عمر کے لحاظ سے اگر یہ دل میں آرزو بیدار ہو جائے کہ یا اللہ میری عمر اسی طرح سے ان ہی پیہم

تکلیفوں میں ہی گذر جائے گی یا جو بیج میں نے بویا ہے اس کا پھل بھی میرے سامنے آ جائے گا؟ تو میں نے کہا ہے نا بڑی معصوم ہے یہ آرزو۔ اور اگر موت کا وہی ہے جو ہم سمجھتے ہوئے ہیں کہ جسے چاہے وہ لمبی کر دیتا ہے' جس میں کہنا چاہیے تھا کہ اچھا کوئی بات نہیں ہم تمہاری عمر اتنی بڑھا دیں گے کہ تم یہ نتائج دیکھ لو۔ کہا لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (13:38) بیج بونے میں اور اس کے فصل کے پکنے کے اندر ایک وقفہ ہوتا ہے اور وہ ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (13:40) وہ وقفہ بدل نہیں سکتا لیکن تم کیوں اس کے متعلق مضطرب ہوتے ہو؟ وہ تمہاری زندگی میں تمہارے سامنے پھل آ جائے یا تمہارے بعد پھل آ جائے' اس کا کچھ فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ اس لیے کہ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) تیرے ذمہ تو اس چیز کو پہنچائے چلے جانا ہے یہ تخم کب بار آور ہو گا یہ حساب ہمارے ذمہ ہے۔ تم اپنا کام کرتے چلے جاؤ۔ عزیزانِ من! یہ ہیں خدا کے قوانین کے مطابق کام کرنے والوں کی کیفیت۔ اس کے لیے نہ تو وہ DATE ہی ذرا بدل کے پہلے کرتا ہے' نہ اس کی عمر ہی اتنی بڑھانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کیسا دوٹوک جواب دیا ہوا ہے؟ تمہارے سامنے آ جائے' تمہارے بعد آ جائے۔ اتنا بھی نہیں کہ وہ معاذ اللہ وہ داغ کے الفاظ میں کہتا ہوں جھوٹا وعدہ ہی سہی منہ سے مگر ہاں تو کرو' کچھ تو تسلی دیدو تھوڑی سی۔ خدا ہے صاحب! جھوٹے وعدے نہیں کرتا وہ' جھوٹی تسلیاں نہیں دیتا وہ۔ اٹل قانون اپنے پیغمبر کے لیے بھی نہیں بدلتا۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (13:38) سمجھ لیا اب اجل کے معنی اور کتاب کے معنی کیا ہیں؟ تمہارے سامنے آ جائے' تمہارے بعد میں آ جائے۔ یہ پوزیشن ہے اس شخص ﷺ کی جو ذاتی منفعت کے لیے' گروہ بندانہ منفعت کے لیے' پارٹی کے لیے اقتدار حاصل کرنے کے لیے' الیکشنوں میں کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے' کچھ نہیں کر رہا تھا۔ وہ کلمۃ اللہ کو خدا کے قانون اور نظام کو بلندی اور کبریائی حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر رہا تھا۔ اس لیے کہا کہ اس کی کون سی بات ہے۔ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (13:40) تمہارے سامنے ہو جائے' تمہارے بعد میں آ جائے' اس میں کیا فرق پڑتا ہے۔ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40)

دل جمعی اور یک سوئی کے ساتھ ٹھوس پروگرام کا نتیجہ ہمیشہ ہزاروں سال پر محیط ہوتا ہے

عزیزانِ من! بڑی شدید آیت ہے۔ تیرے ذمے اس کو پہنچائے چلے جانا ہے۔ تو اپنا کام کرتا چلا جا' یہ کب بار آور ہو گا' یہ ہم جانتے ہیں۔ ٹھیک ہے جلدی پھل لانا تھا تو کیلا بو دینا تھا چھ مہینے میں گچھا آ جاتا لیکن پھر وہ ایک ہی دفعہ لٹکتا ہے وہ گچھا پھر اس کے بعد کیلا کٹ جاتا ہے۔ صبر کی بات تھی' کھجور بوؤ چالیس سال کے بعد پھل دیتی ہے اور اس کے پھل کی کیفیت یہ ہے کہ محمد بن قاسم

کے وقتوں کی کھجوریں ہیں نا جو یہاں لگی ہوئی ہیں ہمارے ہاں' آج تک پھل دیے چلی آتی ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے ہاتھوں کی کھجوریں لگی ہوئی ہیں آج تک ہمارے جیسے بدبخت بھی پھل کھائے چلے جارہے ہیں۔ اتنے ناشکرے واقع ہوئے ہیں' کبھی اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ ہم نے کیا کچھ نہیں کیا ان کھجوروں کو اجاڑنے کے لیے لیکن ایسے مقدس ہاتھوں کی ایسے پختہ قانون کے تابع ان کی جڑیں جو قرآن کے الفاظ میں کَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ (14:24) اس شجرِ طیب کی طرح کہ جس کی جڑیں پاتال میں گئی ہوئی ہوں' جس کی شاخیں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہوں۔ اور قرآن میں یہ ہے کہ وہ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ۢ (14:25) وہ اپنا پھل ہر موسم میں دیتا ہے بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ۔ ان کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے شجرِ طیب کیا بات تھی کہ تمہاری زندگی کے سامنے یہ پھل دے دیں یا تمہارے بعد پھل دے دیں' تم اس کے لیے مضطرب اور بے قرار نہ ہو۔ عزیزانِ من! انقلاب لانے والے کے سامنے یہ بات ہونی نہیں چاہیے۔ اگر یہ چیز اس کے سامنے آ جائے' پروگرام کے اندر نقص واقع ہو جاتا ہے۔ اگر وہ جلدی کرنے لگ جائے اس کے لیے کہ میرے ہی سامنے کچھ ہو جائے' میرا حصہ اس کے اندر ہو جائے' میں اس کی فتوحات کو لے لوں تو وہ اس عجلت کے اندر انقلاب نہیں ہو سکتا ہے' فساد برپا کر دے۔ لیکن جسے یہ کہا ہو کہ تجھے اس سے پروا نہیں ہونی چاہیے کہ تیری زندگی میں یہ ہوتا ہے یا بعد میں ہوتا ہے تو وہ پھر پروگرام کے مطابق' اطمینان سے چلتا چلا جاتا ہے اس کا انقلاب' فساد میں نہیں بدلتا۔ ہمارے ہاں انقلابات لانے کے مدعی اٹھتے ہیں' آپ کو پتہ ہے چار قدم کے بعد فساد کیوں ہو جاتا ہے؟ وہ یہ ہو جاتا ہے کہ صاحب! میں گر گیا دورے کرتا کرتا' تقریریں کرتا کرتا' اتنے روپے خرچے سب کچھ ہوا "اے کیندے نیں الیکشن ایت کی نئیں اگلے سال ہونا اے۔ لے ایسی دی تیسی اگلے سال ہونا اے"۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ ثواب الدنیا چاہتا ہے صرف۔

انسانیت ساز پروگرام کی تکمیل کے لیے جدوجہد کے دوران صبر و استقلال حصولِ منزل کے لیے نشانِ راہ ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ج وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ط وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (3:145) باقی رہا یہ کہ مہمات ہیں' جنگیں ہیں' لڑائیاں ہیں' مصائب ہیں' تکالیف ہیں وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ج (3:146) یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہر انقلابی جو آیا ہے ہر نبی جو آیا ہے وہ اور اس کے ساتھی ربیون اللہ

والوں کی جماعتیں جو اس کے ساتھ تھیں انہوں نے بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں۔ فَمَا وَ هَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ (3:146) تین درجے عجیب بتائے ہیں کہ اس راستے کے اندر جو حادثہ بھی ان کو پیش آیا' جو واقعہ بھی ان کے رونما ہوا' اس سے نہ تو ان کے ارادے میں کسی قسم کی کچھ کمی واقع ہوئی۔ وھن یہ ہوتا ہے ہمت اور ارادے کے اندر ہی کوئی کمزوری پیدا ہو جانا۔ وَمَا ضَعُفُوْا کے معنی ہوتا ہے طبعی طور پہ کچھ کمزور پڑ جانا دوسرا درجہ ہے۔ وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ (3:146) تیسرا درجہ ہے ہتھیار رکھ دینا۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر اس کے لیے جو اس قسم کا انسانیت ساز انقلاب لانا چاہتا ہے' جس کے سامنے پوری انسانیت کی منفعت بخشیاں ہیں وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ (13:17) اس کے لیے ٹکراؤ ضروری ہے۔ باطل کی قوتیں ہجوم کر کے آجائیں گی۔ یہ نئی بات نہیں ہے' ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مخالفت کی قوتوں نے نہ تو ان کے ارادے کے اندر کوئی سستی کی' نہ ان کی طبعی جدوجہد کے اندر کسی قسم کی کمزوری آئی اور ایسا تو ہوا ہی نہیں کہ انہوں نے ہتھیار رکھ دیے ہوں۔ عزیزانِ من! دیکھیے کہاں لفظ آ رہا ہے پھر آپ دیکھیں گے صبر کے معنی کیا ہیں؟ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (3:146) پھر لفظ آیا وہی جس کے میں کئی دفعہ معنی بتا چکا ہوں کہ ہمارے ہاں "صبر کینوں کیندے نیں اچھا بھین صبر کر" یعنی جب کچھ نہ ہو سکتا ہو۔

میدانِ جنگ میں جماعتِ مومنین کے احساسِ ذمہ داری کی نوعیت اور پھر خدائے خبیر کی طرف سے اس کے اجر کا انداز

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (3:146) صابر وہ ہے کہ جس کے نہ ارادے کے اندر سستی ہو نہ جدوجہد کے اندر کمزوری ہو اور ہتھیار تو رکھے ہی کبھی نہ' اسے صابر کہتے ہیں اسے خدا پسند کرتا ہے۔ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (3:147) ان کے ہاتھ اور پاؤں تو مصروفِ جدوجہد تھے اور ان کی زبان پر یہ آرزوئیں دعا بن کے آ گئی ہوئی تھیں کہ اے ہمارے بارِالٰہا! کہیں اگر کوئی چیز ایسی سہواً بھی لغزش کی ہو گئی ہے' یہاں ذنب ہے وَ اِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا (3:147) عجیب بات ہے کہ میدانِ جنگ کے اندر بھی ہیں کہ جہاں ہمارا ہاتھ کہیں ایسے اٹھ گیا ہے کہ جہاں نہیں اٹھنا چاہیے تھا' اگر ایسا ہوا ہے کہ قدم اٹھنا چاہیے تھا اور نہیں اٹھا' اس سے بھی ہمارے ذمے جرم عائد ہوتا ہے اور اگر ایسا ہے کہ ایک قدم اٹھنا چاہیے تھا اور ہم نے دو اٹھا دیے ہیں' یہ اسراف ہے' یہ بھی ہمارے ذمے جرم ہے۔ دعا ہماری یہ ہے کہ اگر کہیں سہو و خطا سے ایسا ہو گیا ہے تو اس کے نقصان دہ نتائج سے ہماری حفاظت کرنا۔ وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (3:147) وہ

صابر کی یہاں آ گئی تشریح کہ ہمارے قدموں کو جمائے رکھ۔ اور یوں وہ قوم جو تیرے قوانین کی مخالفت کے اوپر ابھر کے سامنے میدان میں آ گئی ہے' ان کے خلاف ہمیں نصرت دے مدد دے۔ برادرانِ عزیز! سن لیا یہاں تک کیا نقشہ آ رہا ہے؟ اور آ گے سنیے ثواب کے معنی۔ فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا (3:148) انہیں ہم نے سب سے پہلے ثواب الدنیا دیا ان کی اس محنت کی ریٹرن جو تھی' اسی دنیا کے اندر ہم نے دے دی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ابراہیمؑ اور اس کی آل کو ہم نے ملکِ عظیم دیا تھا' عظیم مملکتیں عطا کر دی تھیں۔ ثواب الدنیا پہلا ہے یہ۔ لیکن یہ تو مومن تھے۔ یہاں تک تو آپ کی ہر اس فوج کو مل جائے گا جو طاقت زیادہ صرف کرے جو ثابت قدم ہو' یہاں تک تو مل جائے گا۔ وَ حُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِؕ (3:148) انہوں نے تو یہ سب کچھ انسانیت کی منفعت بخشیوں کے لیے کیا تھا۔ مملکت یہاں ملی ہے' ثواب الدنیا ہے لیکن حسین تر ثواب جو ان کا تھا' ان کا حصہ جو تھا وہ مستقبل میں جا کے ان کے لیے آخرت میں ملے گا۔ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (3:148) اور یوں جو حسن کارانہ زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ اب یہاں حسن کے معنی ہو گئے۔ دو ہی چیزیں ان کے ہاں تھیں۔ ذنب جو تھا کسی چیز کا ذرا پیچھے رہ جانا۔ اسراف تھا قدم زیادہ بڑھ جانا' دونوں میں توازن بگڑ جاتا ہے انسان کا PROPORTION غلط ہو جاتی ہے۔ مومن کی تو زندگی یہ ہے کہ حسن کارانہ اس انداز کی PROPORTION کی چیز کہ جس سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ حسن کہتے ہی صحیح تناسب کو ہیں۔ صحیح توازن کو رکھنے والے جو ہیں زندگی کے اندر ان کو خدا پسند کرتا ہے یہ ہیں وہ لوگ۔ اور توازن یہ ہے کہ ثواب الدنیا بھی ہو اور ثواب الآخرت بھی ہو۔ اب یہاں وہ بات آئی۔ وہاں کہا یہ تھا کہ محمد ﷺ ان کی وفات یا ان کے قتل ہونے سے نظام نہیں بگڑے گا۔ کیا تم اس کے بعد یہ سمجھو گے کہ بس ہم پچھلے پاؤں لوٹ جائیں' وہی پرانی جو ہماری تھی' وہ روشِ کہن اس کے اوپر چلے جائیں؟ چلے جاؤ خدا کا کیا بگاڑو گے۔ کہا کہ کسی شخصیت کے رہنے یا جانے سے فرق نہیں پڑے گا محمد ﷺ کی موت سے یہ نہیں ہو گا کہ تم کفر کی طرف لوٹ جاؤ۔ سنیے عزیزانِ من! يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَرُدُّوۡكُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ (3:149) اشخاص کے رہنے یا جانے سے نہیں اگر تم نے ان کی اطاعت کر لی کہ جو ہمارے ان قوانین سے انکار کرتے ہیں تو پھر تم اسی روشِ کہن میں چلے جاؤ گے پھر ایامِ جاہلیہ کی طرف لوٹ جاؤ گے تم۔ یہ تو نظام کی اطاعت کا سوال ہے اس نظام کو قائم رکھ کے اس کی اطاعت کرتے رہو گے تو کفر کی طرف جانے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ نام رکھتے ہوئے نسبتیں بھی اپنی رکھتے ہوئے اس نبی کی طرف اگر تم نے نظامِ کفر کی اطاعت قبول کر لی' پھر تم اسلام سے پہلی حالت کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ (3:149) پلٹ جاؤ گے تو ہمارا کیا بگڑے گا؟ پلٹ جاؤ گے' تم نقصان اٹھاتے ہوئے پلٹ جاؤ گے۔ پلٹتے جاؤ۔

صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کی حالتِ زار قابلِ افسوس بھی اور قابلِ غور بھی

عزیزانِ من! سوچیے تو سہی کہ ہماری تاریخ کیا ہے؟ کیا ہم نے وہی نہیں کیا جس سے قرآن نے اس طرح سے متنبہ کیا تھا ہمیں کہ اس کے بعد کفر کے نظام کی اطاعت نہ کہیں کر لینا۔ کبھی تجزیہ کر کے دیکھیے اپنے نظامِ زندگی کا ایک ایک شق اس میں آپ کو کفر کی ملے گی۔ نتیجہ اس کا؟ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ (3:149) جہاں دو مسلمان ملتے ہیں دنیا میں کسی خطے میں آپ جایئے' مسلمان جہاں دو ملیں گے' مرثیہ پڑھیں گے اپنی حالت کا۔ یہ ساٹھ ستر کروڑ قوم جو ہے رو رہی ہے مستقل طور پر۔ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ (3:149)۔ ثواب الاٰخرۃ تو گیا ہی تھا ثواب الدنیا بھی ان کے ہاں گیا' اس تقدیر کے مسئلے اور اس قسمت کے سوال نے ان کے ہاں تباہ کر کے رکھ دیا۔ مومن کا مقام نہیں تھا مقامِ آدم ہی نصیب رہتا صاحب۔ وہ یوں ختم کر دیا آپ نے' عقل و فکر سے کام لینا حرام اس قوم کے اوپر۔ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ (3:149)۔ اور اگر تم اس نظام کے تابع رہو گے بَلِ اللّٰہُ مَوۡلٰـکُمۡ وَھُوَ خَیۡرُ النّٰصِرِیۡنَ (3:150) تو پھر تمہارا سرپرست' خدا تمہارا رہنما ہوگا' وہ تمہارا مولا ہوگا اور وہ بہترین مدد دینے والا ہے۔ اس کے بعد وہ کرے گا کیا؟ ہوگا کیا؟ اب پھر وہی جنگِ احد کی داستاں جو ہے وہ آگے چل رہی ہے۔ وقت اگرچہ دو تین منٹ ہیں لیکن بات شروع کی تو وہ ختم نہیں ہوگی میں چاہتا یہ ہوں کہ وہ تسلسل سے بات ہو' اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ ہم آج سورۂ اٰلِ عمران کی آیت 150 تک آ گئے۔ عزیزانِ من! 151 سے اگلے درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

پچیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیت 151)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرک کی مختلف نوعیتیں اور ان کا حل

عزیزانِ من! آج مارچ 1967ء کی 22 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی آیت 151 سے ہوتا ہے:(3:151)۔

لفظ شرک کی وضاحت اور اس سے پیدا ہونے والے نفسیاتی نتائج کی مکمل شکل وصورت کا ذکر

سابقہ آیت کے آخری الفاظ یہ تھے بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ (3:150) صرف خدا ہی تمہارا سرپرست' پناہ دینے والا' آقا' مولا' حامی اور ناصر ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ج وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ط وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ (3:151) یوں تو قرآنِ کریم کی کونسی آیت ہے کہ جس کے اندر ادبی حقائق اور موعظتِ کبریٰ نہیں ہے۔ لیکن بعض آیاتِ جلیلہ ایسی ہیں کہ جن میں یہ قرآن کی تعلیم سمٹ کر مرکوز ہوگئی۔ اس میں ارتکاز ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور یہ جو آیہ جس کی تلاوت میں نے ابھی ابھی کی ہے اس کی یہی کیفیت ہے۔ پہلی آیت میں یہ کہا تھا کہ آقا وہی ہے۔ اس میں یہ کہا کہ وہ لوگ جو اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں ان کے دلوں کے اندر شرک کی وجہ سے خوف طاری ہوتا ہے۔

شرک کی بنا پر انسان کا دل خوف وحزن کی آماجگاہ بن جانے کی وجہ سے جرأت وشجاعت اور قلندری کی نعمت سے ہی محروم ہوجاتا ہے

بڑی غور طلب چیز ہے کہ یہ شرک سے دلوں میں خوف کیسے طاری ہوتا ہے؟ اور زیادہ غور طلب اس لیے ہے کہ ہم نے تو قرآنِ

کریم کی دیگر اصطلاحات کی طرح شرک کا مفہوم بھی اتنا ہی سمجھ لیا کہ کسی بُت کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا بس یہ شرک ہے۔ اور اگر اتنا ہی مفہوم لیا جائے تو بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان کے دل خوف اور ہراس کے مسکن کس طرح سے ہو سکتے ہیں؟ کیوں یہ بات ہے کہ بت پرستی کرنے والوں کے دل خوف کے نشیمن ہونگے۔ ان میں جرأتیں بیباک نہیں ہوسکیں گی، ڈرتے رہیں گے۔ شرک کا اگر قرآن کا مفہوم سامنے آ جائے تو پھر بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بیباکی اور جرأتیں اور شجاعتیں، بے خوفی اور قلندری صرف توحید کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ شرک سے واقعی انسان کا دل بزدلی اور حزن اور خوف کا نشیمن بن کے رہ جاتا ہے۔ شرک ہے کیا؟ بات ذرا پیچھے سے کرنی پڑے گی۔

خدا کے صحیح تصور کے اہمیت کے پیشِ نظر کائنات میں انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرنا ہے

دین کا سارا ماحصل یہ ہے کہ خدا کا صحیح صحیح تصور آپ کے سامنے آ جائے ورنہ خدا تو اس چیز سے بے نیاز ہے۔ **فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ** (3:97) کہ اس کا تصور ہم اپنے ہاں صحیح رکھتے ہیں یا غلط رکھتے ہیں۔ اس کا غلط تصور لوگ رکھیں گے تو اس کا کیا بگڑ جائے گا۔ صحیح تصور رکھیں گے تو اس کا کیا سنور جائے گا۔ صحیح اور غلط تصور تو بعد کی چیز ہے۔ اگر کوئی اس کا تصور ذہن کے اندر رکھے ہی نہ تو پھر بھی خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اور خدا تو اس وقت خدا تھا جب کوئی تصور رکھنے والا ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اور وہ اسی طرح سے اپنی ذات کے اندر پورا مکمل خدا تھا جب کوئی بھی اس کا ماننے والا موجود ہی نہیں تھا۔ کائنات میں کچھ بھی موجود نہیں تھا یہ تو اس نے بعد میں پیدا کی ہے۔ اس وقت بھی وہ خدا تھا۔ لہٰذا اس سے غرض و غایت جو ہے وہ یہ نہیں کہ خدا کا تصور ہم کس قسم کا قائم کرتے ہیں تا کہ خدا کا کچھ بگڑا ہوا کام بن جائے یا خدا کی بات صحیح طور پہ ہمارے سامنے آ جائے۔ خدا کا صحیح مقام اس لیے قرآن دیتا ہے، اس لیے اس کا صحیح تصور قرآن کی رو سے قائم کرنا ضروری ہے کہ اس سے انسان کا اپنا مقام متعین ہوتا ہے۔ دین کا مقصود انسان کے صحیح مقام کا تعین ہے۔ اور خدا کا صحیح تصور بھی اس لیے دیا جاتا ہے کہ اس کی رو سے انسان کا اپنا صحیح مقام کائنات میں متعین ہو جاتا ہے۔

شرک کے بالمقابل دین کی پوری تعلیم کا محور مقامِ انسانیت کو سمجھ لینے کے گرد گھومتا ہے

شرک، خدا کے متعلق اگر غلط تصور پیدا کرتا ہے تو یہ مقصود بالذات شئے نہیں ہے۔ اصل مقصد اس سے یہ ہے کہ اس سے انسانیت کا صحیح مقام نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور یہاں سے بات پھر آپ کی سمجھ میں آگے چل کر آئے گی کہ شرک سے جو خدا کا تصور بگڑتا ہے، اس سے انسان کا اپنا مقام بدل جاتا ہے۔ اور جب یہ مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے تو ہر قسم کا خوف اور حزن اس

کے اوپر طاری ہوجاتا ہے۔ دین کی بات خدا کی طرف سے لے کے انسان کی طرف آنے کی نہیں ہوتی۔ یاد رکھیے! دین کی بات انسان سے شروع کرنی چاہیے اور خدا کی طرف چلنا چاہیے۔ مقصود اس کا انسانیت کو اس کے مقام سے آگاہ، شناسا کرنا ہے اور اس کا صحیح تصور دینا ہوتا ہے۔

مقامِ آدمیت اور مقامِ انسانیت میں ایک بنیادی فرق ہے

مقامِ انسانیت کیا ہے؟ پہلے ہی پارے میں تخلیقِ آدم کے سلسلے میں پہلی بات تو اس نے یہ کہہ دی کہ تمام ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ ملائکہ تو 'م ل ک' کے مادے سے ہے جس کے معنی ''قوتیں'' ہیں۔ یہ جتنی قوتیں کائنات کے اندر ہیں وہ تو انسان کے سامنے جھکنے والی ہیں۔ اب اگر انسان کسی کائناتی قوت سے اپنے آپ کو فروتر سمجھتا ہے تو یہ مقامِ آدم پہ نہ رہا۔ اپنے مقام سے گر گیا پہلی چیز تو یہ ہے۔ اب رہے انسان تو وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) تمام نوعِ انسانی' تمام بنی آدم' ہر انسان کا بچہ یکساں طور پر واجب التکریم لہٰذا مساواتِ انسانیہ موجود ہے۔ جو اپنے سے نیچے ہے جو اپنا ساجد ہے جو تمہیں سجدہ کر رہا ہے اس کے سامنے جھک جانا' یہ تذلیل' توہین ہوئی۔ اور جو برابر کا ہے' اس کے سامنے جھکنا' یہ بھی تذلیلِ انسانیت ہوگئی۔ لہٰذا انسان کا کائنات کی کسی شئے' فطرت کی کسی قوت' کو اپنے سے بڑا سمجھ لینا' یہ پہلا شرک ہے۔ اپنے مقام سے گر جانے کی چیز ہے۔ میں ابھی شرک کی طرف آؤں گا۔ اور کسی انسان کے سامنے جو سب برابر ہیں' ان کے سامنے جھک جانا' ان میں سے کسی کی اطاعت اختیار کر لینا' یہ بھی مقامِ انسانیت سے گرنے والی بات ہے۔ جو برابر ہے اس کے سامنے جھکنا کیا معنی! اور جو اپنے سے کمتر ہے اس کے سامنے جھکنا تو اور بھی زیادہ ذلت ہے۔

کسی انسان کا اپنے سرکش جذبات کے سامنے جھک جانا ہی مقامِ انسانیت کی نفی ہے

تو اب اگر کسی کے سامنے جھکنا ہی نہیں' کسی کی اطاعت ہی نہیں تو یہ تو انارکی پیدا ہوجائے گی۔ اطاعت' پابندی تو ضروری ہے۔ باقی کون رہ گیا؟ کائنات کی ساری قوتیں اس سے فروتر' انسان سارے برابر' ایک ذات باقی رہتی ہے جسے خدا کہا جاتا ہے۔ انسان اگر صرف خدا کے سامنے جھکتا ہے۔ جھکنے کے معنی میں ابھی عرض کروں گا۔ اگر صرف ایک خدا کے سامنے جھکتا ہے تو وہ مقامِ انسانیت اس کا باقی رہتا ہے۔ اور اگر وہ اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت اختیار کرتا ہے تو مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ قرآن تو یہاں تک جاتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پست جذبات کی بھی اطاعت کرتا ہے' اس کے سامنے جھکتا ہے تو وہ

بھی مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔اس لیے کہ خود انسان کے اندر بھی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ایک تو وہی حیوانی زندگی کہ جہاں سے یہ ارتقا کرتے کرتے پیکرِ انسانیت تک زندگی پہنچی ہے۔اس میں اتنا بڑا حصہ ابھی حیوانیت کا ہی ہے۔اور ایک بلند سطح زندگی ہے جو انسانیت کی زندگی ہے۔کسی کائناتی قوت کے سامنے جھکنا یا دوسرے انسان کے سامنے جھکنا تو ایک طرف رہا' انسان کا اپنی ذات میں انسانی زندگی کا حیوانی زندگی کے سامنے جھک جانا' یہ بھی مقامِ انسانیت سے گر جانا ہے۔ایک ہی ایسی قوت رہ جاتی ہے' ایک ہی ایسی ہستی یا ذات رہ جاتی ہے جو انسان سے اونچی ہے۔جس نے اسے پیدا کیا' کائنات کو پیدا کیا' اس میں قوتیں عطا کیں۔ اسے خدا کہا جاتا ہے۔

مقامِ انسانیت کا شعور تو انسانی سوچ اور اس کے تصورات کو فلک بوس بلندیوں سے ہم کنار کر دیتا ہے

خدا کے متعلق یہ ماننا اور اس کے بعد وہ تمام چیزیں جو میں نے ابھی عرض کی ہیں یہ ماننا' اس سے انسان کا اپنا مقام متعین ہو جاتا ہے کہ کائنات میں اس سے کوئی اگر اونچی ذات ہے تو وہ صرف ایک خدا کی ذات ہے۔اس سے علاوہ انسان سے اونچا کائنات میں نہ کائنات کی کوئی قوت ہے' نہ کوئی دوسرا انسان کسی انسان سے اونچا ہے۔خدا انسان سے اونچا ہے۔جو فی الحقیقت اپنے سے اونچا ہے اس کے سامنے جھکنا یا اس کی اطاعت کرنا یہ تو اپنے مقام سے گرنا نہیں ہے۔یہ تو ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف ہے۔لیکن خدا تو ہمارے سامنے ہے نہیں۔یہ خدا کے سامنے جھکنا' اس کی اطاعت اختیار کرنا' یہ کس طرح سے ہوگا؟ اس کے لیے اس نے کہا کہ ہم نے کچھ قوانین تمہاری زندگی کے لیے تجویز کیے ہیں۔وہ قوانین نہ تو کائنات کی کسی شے کے بنائے ہوئے ہیں' نہ کسی انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ہم نے کچھ قوانین فطرت کی چیزوں کے لیے عطا کیے۔ان کا اطلاق تم پر بھی ہوتا ہے۔

قوانینِ فطرت کی اطاعت غلامی یا ذلت کا تصور پیدا نہیں کرتی

یہ کھانا پینا سونا افزائشِ نسل وغیرہ' یہ حیوانی زندگی کی چیزیں ہیں۔ان کے لیے بھی فطرت کے قوانین ہیں۔ہم جب ان قوانین کی اطاعت کرتے ہیں تو ہم کسی کی غلامی اختیار نہیں کرتے۔اگر ہم نیند کے وقت سوتے ہیں' بھوک کے وقت کھاتے ہیں' زندگی کے لیے سانس لیتے ہیں تو یہ ہم کسی کے سامنے جھکتے نہیں ہیں۔یہ اس لیے نہیں کہ ہم خدا کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں' یہ ہماری زندگی کا تقاضا ہے۔اسی طرح سے اس نے ہماری انسانی زندگی کے لیے بھی قوانین عطا کیے ہیں۔ان قوانین کی اطاعت کسی غیر کی اطاعت نہیں ہے' یہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے۔لہٰذا اطاعت اگر خدا کے قوانین کی' اس کے احکام کی' کی جائے تو یہ

انسانیت کے لیے وجہ تذلیل نہیں ہے' یہ اس کے زندہ رہنے کا تقاضا ہے۔

شرک کے بنیادی مفہوم کی ایک عملی اور محسوس تر واضح مثال

پھر اس مثال کو دہرادوں کہ اگر ہم سانس لینے سے کائنات میں ذلیل نہیں ہو جاتے تو اس نے جو ہمیں ہماری انسانی زندگی کے لیے قوانین دیے ہیں' ان کی اطاعت سے ہم اپنے مقامِ انسانیت سے گر نہیں جاتے۔ لیکن اگر اس اطاعت میں اس کے قوانین کے علاوہ کسی اور کی اطاعت بھی شامل کر لی جائے تو اسے شرک کہتے ہیں۔ شرک کے معنی ہیں احکام و قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کے حکم' قانون' کے سامنے جھک جانا اس کی اطاعت اختیار کر لینا۔ اس سے انسانیت اپنے مقام سے گر جاتی ہے۔ بت کے سامنے جھکنا تو جہالت ہے۔ وہ تو ذرا بھی خالص فکرِ انسانی اونچی ہو جائے اگر تو وہ اس میں دیکھ لے گی کہ یہ چیز تو جہالت اور توہم پرستی تھی جو ہم کر رہے ہیں۔ اس سے نکل جانا آسان ہے۔ وہاں تو خدا کا ماننے والا ایک طرف رہا Atheist نکل جاتا ہے وہاں سے۔ Atheist خالص اپنی فکر سے معاملات پہ غور کرتا ہے۔ یہ ہندوستان میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے یہ کہا تھا کہ گاؤ کی پرستش اور بتوں کی پرستش کیا ہے! تو وہ یہ نہیں کہ کسی وحی کی رو سے یہ کہا تھا۔

مغربی جمہوریت کا ایک حقیقت کشا تجزیہ

جہالت سے نکلنے کے لیے فکرِ انسانی کافی ہوتی ہے۔ لیکن جب اطاعت کا سوال سامنے آئے گا تو وہاں وہ تنہا فکر جو تھی وہ زیادہ سے زیادہ جمہوریت تک پہنچا سکی۔ جمہوریت کیا ہے؟ اپنے جیسے اکیاون آرا کی اطاعت انچاس آرا کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ ذلت اور کیا ہو گی۔ یہ اطاعت تو آپ فکری طور پہ بھی اختیار نہیں کرتے۔ یہ نہیں ہوتا کہ سوچنے سمجھنے کے بعد آپ کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! یہ بات ٹھیک ہے ہمیں مان لینی چاہیے۔ بالکل نہیں۔ اسی لیے تو اس نے یہ کہا تھا کہ

از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

تم اکیاون کہتے ہو! وہ کہتا ہے دو سو گدھا اکٹھا ہو جائے تو اس کی کثرت رائے سے جو فیصلہ ہو گا' کیا وہ کبھی ایک انسان کی فکر کے برابر بھی ہو سکتا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ تنہا فکر نہرو کو یہاں تو لے گئی کہ بت کے سامنے نہیں جھکنا' گائے کے سامنے نہیں جھکنا۔ ٹھیک ہے فکرِ انسانی یہاں تک لے جا سکتی ہے۔ تنہا فکر اس کی اس سے آگے نہ لے جا سکی کہ اکیاون کی رائے کے سامنے انچاس کا جھک جانا' یہ ٹھیک مقامِ انسانیت ہے؟ اسے کون بتاتا کہ یہ اس سے بدتر چیز ہے۔ بت اور گائے تو سامنے سے اپنا کچھ بھی نہیں منواتی

جوتم اپنے عقیدے سے مانتے چلے جاتے ہو' وہی مان رہے ہو۔ کیوں؟ وہ اس میں مجبور ہوتی ہے تم صاحبِ اختیار ہوتے ہو۔ اکیاون کی رائے کی سامنے جب تک جھکتے ہو تو اپنے اختیارات کو ہاتھوں سے سلب کر دیتے ہو اپنے۔ میں نے یہ مثال دی ہے۔

لفظ توحید کا بنیادی مفہوم صرف قوانینِ خداوندی کو تسلیم کرنے میں ہے اور اگر یہ نہ ہو تو وہ شرک ہے

اس مقام کے اوپر صرف خدا کی وحی کے ذریعے سے جو قوانین آپ کو ملے ہیں صرف وہ ہیں کہ جن کو آپ قوانینِ خداوندی کہتے ہیں۔ لہٰذا توحید کے معنی ہیں' خدا کے دیے ہوئے قوانین۔ اور وہ قوانین تو آج قرآن کے علاوہ کہیں ہیں نہیں۔ توحید کے معنی ہیں خالص قرآنِ کریم کی اطاعت۔ اور شرک ہے اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت۔ اور چونکہ قرآن کی رو سے سیاست اور مذہب یا دین اور دنیا میں تو کوئی فرق ہے نہیں لہٰذا یہ اطاعت آپ کی شریعت کے مسائل میں' The so called شریعت جسے کہتے ہیں جس کا تعلق دنیاوی امور سے نہیں بتایا جاتا تھا' اسکی اطاعت ہی نہیں' زندگی کے ہر گوشے میں جہاں بھی آپ قانونِ خداوندی کے خلاف کسی اور کی اطاعت کریں گے' وہ شرک ہوگا اور مقامِ انسانیت سے آپ اسی وقت گر جائیں گے۔ صاف ستھری پاکیزہ ہوا میں سانس لینا' توحید ہے۔ اس میں اگر کاربن مونو آکسائیڈ مل جاتی ہے' اس قسم کی کوئی گیس مل جاتی ہے تو اس کی سانس جب آپ لیتے ہیں تو یہ شرک ہوتا ہے۔ آپ دیکھنا کس طرح آپ کے اندر تلملاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ احساس اس لیے ہے کہ ہم نے اپنی حیوانی زندگی ہی کو زندگی سمجھا ہے۔ وہ تو محسوسات کی زندگی ہے' ہم جلدی محسوس کر لیتے ہیں۔ لیکن جب ہم قانونِ خداوندی جو ہماری زندگی سے متعلق ہے' اس میں دنیا بھر کی کاربن مونو آکسائیڈ اور کیا کیا گیسز اکٹھی کرتے چلے جاتے ہیں' اس کا کبھی احساس نہیں ہوتا کہ زہریلا مادہ ہے جو ہمارے پھیپھڑوں میں چلا جا رہا ہے۔ یہ شرک ہے۔

عزیزانِ من! شرک ہے خدا کے احکام کی اطاعت میں کسی اور کی اطاعت کو شامل کرنا۔ آیئے اس تمہید کے بعد قرآن کی طرف کہ قرآن یہی کہہ رہا ہے۔ یہاں لفظ ہے وَّ لَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا (18:110) میں لفظِ عبادت کے متعلق بڑی تفصیل سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کے معنی پرستش نہیں ہے۔ اس کے معنی اطاعت ہے۔ صحیح مقامِ انسانیت کے متعلق کہا کہ جسے دوسرے لفظوں میں مقامِ مومن کہا جاتا ہے۔

آدمی' انسان اور مقامِ مومن کا باہمی فرق

سمجھ لیجیے کہ فطرت کی قوتیں جب کسی کے سامنے جھکتی ہیں تو مقامِ آدم ملتا ہے' وہ آدمی کے مقام پہ آ جاتا ہے۔ اور وہ بات تو

بڑی ٹھیک کہہ گیا تھا کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مقامِ مومن یہ ہے کہ فطرت کی قوتیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہوں اور یہ خدا کے قوانین کے سامنے جھکا ہوا ہو۔ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے کا نام' اس کی اطاعت کا نام' عبادت ہے۔ عبدیت کے معنی ہی ہیں کسی کا عبد ہو جانا' کسی کا بندہ ہو جانا' کسی کا غلام ہو جانا۔ کہا وَّ لَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18:110) خدا کی اطاعت میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ اور خود خدا کے متعلق یہ کہا کہ وَّ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) دیکھیے عبادت کا ترجمہ حکم ہو گیا یہاں۔ وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ تو آپ نے دیکھا کہ عبادت اور محکومیت دونوں مرادف الفاظ ہیں۔ خدا اپنے حاکم ہونے میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا اور تم اس کے محکوم ہونے میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ خدا کی محکومیت کس طرح اختیار کی جائے گی' اس کی حاکمیت جسے ہم کہتے ہیں کہاں سے معلوم ہو گی کہ اس کی حاکمیت کیا ہے؟ جیسا میں نے عرض کیا کہ خدا تو ہمارے سامنے ہے نہیں اس کی حاکمیت کا کہاں سے پتا لیں۔ (6:115)

مقامِ انسانیت کے حصول کے لیے نبی اکرم ﷺ کی زبانی قرآنِ حکیم کا ارشاد اور وہ یہ کہ خدا کی کتاب کو حاکم تسلیم نہ کرنے والے کافر ہیں (5:44)

عزیزانِ من! بڑی غور طلب آیت ہے۔ تصور بدل دیتی ہے یہ دین کا' تصور بدل دیتی ہے انسانیت کے مقام کا۔ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا (6:114) نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہو رہا ہے کہ کیا میں خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنا حاکم' خالق' حَکَم مقرر کروں یا تلاش کروں' تم یہ چاہتے ہو۔ سوال پیدا ہوا کہ پھر یہ کیسے چیز ہو گی؟ عزیزانِ من! سنیے اس کا جواب۔ وَّ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (6:115) درآں حالیکہ اس نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کر دی ہے کہ ہر بات کو نکھار کر ابھار کر بیان کر رہی ہے۔ کیا اس کی موجودگی میں' میں کسی اور کو حاکم تسلیم کروں۔ معلوم ہو گیا کہ خدا کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اس کی کتاب کو اپنا حاکم تسلیم کر لینا۔ تو اسی لیے کہا کہ وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) جو بھی ما انزل اللہ' خدا کی کتاب کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتا ہے' انہی کو تو کافر کہا جاتا ہے۔

انسانیت کے لیے قرآنِ حکیم ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ہر طرح سے محفوظ ہے

یہاں خود رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ بات ہے۔ اور اسی کتاب کو کہا کہ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ. وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (6:114-115) عزیزانِ من! یہاں آیا ہے یہ۔ یہ کتاب اس نے نازل کی، جن امور کی اطاعت تم سے کرانی تھی، جو قوانین تمہاری زندگی کے لیے اس نے دینے تھے، اس میں مکمل کر کے دیدیئے۔ صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اس میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں ہے۔ مکمل، غیر متبدل، محفوظ، قوانینِ خداوندی۔ جن کی اطاعت کا نام خدا کی عبدیت تھا، جن کو مان لینے کا نام خدا کی حاکمیت کا اقرار تھا۔ وہ اس کتاب کے اندر آ گئے، مکمل ہو گئے، غیر متبدل ہو گئے۔ اب توحید نام ہو گیا خدا کی اس کتاب کے قوانین و احکام کی اطاعت اور شرک نام ہو گیا اس میں کسی اور کی اطاعت کا شریک کرنا۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے انسان کا مقام کیا ہو گیا! کائنات کی قوتوں کے سامنے جھکنا تو ایک طرف رہا، وہ تو جہالت تھی۔ دنیا میں کسی انسان کے حکم کے سامنے بھی یہ نہیں جھکتا اس کی اطاعت نہیں اختیار کرتا۔

انسانوں کی آزادی کا راز اس میں ہے کہ وہ کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون کے سامنے نہ جھکیں

عزیزانِ من! اسے مساواتِ انسانیہ کہتے ہیں۔ اب اس کے سامنے سند اور حجت کسی انسان کا قول نہیں۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کو وہ یہ کہے کہ وہ اس کا عبد بن جائے۔ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ خدا اس کو نبوت اور کتاب اور حکومت بھی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ کسی انسان سے یہ کہے کہ تم میرے عبد بن جاؤ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کیا مقامِ انسانیت دے رہا ہے قرآن! توحید کے معنی کیا ہیں! شرک کہتے کس کو ہیں! قرآن نے مختلف مقامات پر یہی تفصیل ہے جو بیان کی ہے۔ سورۃ یوسف میں وعظِ یوسفؑ دیکھیے۔ کس حسین انداز سے بات ہو رہی ہے۔ جیل خانے کی کوٹھڑی کے اندر ایک توحید کا جاننے والا، توحید کا مبلغ اپنے ساتھی قیدیوں سے یہ کہہ رہا ہے۔ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ (12:39) اے میرے قید خانے کے ساتھیو! ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ (12:39) کہو! بہت سے آقاؤں کی غلامی اختیار کر لینا یہ بہتر ہوتا ہے یا ایک خدا کے احکام کی، قوانین کی، اطاعت کرنا بہتر ہوتا ہے۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ

وَاٰبَـــآؤُكُـــمْ (12:40) اس کے سوا کسی اور کے سامنے جو تم جھکتے ہو ان میں کوئی اختیار و اقتدار اپنا ہے نہیں۔ تم نے اپنی توہم پرستیوں سے اعتقادات کی بنا پر ان کے لیے کچھ نام تجویز کر لیے ہیں۔ کچھ تمہارے آباؤ اجداد نے تجویز کر لیے تھے' کچھ تم نے تجویز کر لیے ہیں۔ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط (12:40) عزیزان من! سُلْطٰنٍ ط (12:40) کا لفظ اس آیت میں بھی آیا ہے جس سے آج درس کا آغاز ہوا ہے۔ میں سُلْطٰنٍ (12:40) کے معنی ابھی آگے چل کے بیان کروں گا۔ اس کے لیے خدا نے کوئی دلیل نہیں نازل کی اور توحید کیا ہے؟ اِنِ الْـحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط (12:40) محکومیت خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہے۔ اَمَرَ اَلَّا تَـعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّـاهُ ط (12:40) دیکھیے! پھر یہاں عبادت آیا ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ میرے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ سنتے ہیں آپ آگے کیا بات آئی ہے؟ آگے یہ ہے کہ ذٰلِكَ الـدِّيْـنُ الْقَيِّمُ(12:40) یہ ہے دینِ قیم۔ وہ اطاعت کہ جو تمہیں اپنے مقامِ انسانیت میں محکم کر کے رکھ دے گی۔ دینِ قیم ہے جس سے تم مقوّم ہو سکتے ہو وہ تمہارے قیام کا باعث بن سکتا ہے۔ افوہو! زمین پہ گری ہوئی پیشانیوں کو کس طرح سے اٹھا کے کھڑا کر دیا ہے۔ ذٰلِكَ الـدِّيْـنُ الْـقَيِّمُ(12:40) یہ ہے دینِ قیم۔ وَلٰـكِـنَّ اَكْـثَـرَ الـنَّـاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (12:40) یہ جہالت ہے جس کی بنا پہ لوگ اس کی طرف نہیں آتے۔ لَا يَـعْلَمُوْنَ (12:40) آپ دیکھیے کہاں لایا ہے قرآن۔

توحید کی ثمر باری کے برعکس مختلف انسانوں کی غلامی کی اذیت ناکیوں کی ایک سبق آموز مثال

آپ نے غور فرمایا کہ یہ توحید کے معنی کیا ہو گئے؟ اسی کے متعلق دوسری جگہ بڑی خوبصورت مثالوں سے بات سمجھائی ہے۔ کہا کہ ضَـرَبَ الـلّٰـهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْـهِ شُـرَكَـآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ط هَـلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ط (39:29) کہتا ہے ذرا سوچو تو سہی اس مثال کو کہ ایک شخص ہے دس آقاؤں کا ملازم۔ اور انسان تو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں' مزاج سے مختلف' جذبات سے مختلف' مقاصد ان کے الگ الگ' ان کے کام الگ الگ۔ دس آدمیوں کا ایک نوکر۔ کسی گھر میں جہاں ہر ایک کو' میاں کو' بیوی کو' بچوں کو' اس کی اجازت ہو کہ وہ اپنا اپنا کام نوکر سے کرا لیا کریں۔ اس میں ایک نوکر کو چھوڑ دیجیے اور پھر اس کے بعد دیکھیے کہ اس کا حشر کیا ہوتا ہے۔ ایک وہ کہ جو اتنے لوگوں کا ملازم ہو اور مُتَشٰكِسُوْنَ (39:29) کیفیت ان کی یہ ہو کہ ہم آہنگ بھی نہ ہوں مختلف مزاج رکھنے والے مختلف مقاصد' مختلف مطامع نگاہ' مختلف نصب العین حیات' مختلف اپنے مفاد' مختلف جذبات۔ ان کے اندر گھرا ہوا ایک نوکر اور دوسرا سَـلَـمًـا لِّـرَجُـلٍ (39:29) ایک ہی شخص کا ایک ملازم۔ هَـلْ يَسْتَـوِيٰنِ مَثَلًا ط (39:29) کیا ان دونوں کی کیفیت ایک جیسی ہو جائے گی؟

شرک کے خوگر انسانوں کی نفسیاتی کیفیت اور ان کی عملی زندگی کی تصویر کشی

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (39:29) اکثریت تم یہ دیکھو گے کہ جہالت کے اندر ڈوبی ہوئی ہے۔ یہاں یہ چیز کہی اور اس کے ساتھ ہی یہ مختلف آقاؤں کا ذکر کرنے کے بعد' یہیں اسی سورۃ میں کہا کہ اس کے بعد جب انسان شرک کا خوگر ہوتا ہے تو ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ ج (39:45) کہ جب انہیں صرف خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی ہے' اس اکیلے خدا کی اطاعت تو ان کی عجیب کیفیت دل کی ہو جاتی ہے' تنگ پڑ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ کیا بات ہوگئی! ایسا نہ کسی طرح سے ہو۔ عجیب کیفیت ان کے دل کی ہوتی ہے۔ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِذَا هُمۡ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (39:45) خدا کے علاوہ کسی اور کا بھی ساتھ اس کے ذکر کرو تو باچھیں کھل جاتی ہیں' سبحان اللہ! بات ہوئی ناں صاحب! اب بات کی ناں تم نے' حضرت صاحب کا نام ساتھ لینا چاہیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک سے زیادہ انسانوں کی ملازمت کا جب خوگر ہو جاتا ہے تو کہا اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جب اسے اس کے صحیح مقام سے آشنا کرایا جاتا ہے' اسے اٹھا کے بلندیوں پہ لے جایا جاتا ہے تو وہ چونکہ خوگر ہو چکا ہوتا ہے پستیوں کا' خاک کے اندر رینگنے کا۔ یہ مقام جو ہے وہ پاتا یہ ہے کہ جیسے یہ اس کے لیے مساعد نہیں' ناساز گار سا مقام ہے۔ وہ پنجرے کے اندر مدتوں تک رہنے والا تیتر' وہ قفس کا خوگر ہو چکا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا' اب تو شاید نہیں ہوتے' ہندوؤں کے زمانے میں ہوتا تھا۔ صبح کے وقت وہ جاتے تھے پنجرہ بند ہاتھ میں' تیتر کو کھلا چھوڑا ہوا ہے۔ جنگل کے دوسرے تیتر اسے آوازیں دے رہے ہیں کہ کمبخت! تیرا مقام تو یہ ہے تُو کدھر جا رہا ہے اس کے اندر۔ وہ ان کی آواز نہیں سنتا۔ زور کی آواز آتی ہے تو تیزی سے پنجرے کی طرف بھاگتا ہے۔ پنجرے کے اوپر جا بیٹھتا ہے' چونچیں مار مار کے اس کا دروازہ کھولتا ہے خود۔ شرک کا خوگر جب ہو جاتا ہے انسان تو اس کے بعد ایک خدائے واحد کی طرف کی دعوت جو ہے' اس کی یہی کیفیت پیدا کرتی ہے جو اس پنجرے کے خوگر قفس کے خوگر پرندے کی کیفیت ہو جاتی ہے۔

نہ تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ جو چیز اس نے کہی ہے کہ ایک خدا کا ذکر جو ہے اس کے دل میں کتنی تلملاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ عادت ہو جانے کی بات ہے ناں۔ یہ ڈالڈا کھاتے کھاتے ہماری کیفیت یہ ہوگئی کہ اگلے دنوں کہیں سے کوئی شخص ہماری بدقسمتی سے خالص گھی لے آیا تھوڑا سا۔ وہ اب تو وہ نسخوں میں آتا ہے گھی۔ وہ کہیں انہوں نے ڈال لیا تو سارے بچوں کو کھانسی لگ گئی۔ آمیزوں کی خوگر جب ہو جاتی ہیں

طبائع تو پھر خالص شے جو ہے اس سے ہمیں کھانسی آنے لگ جاتی ہے۔قومیں جب شرک کی عادی ہوجاتی ہیں تو پھر وہ اطاعتِ واحد جو ہے اس سے ان کو تپ دق ہونے لگ جاتی ہے۔اصل یہ ہے کہ وہ اس قدر جادو کر دیتے ہیں ان کے سروں کے اوپر وہ جو سامری ہیں۔

شرک کی ماری افیون زدہ قوم کی زبوں حال زندگی کا ذکر

عزیزانِ من! سامری کے معنی داستانوں میں الجھانے والا ہے۔وہ ان کو اس طرح سے ان داستانوں میں الجھاتے ہیں کہ وہ ان کے افیون کے اندر' اس نشے کے اندر ہر وقت مست رہنا چاہتا ہے۔اس نشے سے اس کو بیدار کیا جاتا ہے تو وہ اس زندگی کو غیر فطری زندگی سمجھتا ہے۔پھر دوڑتا ہے بھاگتا ہے کہ پھر کہیں سے افیون کی وہ گولی اس کو مل جائے۔یہ جس کو خدا کے ساتھ خدائے واحد کا نام جب لیا تھا تو اس قدر وہ بھنا اٹھتا تھا۔دوسری جگہ یہ ہے کہ یہ خدائے واحد کے نام کے معنی کیا ہیں۔عزیزانِ من! میں بار بار یہ کہتا ہوں کہ قرآن سمجھنا ہو تو تصریفِ آیات سے سمجھیے۔ایک مقام پہ جو ایک بات کہی ہے' دیکھیے دوسرے مقام پہ اس کی تفسیر کیا بیان کرتا ہے۔قرآن کی ہر آیت کی تفسیر وتشریح آپ کو قرآن کے اندر مل جائے گی۔قرآن روشنی ہے' روشنی اپنے دکھانے کے لیے کسی غیر کی محتاج نہیں ہوتی۔وہ ہر ایک کو راستہ دکھائے گی۔خود اپنی ذات کے اندر وہ روشنی ہوتی ہے' اسے کسی دوسرے کی فکر کی احتیاج نہیں ہوتی۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ قوانین میں انسانی قوانین کی آمیزش شرک کے مترادف ہے

قرآن نے پہلے یہ کہا کہ جب خدا کے علاوہ دوسروں کی دعوت انہیں دی جائے تو اس سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔واحد خدا کی طرف بلایا جائے تو غم زدہ ہو جاتے ہیں۔اور اس کی تفسیر یہ ہے کہ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (17:46) قرآن میں جب یہ خدائے واحد کا ذکر آتا ہے ان کو دل کے اندر نفرت کا عجیب ری ایکشن پیدا ہوتا ہے۔بھاگتے ہیں کہ ان کو آمیزش شدہ گھی چاہیے' ان کو خالص چاہیے ہی نہیں ہے۔قرآن یہاں آ گیا۔وہاں صرف خدا کہا تھا۔دیکھا پھر قرآن کی طرف خدا کیسے لایا ہے۔اطاعت اس کے قوانین کی جواب قرآن کے اندر ہیں' صرف قرآن کے اندر ہیں' قرآن کے باہر کہیں اور نہیں ہیں۔غیر آمیزش شدہ خالصتاً اس کے قوانین صرف اس کے اندر ہیں۔شرک کا خوگر انسان اس سے مطمئن نہیں ہوتا' وہ اس میں آمیزشیں چاہتا ہے۔عزیزانِ من! جب اس میں آمیزشیں چاہے گا اگر جہالت ہے تو فطرت کی ان

قوتوں کے سامنے جھکے گا۔ عہدِ جہالت کے اندر انسان نے فطرت کی قوتوں کو دیوی دیوتا بنایا۔ دریا کو کہیں دیوی بنایا' پہاڑ کو دیوتا بنایا' آگ کو بنایا' بادل کو بنایا' کڑک کو بنایا' گرج کو بنایا' گائے کو بنایا' دھرتی کو بنایا۔ ہم اس کے اوپر ہنستے ہیں۔

کسی غلط سوچ کی بنا پر اختیار کردہ انسانوں کی اطاعت کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں

جیسا میں نے عرض کیا ہے وہ عدمِ علم تھا' جہالت تھی۔ علم کی روشنی آ لینے کے بعد یہ چیزیں خود بخود محو ہو جاتی ہیں۔ محو ہو گئیں۔ لیکن جب ان کی جگہ آپ انسانوں کو اپنا خدا بنا لیں یہ ہے وہ چیز جو عقیدے کی شکل اختیار جب کر لیتی ہے' دلوں سے نکلتی نہیں ہے۔ شرکِ عظیم یہ ہے کہ آپ خدا کے قوانین واحکام کی جگہ انسانوں کی اطاعت شروع کر دیں۔ اب آپ ذرا غور کر کے دیکھیے۔ جن قوموں کے شرک کے اوپر آپ ہنستے تھے' وہ اپنے شرک سے خالص علم اور فکر کی بنا پر نکلتی جا رہی ہیں اور نکل گئی ہیں۔ لیکن آپ اپنی قوم کو ذرا دیکھیے تو سہی۔ سب سے بڑی دنیا میں توحید کی مدعی قوم' سب سے زیادہ شرک کے اندر گھری ہوئی قوم۔ شرک کی وہ Definition جو اس نے کہی کہ جب خدائے واحد کی اطاعت کی طرف ان کو دعوت دیجیے تو دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ اور الدین کی جگہ اور انسانوں کو ساتھ ملایئے تو هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45) باچھیں کھل جاتی ہیں آہاہا ہا! بات کی ناں صاحب۔

ختم نبوت کے تصور کو عملی طور پر اپنانے کا طریق

میں نے غالباً پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ ختمِ نبوت کے معنی یہ تھے کہ اب دین کے معاملے کے اندر کسی انسان کا قول کوئی سند اور حجت نہیں ہوگا۔ ہر چند نبی کے آنے پہ بھی اطاعت کے متعلق خود نبی بھی یہ کہتا تھا۔ ابھی ابھی جو میں نے آیت تلاوت کی۔ خود رسول اللہ ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کیسے کروں درآں حالیکہ اس نے کتاب نازل کر دی ہے۔ نبی خود دعوت دیتا تھا کتاب ہی کی اطاعت کی۔ لیکن بہرحال اس میں ایک شائبہ تو تھا ناں کہ ایک انسان ہے ہمارے سامنے۔ سابقہ انبیاء کی امتوں نے اس کے بعد نبی کو خدا بنایا۔ اس میں ایک شائبہ تھا اس جہالت کا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق ایک وقت جب انسانیت کے بالغ ہو جانے کا آیا۔ اتنی سی شخصیت کا شائبہ جو تھا اس کو بھی ختم کر دیا ختمِ نبوت کے ساتھ کہ انسان اس کے بعد شرک میں مبتلا ہو کر مقامِ انسانیت سے نہ گر جائے۔ اطاعت صرف قوانین کی رہ گئی۔ قوانین صرف قرآن کے اندر محفوظ کر کے دیدیئے گئے۔ تَمَّتْ مکمل' غیر متبدل۔

انسانوں کی اطاعت کے سلسلہ میں فریب دہی کا عمل اوراس کے اثرات

عزیزانِ من! اب اس کے ساتھ کسی انسان کی اطاعت کا جو ساتھ شامل کرنا ہے' یہ شرک ہے۔اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ اسے دین میں سند اور حجت قرار دینا۔عجیب عجیب قسم کے پھر فریب اس میں دیئے جاتے ہیں کہ صاحب! یہ اپنی اطاعت نہیں کرا رہے' یہ بھی تو قرآن ہی کی اطاعت کراتے ہیں' خدا کے حکم کی اطاعت کراتے ہیں۔ٹھیک ہے اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہتا ہے کہ مثلاً زنا حرام ہے اور وہ قرآن کی آیت آپ کے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ اپنی اطاعت نہیں کراتا' قرآن کا ایک حکم آپ کے سامنے لاتا ہے۔ یہ اُس کی اطاعت نہیں ہے۔لیکن جب آپ قرآن کی سند سے نہیں بلکہ کسی شخص کے اپنے قول سے اس کی اطاعت شروع کرتے ہیں اور اس کو ایک حجت مان لیتے ہیں وہ اس شخص کی اطاعت ہے اور یہ شرک ہے۔اب اس کے اندر جیسا میں نے عرض کیا ہے عجیب قسم کے فریب آئے۔صاحب! پہلے تو تفسیر آئی۔قرآن کی آیت اوپر لکھی ہوئی ہے جیسے 786 خط کے اوپر لکھا جاتا ہے اور نیچے سارے اپنے انسانی خیالات ہیں۔عزیزانِ من! قرآن کی تفسیر کے معنی یہ ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں اگر آپ کچھ کہیں تو قرآن سے اس کی سند لائیے۔سمجھا سکتے ہیں آپ دوسری دلیلوں سے۔خدا نے بھی تو اپنے قوانین کو مختلف دلائل سے سمجھایا ہے۔کارگہٗ کائنات کے نظم ونسق کے دلائل سے' امم سابقہ کی تاریخ کے دلائل سے' فکری طور پر منطقی دلائل سے۔لیکن یہ سمجھانے کا انداز ہے۔اطاعت اس قانون کی ہوگی۔سند صرف خدا کی کتاب ہوگی۔

قرآنِ حکیم جیسی کتابِ مبین کے متعلق باطنی معنی کا وہ غیر قرآنی عقیدہ جس نے اس قندیلِ آسمانی کے حقیقی مفہوم کو ہی اوجھل کر دیا

اس کے بعد اور عقیدہ آگے چلا آیا کہ قرآن کے باطنی معنی ہیں۔الفاظ کے معنی نہیں ہیں۔قرآن کہتا رہے کہ لسانِ عربیِ مبین کے اندر میں آیا ہوں۔زبان ہے یہ عربی کی جس میں میں آیا ہوں۔انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ تو استخواں ہیں' ہڈیاں ہیں۔ وہی مشہور شعر مثنوی کا کہ

ماز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیشِ سگاں انداختم

(معاذ اللہ)

قرآن کا مغز ہم نے لے لیا ہے یہ تو ہڈیاں ہیں جو ان لوگوں کے سامنے پھینکی ہوئی ہیں۔مغزِ قرآن کے معنی ہیں قرآن کے باطنی معنی ہیں کچھ۔یعنی ان کا تعلق ان الفاظ سے ہے ہی کچھ نہیں۔

باطنی علم کا تمام تر دارومدار نبوت کی مہر کو توڑتے ہوئے براہِ راست خدا سے ہم کلام ہونے پر ہے۔

کیسے معلوم ہوئے صاحب! یہ معنی؟ یہ ہے وہ عقیدہ عزیزانِ من! جیسا میں نے اس دفعہ بھی کہا تھا پھر دہرا دوں اس چیز کو کہ جس نے نبوت کی مہر کو توڑ دیا اس کے دروازے کو چوپٹ کھول دیا اور انسانوں کو عظیم شرک کے اندر مبتلا کر دیا۔اور عقیدہ یہ کہ صاحب! یہ خدا سے علم پا کر براہِ راست بات کرتے ہیں۔چلیے! اس سے بڑی انسان پرستی اور کیا ہوسکتی ہے عزیزانِ من! کسی شخص کا یہ کہنا کہ وہ خدا سے براہِ راست ایک علم پا رہا ہے اور تم سے اس کی اطاعت کرا رہا ہے' شرکِ عظیم ہے۔خدا سے علم پانا جو تھا وحی کے ذریعے سے صرف ممکن تھا۔ختمِ نبوت کے معنی ہیں یہ طریقِ علم ختم ہوگیا کیونکہ ختمِ نبوت کے بعد اس طریق کو اگر آپ جائز قرار دیتے ہیں تو آپ کو انسانوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔مجھے کیا معلوم ہے اس چیز کا کہ یہ کیسے کہہ رہا ہے۔اور جب میرا ایمان ہے کہ نبوت ختم ہوگئی ہے' وحی حاصل کرنے کا وہ طریق ختم ہوگیا ہے تو پھر کسی کے متعلق کسی کا یہ دعویٰ کہ میں خدا سے علم پا کے تم سے اپنی بات منواتا ہوں۔یہی تو انسان پرستی ہے۔

خاصۂ نبوت کے برعکس انسانی علم کی وسعت صرف حواسِ خمسہ کے علاوہ کسی باطنی یا الوہیاتی کیفیات کی حامل نہیں ہوتی

عزیزانِ من! میں بات سمجھا دوں بڑی اہم بات ہے یہ۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ صلاحیتیں دی ہیں' حواس: دیکھنا' سننا' سمجھنا۔یہ Senses ان کو کہتے ہیں اس کے ذریعے سے آپ کو معلومات ملتی ہیں۔وہ معلومات آپ لے جاتے ہیں اپنے اندر جسے Mind کہا جاتا ہے۔عام طور پہ دل یا دماغ یا فکر کچھ کہہ لیجیے۔ایک صلاحیت ہے آپ کے اندر وہ پھر آپ کو کسی نتیجے پہ پہنچاتی ہے۔جب آپ گولی کی آواز سنتے ہیں' کان میں ایک آواز آئی۔اندر آپ کے ایک صلاحیت ہے جس نے یہ کہا کہ بندوق چلی ہے۔پھر آپ چیخ کی آواز سنتے ہیں آپ نے دیکھا کچھ نہیں' ایک آواز سنتے ہیں۔اندر ایک چیز ہے جو کہتی ہے کہ کسی کو گولی لگی۔یہ صلاحیتیں ہیں انسان کو دی گئیں علم حاصل کرنے کی۔قرآن نے علم کی Definition یہ دی ہے وَ لَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿17:36﴾ علم کی Definition یہ ہے کہ

Senses کے ذریعے سے معلومات حاصل کرو اور Mind جو ہے اس تک پہنچا کے کسی نتیجے تک پہنچے۔ اسے علم کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی چیز نہ باطنی ہے، نہ الوہیاتی ہے، نہ آسمان کی ہے، نہ زیرِ زمین کی ہے۔ ذریعۂ علم یہ ہے قرآن کی رو سے۔ اس میں صرف ایک استثنا یا ایک Exception ہے بہت بڑی Exception ہے اور Exceprtion تھی وحی کی۔ نبی اس طریق سے علم نہیں حاصل کرتا، جسے وحی کہتے ہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے وہ بھی اسی طرح سے حاصل کرتا تھا۔ ایک Exception تھی اس کے اندر کہ وہ معلومات حواس یا Senses کے ذریعے سے Perceptually چیزیں اکٹھی کرنے کے بعد کسی فکری نتیجے پہ خود نہیں پہنچتا تھا وہ اس سے اپنے Concept نہیں تیار کرتا تھا۔ عزیزانِ من! اسے Perceptual اور Conceptual Knowledge کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کرتا تھا بلکہ ایک علم براہِ راست اس کو خدا کی طرف سے ملتا تھا۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنا، اسے وحی کہا جاتا تھا اور یہ تھی Exception۔ اور اس کا نام تھا نبوت، اس طرح سے علم حاصل کرنا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے اوپر ختم کر دیا۔ یہ ذریعۂ علم ختم ہو گیا، اس کا امکان ختم ہو گیا۔ اب اگر اس کے بعد کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا ہے تو وہ وہی بات کہتا ہے جو نبی کہتا تھا۔ یہ وہی چیز ہے جسے وحی کہتے ہیں۔ الفاظ اس کے بدل لیجیے۔ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ (12:40) نام ہیں جو تم نے رکھ لیے۔ کچھ تمہارے بڑوں نے رکھ لیے، کچھ تم نے رکھ لیے۔

شخصیت پرستی کی پہچان یہ ہے کہ کسی انسان کی کہی ہوئی بات کو وحی کے درجے تک تسلیم کر لیا جائے

عزیزانِ من! شخصیت پرستی کی انتہا یہاں آ کے ہو جاتی ہے۔ میں بات آپ سے کچھ کہتا ہوں دین کی۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے آپ نے کہی۔ میں اگر قرآن کا مدعی ہوں یعنی قرآن پیش کرنے یا سمجھنے کا تو میں قرآن کی کوئی آیت آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اہلِ حدیث بات کرتا ہے آپ اس سے پوچھتے ہیں وہ کوئی حدیث پیش کرے گا۔ اہلِ فقہ کوئی بات کرتا ہے وہ اپنے کسی امام کی فقہ پیش کرے گا۔ اس میں اطاعت ان کی نہیں ہو گی بہر حال وہ اطاعت اوپر کسی جا کے شخصیت کی کرائے گا۔ یہ شخص جو کہتا ہے میں براہِ راست خدا سے علم پاتا ہوں، اس سے آپ پوچھتے ہیں تو وہ کسی کی سند نہیں دیتا، وہ کہتا ہے میں براہِ راست خدا سے علم پاتا ہوں۔ وہ اسے اپنی بات کہہ کر نہیں منواتا۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ تھے کہ یہ چیز ختم کر دی گئی ہے۔ اب کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ قرآن کی سند کے بغیر یہ کہے کہ میں خدا سے براہِ راست علم پاتا ہوں۔

ذکرللعالمین کے لغوی اور قرآنی مفہوم کے سلسلہ میں قرآنی حقائق سے باخبر ہونے کا طریق

یہ چیز کہ صاحب! قرآن کے سمجھنے کا علم براہِ راست خدا سے پاتا ہوں' یہ پھر قرآن کے خلاف ہے۔ خدا کی کتاب اگر ایسی ہے کہ کتاب اس نے نازل کی پھر اس کے بعد سمجھانے کے لیے بھی اپنی ہی طرف سے وضاحت دیتا چلا جا رہا ہے اور مامور من اللہ ہے کہ یہ بات کوئی سمجھے گا اور نہیں سمجھے گا۔ واہ بھئی واہ! عجیب کتاب ہے۔ اس کے تو معنی یہ ہیں کہ مجھے اپنی ہر کتاب کے ساتھ جانا چاہیے کہ کتاب میری جو ہے' میں ہی سمجھا سکتا ہوں۔ یا جو مجھ سے سمجھے گا' وہ سمجھا سکتا ہے۔ اور اسے کہا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لیے ذکرللعالمین ہے۔ نوعِ انسانی کی طرف بصائر ہیں۔ ہر انسان کو کہا ہے کہ فکر کرو' غور کرو' تدبر کرو' تعقل سے کام لو' شعور سے کام لو۔ وہ کہتے ہیں شعور' عقل' فکر' تدبر' سب یہاں گم ہیں۔ یہاں تو یہ ہے کہ خدا تمہیں سمجھائے گا قرآن کے معنی کیا ہیں۔ ہم تم سے کہیں گے وہ تمہیں ماننا پڑے گا۔ نہ دلیل' نہ سند' نہ حجت' نہ منطق' نہ فکر' نہ تعقل' نہ شعور' کچھ نہیں۔ سب کے دیے گل کرو' میری بات مانو۔

قرآنِ حکیم کی سند کے بغیر اگر پوری دنیا بھی کسی اصول پر متفق ہو جائے تو وہ بھی جمہوریت نہیں کہلا سکتی

عزیزانِ من! اس سے بڑا شرک کوئی نہیں۔ یہی چیز آپ کے ہاں سیاست کے اندر آئی۔ ایک بادشاہ کا حکم مانو۔ شرک ہے۔ جمہوریت میں اکیاون نہیں' سو کا جو فیصلہ ہے اس کو مانو۔ شرک ہے۔ ان میں سے اگر وہ ایک فرد بھی جسے آپ نے بادشاہ کہا ہے وہ قرآن کی آیت کو نافذ کرے تو وہ خدا کی اطاعت ہے۔ یہاں Form کا سوال ہی نہیں ہے۔ اسلامی نظام ہے' اسلامی آئین ہے' ڈگڈگی بج رہی ہے صاحب۔ کوئی نہیں بتلا رہا۔ اسلامی نظام اور اسلامی آئین صرف یہ ہے کہ اپنے ہر معاملے کے لیے قرآن کی سند پیش کرو۔ اسلامی ہو گیا۔ اس میں کوئی اور آمیزش کرو' شرک ہو گیا۔ لایئے وہ مثال اس نوکر کی جو اتنے انسانوں کا ملازم ہو اور مُتَشٰكِسُوْنَ (39:29) ان کی کیفیت ہو۔ بنا دیجیے گا ناں ایک پارلیمینٹ اس قسم کی۔ مُتَشٰكِسُوْنَ (39:29) نقشہ ان پارٹیوں میں دیکھیے آپ۔ اور پھر ان کے اکیاون سے احکام قوانین بنایئے' پھر ان کی اطاعت کرایئے' پھر دیکھیے حلیہ کیا بگڑتا ہے آپ کا۔ قدم قدم پہ شرک ہے۔ اکیاون ہوں سو ہوں یا ایک ہو۔ قرآن کا حکم نافذ کرے گا یہ نہ کسی پارلیمینٹ کی اطاعت ہے نہ کسی ادارے کی' نہ Constitution اسمبلی کی' نہ کسی بادشاہ کی' نہ کسی ڈکٹیٹر کی۔ یہ اطاعت ہے خدا کے حکم کی' اس کے قانون کی اطاعت ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے اسلامی نظام۔ اس میں اگر وہ قرآن کی دلیل یا سند نہیں دیتا آپ کو تو میں نے عرض کیا ہے ناں'

اکیاون چھوڑ کے سو بھی متفقہ طور پر آپ کا قانون بنادیں گے، شرک ہے۔ کوئی فرد اگر آپ کو یہ کہے گا کہ میں خدا سے براہِ راست یہ حکم پا کے تمہیں یہ کہتا ہوں تو براہِ راست یہ چیز جو ہے، بدترین شرک ہے۔

قرآنِ حکیم کے احکامات سے ہٹ کر کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون کی پیروی سب سے بڑا شرک ہے

کوئی نظام اگر آپ کو کسی قسم کی Form کیوں نہ ہو حکومت کی یا قوانین سازی کی اگر وہ قرآن کی سند یا قرآن کی دلیل یا قرآن کے حکم کو نافذ نہیں کرتا ہے، شرک ہے۔ اور جب آپ کو اتنے انسانوں کی اطاعت کرنی پڑ جائے۔ کہیں حضرت صاحب کی اطاعت، کہیں فقہ کے امام کی اطاعت، کہیں حدیث کے راوی کی اطاعت، کہیں اپنے نظامِ مملکت کے اس قسم کے جتنے بھی ادارے ہیں ان کی اطاعت ہے۔ تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ آپ کے دل کے اندر بیبا کی اور بے خوفی پیدا بھی ہوسکتی ہے؟ آپ تو قدم قدم کے اوپر کانپتے رہیں گے، لرزتے رہیں گے۔ اور سب سے بڑا خوف حضرت صاحب کا خوف ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں میں پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے متعلق تو یہ کہ اگر اپنے کمرے کی تنہائی میں بیٹھے ہوئے بھی مجھے خیال آجائے اس قسم کا۔ خیال ہی نہیں آجائے صاحب! سوتے میں پاؤں ہوجائیں ان کے مزار شریف کی طرف، تو کانپتا ہے لرزتا ہے۔ میں نے وہ لوگ دیکھے ہیں اس کے بعد نفسیاتی کیفیت طاری ایسی ہوجاتی ہے کہ پاگل ہوجاتے ہیں کہ میں اب تباہ ہوگیا، میں کہیں کا نہیں رہ گیا۔ بخار ہو رہا ہے، لرز رہے ہیں، بچے پہ کوئی آفت آرہی ہے، گھر میں قیامت برپا ہورہی ہے۔ اور حضرت صاحب کے کسی فرمودہ کے مطابق خواہ وہ قرآن کی تفسیر کیوں نہ ہو کہیں وہ اگر سنیں گے۔ وہ جو قرآن نے کہا تھا ناں کہ نفرت سے دل بھرے ہوئے ہونگے، وہ قرآن نہیں اس وقت سن رہے ہونگے۔ تو ہر وقت دل میں یہ بات ہوگی کہ یہ حضرت صاحب کے فلاں ارشاد کے خلاف یہ شخص کہہ رہا ہے۔ بالکل باطل ہے، گمراہ ہے، اس کی بات نہ مانو، ماننی ہی نہیں چاہیے۔ ایمان خراب ہوجائے گا، عقیدہ بگڑ جائے گا۔ ہر وقت دل میں یہ ہے۔ کتنا بڑا خوف طاری ہو رہا ہے ان کا۔ عزیزانِ من! یہ ہے وہ شرک کہ جس سے انسان مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ فطرت کی قوتوں سے تو یہ اونچا ہوگیا اور اس میں بھی میں نے کہا ہے ناں احسان ہے اربابِ فکر و عقل کا جنہیں آپ Materialist کہہ کہ ناک چڑھا لیتے ہیں اپنی۔ یہ انسانیت کے اوپر ان کا احسان ہے کہ انہوں نے بتایا کہ جن کے سامنے تم اس طرح سے جھکتے ہو، جس چاند کو جھروکا مان رہے ہو اس چاند کے اوپر ہم جا کے سوار ہو کے تمہیں بتادیں گے کہ وہ ہمارا ساجد ہے، ہم مسجود ہیں اس کے۔ ان خداؤں کو انہوں

نے پاش پاش کر کے رکھ دیا۔لیکن ہمارے ہاں کے یہ جو دلوں کے اندر انسانوں کو ہم نے خدا بنا کے رکھا ہے‘ ہم نے ان پہ بھی ناک بھوں اس لیے چڑھایا کہ آگے جب ذرا بڑھیں گے اور انہوں نے یہ بتا دیا کہ ہر انسان دوسرے انسان کے برابر ہے تو یہ سارے بت جو ہمارے حریمِ کعبہ میں ہیں‘ یہ بھی نکالنے پڑیں گے۔اس لیے مادہ پرستی کے پیچھے آپ لٹھ لے کے پھر رہے ہیں۔مادہ پرستی کی پرستش جو ہے یہ اور بات ہے کہ آپ آخری حقیقت اسی کو سمجھ لیں‘ قانون کو۔

خالص مادہ پرستی کا عمل قوموں کی سوچ کو پتھروں کی تراش خراش تک ہی محدود کر دیتا ہے

پھر بات میں سے بات نکلتی چلی آ رہی ہے لیکن ’’انیس جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لو پھر یہ موقع آئے یا نہ آئے‘‘۔آپ کو معلوم ہے قرآن نے شروع میں چوتھا لفظ جو کہا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (1:3) کیا عظیم بات وہ کہہ گیا ہے۔الدین کے معنی قانون اور اس کی اطاعت ہیں۔ Materialism کی روسے‘ خالص مادہ پرستی کی روسے‘ وہ یہ کہتے ہیں کہ قانون کے اندر یہ قوت ہوتی ہے کہ جب کسی جگہ خلا پیدا ہوتا ہے گرمی کی وجہ سے‘ تو دوسری جگہ کی ہوا تیزی سے اس کی طرف آتی ہے‘ بڑی قوت سے آتی ہے۔وہ یہیں تک رہ جاتے ہیں۔آگے ان سے پوچھیے سائنٹسٹ سے‘ وہ کہتے ہیں ہم نہیں کہہ سکتے۔ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ ایک قانون ہے اٹل اور اس میں اتنی بڑی قوت ہے۔یہ زلزلہ ایک قانون کے تابع آتا ہے جو ساری زمین کو ہلا دیتا ہے۔یہ بڑی قوت ہے۔وہ قانون تک رہے‘ اس سے آگے نہیں گئے۔

کائنات کے ذرے ذرے میں پائی جانے والی ہر قوت اس قوت کی رہینِ منت ہے جس نے اس کائنات کے ہر فارمولے میں یہ الگ الگ قوت پیدا کی ہے

انہوں نے کہا یہ کہ اس میں یہ قوت ہے۔اس نے یہ کہا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (1:3) قانون کے پیچھے ایک صاحبِ اقتدار بیٹھا ہوا ہے جو قانون کے اندر یہ قوت پیدا کر رہا ہے۔عزیزانِ من! یوں عبدِ مومن ایک قدم آگے چلا جاتا ہے۔مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (1:3)۔جس آن کوئی قانون اپنا نتیجہ مرتب کر رہا ہوتا ہے‘ قانون کے اندر یہ قوت نہیں ہوتی۔قانون تو فارمولا ہوتا ہے‘ ایک Process ہوتا ہے‘ ایک طریق ہوتا ہے ایک چیز کو پورا کرنے کا۔اٹل ہوتا ہے غیر متبدل ہوتا ہے‘ اسے قانون کہہ دیا جاتا ہے۔لیکن قانون میں بجائے خویش قوت کوئی نہیں ہے۔اس کے اندر قوت پیدا کرنے والی ایک اور ذات ہے جس کو کہا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (1:1)۔

مادہ پرست یورپ کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کو مقامِ آدم سے آگاہ کیا

بات دوسری طرف چلی گئی۔قانون کی جب آپ اطاعت کریں گے۔میں نے عرض کیا تھا کہ یہ یورپ کا مادہ پرست' اس حد تک اس کا احسان ہے کہ اس نے لاعلمی اور جہالت کی تاریکیوں سے انسان کو اٹھا کے مقامِ آدم تک وہ لے آیا ہے۔یہ بھی بڑی بات ہے۔اس کے بعد مقامِ مومن تک آنے کی بات ہے

قرآنی معاشرے کی شکل وصورت' اس کے جنتی ماحول کا عکس نیز اس کو شرک کے نقصان سے بچائے رکھنے کا طریق

قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کے متعلق جو احکام دیے ہیں' ان کی اطاعت اسی طرح کرنے لگ جایئے جس طرح سے کہ یہ اطاعت جو ہے ہماری فطرت کا تقاضا بن گیا ہوا ہے۔سانس لینا ہماری زندگی کا تقاضا ہو گیا ہے۔ہم کوئی سوچ سمجھ کر فیصلہ کر کے یہ نہیں کہتے کہ یہ سانس لے لوں اور پھر سوچنے بیٹھ جاتے ہیں کہ اگلا سانس لوں یا نہ لوں۔اس کے لینے سے یہ فائدہ ہوگا نہ لینے سے یہ نقصان ہوگا۔سانس تو زندگی کا تقاضا ہے لیتا چلا جاتا ہے۔زندگی یہ ہو جائے کہ جو انسانیت سے متعلق قوانینِ قرآنی ہیں وہ ہماری زندگی کا تقاضا ایسا بن جائے کہ از خود ان کی اطاعت ہوتی چلی جائے' اطاعت نہ ہو تو دم گھٹنے لگ جائے۔یہ مقامِ مومن ہے۔جیسا میں نے عرض کیا ہے اگر اس کے اندر کسی انسانی خیال کی بھی آمیزش ہو جائے گی تو یہ اس شکل میں غیر آمیزش شدہ قانون نہیں رہے گا۔جسے تحریف قرآن نے کہا تھا وہ تھا کیا؟ وہ شرک تھا یعنی خدا کے قانون میں انسانی خیالات کی آمیزش۔یہ شرک ہے۔

زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی خاطر تنہا عقلِ انسانی کا کردار اور اس کا محسوس نتیجہ

آپ سوچیے کہ اگر انسان اس جہالت سے بھی نکل جائے جو فطرت کی قوتوں کے سامنے جھکنے سے تھی اور اس مقام کے اوپر آجائے تو اس کو اپنی تمدنی زندگی کے اندر جو اطاعت کرنی پڑے گی' وہ بہرحال انسانوں کے فیصلوں کی کرنی پڑے گی۔اگر وہ وحی کو نہیں مانتا' قرآن کو نہیں مانتا۔انسانوں ہی کے فیصلوں کی کرنی پڑے گی۔عزیزانِ من! اس سے لرزنے کی کیفیت یہ ہے کہ امریکہ میں President کا الیکشن ہوتا ہے اور جتنی قومیں دنیا کی ایسی ہیں جن کے مفاد وابستہ ہیں ان کے ساتھ' وہ سہمے ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں اب کونسی پارٹی برسرِ اقتدار آجائے۔آپ دیکھتے ہیں' دلوں کے اندر ڈر کتنا ہوتا ہے۔کیونکہ جو وہاں برسرِ اقتدار پارٹی آئی' اس کا President ہوا' اس کے مطابق پالیسی بدلے گی اس حکومت کی' اس کے مطابق ہماری یہاں پتہ نہیں کیا

درگت بنے۔ سَنُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا الرُّعۡبَ بِمَآ اَشۡرَکُوۡا بِاللّٰہِ (3:151) قانونِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کی اطاعت کو شریک کر کے دل تمہارے خوف کے مامن بن جائیں گے' کانپنے لگ جاؤ گے' لرزنے لگ جاؤ گے قدم قدم کے اوپر۔ عزیزانِ من! شرک سے مقامِ انسانیت سے کیسے گرتا ہے۔ سنیئے قرآن کی آیت۔ پھر دہرادوں۔ نہ توحید کے ماننے سے خدا کا کچھ بنتا ہے' نہ شرک سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ یہ تو انسانوں کی حکومتیں ہیں جن کے اندر اگر آپ پاکستان میں بیٹھے ہوئے اپنے ذہن میں یہ کہیں کہ نہیں صاحب! یہاں ہمیں کسی Foreign Power کو Invite کر کے لے آنا چاہیے یا اس کا ایجنٹ۔ واقعی یہاں غداری ہے اور بغاوت ہے۔ اس لیے کہ یہ حکومت جو ہے پھر وہ کمزور ہو جاتی ہے۔ خدا کی حکومت تو کمزور ہی نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ آپ بیس اور مان لیجیے' بگڑتا کیا ہے اس کا۔

مشرک قوم کو دوسری قوم اس طرح اُچک کر لے جاتی ہے جس طرح چیل چڑیا کے گھونسلے سے بوٹ کو

میں نے عرض کیا ہے ناں کہ اس سے بگڑتا ہے انسان کا اپنا کچھ۔ انسان مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ کس طرح سے گر جاتا ہے؟ میں کہتا ہوں آپ تمام احباب سامنے قرآن رکھا کریں تو پھر دیکھیں الفاظِ قرآنی سامنے آنے چاہئیں۔ سنیئے! حُنَفَآءَ لِلّٰہِ (22:31) صرف ایک خدا کو سامنے اپنے بطور مطمحِ نگاہ رکھنے والے۔ غَیۡرَ مُشۡرِکِیۡنَ بِہٖ ط (22:31) اس کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو نہ ملانے والے۔ کہا کہ جو انسان اس کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو ملاتا ہے وہ مقامِ انسانیت سے جو گرتا ہے وَ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا(22:31) اس کی مثال یوں سمجھیے فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (22:31) جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گرا ہو۔ خدا تو اپنے مقام سے نہیں گرتا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (22:31) آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گیا۔ سورۃ الاعراف میں قرآن نے کہا ہے کہ وَ لَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰہُ بِہَا وَ لٰکِنَّہٗۤ اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ (7:176) ہم تو چاہتے تھے کہ اس کو آسمان کی بلندیوں کی طرف لے جائیں' اس کمبخت نے زمین کی پستیوں کی طرف لوٹنا شروع کر دیا ہے۔ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (22:31) پستیوں پہ گر گیا۔ اتنی سی بات ہی پھر نہیں ہوئی کہ گر گیا۔ فَتَخۡطَفُہُ الطَّیۡرُ (22:31) کہا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ چڑیا کا بوٹ جو گھونسلے سے نیچے گر جاتا ہے تو پھر ہوتا کیا ہے؟ کہتا ہے چیل آتی ہے اور اسے اُچک کے لے جاتی ہے۔ فَتَخۡطَفُہُ الطَّیۡرُ (22:31) اس طرح سے چیل اور کوے اس کو اچک کر لے گئے جس

نے خدا کے ساتھ شرک کیا۔ آسمان کی بلندیوں سے گرا زمین کی پستیوں پہ آ کے پڑا اور اس طرح سے ہر اچکنے والی قوت جو تھی' دنیا کی جس کا جی چاہے' اس کو اچک کر لے گئی۔ اَوۡ تَهۡوِیۡ بِهِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَكَانٍ سَحِیۡقٍ (22:31) یا یوں سمجھو کہ وہ ایک درخو دخزیدہ چٹان کی بجائے گھاس کا ایک تنکا آ گیا کہ ہوا کا جھونکا جدھر جی چاہے اُسے لیے لیے پھرے۔ اِدھر کی ہوا آئی اِدھر اڑ گیا' اُدھر کی ہوا آئی اُدھر اڑ گیا۔ کہنے لگا اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے اپنا کوئی مقام نہیں رہتا اس کا۔

کرۂ ارض پر آج قومِ مسلم کی حالتِ زار اور اس کی کوتاہ نظری کا تفصیلی ذکر

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ شرک کے معنی کیا ہیں۔ اور شرک سے پھر انسان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ یہ جو آج ہر وقت ہر جگہ مسلمان اپنا رونا رو رہا ہے۔ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ گرا ہوا ہے۔ چڑیا کے گھونسلے سے گرا ہوا بوٹ' وہ بے بال و پر سا بوٹ ہے جس کو جو تیز پنجے والا جانور' جو پرندہ چاہتا ہے' اچک کے لے جاتا ہے۔ ایک گھاس کا خشک تنکا ہے جدھر کو ذرا تیز ہوا آتی ہے' اُدھر اڑ کے چلا جاتا ہے۔ نہ اپنا کوئی قبلہ ہے نہ قبلہ نما ہے' نہ مطمحِ نگاہ ہے نہ منزلِ مقصود ہے۔ خس و خاشاک کی طرح بکھرا ہوا ہے۔ جدھر سے تیز جھونکا آ جاتا ہے اس کے ساتھ اڑ کے چلا جاتا ہے۔ اس کا علاج؟ کبھی ہم بساطِ سیاست کے اوپر بیٹھ کے ڈھونڈتے ہیں۔ بیٹھتے ہیں ناکام اٹھ جاتے ہیں۔ کبھی اپنے ہاں کی شریعت کی دنیا میں آتے ہیں: ان کی نمازیں ٹھیک نہیں' ان کے روزے درست نہیں' ان کے اعتقادات درست نہیں۔ ان کا تعلق سارا اوپر کی چیزوں سے ہوتا ہے۔ کبھی اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ انتہائے مایوسی یہ ہے کہ ہم پھر خدا کی طرف سے ایک آنے والے کا انتظار کر لیتے ہیں اس پہ امیدیں لگا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ بھی آتا ہے وہ بھی چلا جاتا ہے' حالت اور بدتر ہو جاتی ہے۔ علاج صرف ایک تھا قرآن نے جو کہا ہے مقامِ انسانیت پہ پہنچنے کا کہ شرک کو چھوڑ دو۔

قانونِ فطرت کی اطاعت کرنے والی قوموں کی پوزیشن

جو قومیں آج مادی قوت اختیار کر کے آپ کو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اڑائے پھرتی ہیں' انہوں نے نیچے کا جو حیوانی سطحِ زندگی کا جو شرک تھا' اُسے چھوڑا ہے' قانونِ فطرت کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اور قانونِ فطرت کی اطاعت کی جاتی ہے ان کو مسخر کرنے کے لیے You avail nature to conquer it ۔ وہ اس لیے آپ سے زیادہ بھاری ہیں۔ آدھے حصے کا سہی' ایک حصے کا سہی' خالص قوانینِ فطرت کا ہی سہی۔ عزیزانِ من! وہ بھی خدا کے قانون ہیں ''کوئی مُھنّے کمہیار نے نئیں بنائے ہویئے ہیگے''۔

خدا کے ہی قوانین ہیں جنہیں آپ قوانینِ فطرت کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں فطرت کے قوانین پرغوروفکر کی دعوت دینے والا نیچری کہلوایا اورقرآن کی طرف دعوت دینے والا منکرِ حدیث اورکافر ٹھہرا

یہ بھی آپ کے ساتھ سخت فریب دیا گیا تھا کہ فطرت کے قوانین کی طرف جس نے توجہ دلائی اس کو آپ نے نیچری کہہ دیا۔ اوراس کے بعد جس نے آپ کو قرآنِ خالص کی طرف دعوت دی' آپ نے اس کو منکرِ حدیث بنا دیا۔شرک سے نکلنا نہیں چاہتے۔ اس نیچری نے یہ کہا تھا کہ وہ اس لیے آپ سے زیادہ طاقتور ہیں۔

روحانیت کے پردے میں فریب درفریب کی نوعیت کا ذکر

اس کے بعد اب اگلی مثال تو میں کہیں دے ہی نہیں سکتا کہ خالص قرآن کے قوانین کا جو ماننے والا ہوگا' اس کے سامنے یہ قوتیں والے جو ہیں یہ بھی پرکاہ کی طرح ہو جائیں گے۔ کہا تھا کہ جی خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو' مومنین کو غالب کرتا ہے۔ اب جب ہم نے دیکھا کہ وہ خدا کے وعدے پورے کرنے والے بھی آ گئے' اس کے باوجود بھی ہماری کیفیت یہ رہی کہ محکومیت پہلے سے بھی بدتر چلی آ رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ کہ جی! یہ غلبہ اصل میں روحانیت کا غلبہ ہے۔عزیزانِ من! فریب درفریب ہے۔اگر آپ نے قرآن کا مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنا ہے تو پھر آپ کو شرک کو چھوڑنا پڑے گا اورصرف خدا کے قوانین کی اطاعت کرنا ہوگی جو اس کی کتاب کے اندر درج ہے۔ اس نے تو کہا ہے کہ ہم نے اپنے قوانین اس کتاب کے اندر دیدیئے ہیں۔ براہِ راست خدا کے ساتھ تعلق' وہاں سے علم لینے کا' وہاں سے اورحکم لینے کا' وہاں سے اور چیز لینے کا' یہ سارے شرک میں مبتلا کرنے کے فریب ہیں۔ یا کسی نے فریب کھایا ہے یا کوئی فریب دیتا ہے' ہمیں اس سے کیا غرض ہے۔

لاریب شکل میں خدا کی طرف سے پیش کردہ دین صرف اورصرف کتابِ مبین میں ہی ہے

خالص قانونِ خداوندی کی اطاعت جو قرآن کے اندر ہے' یہی آپ کے ہاں کا دین ہے یہی حکومت ہے آپ کے ہاں کی یہی معیشت ہے' یہی معاشرت ہے آپ کے ہاں کی۔ اس لیے کہ یہی توحید ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ملاؤ گے' شرک ہے۔ اورشرک کا نتیجہ مَاْوٰهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ (3:151) کیا بات ہے عزیزانِ من! دوسری جگہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (31:13) ظلمِ عظیم ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ یہ ظالمین ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔ اب اس کے بعد ہم نے

بھی وہ ظلم کے معنی یہی رکھ لیے ناں ''بڑا ظالم ہیگا جی! بڑا ظلم کردا ہیگا اے''۔عربی زبان سے پوچھیے' محاورۂ عرب سے پوچھیے' قرآن سے پوچھیے۔

کسی شے کا اپنے مقام پہ نہ رکھنا ظلم ہے تو انسان اگر اپنے آپ کو صحیح مقام پہ نہ رکھے تو یہ ظلمِ عظیم ہے

عزیزانِ من! یہیں سے ہی بات ساری صاف ہوجاتی ہے۔ظلم کے معنی ہیں' جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اسے اس مقام پہ نہ رکھا جائے۔اسے اس سے اونچا لے جائے' یہ بھی ظلم ہے' اس کو اس سے نیچے گرادیا جائے یہ بھی ظلم ہے۔شرک انسان کو اس کے مقام سے گرا دیتا ہے۔اور یہ سب سے بڑی چیز ہے اس لیے اسے ظلمِ عظیم کہا ہے قرآن نے۔جس مقام پہ انسان کو رہنا چاہیے کہ فطرت کی ساری قوتوں کا مسجود۔انسان سب برابر' کسی انسان کے سامنے اس کا سر نہیں جھکتا۔صرف خدا کے قوانین کی اطاعت جو اس کے قرآن کے اندر آ گئی ہوئی ہے۔یہ تھا مقام۔اس مقام سے یہ اگر کسی اور جگہ بھی اس کا سر جھک گیا ہے تو اپنے مقام سے دوسری جگہ چلا گیا۔یہ ظلمِ عظیم ہے۔چھوٹی چھوٹی سی چیزوں کو دوسری جگہ رکھو تو عام ظلم ہوگا۔انسان خود اپنے آپ کو دوسرے مقام پہ رکھے گا تو ظلمِ عظیم ہوجائے گا۔جو خود اپنے صحیح مقام پہ نہیں ہے وہ دوسری چیزوں کو صحیح مقام پہ کیسے رکھ سکے گا۔شرک ظلمِ عظیم ہے۔نتیجہ مَاْوٰهُمُ النَّارُ ط (3:151) ہے۔جھلس جاتی ہیں ان کے اعمال کے کاروبار کی کھیتیاں۔بار آور ہی نہیں ہوسکتیں' جو جی میں آئے کرلو۔ایک وقت میں دو قوانین کو مان کے پھر دیکھو تو سہی۔وہ جو دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کے چلنے والا کہا کرتے ہیں۔دو قوانین کو ہی ملا کے دیکھیے' امتزاج کر کے دیکھیے۔

قوانینِ خداوندی کے حصے بخرے کرنا لفظ توحید کے ساتھ بغاوت ہے

وہ جو کہتے ہیں ناں کہ صاحب! کوئی بات نہیں۔کچھ خدا کے قوانین بھی ہیں' جتنی جتنی کسی میں استطاعت ہے کرلے۔کچھ خدا کا قانون مان لے کچھ اِدھر کا مان لے۔آپ کو پتا ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج (2:85) اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ج (2:85) کیا تم یہ انداز اختیار کرنا چاہتے ہو کہ کتاب' قانون' خدا کے قانون کے بعض حصے جو ہیں ان کو تم مان لو کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے اسلامی ہوجاتا ہے' پیوند لگائے جارہے ہیں اور بعض حصے جو ہیں اس سے انکار کردو کہ ہاں صاحب! یہ لے آئیے یہ ٹھیک ہے یوں کرلیجیے۔تو نظر تو ایسا آتا ہے ناں کہ بہرحال جتنا کچھ قرآن کا یہ لائے ہیں تو یہ تو بہت اچھی بات ہے' اتنا ہی سہی ''جنے جوگا کوئی ہووے بھائی' او ہناں ای کرلوے' روز ساہڈے اے کہیا جاندا

ہیگا''۔تو اس سے یہ نظر آئے کہ اتنا کر لینے سے یعنی ذہن اس طرف جاتا ہے منطقی طور پہ کہ خیر کچھ Percentage ہی سہی' دس سوال ہی دیۓ تھے اس میں سے آٹھ غلط ہیں دو صحیح ہیں' دو کے تو نمبر ملیں گے۔آپ کو معلوم ہے شرک میں ہوتا کیا ہے؟ کہا ہے اگر یہ کیفیت پیدا کرتے ہو۔عزیزانِ من! سنیئے غور سے فَمَاجَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ(2:85) جو تم میں سے ایسا کرتا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ج (2:85) اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت اور خواری وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ط (2:85) اور مستقبل کی زندگی میں آخرت کی زندگی میں اس سے زیادہ عذاب۔ خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ج (2:85) آپ دیکھ رہے ہیں۔ملاؤ خدا کے قانون میں اور کسی دوسرے قانون کو۔کہہ دو کہ ہاں صاحب! چلو اتنا حصہ تو ہمارے ہاں کا اسلامی ہو گیا' اتنی اطاعت تو ہم کر رہے ہیں۔حضرت صاحب کے خیالات کی بھی سہی لیکن بہر حال قرآن کی آیتیں بھی تو ہیں۔کر و یہ تم اور پھر دیکھو۔

کیا خالص کفر مخلوط دین کے مقابلے میں سود مند ثابت ہوتا ہے

اس دیکھنے کے لیے تو عزیزانِ من! کسی ارسطو کے منطق کی ضرورت نہیں اس کو پہچاننے کے لیے ''صورت ببیں حالم نہ پرس''۔خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ج (2:85)۔بات دور نکل جائے گی۔اس شرک کو چھوڑ کر کافرِ خالص بن جاؤ گے تو خالص عقل وفکر کی بنیادوں پہ تو کچھ کر لو گے۔کم از کم اس حیات الدنیا کے اندر تو یہ چیزیں تمہیں مل جائیں گی' دنیا کی خوشگواریاں اور دنیا کی سعادتیں۔یہ تو قوانینِ طبعی کے ماتحت ملتی ہیں۔پچھلی دفعہ میں نے عرض کر دیا تھا۔خدا کہتا ہے کہ جو دو قومیں چلتی ہیں قوانینِ طبعی کو لے کے تو ہم دونوں کو خواہ وہ مومن ہیں خواہ کافر ہیں' ان کی کوشش کے مطابق ہم دونوں کو بڑھاتے ہیں۔کم از کم حیات الدنیا تو بن جائے گی۔یہ جو آپ کے ہاں کی کیفیت ہے کہ عقل وفکر کے دیۓ گل کر دیۓ جاتے ہیں جب آپ یہ کیفیت اختیار کر لیتے ہیں۔یہ کرو گے تو خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ج (2:85)۔تو عزیزانِ من! آخرت کا اشد عذاب تو خیر آخرت کا ہے' آج روز کا رونا تو آپ اس حیاتِ دنیا کی خِزی ذلت ہے اس کا رونا روتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ ہے یہ کہ مَاۡوٰىهُمُ النَّارُ ط (3:151)۔

فکرِ قرآنی کی روشنی میں پیش کردہ دلیل ہمیشہ صاحبِ قوت ہوتی ہے جو کسی غلبے کے زور پر مبنی نہیں ہوتی

درمیان میں ایک چیز تھی مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا ج (3:151) میں نے کہا تھا میں ابھی عرض کروں گا۔عام ترجمہ تو یہی

ہے کہ شرک کے لیے خدا نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ ٹھیک ہے کوئی دلیل نہیں اس کے لیے آپ کو ملے گی۔ بات بہت بڑی ہے۔ دلیل ہی نہیں مل سکتی۔ دوسری جگہ بھی قرآن نے کہا ہے۔ ان سے کہا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو هَاتُوا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (2:111) دلیل لاؤ' برہان لاؤ۔ اور آگے جا کے کہا ہے کہ ان کو نہیں کوئی دلیل مل سکتی۔ شرک کی کوئی دلیل نہیں مل سکتی۔ یہاں بھی یہ کہا ہے کہ خدا نے نازل نہیں کی۔ میں کہہ رہا تھا کہ یہ لفظِ سلطان میرے سامنے آ گیا۔ عربوں کی زبان دیکھیے کہاں یہ لوگ پہنچے ہوئے تھے۔ قرآن کا انتخاب ملاحظہ فرمائیے۔ سلطان' غلبہ اور قوت کو کہتے ہیں۔ آپ دیکھیے اس قوم کی کیفیت کہ یہ خود قوم کتنی خوددار واقع ہوئی تھی' شخصیت پرستیوں سے کتنی دور واقع ہوئی تھی کہ انہوں نے غلبہ اور قوت جو تھی اس کے لیے کہا کہ دلیل میں غلبہ اور قوت ہوتی ہے' شخصیتوں میں نہیں ہوتی۔ سلطان کا لفظ دلیل کے لیے استعمال ہوا ہے آپ کے ہاں۔ قوت دلیل میں ہوگی کسی حضرت صاحب کے قول میں نہیں ہوگی' کسی انسان کے فرمان میں نہیں ہوگی' کسی مستبد بادشاہ کے حکم میں نہیں ہوگی۔ قوت دلیل میں ہوگی' سند میں ہوگی' حجت میں ہوگی۔ مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا ج (3:151) بشرطیکہ وہ دلیل خدا کی طرف سے نازل کردہ ہو۔ ورنہ فکرِ انسانی تو پھر تراشتا ہے۔ یہ ہر چار سو بیس کرنے والا اتنی دلیلیں رکھتا ہے اس کو کیا کہتے ہیں۔ خدا بھی یہ چیز جو منوا رہا ہے وہ محض غلبے کے زور پہ نہیں منوا رہا' دلیل اور حجت کی بنیادوں کے اوپر منوا رہا ہے۔ وہ اس کے لیے دلائل دے رہا ہے کہ شرک سے تمہاری حالت یہ ہو جائے گی۔ خدا کی طرف سے نازل کردہ دلیل۔ قانون بھی اس کا اور اس قانون کو صحیح ثابت کرنے کے لیے' دوسروں سے منوانے کے لیے' اس کے نتائج پرکھنے کے لیے دلیل بھی' وہ جو خدا نے دی ہے۔

انسانوں کی طرف سے پیش کردہ دلیل وہی حق پر مبنی ہوگی جو قرآنی قوانین پر منطبق ہو

یہ ہماری اپنی دلیلوں کے نتیجے ہیں ناں کہ روز آپ کے ہاں مناظرے اور مباحثے یہ ہوتے ہیں۔ دونوں کرتے کیا ہیں؟ دلیلیں دے رہے ہوتے ہیں۔ دونوں باطل پہ' دونوں باطل کی دلیلیں دے رہے ہیں۔ جس کی دلیلیں ذرا زیادہ قوی ہو جاتی ہیں اس کا باطل اس وقت جیت جاتا ہے۔ ہم اسے حق کی فتح کہتے ہیں۔ حق کی فتح تو اس وقت ہے کہ آپ قانون بھی قرآن کا پیش کریں' دلیل بھی قرآن کی پیش کریں۔ اب قرآن کے دلائل میں یہ چیز آ جائے گی۔ اس نے بھی فطرت کے قوانین کو اپنی دلیل میں پیش کیا ہے ناں۔ علمِ انسانی کی رو سے فطرت کی قوتوں کا یہ علم جتنا جتنا زیادہ بڑھتا جائے گا' یہ جو دلائل پیش کریں گے' یہ خدا کے نازل کردہ دلائل ہوں گے۔ اس نے انسانی تاریخ سے دلائل پیش کیے ہیں۔ جتنا تاریخ کا علم بڑھتا چلا جائے گا' آپ دلائل پیش کرتے چلے جائیں گے۔ یہ منزل من اللہ دلائل ہوں گے۔

الحق کی دلیل کو الحق ثابت کرنے کا ایک عملی طریق

اس نے تیسری دلیل یہ پیش کی تھی قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ج فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ لا (6:135) کہا تھا کہ میری آخری دلیل یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ ہم جس پروگرام پہ چل رہے ہیں اس کے نتائج بڑے کامیاب اور بڑے خوشگوار ہونگے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ نتائج تمہارے تباہ کن ہونگے۔ میں جس پروگرام کی دعوت دے رہا ہوں اس کے نتائج بڑے انسانیت ساز ہونگے۔ میں فطری دلائل سے تمہیں سمجھا چکا ہوں تم نہیں مانتے۔ آخری چیز یہ ہے کہ تم میرے پروگرام میں دخل نہ دو میں تمہارے پروگرام میں دخل نہیں دیتا۔ تم اپنے پروگرام کے اوپر عمل درآمد کرو میں اپنے پروگرام کے اوپر عمل پیرا ہوتا ہوں۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کس کا پروگرام سچا ہے۔ یہ دلیل ہے منزل من اللہ۔ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ سُلۡطٰنًا ج (3:151) خدا نے کوئی دلیل اس کے لیے نہیں دی۔ یہ تمہارے اپنے ذہن کے تراشیدہ اعتراضات ہیں جن کے حق میں تم پھر اپنے فکری دلائل پیش کرتے چلے جاتے ہو۔ دلیل کے لیے بھی سند خدا کی کتاب ہے۔

اس ارض وسما میں قرآنِ حکیم کی تعلیم ہی انسان کا صحیح صحیح مقام متعین کرتی ہے

عزیزانِ من! میں نے جیسا شروع میں عرض کیا تھا آیۂ جلیلہ قرآن کے بنیادی حقائق۔ مقصد اس کا انسان کا صحیح مقام متعین کرنا ہے کائنات کے اندر۔ یہ انسان کہ جو صرف خدا کے قوانین کی اطاعت کرتا ہے اور اس کی دعوت دیتا ہے اور دلیل بھی پیش کرتا ہے۔ کائنات کی قوتوں کے سامنے جھکنا تو بہت بڑی بات رہی وہ کسی بڑی سے بڑی بارگاہ کے سامنے بھی نہیں جھکتا اور مستانہ وار آگے چلا جاتا ہے قلندرانہ گزر جاتا ہے اس کائنات سے۔ سوچیے تو سہی یہ ہے وہ جماعتِ مومنین جس کے متعلق کہا کہ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَ لَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:38) خوف نہیں ہوگا۔ اور شرک کرنے والے جو ہیں سَنُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ بِمَآ اَشۡرَکُوۡا بِاللّٰہِ (3:151) اس کے ساتھ کسی اور کو آپ ملا لیجیے آپ دیکھیے کہ آپ کا دل خوف کا مامن بن جاتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں ''خدا سے ڈرتے رہنا چاہیے'' یہ جو کیفیت ہے جسے خوف کہتے ہیں۔

انسان کو خدائے رحیم سے ڈرنے کی بجائے اپنی بدعملیوں کے بدنتائج سے بچنا چاہیے

عزیزانِ من! قرآن تو کہتا ہے فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَ لَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:38)۔ کہا یہ جاتا ہے کہ غیرِ خدا کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ خوف تو ایک Fear Complex ہوتا ہے۔ جہاں قرآن یہ کہتا ہے اگر یہ سارے باقی خوف ہٹا کر وہ ایک اتنا بڑا خوف جو ہے اس کو طاری کر دیا جائے تو خوف تو خوف ہی ہوتا ہے۔ دوسرے مقام پہ میں آؤں گا میں سمجھتا ہوں کہ پورا مجھے درس

ایک دینا پڑے گا اس کے لیے کہ یہ خوف اور وہ خوف کیا ہے۔ یہ خوف کیا ہے؟ بچہ پانی میں جاتا ہے تو آپ اس کو فوراً کہتے ہیں' آگے نہ جانا ڈوب جاؤ گے۔ ڈوب جانے کا ایک خوف' اسے خوف نہیں کہیں گے۔ آگ کے پاس جاتا ہے تو آپ اسے کہتے ہیں' نہ جانا جل جاؤ گے۔ سانپ نکلتا ہے تو آپ سارے اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔ وہ سانپ کا خوف نہیں ہوتا وہ سانپ کے ڈسنے سے اس کا نتیجہ نکلتا ہے' یہ اس کا خوف ہوتا ہے۔ سانپ کے متعلق اگر یقین ہو جائے کہ یہ ڈسے گا نہیں' پنجرے میں بند کر دیا جائے یا وہ کہہ دیں کہ اس کی کنچلیاں نکالی ہوئی ہیں۔ وہ جو سانپ والے کے پاس سانپ ہوتا ہے کہتے ہیں کہ اس کی کنچلیاں نکالی ہوئی ہوتی ہیں۔ بہر حال یہ چیز اگر ہو کہ وہ جو اس کا نتیجہ نکلتا ہے' وہ اگر نہ ہو تو پھر تو خوف کوئی نہیں ہوتا۔ خدا کے خوف کے معنی ہوتے ہیں اس کے قوانین کی خلاف ورزی سے جو نقصان پہنچتا ہے' اس سے محتاط رہتا ہے انسان۔ اور جس خوف سے اس نے کہا ہے کہ مومن آزاد ہو جاتا ہے وہ انسانوں کی طرف سے اپنے ذہن کے اندر ایک پیدا کی ہوئی بات ہوتی ہے۔ خدا کے خوف کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی سے جو تباہ کن نقصان رساں نتائج نکلتے ہیں۔ آگ میں انگلی ڈالنے سے جلنے کا جو نتیجہ ہے' اس سے آدمی اب خائف کہہ لیجیے' محتاط کہہ لیجیے' کچھ بھی ہے۔ یہ ہے جہاں خدا کا خوف آپ لائیں گے قرآنِ کریم کی رو سے۔ میں عرض کروں گا کہ اس میں خوف میں' خشوع میں' خشیت میں قرآن کہاں کہاں یہ الفاظ لایا ہے اور کس طرح یہ حقیقت واضح کی ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے اجمال میں بیان کی ہے' تفصیل میں نہیں بیان کی۔ بہر حال قرآن کہتا یہ ہے کہ **خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ** (2:85) اگر ذلت اور خواری دنیا کی زندگی سے مٹانا چاہتے ہو تو ایک ہی طریقہ ہے' قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔ فطرت کے اندر کے قوانین کی اطاعت' فطرت کی قوتوں سے خوف اٹھ جائے گا' ختم ہو جائے گا۔ خدا کے قوانین کی خالص اطاعت جو قرآن کے اندر ہے' اس سے باہر کہیں اور نہیں ہے۔ ان کی خالص اطاعت سے شخصیتوں کا خوف تمہارے اندر سے دور ہو جائے گا۔ یہ کر لو گے تو دل تمہارے جرأت کے' بیباکی کے حامل ہو جائیں گے' خوف اس سے نکل جائے گا حزن ان کے اندر سے نکل جائے گا۔ اور جب یہ جماعت دنیا کے اندر چلے گی' دنیا میں کونسی جماعت ہے جو اس کے سامنے آ جائے گی۔

ہم نے سورۃ آلِ عمران کی آیت 151 کا درس آج ہوا۔ عزیزانِ من! 152 سے ہم آگے لیں گے۔ اور وہ ہے جنگِ اُحد کے متعلق۔ اب سامنے آئے گی وہ جماعت کہ جن کے دلوں سے خوفِ غیر اللہ نکل چکا ہوا تھا۔ دیکھیے وہ دنیا میں کیا کر کے دکھاتی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

چھبیسواں باب: سورۃ آلِ عمران (آیات 152 تا 158)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنگِ اُحد کی تفصیل

عزیزانِ من! آج مارچ 1970ء کی 29 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ الِ عمران کی 152 آیت سے شروع ہوتا ہے: (3:152)۔

شرک کے سلسلہ میں سابقہ درس کی بازگشت اور زیرِ نظر درس کا تمہیدی ذکر

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں جنگِ احد کے متعلق بات چلی آ رہی تھی۔ درمیان میں ایک نہایت اہم بنیادی ٹکڑا آ گیا اور وہ یہ تھا کہ شرک کی وجہ سے انسان کا دل خوف اور ہراس کا نشیمن بن جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے ساز و سامان کی موجودگی میں جماعتوں کو شکست ہوتی ہے' افراد کے پاؤں میں لغزش آ جاتی ہے شرک کی وجہ سے۔ اور سابقہ درس تو پورے کا پورا شرک ہی کی قرآنی DEFINITION کی نذر ہوا تھا اور بڑے اہم نقاط سامنے آئے تھے۔ جس میں میں نے بتایا تھا کہ شرک سے درحقیقت انسان اپنے مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے یا وہ کائنات کی قوتوں کو اپنے سے زیادہ طاقت ور بالا دست سمجھنے لگ جاتا ہے تو یوں وہ مسجودِ ملائک بننے کی بجائے ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے' یہ بھی شرک ہے۔ اور یا وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنے سے زیادہ بالا دست سمجھ کر ان کی اطاعت اختیار کر لیتا ہے۔ عقیدت مندیوں' ارادت مندیوں سے دل کے اندر ان کا خوف طاری ہو جاتا ہے اور یوں وہ اپنے مقام سے گر جاتا ہے۔ صحیح توحید یہ ہے کہ صرف ایک خدا کے قوانین کے سامنے جھکا جائے اور اس طرح سے دنیا کی ہر بڑی سے بڑی آستاں سے قلندرانہ' بے باکانہ سرفرازی سے گذر جائے انسان۔ یہ ہے توحید اور اسی سے انسان کا دل قوتوں کا مرکز بنتا ہے اور اس کے قدموں میں ثبات اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ کے بعد پھر وہی سلسلۂ کلام جنگِ احد کی بات شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں پھر چند کلمات بطور تمہید ضروری سمجھتا ہوں۔

دین کے برعکس مذہب کی دنیا میں خدا اور رسول کے متعلق خود ساختہ تصور کی شکل و صورت

جب اسلام دین کی بجائے مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس میں مذہب میں آپ کو معلوم ہے کہ سیاست اور مذہب الگ الگ چیزیں ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف ملوکیت آ جاتی ہے دوسری طرف مذہبی پیشوائیت آ جاتی ہے' یوں دین اپنی کسی شکل میں باقی ہی نہیں رہتا۔ کہ پانی جس چیز سے مرکب ہے آکسیجن اور ہائیڈروجن ان دونوں کو الگ الگ کر دیجیے پانی کی کوئی خصوصیت بھی ان میں باقی نہیں رہتی۔ دین جب مذہب کی سطح پر لایا گیا تو سب سے پہلے خدا کا تصور بدلا۔ اب چونکہ ملوکیت آ گئی تھی خدا کو ایک قانون کی رو سے کائنات کے چلانے والی ہستی کی بجائے ایک آمرِ مطلق کی حیثیت سے سامنے رکھا گیا تا کہ ملوکیت کا تصور اس کے اندر فٹ ان ہو جائے۔ کہ کہنے کو تو السلطان ظل اللہ علی الارض کہا کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے لیکن درحقیقت آسمان پر بیٹھے ہوئے خدا کو زمین کے بادشاہ کا بہت بڑا سایہ بنا دیا گیا۔ خدا کا تصور یوں بدلا اور اس کے ساتھ ہی رسول ﷺ کا تصور اسے اس طرح سے بدلا کہ

وہ جو ایک عظیم آسمانی انقلاب کے برپا کرنے والی ایک ہستی تھی' اسے پہلے تو ایک واعظ اور مبلغ کی حیثیت سے پیش کیا گیا' اس سے زیادہ اس کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ آپ دیکھیں گے میلاد کی مجلسوں میں سیرت کی کتابوں میں وہ سارا زور اسی پہ دیا جائے گا کہ جیسے وہ ایک منبر پہ کھڑے واعظ یا خطیب ہوں۔ اس سے آگے بڑھے تو تصوف ہمارے ہاں آیا تو انہوں نے رسول ﷺ کا تصور ایک فقیرِ گوشہ نشیں' تارک الدنیا راہب کا تصور دیا۔ جس کی کیفیت یہ ہے کہ پیٹ پہ تین تین پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ چالیس چالیس دن گھر میں چولہا نہیں جلتا۔ حضرتِ عائشہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد ایک دن دیکھتی ہیں کہ قریش کے ہاں کہیں چھلنی تھی گویا اس سے پیشتر چھلنی دیکھی نہ تھی پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو کہا اس سے آٹا چھانتے ہیں تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ ہم نے تو کبھی چھنا ہوا آٹا ہی نہیں دیکھا تھا۔ آٹا ہی نہیں ہوتا تھا چھاننا کیا تھا۔ یہ ایک تصویر سامنے لائی گئی۔ اس سے بھی آگے بڑھے نبی اکرم ﷺ پہ نزولِ وحی جو تھی آپ کو پتہ ہے اس کے لیے کیا داستاں وضع کی گئی؟ یہی فقیروں کے چلے اور ان کی ریاضتیں۔ کہا یہ کہ حضور ﷺ نبوت سے پہلے تھوڑے سے ستو اور پانی تھوڑا سا لے کر باہر پہاڑ میں غار میں چلے جایا کرتے تھے اور وہاں دن رات گیان دھیان میں رہتے تھے۔ آپ دیکھیے کس طرح سے نبوت کو ان ہی چلوں کا واسطہ دیا گیا' ان ہی ریاضتوں کا ذریعہ بنایا گیا ہے جس سے ان لوگوں کو بقول ان کے کشف ہوتے ہیں' الہامات ہوتے ہیں' نبوت کو بھی اسی لائن کے اوپر چلایا جا رہا ہے۔ تو آپ ﷺ وہاں چلے جایا کرتے تھے وہاں گوشے میں بیٹھ کر اللہ کی یاد کیا کرتے تھے۔ وہی گیان دھیان کی منزلیں وہی چلے اور مراقبے۔ تآنکہ یہ چیز اپنی انتہا تک پہنچی تو پھر کشفِ حقیقت اس وقت آپ کے اوپر ہوئی۔ یہ ایک تصور آپ کے سامنے دیا جا رہا ہے۔ یہ تھا وہ دور کہ جب دین کو مذہب اور سیاست کے دو ٹکڑوں میں بانٹا گیا اور مذہب میں پھر اربابِ شریعت نے وہ کیفیت پیدا کی اور یہ اربابِ تصوف اور آگے بڑھے اور یوں خدا کا وہ نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا اور رسولِ اکرم ﷺ کی یہ سیرت ہمارے سامنے پیش کی۔ نہ خدا وہ قانون کا خدا رہا اور نہ یہ رسول ﷺ دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے والا کہ جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا تھا۔ کائنات کو ایک نئی سمت کی طرف لے چلا تھا ہم نے یہ نقشہ یکسر نگاہوں سے اوجھل کر دیا تا کہ قوم مطمئن رہے۔

قرآنِ حکیم کی وضاحت کے برعکس ہمارے ہاں نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا معیار

ہمارے ہاں اسوۂ رسول اللہ ﷺ یقیناً ایک ماڈل کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ اسوہ کس قسم کا آپ کے سامنے آتا ہے؟ اس قسم کا لباس پہنو' اس قسم کی وضع قطع آپ کی ہونی چاہیے' یہ اندازِ زیست ہونا چاہیے' یہ ہے اسوۂ رسول اللہ ﷺ۔ یہ کہ حضور ﷺ کی زندگی پہلے سانس سے آخری سانس تک کتنے عظیم انقلابی کی زندگی تھی جس نے دنیا کے ہر باطل نظام کے ساتھ ٹکر لی۔

اور ٹکر لینے کے بعد اس نظام کی بنیادوں تک کو اکھیڑ کے ایک نئے نظام کو متشکل کیا اور اس طرح سے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ وہ باب کہ اگرچہ ہم نے اپنی ان ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے اس کو بہت مقدم بنا دیا ہے لیکن دنیا پھر اپنے تمام نظاموں سے گھبرا کر تنگ آ کر پھر اسی دروازے کے اوپر دستک دینے کے لیے مجبور ہو رہی ہے۔ دنیا تو مجبور ہو رہی ہے لیکن ہم نے اپنے سامنے جو اسوہ رکھا ہے رسول اللہ ﷺ کا وہ وہی رکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسجد کے کسی امام کا ہو یا کسی خانقاہ کے کسی مشائخ میں سے کسی کا اسوہ آپ کے سامنے آ جائے۔ ایک فقیر کی حیثیت ایک واعظ کی حیثیت۔ ایک انقلابی کی حیثیت نہیں، دس لاکھ مربع میل کے اوپر مشتمل سلطنت کے سربراہ کی حیثیت نہیں۔

انسانیت کے امام نبی اکرم ﷺ کا ذکرِ خیر اور جنگِ احزاب

عزیزانِ من! اس سے بھی اگلی حیثیت آپ کو معلوم ہے کہ یہ اسوۂ حسنہ کی آیت آئی کہاں ہے قرآنِ کریم کے اندر؟ جنگِ احزاب کہ جب قریش نے تنہا بدر اور احد کے میدانوں میں شکست کھائی تو انہوں نے عرب کے تمام قبائل کو اکٹھا کیا، یہودیوں کو ساتھ ملایا۔ اسے احزاب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ALLIED کی حیثیت سے مختلف قبائل گروہ، دشمنوں کی ہر ایک جماعت کے لوگ اس جنگ کے اندر شریک ہوئے۔ چوبیس ہزار کا لشکر قریباً اور وہ ہجوم کر کے ایک دفعہ آ گئے کہ ایک FINAL BATTLE کی جائے جس میں (معاذ اللہ) اس فتنے کی جڑوں تک نکال دیا جائے۔ یہ تھی جنگِ احزاب جس میں یوں یورش کر کے یہ لشکر آئے۔ کیفیت یہ تھی اس دن میدان میں قرآن کے الفاظ میں سنیے اِذۡ جَآءُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ وَ مِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ وَ اِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ وَ بَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوۡنَا ۔ هُنَالِكَ ابۡتُلِىَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ زُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِيۡدًا (33:10-11) قرآن یہ نقشہ بیان کرتا ہے کہ کیفیت یہ تھی کہ تمہارے اوپر کی جانب سے بھی نیچے کی جانب سے بھی یورش کرتے ہوئے مخالفین کے لشکر بڑھے چلے آ رہے تھے۔ کیفیت تمہاری یہ تھی کہ آنکھیں اس شدتِ حوادث کو دیکھ کر نیلی پیلی ہوئی چلی جا رہی تھیں؛ دل بلیوں اچھل کر حلقوں تک آ پہنچے ہوئے تھے۔ بعض لوگوں کے دلوں میں عجیب عجیب قسم کی بدگمانیاں گذر رہی تھیں۔ مومنین پر ابتلا کا ایک عجیب عالم آیا ہوا تھا۔ ایک تزلزل تھا، زمین کانپ رہی تھی، آسمان ہل رہا تھا۔ اور اس عالم میں کیفیت یہ تھی کہ خوف اور ہراس چاروں طرف سے چھایا ہوا تھا۔ بہت سے قبائل اِدھر کے بھی دل چھوڑ رہے تھے، ہمتیں پست ہو رہی تھیں، ارادے متزلزل ہو رہے تھے۔ لیکن اس تمام ہجومِ مصائب کے اندر ایک ہستی ایسی تھی جو چٹان کی طرح اپنے مقام پر کھڑی تھی۔ نہ اس کے دل میں ذرا سا ہراس تھا، نہ اس کے پاؤں میں ذرا سی لغزش تھی۔ اور یہ وہ ہستی تھی جس کے متعلق اس مقام پہ کہا کہ لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ

فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ (21:11) جماعتِ مؤمنین! تمہارے لیے رسول ﷺ کی اس ذات کے اندر بہترین ماڈل ہے۔لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَ الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا (33:21) اس کے لیے جو خدا اور یوم آخرت کے اوپر یقین رکھتا ہے اس کے لیے رسول ﷺ کی اس زندگی کے اندر بہترین ماڈل ہے۔رسول ﷺ کا یہ مقام تھا جہاں یہ بتایا گیا کہ تمہارے لیے ایک اسوۂ حسنہ بہترین ماڈل تھا اس کے لیے جو خدا پر ایمان اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔اور سنیے وہ جو بار بار میں کہا کرتا ہوں کہ اللہ کا ذکر یہ کہاں لفظ آتا ہے؟ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا (21:11) جو خدا کو سب سے زیادہ سامنے رکھنے والا ہے اس کے لیے یہ ماڈل رسول اللہ ﷺ کی زندگی۔دیکھتے ہیں ذکر کہاں آتا ہے خدا کا؟ خانقاہوں اور حجروں کے اندر ضربیں لگا لگا کے اس طرح سے تلبیس کرنا اور اس طرح سے اس قوم کو الجھائے رکھنا' ان تمام عجمی سازشوں کے اندر۔یہاں آیا ہے وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا (21:11) یہ ہے ماڈل' یہ ہے اسوۂ حسنہ جو رسول اللہ ﷺ کا بتایا۔اس مقام پہ رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے لانے کے بعد پھر اگلی آیت ہے وَ لَمَّا رَاَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ ۙ قَالُوۡا ہٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ (33:22) جماعتِ مؤمنین نے جب اس مقام پر پھر ان لشکروں کو تو دیکھا' ان کے حوصلے بندھ گئے' خوف مبدل بہ اطمینان ہو گیا اور انہوں نے یہ کہا کہ ہاں! یہ تو وہی چیز ہے جس کا وعدہ ہم سے ہمارے خدا اور رسول نے کیا ہوا ہے۔وَ صَدَقَ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ ۫ (33:22) خدا اور اس کے رسول نے اپنے وعدوں کو سچ کر دکھایا ہے۔وَ مَا زَادَہُمۡ اِلَّاۤ اِیۡمَانًا وَّ تَسۡلِیۡمًا (33:22) اور اس سے ان کے دلوں میں اور تقویت آ گئی' ایمان بڑھ گئے۔ایمان بڑھنے کا نتیجہ آپ کو پتہ ہے کیا ہوا؟ وَّ تَسۡلِیۡمًا وہ اطاعت کے لیے اور جھک گئے۔عزیزانِ من! ایمان بڑھنا یہ ہوتا ہے۔یہ ہے وہ مقام' یہ ہے رسالت کا مقام۔حضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ زندگی کے ہر گوشے کے اندر ہمارے لیے ایک بہترین ماڈل ہے۔

خاندانِ نبوت تو اپنے ہاں انسانیت کے قلب و نگاہ میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کرنے کا عظیم پروگرام لیے ہوتا تھا

عزیزانِ من! وہ تو اتنی عظیم شخصیتیں یہ ہوتی تھیں انبیائے کرامؑ کی' وہ آتے اس لیے تھے کہ باطل کے ہر بڑے سے بڑے نظام کے ساتھ ٹکر لی جائے' اس کو پاش پاش کر کے رکھ دیا جائے۔اس کے بعد ایک آسمانی انقلاب' آسمانی نظام کہ جس میں انسان دنیا کی ہر غلامی سے آزاد ہو کر صرف خدا کے قوانین کے سامنے جھکنے کی اور اس کے سامنے تسلیم و اطاعت کی خو ڈالے۔یہ تھا رسول کا منصب' یہ تھا جو رسول کیا کرتا تھا۔یہ تھی رسول کی زندگی پہلے سے آخر تک۔تبلیغ یہ ٹھیک ہے کہ وہ قرآن کے احکام کو پہنچا تا تھا' تزکیہ

ٹھیک ہے کہ وہ انسانی جوہروں کی نشو ونما کے سامان بہم پہنچایا کرتا تھا۔ حکمت دانش مندی کی باتیں بتایا کرتا تھا' رموزِ مملکت کا وعظ کیا کرتا تھا' تمدن وتہذیب کے جتنے اسرار تھے' ان کو بے نقاب کیا کرتا تھا۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے رہنا سکھاتا تھا۔ وہ زمین پہ بیٹھے ہوئے آسمان کے ستاروں پہ کمندیں ڈال کے بتادیا کرتا تھا کہ خدا کے بندے کیا کر کے دکھایا کرتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے قلب و نگاہ کے اندر انقلاب پیدا کرتا تھا کہ جب تک انسان کی اندرکی زندگی کے اندر انقلاب پیدا نہ ہو' خارج میں انقلاب رونما نہیں ہوتا۔ لیکن قلب ونگاہ کا انقلاب مقصود بالذات نہیں تھا۔ مقصود بالذات یہ تھا کہ اس قسم کی تبدیل شدہ خصائل والے انسان اٹھیں اور دنیا میں صرف ایک خدا کا نظام قائم کر کے انسان کو ہر قسم کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کردیں۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے۔ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ (7:157) وہ آئے اس لیے تھے کہ انسانیت جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی ان زنجیروں کو توڑ دیں' جن بوجھوں کے نیچے دبی ہوئی تھیں' ان بوجھوں کو اٹھا کے پھینک دیں۔

امام کے قرآنی تصور کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے جنگِ اُحد میں مجاہدین کے نزدیک مالِ غنیمت کی اہمیت کو متعین کردیا گیا

عزیزانِ من! یہ کرنے کے لیے رسول آیا کرتا ہے۔ یہی تھا وہ رسول کا مقام' یہی تھا وہ رسول کا منصب کہ جس سے جنگِ احد کی بات شروع ہوئی تھی۔ مذہب میں تو امام کی حیثیت آپ کو معلوم ہے سوائے اس کے کہ وہ پانچ وقت میں آ کے مسجد میں آپ کی نماز پڑھا دے اور زیادہ کچھ تصور ہی ہمارے ہاں نہیں ہے۔ لیکن امام کا تصور جو قرآن دیتا ہے آپ کو معلوم ہے کہ جنگِ احد کی ابتدا کہاں سے ہوئی تھی؟ منصبِ رسالت ملاحظہ فرمایے۔ وَ اِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِکَ تُبَوِّیُٔ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ (3:121) رسول ﷺ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کے باہر نکل رہا ہے۔ کاہے کے لیے؟ کہ میدانِ جنگ میں مؤمنین کو (دیکھیے الگ SOLDIER کا تو لفظ آتا ہی نہیں قرآن کے اندر' ہر مومن SOLDIER ہوتا ہے وہاں تو) ان سپاہیوں کو' کیا کرے؟ یہ آج کی ان کی اصطلاح ہے جو جنگ کی: پوزیشنز کے اوپر رکھے۔ کیا لفظ ہے قرآن کا؟ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ (3:121) جنگ کے میدان میں مختلف پوزیشنز جو ہیں وہاں وہاں ان کو رکھے آ کے۔ دیکھتے ہیں آپ رسول کی ایک حیثیت یہ بھی ہے وہ میدانِ جنگ میں ایک سپہ سالار کی حیثیت رکھتا ہے' وہ کمانڈر ان چیف ہوتا ہے میدانِ جنگ کے اندر۔ اس کا منصب یہ بھی ہے کہ وہ سپاہیوں کو اپنی اپنی صحیح پوزیشن کے اندر آ کر وہ رکھتا ہے۔ یہاں سے یہ بات شروع ہوئی تھی کہ رسول یہ کچھ کرتا ہے۔ اب آیے جنگِ احد میں. وَ لَقَدۡ صَدَقَکُمُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗۤ (3:152) آپ کو معلوم ہے کہ جنگ کی ابتدا اس طرح سے ہوئی تھی کہ

پہاڑی میں ایک درہ تھا اس درے کے پیچھے سے بھی آنے کا راستہ تھا وہاں حضورﷺ نے تیراندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور یہ کہا کہ یہاں سے تم نے ہلنا نہیں، ہٹنا نہیں کہ یہ مقام بڑا نازک ہے۔ ادھر سے جنگ شروع ہوئی تو کامیابیوں پر کامیابیاں ہو رہی تھیں، سخت ہزیمت اٹھائی کفار کے لشکر نے مخالفین نے۔ جب وہ میدان کو چھوڑ کے بھاگے تو سامان اپنا چھوڑ دیا انہوں نے وہیں۔ جب یہ دشمن شکست کھا کے بھاگتے ہیں تو اس وقت اپنے ہتھیار دوسرا سامان اسے اٹھانے کی فرصت کسے ہوتی ہے، ہوش کسے ہوتا ہے اس وقت، وہ سب کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ عربوں کے ہاں جنگ کا جذبۂ محرکہ مالِ غنیمت کی لوٹ ہوتی تھی۔ وہاں ہوتا یہ تھا کہ فتح ہونے کے بعد جس سپاہی کے ہاتھ میں جو کچھ آ جائے وہ اس کا ہے۔ تو ان کے پیشِ نظر مقصد جنگ کی فتح کا یہ ہوتا تھا کہ مالِ غنیمت کو لوٹ لیا جائے۔ وہ تنخواہ دار تو ہوتے نہیں تھے اسی کے لیے وہ جنگ میں لڑنے کے لیے جاتے تھے۔ لیکن یہ جو انقلاب نبی اکرمﷺ نے برپا کیا ہے وہاں کیفیت یہ پیدا کر دی حضورﷺ نے کہ مالِ غنیمت کسی سپاہی کا حق نہیں ہوگا وہ سارے کا سارا ملت کی تحویل میں آئے گا، بیت المال میں داخل ہوگا اور وہاں ضروریات کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ ایک ہی جذبۂ محرکہ تھا ان کے سامنے جنگ کا اس جذبے کو اس طرح سے ختم کر دیا۔ یہ جنگ کاہے کے لیے لڑی جاتی تھی؟ یہ جذبہ تو ختم ہوا پھر باقی جذبہ کیا تھا؟ سلطنت قائم کرنے کا؟ کمزور قوموں کی زمینوں پر قبضہ کر کے ان پر حکمرانی چلانے کا؟ یہ جذبہ، تو خدا کے بندوں کا یہ جذبہ نہیں ہوتا۔

مجاہدین کی طرف سے جنگ کے فوری بعد پہاڑی کے ایک درے کو خالی کرنے کا نتیجہ

قرآنِ کریم نے دو لفظوں کے اندر بات صاف کر دی کہ جنگ کا جذبہ کیا ہوگا؟ عزیزانِ من! جنگ کا مقصد: وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ط وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ط (9:40) تاکہ باطل کا نظام مغلوب ہو جائے اور اس کی جگہ خدا کی بات بلندیوں تک پہنچ جائے۔ جنگ کا یہ مقصد ہو گیا صاحب۔ نہ جوع الارض نہ دوسروں کی زمینیں اور سلطنتیں کھینچنا، نہ کمزوروں پر جا کر ان کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ان پر اپنی مملکت قائم کرنا، قوت اور اقتدار قائم کرنا، ان کو EXPLOITE کرنا استحصال کرنا نہ۔ باطل کا نظام مغلوب ہو خدا کی بات بلندیوں تک پہنچ جائے۔ یہ جنگ کا محرک جذبہ جو تھا، یہ سامنے رکھ دیا۔ فتح حاصل ہو رہی تھی میدان میں غنیمت کا مال پڑا ہوا تھا۔ یاد رہے ان لوگوں کے ہاں مال و دولت تو اور کیا زیادہ ہوتا تھا، بھیڑ بکریاں ہوتی تھیں ان ہی کو وہ چھوڑ کے جاتے تھے۔ غنم کہتے ہی بھیڑ بکریوں کو ہیں۔ یہیں سے تو یہ غنیمت تھا۔ تو مالِ غنیمت میدان میں پڑا ہوا تھا یہ جو درے میں تیرانداز تھے انہوں نے دیکھا کہ اب تو فتح حاصل ہو گئی ہے، خطرہ ٹل گیا ہے۔ وہ اس انتظار کیے بغیر کہ کمانڈر کی طرف سے کیا حکم

ہمارے لیے ہوتا ہے' وہ وہاں سے نیچے اترے اور فوراً مالِ غنیمت کے اوپر آ گئے' درہ خالی ہو گیا۔ دشمن عقب میں تھا وہ فوراً اس درے سے اندر گھس آیا اور پیچھے سے آ کے جو اس نے یلغار کی ہے' میدان کا نقشہ بدل گیا۔ ابھی قرآن بتاتا ہے کہ پھر اس کے بعد نقشہ کیا ہو گیا تھا؟ یہاں سے بات شروع ہوتی ہے وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ (3:152) خدا نے جو تم سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر یہ صفات اپنے اندر پیدا کر لو تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں شکست نہیں دے سکتی۔ یہ وعدہ خدا کا سچا ہو رہا تھا۔ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ج (3:152) تم خدا کے قانون کے مطابق ان مخالفین کو ان سرکش فوجوں کو جو یوں یلغار کر کے آ گئی تھیں' تم ان کو تہ تیغ کر رہے تھے۔

میدانِ جنگ میں ملائکہ کی مدد کا مفہوم

دیکھیے یہاں بات میں سے بات آئی ہے۔ قرآن نے کہا ہے اس جنگ کے متعلق بھی کہ یہاں بھی ملائکہ نے مدد دی تھی۔ تو ہم نے تو یہ سمجھا ہے کہ ملائکہ کی مدد کے معنی ہوتے ہیں کہ ہم بیٹھ جاتے ہیں آرام سے اور وہ پھر ہماری توپیں بھی چلاتے ہیں' ہوائی جہاز سے بم بھی پھینکتے ہیں اور وہ سارا کچھ خود ہی کر جاتے ہیں۔ جب ہو ہوا جاتا ہے تو ہم جا کے پھر مالِ غنیمت سمیٹ لیتے ہیں۔ تقسیمِ کار ہے نا DIVISION OF LABOUR ' مار مرا کے بھگا کے وہ چلے جاتے ہیں تو انہوں نے مالِ غنیمت کیا کرنا ہے فرشتوں نے' ان کے تو کسی کام کی چیز نہیں ہے' وہ بے کار چیز چھوڑ جاتے ہیں' ہم جا کے سنبھال لیتے ہیں اور یوں ہم یہاں بھی مملکت کے وارث بن جاتے ہیں اور پھر جنت کے بھی وارث بن جاتے ہیں۔ کرتے کراتے سارا کچھ وہ ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن ہے ملائکہ کی مدد کے متعلق تو اس نے یہ کہا تھا کہ وَ لِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ط (3:126) تمہارے دلوں کے اندر ایک اطمینان پیدا ہو جاتا ہے' ایک نفسیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس میں تمہارا دل ثبات اور استحکام کا نشیمن ہو جاتا ہے' اطمینانِ قلب اس سے حاصل ہو جاتا ہے' اتنا ہی ہے۔ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ (3:152) قتل تم ہی ان کو کر رہے تھے' وہ نہیں کر رہے تھے۔ عزیزانِ من! یہ سارا کچھ انسان کے ہی دست و بازو سے ہوتا ہے۔ تم ان کو تہ تیغ کر رہے تھے بِاِذْنِهٖ ج (3:152) خدا کے قانون کے مطابق۔ اپنے کسی مقصد کے لیے نہیں۔ یہ کیفیت ہو گئی تھی حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ (3:152) کہ تم میں سے کچھ لوگ تھے جن کے پاؤں میں لغزش پیدا ہو گئی تھی۔ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ (3:152) جس بات کے لیے ان کو متعین کیا گیا تھا اس میں کچھ جھگڑا سا شروع ہو گیا آپس میں۔ نظر آتا ہے کہ وہیں کچھ بات ہو گئی ہو گی کچھ کہتے ہوں گے کہ نہیں ہمیں نہیں ہلنا چاہیے کچھ کہتے ہوں گے کہ نہیں' بات صاف ہو گئی اب یہاں ضرورت ہماری نہیں رہی اس لیے ہمیں آگے بڑھ جانا چاہیے۔

میدانِ جنگ میں اپنے کمانڈر کے حکم کی نافرمانی کا نتیجہ اور حضرت ابراہیمؑ کے اسوۂ حسنہ کا ذکر

وَ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ (3:152)۔ اور آگے ہے بات وَ عَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (3:152) وہ چیز کہ جس کو تم بہت پسند کرتے تھے، فتح و کامرانی میدانِ جنگ میں، وہ جب تم نے دیکھ لیا اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے کہ وہ فتح ہو رہی ہے۔ عین اس وقت عَصَیْتُمْ (3:152) تم نے اپنے کمانڈر کے حکم کی نافرمانی کی۔ آپ دیکھیے کہ جسے آپ اپنا کماندار تجویز کر لیتے ہیں اس کے بعد اس کے کسی ایک حکم کی نافرمانی سے بھی کیا چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیوں بات پیدا ہوئی؟ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ (3:152) عام ترجمہ تو یہی ہے کہ تم میں سے ایک گروہ وہ تھا کہ جو دنیاوی متاع کو چاہتا تھا، وہ اس پہ ٹوٹ پڑا۔ دوسرا وہ تھا جو آخرت کو چاہتا تھا۔ اس کے تو یہ معنی ہو گئے کہ یہ گروہ پورا دنیا داروں کا جیسے ہو جاتا ہے اور دوسرا گروہ تھا کہ اس نے صرف آخرت کو سامنے رکھا اس نے نہ چاہا کہ دنیا کے معاملات میں اس کا حصہ کچھ ہو۔ یہ تو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے قرآن تو دعا ہی یہ سکھاتا ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201) وہ تو دونوں کی خوشگواریاں مانگنا سکھاتا ہے اور دیتا بھی ہے اور مومن کی زندگی بھی وہ یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کے اندر بھی اس کی زندگی سرفرازیوں کی شادابیوں کی ہوگی، مستقبل میں بھی اس کی زندگی ایسی ہوگی۔ یہ جو ہے نا الدنیا اور آخرۃ: الدنیا کے معنی ہوتا ہے قریب تر پڑا ہوا، عاجلہ کہا ہے قرآن نے دوسری جگہ اس کو۔ الدنیا کا لفظی معنی ہوتا ہے نزدیک قریب۔ وہ سامنے پڑا ہوا جو مالِ غنیمت تھا وہ قریب تر نظر آ رہا تھا، بالکل اپنے پاؤں کے نیچے، ہاتھوں کے نیچے۔ اور ایک مفاد وہ ہے جو ذرا مستقبل میں جا کے ذرا بعد میں جا کے سامنے آتا ہے۔ میدانِ جنگ میں کامرانی کے بعد اطمینان سے ان تمام چیزوں کو نظام کے تابع بیت المال میں لے جا کے وہاں رکھ دینا۔ پوری امت کے مقاصد کے لیے اس کو صرف کرنا، اسے قرآن نے آخرۃ یہاں کہا ہے۔ اور خود جھپٹ پڑنا قریبی مفاد کے اوپر اسے اس نے الدنیا کہا ہے۔ ورنہ یہ نہیں ہے کہ یہ جو اس پہ لپٹ پڑے تھے (معاذ اللہ) وہ آخرت کے منکر ہو گئے ہوئے تھے۔ یہاں یہ معنی ہیں اس کے اور آخرۃ کے معنی ہی مستقبل ہوتا ہے۔ تو ان میں سے وہ تھے کہ جو یہ جو قریبی مفاد سامنے آ پڑا تھا ان کی آنکھوں کے، اس کے اوپر لپک پڑے۔ دوسرا وہ گروہ تھا کہ جس نے مستقبل کے مفاد کو اپنے سامنے رکھا وہ اس کے اوپر رہا۔ یہ تھے وہ دو گروہ جو یہاں کہا ہے۔ ہوا صرف اتنا ہی تھا کہ یہ جو سامنے غنیمت کا مال پڑا ہوا تھا، یہ اس کے لیے آگے آ گئے۔ ابھی تو ابتدائی دور تھا ان لوگوں کا اس لیے انہوں نے اس وقت یہ اپنا فیصلہ کیا اور اس پہ آ گئے اسے قرآن نے کہا ہے یُرِیْدُ الدُّنْیَا (3:152)۔ ہوا کیا؟ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ (3:152) بڑی عجیب بات قرآن کہہ گیا ہے۔ شرک میں، میں نے یہ عرض کیا تھا کہ توحید کے معنی یہ ہیں کہ پوری

کی پوری جماعت کے سامنے ایک نصب العین رہے۔ایک منتہا ہو' ایک مقصود ہو' ہم آہنگی ہو' یک نگہی ہو' پوری ٹیم کی طرح فٹ بال کے۔بال کو وہ ایک گول کی طرف لے جانے کے لیے ہر شخص کوشاں ہو' یہ توحید ہوگی۔اور اگر نگاہ اس گول اور منتہا اور مقصد سے ہٹ کے دوسری طرف چلی جائے تو کچھ لوگ ان کی نگاہ اُس مقصد کی طرف' کچھ لوگ جن کی نگاہ دوسری طرف "آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا" اسے شرک کہتے ہیں۔کیا بات کہہ گیا ہے قرآن؟ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ (3:152) تمہاری نگاہیں ان کی طرف سے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئیں اور جوں ہی نگاہوں کا رخ ذرا سا بدلا' فتح مبدل بہ شکست ہوگئی۔عزیزانِ من! زندگی کے میدانوں میں تو ہوتا ہی یہ ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ اور ہر توحید پرست کے متعلق جو کہا ہے حُنَفَآءَ لِلّٰهِ (22:31)' وہ خصوصیت سے ساتھ حُنَفَآءَ (22:31) کیوں کہا ہے؟ حنیف وہ ہوتا ہے کہ ہر وقت جس کی نگاہوں کے سامنے ایک نصب العین ہو اسی کی طرف وہ دیکھتا ہوا چلا جائے۔جسے کہا ہے کہ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (2:115) دنیا میں جہاں کہیں بھی تم ہو تمہاری نگاہوں کا رخ صرف اس کی طرف رہنا چاہیے۔

ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد کی نگاہ تو فضا کی پہنائیوں میں اڑنے والے پرندے کی مانند ہر آن اپنے آشیانے پر مرکوز ہوتی ہے

وہی پھر اقبالؒ کا شعر یاد آجاتا ہے ایسے مقام پہ۔کیفیت اس امت کی یہ ہونی چاہیے کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ

وہ ایک پرندے کی طرح اس فضا کی وسعتوں کے اندر یگانہ اڑتا پھرتا ہے سارا دن لیکن

نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

اس کی نگاہ ہمیشہ اپنے شاخِ آشیانہ پہ رہتی ہے وہاں سے نہیں بھٹکتا وہ۔

میدانِ بدر میں عین جنگ کے وقت مجاہدین کے لیے قرآنِ حکیم کی ایک کھلی وارننگ

مومن کے سامنے تو ایک ہی مقصد رہتا ہے زندگی کا' جوں ہی اس مقصد سے نگاہ دوسری طرف ذرا ہوئی' فتح شکست میں بدل گئی۔صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ (3:152) ایک گردش آئی اس کے بعد' پہلو بدل گیا' رخ' بدل گیا میدان کا نقشہ۔لیکن یہ ایک اجتہادی غلطی تھی میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے کی چیز نہیں تھی' صرف اتنی چیز ہوئی تھی۔اس لیے کہ میدانِ جنگ میں پیٹھ

دکھا کر جو بھاگنا ہے قرآن کی رو سے وہ تو بڑا ہی سنگین جرم ہے۔ بدر کا میدان ہے دنیا میں خدا کا نام لینے والوں کی کل کائنات تین سو تیرہ تھی۔ شمشیر بدست کفن بدوش میدانِ جنگ میں آ گئی تھی' ساری کائنات خدا کا نام لینے والوں کی وہاں جمع ہوگئی تھی۔ نچوڑ نبی اکرم ﷺ کی تربیت یافتگان کا پورے کا پورا سامان یہاں۔ ان کے ایمان میں تو کسی کو شبہ نہیں' ان کا تو اسوہ ہمارے لیے ایمان کی نشانیاں بنتا ہے جن کے لیے قرآن نے اسی وقت جنت کی بشارت دے دی تھی۔ یہ صحابہؓ وہاں کھڑے ہیں' یہ جماعت وہاں کھڑی ہے' ابھی ابھی حکم ہونے والا ہے ان کو یلغار کرنے کا کہ عین اس وقت ایک آیۂ جلیلہ نازل ہوتی ہے اور اس میں کہا جاتا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (8:15) ذرا سن لو آگے بڑھنے سے پیشتر اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا (8:15) جب تمہارا مقابلہ ہو دشمن کی فوج کے ساتھ فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ (8:15) دیکھنا پیٹھ دکھا کر میدان سے بھاگ نہ اٹھنا کہیں۔ خیر تلقین تو کی ہی جاتی ہے فرض ہوتا ہے سپہ سالار کا ایک مقام کے اوپر اپنے سپاہیوں کو تلقین کرے۔ خدا کی طرف سے یہ تلقین آ رہی ہے تلقین ہی نہیں پہلے تو کہا ہے فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ (8:15) دیکھنا پیٹھ دکھا کے نہ بھاگنا وَ مَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ (8:16) آج کے دن جو شخص تم میں سے میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائے گا بجز اس کے کہ وہ ایک WAR کی STRATEGY کے اعتبار سے اپنی جماعت سے ملنے کے لیے یا میدان میں جسے سٹریٹجی کہتے ہیں جنگ کی اس کا تقاضا کہیں ہو کہ ادھر کا رخ نہیں' ادھر کا رخ کرنا ہے' یہ بات اور ہے۔ شکست کھا کر ہمت ہار کر دشمن کو پیٹھ دکھا کر جو بھی وَمَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗ (8:16) جو بھی تم میں سے آج کے دن دشمن کو پیٹھ دکھا کے بھاگ گیا' کیا ہوگا؟ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ (8:16) اللہ کا غضب اس کے اوپر نازل ہو جائے گا۔ اور ہوگا کیا؟ وَ مَاْوٰہُ جَھَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (8:16) یہاں سے پیٹھ دکھائی اس نے سیدھا جہنم میں جا گرے گا۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

عزیزانِ من! یہ ہیں مقام۔ صحابہؓ کی زندگی' ساری عمر کی نمازیں اور روزے اور ان کے تمام اعمال جنہیں ہم کہتے ہیں نیکیوں کے سارے کے سارے ساتھ ہیں۔ لیکن انتہائی وقت ہوتا ہے نا یہ تو ایمان کی شہادت کا' شہید تو کہا اس لیے جاتا ہے کہ وہ اپنے اس عمل سے شہادت دیتے ہیں اپنے ایمان کی صداقت کی۔ نازک تریں وقت ہی وہ ہوتا ہے ایمان کا کہ جب جان جیسی عزیز تریں متاع جو ہے خدا کی بات کو اونچا کرنے کے لیۓ اسے بھی انسان قربان گاہ میں لے آئے۔ اور ایسے مقام میں کسی کا دشمن کو پیٹھ دکھا کے جو بھاگ جانا ہے' وہ اتنا بڑا سنگین جرم ہے کہ ان سے کہا جا رہا ہے کہ جوں ہی کسی نے پیٹھ دکھائی' بھاگا سیدھا جہنم کے اندر چلا

جائے گا۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے معافی دینے کا معیار اور لفظ عفو کا لغوی مفہوم

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو یہاں احد کے میدان میں واقع ہوا ہے' وہ پیٹھ دکھا کے نہیں بھاگے تھے' ایک اجتہادی غلطی تھی ان سے۔اسی لیے یہ کہا کہ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ (3:152) اس کو معاف کر دیا گیا۔معافی کے متعلق قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ مؤمنین کی خصوصیت یہ ہوتی ہے اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ (53:32) وہ بڑے بڑے جو جرم ہیں اثم اور فواحش کے ایسی چیزوں کو کہ جو سستی افسردگی پیدا کر دیں یا عام بے حیائی کے باتیں جو ہوں' بڑی بڑی چیزیں ہیں' ان سے تو ہمیشہ مجتنب رہتے ہیں۔اِلَّا اللَّمَمَ ؕ (53:32) لیکن بہرحال انسان ہیں یوں ہی چھوٹی موٹی سی کوئی بات جو ہے وہ کبھی ان سے سہواً سرزد ہو جاتی ہے' تو اس کے فوری بعد ان کو احساس ہوتا ہے۔وہ آیت آپ کو یاد ہوگی کہ جب گھومتا پھرتا ہوا بھی کبھی کوئی شیطان کا خیال آ جاتا ہے تو وہ فوراً خدا کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔وہاں بھی ذکر اللہ کہا گیا ہے۔اور اس کے بعد فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (7:201) جھٹ سے حقیقت ان کے سامنے واضح ہو جاتی ہے اور وہیں رک جاتے ہیں۔تو یہ جو چیز ہے نا کبھی کبھی ذرا سی لغزش آ جانا' یہ اس سے ایمان نہیں چلا جاتا۔وہ تو دل کے ارادے سے میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگنے والوں کی کیفیت بتائی تھی۔اس لیے یہاں یہ کہا ہے کہ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ (3:152) یہ دیکھیے یہ جو گنجائش رکھ دی ہے ان چھوٹی چھوٹی سی لغزشوں سے' عفو کے معنی ہوتا ہے' آگے گذر جانا' وہیں کھڑے ہو کے پکڑ نہیں لینا' دیکھنا اس کی طرف کہ دوبارہ نہ ایسا کرنا اور آگے چلے جانا۔قرآن کے کیا عجیب الفاظ ہوتے ہیں؟ خدا یہ کہہ کے ان کو آگے بڑھ جاتا ہے۔اور اس لیے کہ وہ بہت صاحبِ فضل ہے مؤمنین کے اوپر۔

جنگِ اُحد میں ایک نافرمانی کی بنا پر پیدا ہونے والی بدحواسی کے عالم میں نبی اکرم ﷺ کی عظمتِ کردار

اب دیکھیے وہ مقام جو میں نے کہا تھا کہ یہ جو وہاں سے درے کو چھوڑ کے آگے بڑھے' اس میں جو بھگدڑ مچی ہے تو بدحواسی کا عالم کیا ہوگا۔دوہری چیز ہوگئی نا ادھر اطمینان ہو گیا تھا کہ کامیابی ہوگئی میدان مار لیا ہم نے' دشمن ادھر سے بھاگ اٹھا تھا۔اور اُدھر سے اگر اچانک یک لخت پیچھے سے دشمن پھر آ کے چڑھائی کر دے تو یہ جو غیر متوقع چیز ہوتی ہے' اس سے بدحواسی کا عالم ہوتا ہے۔قرآن دیکھیے کیا کہتا ہے؟ اِذْ تُصْعِدُوْنَ (3:153) کیفیت تمہاری یہ تھی کہ بدحواسی کے عالم میں تم بھاگے چلے جا رہے تھے'

دوڑے چلے جارہے تھے۔ عجیب نقشہ ہے۔ وَ لَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ (3:153) کوئی ایک دوسرے کی بات نہیں پوچھتا تھا' دوسرے کی طرف نگاہ نہیں کر رہا تھا' یوں بھاگ رہے تھے بدحواسی کے اندر' بھگدڑ مچی ہوئی تھی' بدحواسی تھی' پریشانی تھی' نفسا نفسی تھی' یوں بھاگ رہے تھے۔ اور اس کے اندر ایک ذاتِ اقدس ﷺ۔ عزیزانِ من! یہ ہوتا ہے کمانڈر' حق ہی اس کو کمان کا جس کی کیفیت یہ تھی کہ تمہارا تو یہ عالم تھا وَّ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ (3:153) اور رسول اپنے مقام پہ کھڑا تھا پیچھے سے تمہیں آوازیں دے رہا تھا کہ کیا ہو گیا تم کو کہاں جارہے ہو' میں کھڑا ہوں اس مقام کے اوپر۔ عزیزانِ من! یہ ہے امام کا مقام۔ ہم نے تو سنی ہوئی باتیں ہیں۔ ہم میں جواب بھی اربابِ جیش ہیں' فوج سے متعلق احباب ہیں وہ اس کو APPRECIATE کریں گے کہ ایسے عالم میں بھی جب فوج کے سپاہیوں میں بھگدڑ مچ جائے' فوج کا جرنیل یا کمان کرنے والا جو ہے وہ اپنے مقام پہ کھڑا رہتا ہے اور وہ ان کو آواز دیتا ہے کہ میں یہاں کھڑا ہوں' تم کیوں بھاگے چلے جارہے ہو؟ اس سے نقشہ بدل جاتا ہے میدان کا۔ یہ کون ہے جو اس طرح سے یہ کہہ رہا ہے وَّ الرَّسُوۡلُ (3:153) منصبِ رسالت آپ دیکھ رہے ہیں کیا ہے۔ وہاں کہا تھا کہ صبح اٹھ کے یہ رسول تمام کو میدانِ جنگ میں پوزیشن پہ بٹھا رہا تھا۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ پوری فوج میں بھگدڑ مچ رہی ہے اور رسول ﷺ اپنے مقام میں روشنی کے مینار کی طرح کھڑا پیچھے سے آوازیں دے رہا ہے' کہاں بھاگ کر جارہے ہو۔

منصب رسالت کے لیے شبانی کی ضرورت' ہر لحہ تگ و تاز اور نت نئے مسائل کا سامنا

عزیزانِ من! یہ منصبِ رسالت یہ بات نہیں ہے کہ آگ لینے کو جائیں' پیمبری مل جائے۔ جہاں کہا ہے نا آگ لینے کو جائیں والی بات جو ہے' وہاں آپ دیکھیے سورۃ قصص میں وہاں کہا ہے حضرتِ موسیٰ کو جب منصبِ نبوت پہ سرفراز کیا۔ اور پھر میں یہاں کہہ دوں کہ انہوں نے چلے نہیں کاٹے تھے' مراقبے میں نہیں بیٹھے تھے' وہ تو چلے جارہے تھے اپنی بکریاں لے کے گھر والوں کے ساتھ۔ وہاں گئے منصبِ نبوت سے سرفراز کیا گیا' گردن جھک گئی اس احساسِ تشکر سے کہ میں اور یہ مقام' اللہ اللہ' شکر یہ ادا کیا بڑا احسان' بڑا کرم آپ کا۔ جواب ملا کہ موسیٰ! اس کرم نوازیوں کی ابتدا آج ہی نہیں ہوئی بہت پہلے سے شروع ہو گئی تھی۔ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہاری ماں سے ہم نے کہا تھا کہ اس نے تو کل کو ان سیاست والوں سے ٹکر لینی ہے' اس کی پرورش محلات میں ہونی چاہیے' دریا میں بہا دو اسے۔ کہاں وہاں سے بات شروع کی تھی ہم نے۔ یہ محلاتی سیاست کے جب تم رموز و اسرار سے واقف ہوئے' وہاں تمہارے ہاتھوں ایک قتل ہوا' وہاں سے تمہیں محفوظ ادھر بلایا کہ وہاں قوت کا مظاہرہ تھا' سیاست کا مظاہرہ تھا۔ اب شبانی کی زندگی بھی تمہارے لیے ضروری تھی کہ بہت سی بھیڑیں بکریاں تمہارے سپرد کی جائیں تو ان کے رکھوالے کیسے بنتے ہو تم۔ شبانی بھی

بڑی ضروری ہے منصبِ رسالت کے لیے۔عزیزانِ من! مشکل تریں کام ہے۔کسی چرواہے کو دیکھیے سہی باہر بے چارہ دن بھر پاگل ہوجاتا ہے ایک بکری ادھر کو چلی جارہی ہے، بھاگا بھاگا اس کو ادھر لا رہا ہے، دو ادھر بھاگی چلی جارہی ہیں، اسے پھر اس پہ لا رہا ہے، دوسرے کے کھیت میں نہ منہ مار دے، بھیڑیا نہ کہیں سے آجائے، پیچھے نہ رہ جائے۔بچہ ہوتا ہے گود میں اٹھائے ہوئے، ایک ہے اس کو مونڈھے پہ لادے ہوئے اور لیے ہوئے اپنا لٹھ دن بھر چلا جارہا ہے۔عزیزانِ من! یہ بھی منصبِ رسالت ہے اپنے افراد کی ان بھیڑوں کو اپنے غلے کے اندر رکھنا۔بات دوسری طرف چلی جائے گی۔آئیں گی وہ آیات تو بتاؤں گا جہاں وہ کہتے ہیں کہ حضرتِ موسیٰؑ سے کہا تمہارے ہاتھ میں یہ عصا ہے، اس سے کیا کرتے ہو؟ کہ صاحب! میں وہ پتے جھاڑتا ہوں، وہ بکریوں کو پتے ڈالتا ہوں۔بکریوں کو پتے ڈالنے کی بات کیا تھی؟ یہ تھیں بکریاں جو اس کے سپرد کی گئی تھیں اس کے لیے وہاں تربیت ہورہی تھی

نبوت کی سرفرازی میں امامت کا فریضہ یعنی بھیڑوں اور بکریوں کی (رعایا کی) تربیت کی ذمہ داری اور طاغوتی قوتوں سے مقابلہ

مدین کے میدانوں میں شبانی کے لیے کہ اس کے لیے بہت بڑا چرواہا اس نے بننا تھا۔اور یہ چرواہا ہے یہیں سے تو لفظِ رعایا اور رعیت نکلا ہے، رعیت تو کہتے ہی چرواہے کی بھیڑوں کو ہیں۔اور جو چرواہا اپنی بھیڑوں کا خون چوس چوس کے موٹا ہونا شروع ہوجائے، کیا وہ بھیڑیا ہوتا ہے یا چرواہا؟ دنیا نے چرواہے دیکھے ہی نہیں ہیں۔بھیڑیں تو اب بھیڑیوں کے سپرد ہی ہوتی چلی جارہی ہیں۔ہاں! تو کہا یہ کہ موسیٰؑ پھر تمہیں شبانی کے لیے یہ کیا گیا۔وہاں تم نے بارہ سال کا عرصہ گذارا۔کہاں ان کٹھالیوں میں سے ہم نے تمہیں گذارا ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰى قَدَرٍ (20:40) تب کہیں جاکے تم پیمانے پہ ہمارے پورے اترے تو پھر ہم نے تمہیں اپنے مقصد کے لیے چنا ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے؟ وہاں ہے یہ ان کٹھالیوں میں سے تمہیں گذارا پھر جاکر تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے۔تو تمہیں اس منصب کے لیے ہم نے چنا ہے۔کس منصب کے لیے؟ اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى (20:24) جاؤ آج دنیا میں سب سے بڑی جو طاغوتی سرکشی قوت ہے فرعون کی، جاؤ اور اس سے ٹکرلو۔ہمارے بندوں کو اس کے قبضۂ غلامی سے چھڑا کے لاؤ۔اس منصب کے لیے تمہیں تیار کیا جارہا تھا۔یہاں کہتے ہیں صاحب! نبوت یوں مل جاتی ہے؟ کبھی تو آگ لینے کو جائیں، مل جاتی ہے اور کبھی غاروں کے اندر ستو لے کے بیٹھ کے وہاں مراقبوں سے ریاضتوں سے، یوں مل جاتی ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بھی رسالت کا منصب تھا کہ وَّ الرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ (3:153) تم بدحواسی میں

بھاگے جا رہے تھے ایک ذات وہاں پیچھے کھڑی تھی' وہ تمہیں پیچھے سے آوازیں دے رہی تھی۔ ورنہ سب سے پہلے اس کو بھاگنے والوں میں ہونا چاہیے تھا' سب سے آخر میں کھڑا ہے۔ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ (3:153) یہاں یہ لفظ بڑا عجیب ہے اور اس کے دو معنی لیے جا سکتے ہیں ایک تو یہ چیز ہے کہ نقصان پر نقصان ہوتا چلا گیا تمہارا۔ فتح مبدل بہ شکست ہوئی اس سے پیشتر چند نفوس تھے کہ جن کی جانیں گئی تھیں۔ اس بھگدڑ کے اندر بدحواسی کے اندر بہت سا نقصان جانوں کا بھی وہاں ہوا' یہ بھی ایک چیز تھی۔ لیکن بِغَمٍّ (3:153) کے معنی اگر یہ لیے جائیں تو پہلا جو نقصان تھا اس کی جگہ ایک اور نقصان تمہارے سامنے جب آیا ہے تو پھر تم پلٹے۔

مومنین کے نزدیک نبی کی اہمیت' اس کی عظمت' وقار اور احترام کی وجہ جواز

عزیزانِ من! وہ نقصان کیا تھا؟ اس نقصان کے لیے پھر امام اور اس کے مقتدیوں کا باہمی رشتہ جو ہے اس کو دیکھیے۔ امام اور مقتدی مسجد کے نہیں۔ یہی امام اور یہ اس کے مقتدی یہ ان کا قائد اور وہ ان کے مقتدی ان کا باہمی رشتہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق۔ رشتہ یہ ہونا چاہیے کہ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (33:6) نبی مؤمنین کے لیے انہیں اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے۔ آہاہاہا۔ عزیزانِ من! یہ شخصیت پرستی نہیں۔ ہر چرواہا ہر رکھوالا بھیڑوں کے لیے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے کہ وہ ان کی جان کی رکھوالی کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں پھر فوج والوں سے پوچھیے وہ ان کا کمانڈر' وہ ان کا جرنیل جو اپنے کریکٹر سے' اتنا محبوب ہو جاتا ہے اپنی فوج میں' اپنے سپاہیوں کے اندر کہ پھر ہم نے یہ داستانیں سنیں کہ میدانِ جنگ میں اس کی جان کی رکھوالی تو ایک طرف رہی' اپنے جرنیل کی لاش لانے کے لیے سینکڑوں کی تعداد میں سپاہی جانیں دے دیتے ہیں۔ وہ ان کی نگاہوں میں اتنا محبوب ہو جاتا ہے۔ وہ ایک شخصیت یا ایک فرد یا ایک پیکر یا جسم نہیں رہتا' وہ ان کے لیے SYMBOL ہو جاتا ہے ان تمام خصائص و صفات کا جو ایک اچھے سپاہی کے اندر ہونی چاہئیں' وہ ان کے لیے ماڈل ہو جاتا ہے' وہ ان کے لیے اسوہ بن جاتا ہے۔ یوں وہ ان کے دلوں کے اندر گھر کر لیتا ہے۔ اور یاد رکھیے! دنیا میں سیاست کا میدان ہو' تمدن کی بساط ہو' میدانِ جنگ ہو' فتح اور کامرانی ان ہی کے لیے ہے کہ جن کے اوپر وہ کمان کر رہا ہے' ان کے دلوں میں اس کی اتنی محبت ہو جائے کہ وہ اپنی جان سے بھی زیادہ اس کو عزیز سمجھنے لگ جائیں پھر دنیا کی کوئی طاقت اس جماعت کو شکست نہیں دے سکتی۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (33:6)۔ لیکن یہ مقام اسے کس طرح حاصل ہوا تھا اس نبی کو؟ میں نے عرض کیا ہے کہ محض ذاتی عقیدت مندی نہیں ہے بلکہ قرآن اس کی وجہ بتاتا ہے۔ آج بھی جو چاہتا ہے کہ اس کے پیچھے چلنے والے اس کو اس طرح سے عزیز جانیں کہ اپنی جانیں قربان کر دیں' اس کی حفاظت کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (9:128) ایک رسول تمہارے اپنوں میں سے

ہی ایک رسول پیدا ہوا۔ بڑی ایک چیز ہے یہ بھی' تم میں سے اپنوں میں سے ہی' وہ پیدا ہونا چاہیے۔ تم میں سے ہی ایک رسول تمہارے اندر آیا۔ سنیے اس کی صفات کیا ہوئیں؟

نبی کی شخصیت صفاتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے

عَـزِيْـزٌ عَـلَيْـهِ مَـا عَنِتُّمْ (9:128) جس بات سے تمہیں ذرا بھی تکلیف اور اذیت پہنچتی تھی وہ اس کے لیے بڑی زیادہ مصیبت کا باعث بن جاتی تھی۔ اللہ اکبر! ایسا خیر خواہ۔ تمہارے پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھے اس کے آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک اٹھیں۔ امت کے ہر فرد کی تکلیف اس کے لیے اس سے زیادہ باعثِ اذیت بن جائے۔ عَـزِيْـزٌ عَـلَيْـهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَـلَيْـكُـمْ (9:128) جی اس کا چاہتا تھا کہ دنیا بھر کے مفاد کی چیزیں سمیٹ سمیٹ کر تمہارے لیے لے آئے۔ جیسے ایک چھوٹی سی چڑیا اپنے بوٹ (بچے) کے لیے لاتی ہے' دن بھر پھرتی رہتی ہے' یہاں سے وہاں' وہاں سے وہاں' خود نہیں وہ کھاتی اتنا سا ملتا ہے' جھٹ لاتی ہے اس کے منہ میں دینے کے لیے حَـرِيْـصٌ عَلَيْكُمْ (9:128) اس کی کیفیت یہ تھی۔ حریص کا لفظ دیکھیے تمہارے لیے اتنا لالچ تھا اس میں کہ دنیا میں جہاں کوئی اچھی چیز دیکھتا تھا' لے کے تمہارے پاس آجاتا تھا' لو لے لو کھاؤ۔ دیکھتے ہیں کیسے پھر وہ جان سے عزیز بنتا ہے؟ یوں جان سے عزیز بنتا ہے۔ بِـالْـمُـؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (9:128) خدا کی صفات ہیں رؤف اور رحیم۔ خدا کی ان صفات کا مظہر ہوتا ہے وہ رسول۔ ہر امام ہر لیڈر ہر کمانڈر ہر چرواہا اس میں یہ صفات پیدا ہوں تو پھر وہ جو پیچھے چلنے والے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فَـاَثَـابَـكُـمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ (3:153) جو قرآن نے کہا ہے' یہ کہا ہے کہ یہ نقصان تو تھا ہی جو تمہیں ہوا' پھر تمہارے سامنے اس سے ایک بڑا نقصان آیا کہ رسول اللہ ﷺ دشمن کے نرغے میں گھر گئے۔ افوہ! اسے برداشت کر سکتا تھا مومن؟ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب یہ انہوں نے دیکھا ہجوم کر کے حضور ﷺ کے گرد انہوں نے گھیرا ڈال لیا۔ کیفیت یہ تھی کہ ان کی پشت دشمن کے تیروں کی طرف تھی وہ بتا رہے ہیں کہ ایک ایک صحابیؓ کی پشت میں اس طرح سے تیروں کے گچھے' چھلنی انہوں نے کیا تھا جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتا ہوتا ہے۔ یہ کیوں تھا؟ ان صفات کی وجہ سے۔ کہا یہ کچھ اس لیے ہوا اور یہ سارا کچھ اس لیے ہوا لِّـكَيْلَا تَـحْـزَنُـوْا عَـلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَآ اَصَابَكُمْ (3:153) تاکہ آئندہ کے لیے تمہیں یہ ایک سبق مل جائے کہ اگر کوئی چیز دیکھتے ہو کہ سامنے پڑی ہے اور جا رہی ہے تو جانے دو اس کو' عدولِ حکمی مت کرو۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی نافرماں برداری مت کرو جو جا رہا ہے جانے دو اس کو۔ وَ لَا مَـآ اَصَـابَـكُـمْ (3:153) جو مصیبت آ رہی ہے آنے دو اس کو۔

جنگِ اُحد میں بدحواسی کے عالم میں مرکز کی ثابت قدمی نے مجاہدین کو فتح سے ہمکنار کردیا

عزیزانِ من! دو ہی چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت۔ دو ہی تو جذبے دنیا میں ہیں مصیبت نقصان سے اپنی حفاظت کرنا، مفاد کے پیچھے جانا۔ کہا یہ سارا کچھ جو کچھ ہوا ہے یہ تو ہوا ہے تم نے اگر اس سے یہ سبق حاصل کرلیا تو پھر کچھ نہیں بگڑا۔ اور وہ سبق یہ ہے لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ (3:153) تمہاری آنکھوں کے سامنے تم سے کچھ جاتا ہوا ہؤاس پہ دل میں ذرا سا خیال نہ آئے کہ جا رہا ہے۔ تمہیں کہا ہے' کھڑے رہنا ہے' کھڑے رہنا ہے۔ دشمن کا حملہ طوفان کی طرح سیلاب کی طرح بڑھتا ہوا چلا آ رہا ہے تمہارے سامنے' چلا آ رہا ہے' چلا آ رہا ہے تم نے اپنے مقام سے نہیں ہلنا۔ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (3:153) ہم خبر رکھتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ لا (3:154) اس بدحواسی کے بعد پھر اطمینان کی شکل پیدا ہوگئی۔ وہ جب پھر اس آواز کے بعد پلٹ کے آئے ہیں بات تو اتنی سی تھی' یہ مرکز وہاں موجود تھا اپنے مقام کے اوپر یہ کھڑا تھا' اس کے گرد ہی جمع ہونا تھا ان پروانوں نے اس شمع کے گرد' شمع نہیں بجھی تھی' پروانے آ گئے۔ پھر وہی لشکر آ گیا پھر اپنے مقاموں پہ آ گئے پھر شکست مبدل بہ فتح ہوگئی' پھر وہ جو خوف تھا اس کی جگہ پھر وہ اطمینان آ گیا۔ يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ لا (3:154)

جنگ کے دوران منافقین کا کردار سب سے زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے

اب یہ دیکھیے آپ دیکھیں گے یہ ساری زندگی جو شروع ہوئی ہے اس میں جماعتِ مؤمنین مخلص بندوں کی جماعت ہے۔ اس کے اندر کچھ لوگ ایسے بھی ملے ہوئے ہیں آ کر جنہیں قرآن بار بار منافقین کہتا ہے۔ ایسے لوگ کہ جن کے سامنے مقاصد کچھ اور تھے' وہ ان کے ساتھ آ ملتے تھے۔ عزیزانِ من! منافق کا وجود زندگی کے یوں تو ہر گوشے اور ہر مرحلے میں بہت بڑے نقصان کا موجب ہوتا ہے لیکن آپ سمجھیے کہ اگر میدانِ جنگ میں صفوں کے اندر یہ لوگ کہیں شامل ہو جائیں' اس وقت یہ کتنا بڑا عظیم نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اور یہ لوگ میدانِ جنگ میں بھی ساتھ جا کے شامل ہو جاتے تھے۔ آج کے درس کا یہ مقام نہیں کہ میں منافقین کے متعلق کچھ عرض کروں آگے چل کر یہ آئے گا تو میں سمجھتا ہوں کہ شاید کتنے ہی درس اس کے لیے چاہئیں۔ اس لیے کہ ہم نے ذہن میں سمجھ رکھا ہے کہ یہ کوئی الگ جماعت ہوتی ہے' کوئی الگ فرقہ ہوتا ہے۔ الگ جماعت اور فرقہ نہیں ہوتا' ہم ہی ہوتے ہیں کہ جب مقصد دل کے اندر کچھ اور ہوتا ہے اور اس کو اندر رکھا ہوا ہوتا ہے اور کسی اور بات کے لیے دوسرے کے ساتھ شامل ہوئے ہوئے ہوتے ہیں۔

اور نہ یہ کوئی مستقل چیز ہے کہ یوں پہچانا جائے' معلوم نہیں کس وقت منافقت کا جذبہ ابھر آئے۔ اور پہچاننے کے متعلق تو حضورﷺ سے یہ کہہ دیا گیا تھا خدا نے یہ کہا تھا کہ اگر ہم چاہتے تو ٹھیک ہے ان کے ماتھوں سے تم پہچان لیا کرتے' لکھ دیا کرتے ہم کہ یہ منافق ہیں۔ کہتے یہ تو بات نہ ہوئی پھر تو رعی ہو جاتی نا۔ کہا یہ ہے کہ تمہیں خود پہچاننا پڑے گا ان کو۔ نبی کی فراست بھی یہ ہوتی ہے۔ بہر حال کہا یہ کہ یہ اطمینان وسکون تم پہ طاری ہوا لیکن ایک گروہ ایسا بھی تھا کہ وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ (3:154) وہ ایسا بھی گروہ تھا کہ جن کے ارادوں میں بدستور لغزش رہی۔ انہیں نظر آتا رہا کہ جان کے لالے پڑ جائیں گے' بہت سے وساوس ان کے دل کے اندر آئے یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ ط (3:154) خدا کے متعلق بڑی بڑی بدگمانیاں ان کے دل میں آئیں ایسی ہی بدگمانیاں جیسی کہ اسلام سے پہلے عہدِ جاہلیت میں ہوتی تھیں۔ عزیزانِ من! ہم تو ایمان کی اس لذت سے ہی محروم ہیں' اس لیے اس کا ذکر ہی غلط ہے کہ ایسے مقام پہ بدگمانی کیا آیا کرتی ہے۔ لفظی ایمان ہوتا ہے نا ذرا سی کہیں تکلیف آتی ہے تو فوراً واویلا مچا دیا جاتا ہے کہ صاحب! یہ دیکھیے خدا نے یہ کیا کر دیا اور اگر خدا قادرِ مطلق ہے تو وہ یوں کیوں نہیں کر دیتا؟ سب کچھ تمہارے لیے وہی کرتا چلا جائے جب تو تمہارا خدا ہے اور کہیں تمہاری اپنی غلطی سے تمہارے خلاف کوئی بات ہو جائے تو پھر ایسے خدا کو مان کے کرنا کیا ہے صاحب ہم نے؟ ٹھیک ہے ہوا کرے۔ یہ ہے یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ ج (22:11)

منافقین کا کردار' اُن کی پہچان اور ان کی چالیں

قرآن کہتا ہے وہ ON THE FENCE بیٹھے ہوئے خدا کی عبودیت کا دعویٰ کیے ہوئے ہوتے ہیں لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ (4:143) نہ ادھر آتے ہیں نہ اُدھر جاتے ہیں مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ (4:143) مکھی کی طرح منڈلا رہے ہیں اوپر۔ ایک ایمان یہ بھی ہوتا ہے' اسے منافقت کا ایمان کہا ہے۔ یہ جو روز آپ کے ہاں یہ بدل رہی ہیں مسلکیں اور منشور اور یہ ساری چیزیں' یہ کیا ہیں؟ نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر ہیں مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ (4:143) یہ ہوتا ہے۔ مومن تو پہلے دن سے اپنے لیے ایک نصب العین متعین کر لیتا ہے اور اس کے بعد پھر ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) اس پر جم کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ کہا کہ وہ گروہ بھی تم میں تھا کہ جس نے خدا کے متعلق پھر اس قسم کی بدگمانیاں شروع کر دیں۔ یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ط (3:154) دیکھیے باتیں کس قسم کی منافق کرتا ہے؟ کہتا یہ ہے کہ صاحب! یہ معاملے جتنے ہیں یہ آپ ہی کچھ طے کر لیتے ہیں' ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ نہیں مانتے یہ۔ پہلی بات تو یہ ہے۔ اب ہوئی تنقید اس کے اوپر کہ ہونا وہ چاہیے جو ہم کہیں' یہ خود ہی کچھ کر لیتے ہیں۔ کہا قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهٗ لِلّٰهِ ط (3:154) ان سے کہو کہ نہ یہ طے کرتے ہیں' نہ تمہارا طے کردہ کچھ ہے یہ تو خدا کے قوانین کے مطابق کچھ بات

طے ہوتی ہے' امر سارا اس کے ہاتھ میں ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تم طے کرو یا یہ طے کریں اس کے لیے۔ اس کے اوپر آ جاؤ پھر تمہیں کوئی گلا ہی نہیں رہے گا۔ باقی رہا یہ کہ تم یہ جو کچھ کہتے ہو کہ ہم سے بھی پوچھا ہو يُخْفُوْنَ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ط (3:154) اے رسول! یہ اپنے دلوں میں وہ کچھ چھپائے ہوئے ہیں جو ظاہر نہیں کرتے آ کے' بات اندر کچھ اور ہے۔ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَىْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (3:154) کہتے ہیں کہ اگر ہم سے پوچھ لیا جاتا مدینے سے چلنے سے پہلے ہی تو یہاں یوں تو نہ خون خرابا ہوتا ہمارا' یوں تو نہ قتل و غارت ہماری ہو جاتی ہے' ہم سے وہیں پوچھ لیا جاتا' سیدھی بات ہے ہم وہیں کہہ دیتے کہ نہیں صاحب! جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ قُلْ (3:154)

آیت نمبر (3:154) کا وہ مفہوم جو کئی الجھنوں کا باعث ہے

ان سے کہو لَّوْ كُنْتُمْ فِىْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ج (3:154) یہاں اس آیت کا غلط مفہوم پھر بہت سی چیزیں غلط ذہنوں میں لے آتا ہے۔ عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ان سے کہو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کے لیے قتل ہونا مقدر ہو چکا تھا' لکھا جا چکا تھا' وہ ضرور اپنے قتل ہونے کی جگہ پہ آ ہی پہنچتے۔ پھر وہی بات آ گئی جو میں بار بار کہا کرتا ہوں کہ لاکھ وہاں بیٹھے رہو' جس نے قتل ہونا ہے' وہ تو کشاں کشاں اپنی قتل گاہ کی طرف آ ہی جائے گا' بچ ہی نہیں سکتا۔ اور وہاں کہا ہوا ہے وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (2:195) دیکھو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ اپنے آپ کو ڈالا کرو۔ وہاں حفاظت کے لیے اتنی تاکید کی ہوئی ہے۔ تو یہ بات ہی نہیں' معنی ہی یہ نہیں ہے۔ عزیزانِ من! بات تو دو گروہوں کی ہو رہی ہے کہ ایک گروہ تو یہ منافقین کا ہے' ان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر ہم سے پوچھ لیتے تو ہم یہاں کہیں آنے کا نام نہ لیتے۔ کہا ہے کہ تم اگر گھروں میں بھی رہتے یہ جماعتِ مؤمنین اگر ان کے اوپر ہم جنگ فرض کر دیتے تو یقیناً یہ اس میدان کے اندر آ کے جانیں دے دیتے اپنی۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (2:216) کے معنی ہیں جنگ فرض قرار دیا۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (2:216) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183)۔ کہا مؤمنین کی یہ کیفیت نہ ہوتی اگر ان کے اوپر جنگ فرض قرار دے دیا جاتا تو وہ یقیناً اس مقتل کے اندر آ جاتے خود آ جاتے وہ اس لیے نہ بیٹھ رہتے کہ یہاں آنے کے بعد تو صاحب! ہماری جان چلی جائے گی۔ وَ لِيَبْتَلِىَ اللّٰهُ مَا فِىْ صُدُوْرِكُمْ (3:154) یہ سارا کچھ بہرحال اس لیے ہوا ہے کہ جو کچھ کسی کے دل میں ہے' وہ ابھر کر باہر آ جائے۔

میدانِ جنگ وہ کٹھالی ہے جو کھوٹ کے ایک ایک ذرّے کو الگ کر دیتی ہے

عزیزانِ من! میدانِ جنگ تو ایسا ہے وہاں تو یہ سب کچھ خوب ابھر کے باہر آ تا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا تا کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے وہ ابھر کر باہر آ جائے۔ اور اگلی چیز ہے وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِىْ قُلُوْبِكُمْ ط (3:154) اور جو کچھ تمہارے دلوں کے اندر ہے اس میں سے کھوٹ کو الگ کر دیا جائے اور خالص کندن سونا الگ ہو کے رہ جائے۔ میدانِ جنگ وہ بھٹیاں ہیں جس میں کھرا اور کھوٹا نکھر کر الگ الگ ہو جاتا ہے۔ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (3:154) باتیں تم یہاں ان لوگوں کے سامنے کر سکتے ہو لیکن خدا سے کچھ نہیں چھپا سکتے وہ جانتا ہے۔ اب خدا کو تو اس کا علم ہوا تو اگر وہ علم ہمارے ہاں کسی کام نہیں آ تا تو ہمیں فائدہ کیا ہے خدا کے اس علم کا؟ کہ اسے وہ جانتا ہے۔ یہ جو چیز تھی نا کہ یہ اس قسم کے مواقع اس لیے سامنے تمہارے آتے ہیں کہ جو دلوں میں ہے، باہر آ جائے۔ وہ تو دلوں کے اندر بھی جانتا ہے جو کچھ ہے لیکن یہاں تمہارے معاشرے میں تمہارے جماعتی نظم ونسق کے اندر تو لوگوں کے سامنے بات آنی چاہیے نا کہ دلوں کے اندر کیا ہے۔ اس قسم کے حوادث اس قسم کے مواقع اس لیے آتے ہیں کہ دلوں کے چور ابھر کر پیشانیوں پہ آ جائیں۔ جو اس نے کہا ہے يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (55:41) کہ ایسی صورت ہو جائے گی کہ مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانا جائے گا۔

قرآنی معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دیتا ہے

عزیزانِ من! نظام ایسا ہونا چاہیے کہ جس کے اندر شریف اور بدمعاش کی تمیز یوں ہو جائے کہ فوراً پتہ چل جائے کہ یہ شخص جو ہے یہ کیا دل میں لیے ہوئے بیٹھا ہے۔ اور وہاں جو صاحبِ اقتدار ہوں پھر اس طرح سے کہیں وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (36:59) او بدمعاشوں کے گروہ! شریفوں سے الگ ہو جاؤ۔ یہ تو مخلوط معاشرہ ہے جس میں پتہ ہی نہیں چلتا انسان کو، ساری عمر ساتھ رہ رہا ہوتا ہے ہمسایہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کس وقت خنجر گھونپ دے گا۔ کہا اس قسم کے حوادث مواقع اس لیے آتے ہیں کہ جو کچھ اللہ جانتا ہے دلوں کے اندر، وہ انسانوں کے سامنے بھی آ جائے کہ کسی کے دل میں کیا ہے اور کسی کے اندر کھوٹ کتنا ہے اور وہ کھرا سونا کتنا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ لا (3:155) ہاں یہ لوگ کہ جو اس جنگ میں اس مالِ غنیمت پہ ٹوٹ پڑے تھے اور اس طرح سے پیٹھ دکھا کے یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ج (3:155) یاد رکھو! کہ وہ اس طرح سے میدانِ جنگ چھوڑ کے نہیں بھاگے تھے جیسا ہم نے وہ کہا ہے کہ وہ جہنم میں

چلا جائے گا بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ج (3:155) وہ ایک غلطی تھی جوان کو لگ گئی تھوڑی سی اجتہادی غلطی تھی جوان سے ہوگئی۔اسی لیے وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ط (3:155) یہ بات جو ہے خدا نے معاف کر دی آگے بڑھ گیا۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (3:155) واہ واہ واہ۔عزیزانِ من! میں نے کہا ہوا ہے قرآن کی آیتوں کے آخر میں جو خدا کی صفات آتی ہیں بڑی غور طلب ہوتی ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے' غفور اس کی تلافی کر دینے والا۔ اس کے نظام میں یہ بات موجود ہے کہ وہ اس کی تلافی کر دینے والا ہے' حفاظت کا سامان بہم پہنچانے والا ہے۔لفظ یہاں آیا ہے حلیم بڑی عجیب چیز ہے۔ ہمارے ہاں تو آپ کو پتہ ہے حلیم الطبع کس کو کہتے ہیں؟ ''جو مرضی کر دے رہو اوہدے نال اگوں کہے کچھ نہ' ہو جا ککھ مسیت دا''۔مومن کا تو یہ شعار نہیں ہے وہ تو اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) بھی ہے۔خود خدا کے متعلق بھی یہ ہے اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (85:12) بڑی سخت گرفت۔ وہ تو جبار بھی ہے المتکبر بھی ہے۔

لفظ حلیم کا عربی لغت کا مفہوم قابلِ غور ہے

یہ حلیم ہمارے معنوں میں ''اک حلیم اومحرم اچ ہوندی ہیگی اے نا''۔ادھر نہیں ہوتی' دلی میں ایک حلیم شریف ہوتی تھی۔ آخری جمعے سے پہلے جمعرات کی دو پہر سے ہی یا شام سے گرد و نواح کے لوگ سارے آ کے جامع مسجد میں جمع ہونا شروع ہو جاتے تھے۔ بہت بڑی جامع مسجد ہے' یہاں جیسے ہے۔ پھر اس کے باہر تک بھی ہزار ہا کی تعداد کے اندر بیٹھے ہیں۔ وہیں وہ روزہ افطار کر لیتے تھے وہیں ان کے لیے سامان لوگ بڑا کارِ ثواب سمجھتے تھے اس کو' ان کے لیے سحری بھی آ جاتی تھی' وہ کھا لیتے تھے۔ جمعۃ الوداع کی نماز کا ثواب ستر ہزار نمازوں کے برابر۔ جب وہ نماز پڑھ لیتے تھے جمعہ کی۔ روزے میں آخری جمعہ تو وہ توپ دغتی تھی' توپ دغی' یہ باہر بھاگے اور حلیم کی پکی ہوئی دیگیں یہاں سے وہاں تک وہ ہوتی تھیں (بکتا تھا وہ) اور وہاں آ کے فوراً انہوں نے حلیم کھانی شروع کی۔ اس حلیم کو حلیم شریف کہتے تھے وہ' دو پہر میں ہی روزہ توڑ لیتے تھے۔''اوحلیم ہوندی ایس واسطے اے پئی اوہدے اچ دانہ رڑکدا ای کوئی نئیں ہیگا''۔ آپ کو پتہ ہے یہاں حلیم کیا لایا ہے قرآن؟ ذرا سی لغزش ہوگئی تھی یہ جانتے تھے کہ دل کے ارادوں سے معصیت نہیں تھی' سرکشی نہیں تھی' ایک اجتہادی غلطی تھی۔ جبار اور مستبد حکومتیں جو ہیں ان کے سامنے کی تو اگر یہ صورت ہو کہ سلام کے لیے اتنا ہاتھ نہ اٹھے جتنا انہوں نے کہا ہوا ہے' اتنا سر نہ جھکے کہ جس کو وہ دیکھ کے کہیں کہ وہ جھکا ہے' تو اتنے سے ہی آپ کو پتہ ہے کہ پھر وہ کس طرح مشتعل مزاج ہو جاتے ہیں' کیا سے کیا کر دیتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ خدا کی قوتوں کا تو آپ نے دیکھ لیا کیا اندازہ ہے؟ کائنات ساری جھکی اس کے سامنے ہے۔ عربوں کے ہاں حلیم کہتے تھے ایک تو مرکھنا سا جانور ہوتا ہے نا کمزور سا۔ اس

کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ذرا کوئی اس کے پاس آئے تو اس کو اپنی جان کا خطرہ ہوتا تو وہ جھٹ سے مارنے دوڑتا ہے حفاظتِ خود اختیاری میں AGRESSIVENESS اس کی ہوتی ہے اپنی حفاظت کے لیئے وہ ذرا ذرا سی بات کے اوپر بھڑک اٹھتا ہے۔ ان کے ہاں ایک ایسے اونٹ ہوتے تھے بھاری بھرکم توانائیوں میں بھرے ہوئے پوری قوتوں والے سارے کے سارے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ بیٹھے ہوئے ہیں بچے آ رہے ہیں کوئی اوپر چڑھ رہا ہے کوئی کان مروڑ رہا ہے کوئی وہ تنکے سے کچھ کر رہا ہے۔ وہ یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یوں سر ہلا دیتا تھا اور اپنے مزے میں بیٹھا جگالی کر رہا ہے۔ ذرا ذرا سی بات کے اوپر بھڑک نہیں اٹھتا تھا اس لیے کہ اس کو اپنے مقام کا معلوم تھا بجائے خویش وہ بخود خزیدہ ہوتا تھا جم کے بیٹھا ہوا بچوں کی ذرا ذرا سی شرارتیں میرا کیا کر لیں گی؟ اس اونٹ کو وہ حلیم کہتے ہیں۔ ذرا ذرا سی لغزشوں کے اوپر بھڑک نہ اٹھے۔ اور ایسا حلیم وہی ہوتا ہے کہ جسے اپنے آپ پہ بڑا CONFIDENCE ہو کہ یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ کیا قرآن کی آیتیں ہیں؟ کیا خدا کی صفات وہ کہاں لاتا ہے؟ کس مقام کے اوپر لاتا ہے؟ افوہو۔ ٹھیک ہے لغزش ان سے ہوگئی لیکن لغزش تھی

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سرکشی نہیں تھی ایک غلطی ہوگئی تھی۔ اس غلطی سے ہمیشہ کے لیے مردودِ درگاہ بنا دیا جائے ان کو؟ پھٹکار کے رکھ دیا جائے؟ یہ بات نہیں۔ وہ خدا حلیم ہے چھوٹی چھوٹی سی باتوں پہ بھڑک نہیں اٹھتا اس لیے کہ وہ بخود خزیدہ ہے محکم ہے اپنے مقام پہ بیٹھا ہوا ہے اسے پتہ ہے کہ ان باتوں سے کچھ نہیں بگڑ جاتا۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ (3:155) پھر شکست کو فتح سے بدلا تو غفور ہو گیا حفاظت کا سامان پہنچا دیا۔ باقی رہے یہ ان کے متعلق عَفَا اللّٰہُ عَنۡہُمۡ ط (3:155) ٹھیک ہے اس لیے کہ وہ حلیم واقع ہوا ہے چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر بھڑک نہیں اٹھتا۔

مومن اور کافر کے اندازِ زیست میں ایک بنیادی فرق کی وضاحت

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (3:156) عزیزانِ من! یہاں پھر کفر اور ایمان کے امتیاز کی ایک بات آ رہی ہے۔ اے جماعتِ مؤمنین! کافروں کا شعار نہ اختیار کر لینا تم نے۔ کیا ہے کفر کا شعار؟ کون سی چیز ہے جو یہاں بتائی گئی کہ کفر ہے یہ؟ کہتے ہیں کفر یہ ہے کہ ان کی کفار کی طرح نہ ہو جانا جو کہتے ہیں وَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِہِمۡ اِذَا ضَرَبُوۡا فِی الۡاَرۡضِ اَوۡ کَانُوۡا غُزًّی لَّوۡ کَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَ مَا قُتِلُوۡا ج (3:156) عزیزانِ من! ایک اندازِ زیست (زندگی کا انداز) یہ تھا

کہ ''بدریا در منافع بے شمار است''۔ٹھیک ہے سمندر میں دریا میں بہت سے منافع ہوتے ہیں' موتی ملتے ہیں' وہاں بڑی بڑی چیزیں ملتی ہیں' منافع ہوتے ہیں' وگر خواہی سلامت بر کنار است۔لیکن بھائی اگر سلامتی چاہو تو پھر وہ کنارے پہ بیٹھے رہنے سے ہوتی ہے۔دریا میں جانے سے خطرہ ہے ایک اندازِ زیست یہ ہے۔

نہ تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

خطرات سے ڈرنا یہ ایک اندازِ زیست ہے۔امن کی جگہیں تلاش کرنا خواہ وہ ابدی محکومی کیوں نہ ہو' غلامی کی زندگی کیوں نہ ہو' قفس کی زندگی کیوں نہ ہو۔جان اتنی عزیز' خطرات کے مقابلے سے ہر وقت ڈرتے چلے جانا' ایک یہ اندازِ زیست ہوتا ہے۔کہا یہ کفر کا اندازِ زیست ہے یہ کافرانہ زندگی ہے۔مومن کی زندگی یہ ہے' اسی سعدی کی مثال کو الٹا تا ہوں اس نے کہا تھا کہ

بدریا در منافع بے شمار است
وگر خواہی سلامت بر کنار است

اور یہ کہتا ہے کہ

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا
نوائے زندگانی نرم خیز است

ساحل کے اوپر محفل آرائیاں مت کرو کہ وہاں زندگی کا نغمہ جو ہے بڑی نرم آواز میں ہوتا ہے

بدریا غلط و با موجش در آویز

کود جا سمندر کے اندر ان کی موجوں کے ساتھ لڑ جا کر اس لیے کہ

حیاتِ جاوِدان اندر ستیز است

ابدی زندگی چاہتے ہو' تصادمات میں ہے' لڑائی میں ہے' پیکار میں ہے' کفر اور باطل کے نظاموں کے ساتھ ہر وقت ٹکر لینے کے اندر زندگی ہے۔یہ ہے رازِ حیات۔اگر خواہی حیات اندر خطر زی وہ تو یہ کہتا ہے کہ سفر با کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است۔میں تو کعبے کی طرف اس لیے نہیں گیا کہ کہتے ہیں راستہ بے خطر ہے۔مومن کی زندگی ستیز کی زندگی ہے' خطرات سے مقابلے کی زندگی ہے' ٹکراؤ کی زندگی ہے' ہر باطل کی قوت کے سامنے ضربِ کلیمی کی زندگی ہے' یہ ہے مومنانہ شعار۔آیئے آیت کی طرف۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا (3:156) عزیزانِ من! یوں نہ گذر جایے ان آیات کے اوپر۔ کفر اور ایمان کی تمیز بتائی جا رہی ہے اندازِ نگاہ' نہجِ زندگی۔ کفر یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں سے کہہ رہے تھے کہ بھئی! خوامخوہ کے لیے یوں ہی نکل گئے' دنیا میں چلو پھرو جا کر ADVENTURES کرو' RISK لو' جنگ ہوتا ہے تو اس میں جاؤ' دیکھیے نا۔ گئے کس مصیبت میں پھنس گئے لو وہ مارا ہی گیا' یہاں اگر ہمارے پاس بیٹھے رہتے' بالکل امن میں رہتے صاحب۔ یعنی ان کے نزدیک' جہاز بنایا اس لیے جاتا ہے کہ بندرگاہ میں اس کو کھڑا رکھا گیا' اس لیے کہ وہ اگر سمندر میں بھیجا گیا' ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔ تو جہاز اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ بندرگاہ میں رکھا جائے ان کو۔ کہتا ہے دیکھا نا ڈوب گیا۔ آپ کو پتہ ہے اس اندازِ نگاہ نے آج بھی ہمارے ساتھ کیا کر رکھا ہے؟

چاند کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں حضرت انسان کو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا پڑی تھیں

یہ قومیں رسک لینے والی قومیں خطرات کا مقابلہ کرنے والی قومیں: زمین کو مسخر' فضا کو مسخر کیا چاند کو مسخر کیا۔ میں کہتا ہوں کتنا بڑا رسک ہے اس کے اندر سوچیے تو سہی اس دن پوری دنیا کے دل کانپ رہے تھے جس دن وہ ان کا اپالو اس کے قریب جا رہا تھا اور یہ تھا انہوں نے کہا تھا کہ اگر وہ سیکنڈ کے کروڑویں حصے کے مطابق بھی اس کی رفتار کے اندر ذرا سا فرق آ گیا تو وہ اس طرح سے ٹکرائے گا لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (76:1) یعنی اس کا کوئی ذرہ بھی کہیں نظر نہیں آئے گا۔ یہ ان کو پتہ تھا' یہاں اڑنے سے پہلے یہ کیفیت تھی۔ اور آنے کے بعد انہوں نے جو ایک بات کہی تو وہ تو اس سے بھی زیادہ ہول آتا تھا۔ وہ جو گاڑی وہاں سے الگ کر کے چاند پہ اتاری تھی اس میں انہوں نے کچھ پٹرول جمع کیا تھا وہ اندازہ لگایا تھا کہ اتنے وقت کے لیے یہ یوں جائے گی پھر اس میں سے یہ اتنی اتر جائے گی اتنا وہ باقی رہے گا پٹرول۔ پھر وہ واپسی جہاز تک ملانے کے لیے کافی ہوگا۔ وہ جو وہاں گئے ہیں تو کوئی ایک چکر کسی طرح سے زیادہ لگ گیا' وہاں سے انہوں نے نہیں یہ بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا یہاں آنے کے بعد جب وہ اتاری ہے' ہم نے' وہ جہاز تو الگ ہو گیا۔ یہ چاند کے اوپر اس گاڑی کو اتار کے جو بیٹھے اس میں دیکھا تو اس اندازے سے تیل کم تھا اس میں۔ سوچیے تو سہی کہ یہ گاڑی اڑے اور پٹرول راستے میں ذرا پہلے ختم ہو جائے یہاں پٹرول پمپ سے دس قدم کے فاصلے پہ ختم ہو جائے تو وہ کتنے ہی آدمی وہ اللہ اللہ کر کے گاڑی کو دھکیل رہے ہوتے ہیں۔ وہاں اگر پٹرول ختم ہو جائے؟ انہیں ان تمام خطرات کا علم تھا اس لیے انہوں نے یہ کہا تھا کہ بدریا غلط و با موجش درآویز تسخیر، ارض و سما تو وہی کر سکتا ہے جو خطرات کا مقابلہ کرنے والا ہو۔ عزیزانِ من! یہ چیز انسان کو سب سے پہلے قرآن نے سکھائی تھی۔ مومنین کی جماعت جو پیدا کی تھی اس نے کہ ''بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے''۔ آج وہ امن کی جگہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ جب باہر ذرا سا خطرہ ہوتا ہے'' تے مسجد اچ جا وڑ دے ہیگے نیں اندروں بو ہا مار کے کہ

آ جاؤ اتھے آ جاؤ''۔ یہ کہہ رکھا ہے کہ صاحب! مسجد کے اندر اگر کوئی بوٹ سمیت آیا تو مسجد کی بے حرمتی ہوگی۔ وہ مسجد کی حرمت اور بے حرمتی نہیں ہوتی' وہ گوشے میں قفس میں مجھے آرام بہت ہے۔''یعنی اومسیت ایس کم اوندی ہیگی اے او ہناں دے۔ ساری عمر گنیش جی نوں پوجدا رہیا' اواپناں کو جناں وٹا ہوندا ہیگا' روٹیاں پکاندا سی پیا' او لاگے گنیش وی پئے ہوئے ہیگے سن۔ روٹی توے تے لگا پان' کتا آیا او جیہڑی پکی ہوئی روٹی سی او منہ اچ لئی' تے ایووں نسا' او ہنے ایدھر اودھر تکیا' کچھ نہ نظر آیا' او گنیش جی پئے ہوئے سن تے' دبا ماریا او ہدے منہ تے آ وجیا بتھاڑ دے اُتے اور روٹی سٹ کے نٹھ گیا' کہن لگا ساری عمر تیری بندگی کردا رہیا کم اج آیا ایں''۔ جب باہر گرفتاریاں شروع ہو جائیں تو یہ مسجد میں آ جاتے ہیں''کہ آج کم آئی اے''۔ عزیزانِ من! وہ تربیت گاہیں کہ جہاں جان دینا سکھایا جاتا تھا' آج وہ جان چھپانے والوں کے کمیں گاہیں بن کے رہ گئی ہوئی ہیں۔ وہ دین تھا یہ مذہب ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خدا آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

ہمارے ہاں آج مسجدیں اس کام آتی ہیں کہ باہر اگر گرفتاری ہو رہی ہے تو مسجد میں جا کے چھپ جاتے ہیں۔

حیات بے شرف اور مرگ باشرف میں اتنا فرق ہے جتنا زمین اور آسمان میں اور جتنا عمر اور زندگی میں

کہا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا (3:156) عزیزانِ من! اس پہ میں زور دے رہا ہوں' کفر کی ذہنیت نہ اختیار کر لینا کہ خطرات میں جانے والوں کے متعلق وہ یہ کہیں کہ صاحب! وہاں گئے اور خواہ مخواہ کے لیے مر گئے اگر یہاں ہمارے ہاں رہتے تو کاہے کو مرتے۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ حیاتِ بے شرف اصل میں مرگ ہے' وہ مرگِ باشرف درحقیقت حیات ہے وَ لَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ (2:154) زندہ تو وہ ہیں جنہوں نے جان دے دی تم تو چلتے پھرتے لاشے ہو۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا غور فرما لیا کفر اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ؕ (3:156) ٹھیک ہے ان کو بیٹھے رہنے دیجیے چوڑیاں پہن کے گھر کے اندر' کہنے دیجیے کہ نہ جاتے تو نہ مرتے' جانے والے جو ہیں جو کچھ وہ

لے کے لوٹیں گے ان کے سینے میں وہ حسرت بن کے کانٹا بن کے چبھے گا وہ۔ آہاہاہا۔ وہ سرفرازیاں۔ وَ اللّٰهُ يُحۡیٖ وَيُمِيۡتُ ط (3:156) تم نے موت اور زندگی کے پیمانے اپنے مقرر کر رکھے ہیں' تم نے DEFINITION ہی کچھ اور مقرر کر رکھی ہے زندگی اور موت کی۔ خدا کے پیمانوں سے پوچھیے کہ زندگی کسے کہتے ہیں اور موت کسے کہتے ہیں بات سمجھ میں آ جائے گی۔

میرا دیں نفس گدازی' تیرا دیں نفس شماری

تو سانس گننے کا نام دین سمجھ رہا ہے' یہاں تو سانس کو گداز کرنے کا نام دین ہوتا ہے۔ خدا کے پیمانوں سے ماپیے' زندگی کسے کہتے ہیں' موت کسے کہتے ہیں۔ وَ اللّٰهُ يُحۡیٖ وَ يُمِيۡتُ ط وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ (3:156) موت اور حیات تو اعمال سے بنتی ہے اور بگڑتی ہے سانس لینے سے نہیں۔ سانس میں تو کوئی عمل ہی نہیں ہوتا' سانس تو پودے بھی لے رہے ہیں۔ ہر وقت ہم سانس لیتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی سانس لینے کا نام ہے تو یہ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ (3:156) کیا کہا ہے؟ یہ يُحۡیٖ وَ يُمِيۡتُ ط (3:156) کی نئی DEFINITION کیا ہوئی ہے؟ یہ عمل ہے کہ جس سے موت اور حیات کا تعین ہوتا ہے۔ سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہے۔ سارے حیوانات سانس لے کے زندہ رہتے ہیں' اسے زندگی تو نہیں کہا جاتا۔ اس لیے زندگی اور موت کی DEFINITION خدا سے پوچھو' اس کا تعین انسان کے اعمال سے ہوتا ہے' سانس لینے سے نہیں ہوتا۔

موت وحیات کے پیمانے تو صرف قرآنِ حکیم ہی متعین کرتا ہے

عزیزانِ من! ہم سورۃ اٰلِ عمران کی آیت 156 پہ آ گئے۔ دو منٹ اور دے دیں تو ایک آیت اس کے ساتھ ہی ہے پھر نیا مضمون شروع ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ موت اور حیات کے پیمانے ہم سے مانگو۔ وَ لَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَوۡ مُتُّمۡ لَمَغۡفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحۡمَةٌ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ (3:157) اگر تم اس طرح سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلو' وہاں قتل ہو جاؤ' وہاں مر بھی جاؤ' یہ ہے حیاتِ جاوید اں جس طرح سے ملتی ہے۔ وَ لَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ لَاِالَی اللّٰهِ تُحۡشَرُوۡنَ (3:158) اس لیے کہ یہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے یہ زندگی آگے بڑھنے والی چیز ہے' سانس کے ساتھ ختم ہونے والی نہیں ہے۔ وہاں بھی تو تم اس طرح سے ایک اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے اکٹھے ہو گے اس لیے یہ نہ کہو کہ جو یہاں مر گیا' ابدی طور پر موت وارد اس پہ ہو گئی۔ موت تو اس پہ ہے جو موت سے بھاگ کے تمہارے ہاں جینا چاہتا ہے۔ تم اگر اپنے دعوے میں سچے ہو فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (2:94) سچے ہو تو اس موت کی تمنا کرو۔ اور یہی وہ موت ہے جس کے متعلق کہا تھا اس کہنے والے نے کہ

نشانِ مردِ مومن با تو گویم

مردِ مومن کی نشانی تمہیں بتاؤں میں کیا ہوتی ہے؟

چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

موت آتی ہے تو تبسم اس کے چہرے پہ آ جاتا ہے۔

ہم سورۂ آلِ عمران کی 159 آیت سے اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

ستائیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 159 تا 163)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1970ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ الِ عمران کی آیت 159 سے ہوتا ہے: (3:159)۔

میدانِ جنگ میں کمانڈر کے کردار اور مجاہدین کے جذبۂ شہادت کا نتیجہ

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں بات یہ سامنے آئی تھی کہ ایک لیڈر کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں؟ وہ کیا چیزیں ہیں جن کی وجہ سے سپاہی اپنے کمانڈر پر جان چھڑکتے ہیں؟ اس کی حفاظت تو ایک طرف رہا' اس کی لاش تک کے لانے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ اسے ذرا سا بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو اس کے گرد ایک حصار باندھ دیتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم جنگِ احد کے سلسلے میں ان واقعات کو سامنے لاتا ہے اور اس کے ساتھ بتاتا یہ ہے کہ اس لیے تھا کہ خود اس لیڈر' اس سربراہ' اس جرنیل' اس کمانڈر کی خود کیفیت یہ تھی کہ **لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ** (9:128) تم میں سے وہ رسول تمہارے پاس آیا جس کی کیفیت یہ ہے کہ تمہیں اگر ذرا سی بھی کہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مضطرب و بے قرار ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں یہ آرزو موجزن رہتی ہے کہ دنیا بھر کی خوشگواریاں سرفرازیاں اور بھلائیاں تمہارے لیے اکٹھی کرتا چلا جائے۔ وہ اپنی جماعت کے افراد کے لیے بے حد رؤف اور رحیم واقع ہوا ہے۔ خدا کی یہ صفات اس کے اندر ہیں جن کا اظہار علیٰ حدِ بشریت اس کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیڈر اور جرنیل کی یہ خصوصیات ہیں جن کی

بنا پر اس کے پیچھے چلنے والے، اس کے زیرِ کمان، اس کا بال نہیں بیکا ہونے دیتے اور ذرا سی تکلیف کا بھی احتمال اگر پہنچتا ہے تو اپنی جانیں تک اس کے اوپر نثار کر دیتے ہیں۔ یہی سلسلہ آگے بڑھتا ہے جہاں سے آج درس کا آغاز ہو رہا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے سلسلہ میں زیرِ نظر آیت کا مروجہ ترجمہ 'نرم دل' کرنا موقع کی مناسبت سے درست نہیں

کہا کہ فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ج وَ لَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ص (3:159) یہ بھی نوازش ہائے خداوندی میں سے ہے کہ اے رسول تیری کیفیت یہ ہے (میں پہلے عام ترجمہ اس کا پیش کروں گا) کہ تو بڑا نرم واقع ہوا ہے اگر کہیں کیفیت یہ ہوتی کہ تو درشت سنگ دل واقع ہوتا تو یہ لوگ تجھے چھوڑ کر بھاگ جاتے، تیرے حلقے میں کبھی نہ رہتے۔ اس چیز کو دہرایا ہے یہاں خدا نے۔ یہاں ایک چیز بڑی توجہ طلب ہے اور میں کہتا ہوں کہ بار بار آپ کے سامنے میں نے اسے دہرایا ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے لیکن الفاظ کا انتخاب بتا رہا ہے کہ یہ واقعی آسمانی کتاب ہے، خدا ہی اس قسم کے الفاظ انتخاب کر سکتا تھا۔ بات یہاں ایک لفظ یہاں آیا ہے فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ج (3:159) ترجمہ ہو گیا کہ نرم دل واقع ہوا ہے، تو نرم واقع ہوا ہے۔ لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے الفاظ سے یوں ہی آگے نہیں گذر جانا چاہیے۔ تدبر، تفکر کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہو کے انسان سوچے کہ یہاں یہی لفظ کیوں آیا ہے؟ ایک لفظ میں آپ دیکھیں گے کہ اسلام کی بنیادی تعلیم اس کے اندر آ گئی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ ایک لفظ جس کے معنی نرم ہونا ہے اس کے اندر بنیادی تعلیم آ رہی ہے۔ اور اس لیے بھی خاص طور پہ آ رہی ہے کہ یہ خصوصیت بتائی گئی ہے رسول اللہ ﷺ کی، لیڈر کی، جرنیل کی، سربراہ کی ایک لفظ کے اندر۔ نرم ہونا یہ بھی ایک خوبی ہے لیکن ہر مقام پہ نرم ہونا زندگی تو اس طرح سے نہیں چل سکتی۔ عیسائیت نے یہی سوچا GOD IS MERCY اور قدم قدم پر انہیں اس خدا کو چھوڑ دینا پڑا جس کے متعلق زبان سے کہتے گئے GOD IS MERCY۔ GOD IS MERCY کے معنی پھر یہ ہوئے کہ خدا کے نام لینے والے بھی ان کو بہر حال زندگی کے ہر گوشے میں، ہر موقع پر، ہر حادثے میں ہر واقع ہمیں رحم دل ہونا چاہیے۔ اور یہ جو آئے دن لڑائیاں ہوتی ہیں، جنگیں ہوتی ہیں، ساری تاریخ عیسائیت کی پٹی پڑی ہے۔ تنگ آ کر مجبور ہو کر پچھلی WAR کے اندر ان کے ہاں عیسائیت کے سربراہوں کو یہ فتویٰ دینا پڑا کہ نہیں! ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں جنگ کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس فتوے کے ماتحت یا جو کچھ یہ کرتے رہے اس کے ماتحت وہ GOD

IS MERCY جوتھا اس خدا کو تو چھوڑا گیا نا۔ ایک قوت والے خدا کا تصور پھر سامنے آیا۔ خود ان کی تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ زبان سے بے شک وہ یہی کہتے رہے لیکن قوت اور سختی کے بغیر زندگی میں چارہ ہے نہیں۔ زندگی کے ایسے گوشے آتے ہیں جہاں سخت ہونا پڑتا ہے۔ لیکن صرف سختی بھی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے گذارا ہو جائے۔ ہر وقت ہر آن ہر گوشے میں انسان سخت ہی ہوتا چلا جائے' نرم بھی ہونا پڑتا ہے۔ زندگی کی یہ دو بنیادی خصوصیتیں ہیں ان کے لیے موقع اور محل کون سا ہو' یہ چیز ہے دیکھنے کی۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ ساری زندگی کے اندر زندگی کے ہر گوشے کے اندر ایک ہی خصوصیت رہے گی۔ یا سختی رہے گی یا نرمی رہے گی۔ یہودیت زندگی کے ہر گوشے میں سختی کی تلقین کرنے والی۔ خدا کے ہاتھ میں آتشیں کوڑا ہوتا تھا ان کے ہاں' وہاں MERCY نرمی کا تصور ہی نہیں تھا۔ بالکل اس کا ری ایکشن تھا جو عیسائیت آئی ہے۔ اس نے خدا کو یکسر رحم اور MERCY قرار دیا آتشیں کوڑا اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ نہ وہ چیز ایسی تھی کہ جس میں زندگی پنپ سکتی' نہ عیسائیت کا یہ تصور تھا کہ جس میں اس کی نمود ہو سکتی۔ یہ دونوں چیزیں ہونی ضروری ہیں۔ قرآن نے مختلف مقامات پر اس کے متعلق کہا ہے **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ** (48:29) ایک ہی مقام پہ آپ دیکھتے ہیں کہ دونوں خصوصیات زندگی کی کیسے اکٹھی آ رہی ہیں۔ خود محمد ﷺ والذین معہٗ ان کے ساتھی' خصوصیت ان کی یہ ہے کہ مخالفین جب آتے ہیں حق کو تلف کرنے کے لیے تو ان کے مقابل میں یہ چٹان کی طرح سخت ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ بریشم کی طرح نرم ہوتے ہیں۔ باہمدگر بھائی بھائی ہیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ریشم کی طرح نرم۔ مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے چٹان کی طرح سخت۔ یہ دونوں چیزیں ہیں کہ جن سے زندگی بنتی ہے۔ یہاں ایک چیز کہی کہ یہ رحمت ہے خدا کی **لِنْتَ لَهُمْ** ط (3:59)۔ عزیزانِ من! غور کیجیے گا کیا لفظ آیا ہے یہ؟ لوہا فولاد بڑا سخت ہوتا ہے لیکن اسے اگر تپا دیا جائے تو آپ کو معلوم ہے وہ نرم ہو جاتا ہے۔ اتنا نرم ہو جاتا ہے کہ وہ سیال ہو جاتا ہے LIQUID ہو جاتا ہے' پانی کی طرح بہنے لگ جاتا ہے' نرم ایسا کہ موم کی طرح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ساری نرمی میں اس کی جو صلابت اور سختی کی خصوصیت ہوتی ہے وہ زائل نہیں ہو جاتی۔ جب بھی دوسرا وقت آتا ہے' وہی پانی کی طرح بہنے والا لوہا' وہ موم کی طرح لوہا نرم جو ہے' فولاد چٹان کی طرح سخت پھر ہو جاتا ہے۔ جب جی چاہے وہ نرم ہو جاتا ہے' جب جی چاہے سخت ہو جاتا ہے یہ جو **لین** کا لفظ عربوں کے ہاں تھا قرآن نے بھی استعمال کیا' ان کی زبان میں بھی استعمال ہوتا تھا' وہ اس قسم کی نرمی جیسے لوہا نرم ہو جاتا ہے۔ قرآن نے خود یہ حضرتِ داؤدؑ کے قصے میں جو یہ کہا ہے **وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ** (34:10) فولاد کی نرمی۔ عزیزانِ من! غور فرمایئے لفظ کا انتخاب روح وجد میں آ جاتی ہے۔ **لِنْتَ لَهُمْ** ج (3:159)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

لیکن جب وہ فولاد نرم ہوتا ہے پھر میں دہرادوں اس کو کہ اپنی جو صلابت کی سختی کی خصوصیت ہے' وہ اس میں زائل نہیں ہو جاتی۔ایک نرمی روئی کی نرمی ہے وہ نرم ہی رہتی ہے اس میں سختی آ ہی نہیں سکتی۔ایک سختی پتھر کی سختی ہے اس میں نرمی آ ہی نہیں سکتی' وہ ہر آن میں سخت رہتا ہے۔ایک سختی اور نرمی لوہے کی ہے۔سخت ہوتا ہے پتھر کو بھی توڑ دیتا ہے نرم ہوتا ہے تو پانی کی طرح بہہ جاتا ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) ایک لِنْتَ کے اندر دونوں چیزیں آ گئیں۔غور فرمایا آپ نے کہ الفاظ کا انتخاب کیا ہے؟ لِنْتَ لَهُمْ ج (3:159)۔رسول کو یہاں کہا تھا کہ وہ بالمؤمنین رؤف رحیم یہ ٹھیک ہے

قرآنِ حکیم میں لفظ ' فظًا ' کا مفہوم بڑا غور طلب ہے

اسی آیت میں لِنْتَ لَهُمْ ج (3:159) دو لفظ اگلے بھی میں لے لوں تا کہ وہ دہرائے جائیں تو سامنے آئے کہ بات کیا کہہ گیا ہے؟ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ (3:159) دو لفظ یہاں آئے ہیں فظًا اور غلیظ القلب۔یہ فظًا کی چیز جو تھی عربوں کے ہاں' میں سمجھتا ہوں شقاوتِ قلبی نہیں بلکہ یوں کہیے کہ استحصال (EXPLOITATION) دوسروں کی چیز کو' اپنی ذات کے لیے اپنے فائدے کے لیے نچوڑ کے لے لینا اور نہایت مکروہ حیثیت سے یہ لے لینا اس میں یہ کیفیت ہوتی تھی۔وہ سفر پہ چلتے تھے صحرا میں پانی کی بڑی قلت ہوتی تھی۔ان کی جاہلیت میں انداز یہ تھا کہ وہ اونٹ کو بہت سا پانی پلا دیتے تھے پھر اس کا منہ باندھ دیتے تھے کہ وہ جگالی نہ کرنے پائے۔پانی مشکیزے سے بھی زیادہ اس کا تو پیٹ بہت بڑا ہوتا ہے اس میں جمع رہتا تھا' وہ چلاتے تھے۔اور جب کہیں ان کو ضرورت پڑتی تھی پانی کی تو اس کا پیٹ چاک کر کے اس کے اندر جمع شدہ پانی نکال لیا کرتے تھے۔یہ ہوتی تھی ان کے ہاں کی فظًا کی کیفیت کہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے دوسرے کے پیٹ میں سے چیر کے پانی نکال لیا جائے اور اپنی پیاس بجھالی جائے اس کی خواہ جان چلی جائے۔لیڈر ایسے بھی تو ہوتے ہیں' اپنی پیاس بجھانے کے لیے دوسروں کے پیٹ چاک کر کے' وہاں سے پانی نچوڑتے ہیں۔یہ کیفیت تو یہ ہے کہ اپنے تھوڑے سے فائدے کے لیے دوسرے کی جان تک لے لینا 'اس کے معدے میں سے پانی نکال کے پی جانا اپنی جان بچانے کے لیے یہ کیفیت۔غلیظ القلب یہ کہ دل میں' سینے میں' قلب کی جگہ برف کی کاش یا پتھر کا ٹکڑا رکھا ہوا ہو کسی کی مصیبت پر' کسی کی تکلیف پر پسیجے ہی نہیں۔یعنی پہلی چیز تو یہ تھی کہ اپنے فائدے کے لیے دوسرے کے ہاں سے نچوڑ کے بھی چیز لے آئے' دوسری چیز یہ ہے کہ دوسرے کی مصیبت تکلیف کے اوپر پسیجے تک نہیں' یہ دو چیزیں۔کہتا ہے کہ اگر یہ چیزیں کہیں ہوتیں اور تیسری چیز جو ہونی چاہیے لِنْتَ لَهُمْ ج (3:159) اگر تیری یہ کیفیت نہ ہوتی اور یہ

کیفیت ہوتی لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص (3:159) کوئی ایک بھی تیرے ساتھ نہ رہتا۔ یہ جو روز چیختے رہتے ہیں کہ صاحب! یہ دیکھیے آج اس پارٹی کے ساتھ اتنے تھے' دوسری صبح آنکھ کھول کے اٹھتے ہیں وہ کہتے ہیں لو بھئی سارے کے سارے اس کے ساتھ جا ملے۔ وہ دس ہی دن کے بعد پتہ چلتا ہے کہ نہیں صاحب! انہوں نے چھوڑ دیا' وہاں چلے گئے یہ۔ یہ ہو کیا رہا ہے؟ وہ ساتھ آ جاتے ہیں کچھ غلط تصور لے کر' جب دیکھتے یہ ہیں کہ یہ لگا پیٹ چاک کرنے' بھاگتے ہیں وہاں سے۔ اُدھر جاتے ہیں تو وہاں بظاہر ہاتھ ان کا بھی خالی ہوتا ہے' انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ آستیں کے اندر سانپ پنہاں اس نے بھی رکھا ہوا ہے۔ روز یہ کچھ ہوتا ہے آپ کے ہاں۔

قرآنِ حکیم کے علاوہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں 'غَلِيْظَ الْقَلْبِ (3:159)' کا بیان کردہ مفہوم

وہ جو رؤف ورحیم ہونا تھا اس کے لیے کہا ہے کہ لِنْتَ لَهُمْ ج (3:159)۔ اب یہاں لفظ آیا ہے غلیظ القلب' غلظ: اس کے اندر سختی ہوتی ہے۔ یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ خصوصیات یہ ہونی چاہئیں کہ جہاں دیکھا جائے کہ اصلاح کا امکان ہے' وہاں نہایت شفیق باپ کی طرح نرم ہو۔ جہاں دیکھا جائے کہ دوسرے حق اور صداقت کو دنیا سے تلف کرنے کے لیے انتہائی فرعونیت کے اوپر اتر آئے ہیں تو حق کی مدافعت کے لیے ایک حصار بن جائے' دیوار بن جائے سیسہ پلائی ہوئی' چٹان بن جائے' سخت بن جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے سورۃ حدید میں قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے رسول بھیجے' ان کو دلائل دیئے' کتابیں دیں وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ اور ان کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف بھی ہم نے نازل کی۔ اس لیے کہ اگر اس مقام پہ بھی وہ نرم کا نرم ہی رہتا ہے تو حق اور صداقت کی حفاظت ہو نہیں سکتی۔ یہی چیز تھی اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

کانٹے کی سختی پھول کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے اگر وہ بھی گلاب کی پتیوں کی طرح نرم ہی رہے تو پھول کی حفاظت کون کرے۔ کانٹے کی سختی مظلوم کے دل میں چبھنے کے لیے نہیں ہوتی' ظالم کے ہاتھ کو پھول تک پہنچنے سے روکنے کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں جو کہا ہے کہ غلیظ القلب تو نہیں تھا' یہ یہاں اس مقام کے اوپر یہ چیز کہی ہے جن کے لیے تو لِنْتَ لَهُمْ ج (3:159) تھا۔ ورنہ یہ نہیں کہ یہ سخت چٹان یا لوہے کی طرح کی صلابت اور سختی ہے۔ یہ تھی ہی نہیں ہر موقع کے اوپر تو حریر کی طرح نرم ہی تھا یہ کیفیت نہیں۔ یہ دیکھیے کہاں یہ چیزیں آئی ہیں؟ کہا یہ ہے يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ (9:73) اے نبی! یہ سرکشی پہ اترے

ہوئے لوگ یا وہ منافق جو جماعت کے اندر آ کر جماعت کی بیخ کنی پر آمادہ رہتے ہیں' ان کے خلاف جہاد کر۔اور وہی لفظ غلیظ القلب تھا نا میں وہ لفظ لا رہا ہوں۔ وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ (9:73) شدت کے ساتھ ان کا مقابلہ کر چٹان کی طرح ان کے مقابلے میں آ جا' فولاد کی شمشیر بن جا یہاں آنے کے بعد۔یہی چیز مؤمنین سے کہی گئی ہے یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ یَلُوۡنَکُمۡ مِّنَ الۡکُفَّارِ (9:123) جہاد کرو ان کے ساتھ۔اور لفظ یہ آیا ہے آگے وَ لۡیَجِدُوۡا فِیۡکُمۡ غِلۡظَۃً ؕ (9:123) وہ تمہارے اندر سختی کو محسوس کر لیں کہ یہ یوں ہی نہیں' ان کو ہم کھا جائیں گے' انہیں معلوم ہو جائے کہ آساں نہیں مٹانا نام ونشان ان کا۔وہی لفظ یہاں آیا ہے۔عزیزانِ من! وہ پنجابی میں ہمارے ہاں کہا کرتے ہیں کہ ''پتھر پولے ہون تے گیدڑ کھا جان اوہناں نوں'' یعنی نرم ہوں' گیدڑ بڑا ہی بزدل سا جانور مشہور ہے۔یہ تو پتھروں کی سختی ہے کہ جو بچے رہتے ہیں ورنہ باہر وہ عام جنگل میں پڑے ہوئے ہوتے ہیں' گیدڑ بھی عام ہوتے ہیں وہاں بزدل ترین' وہ بچے ہوئے اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ سخت ہوتے ہیں ورنہ ''جے پولے ہون تے گیدڑ کھا جان اوہناں نوں''۔پتھر کو سخت ہونا پڑتا ہے۔وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ (9:73) ان کے مقابلے میں چٹان کی طرح تمہیں سخت ہونا پڑے گا۔

قرآنِ حکیم میں جا بجا بیان کردہ خدائی صفات کا مقصد انسانی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے راہنمائی کا بہترین ذریعہ ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (48:29) انہی صحابہؓ کے متعلق یہ کہا گیا اسی جماعتِ مؤمنین کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ (9:73)۔اب سوال یہ موقع کا ہے' محل کا ہے' کہاں کس صفت کا ظہور ہونا چاہیے۔اور جو میں نے کہا تھا کہ قرآن سے اگر آپ نے یہ چیز سمجھنا ہو کہ کہاں کس قسم کا قانون نافذ کرنا چاہیے' کہاں کس قسم کا ہمارا انداز ہونا چاہیے تو قرآن میں یہ دیکھیے کس مقام پر خدا کی کس صفت کا ذکر آیا ہے۔اگر وہ کہیں غفور رحیم ہے تو دوسری الجبار المتکبر بھی اس کو کہا گیا ہے۔اگر کہیں اس کو حلیم کہا گیا ہے دوسرے مقام کے اوپر شدید العقاب بھی اس کو کہا گیا ہے۔کہاں کہا گیا ہے؟ یہ چیزیں سامنے آ جائیں گی تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ زندگی کے کس مقام پر اشدآء ہونے کی ضرورت ہے' کون سے مقام ہیں جہاں رحمآء ہونے کی ضرورت ہے۔اور یہ جتنی چیزیں آپ کو باطل کی نظر آتی ہیں' خواہ اپنی تاریخ میں یا دوسروں کی تاریخ میں' وہ یہ ہے کہ جس مقام کے اوپر رحمآء ہونا ہے' وہاں اشدآء ہو رہے ہیں۔جہاں اشدآء ہونا ہے وہاں روئی سے بھی زیادہ نرمی برتتے ہوئے چلے

جاتے ہیں ''ہو جا لکھ مسیت دا۔ اوتھے ایناں دی اے کیفیت ہو جاندی ہیگی اے''۔ یہ آپس میں جو آپ کے ہاں روز یہ چیزیں ہو رہی ہیں مار دو، جلا دو، زبانوں کو گدیوں سے نکال لو، گوریلا جنگ پہ اتر آؤ، مقابلے میں رضا کار تنظیمیں بنا لو۔ یہ رحمآء بینھم والے لوگ ہیں یہ آپس میں تو یہ کچھ کر رہے ہیں اور دشمن وہاں مقابلے میں وہاں کھڑا ہے، اس کے خلاف ان میں سے ایک شخص بھی میدانِ جنگ بھی نہیں گیا تھا 1965ء کی۔ جہاں اشدآء ہونے کی ضرورت تھی، وہاں رحمآء کی کیفیت تھی۔ جہاں رحمآء ہونے کی ضرورت ہے وہاں اشدآء کی کیفیت تھی۔ خصوصیات تو دونوں ہی ہیں بس فرق صرف اتنا ہی ہے کہ سانپوں کو دودھ پلا رہے ہیں، بچوں کو سنکھیا دے رہے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی باہمی رفاقت اور شانِ عظمت کا بیان

دوسری چیز یہ دیکھنے کی ہے۔ کہا کہ لِنۡتَ لَهُمۡ ج (3:159) یہ وہ ہیں جن کے متعلق قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر حضور ﷺ کے رفقاء کا اور حضور ﷺ کا جو باہمی تعلق تھا، اسے بتایا ہے اور بہت بڑا نمونہ ہے ہمارے لیے۔ اور کون سا اندازِ زیست ہے نبی اکرم ﷺ کا اور صحابہ کبارؓ کا جو آنے والوں کے نمونہ نہیں ہو سکتا تھا؟ ایک لیڈر کی جو شان ہے اس کی کیفیت کا اندازہ لگایئے کہ الفاظ کیا آ رہے ہیں وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (15:88) آہاہا کیا لفظ ہے صاحب؟ آپ نے دیکھا ہے مرغی اپنے چھوٹے چھوٹے چوزوں کو لیے سارے دانہ دنکا کھلاتی پھرتی ہے ان کو ساتھ لیے لیے پھرتی ہے۔ چیل کا سایہ اگر زمین پر پڑتا ہے تو وہ سارے پرندوں کو اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لیتی ہے حفاظت کے لیے۔ وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ (15:88) اپنے پروں کو ان کے اوپر پھیلا دے۔ یہ ہے کیفیت۔ خطرے کے وقت آپ وہ بھاگ نہیں جاتی۔ حالانکہ یہ جبلی فطرت ہے INSTINCT کا تقاضا ہے PRESERVATION OF SELF اپنی جان بچانا اور یہ حیوانات اور پرندے تو چلتے ہی INSTINCT کے اوپر ہیں۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے نہیں بھاگتی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے لے کے بیٹھ جاتی ہے ان کی حفاظت اپنی جان سے مقدم سمجھتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہونی چاہیے لیڈر کی شان۔ وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (15:88)۔ کہیں دوسری جگہ یہ کہا گیا ہے کہ اے رسول ان سے دیکھنا کبھی بے اعتنائی نہ برتنا ان کے ساتھ (18:28)۔ کیوں یہ کچھ کرنا ان کے لیے؟ کیا محض اس لیے کہ یہ کوئی معاذ اللہ یتیم خانہ کھول رکھا تھا جس کے لیے آپ ﷺ سے کہا گیا بار بار کہ نرمی برتو، یہ کچھ نہ کرو؟

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے جماعتی زندگی کی خصوصیات اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! بات یہ نہیں۔اس نظام میں یہ جن کی حفاظت مقصود ہے' جن کی پرورش مقصود ہے' ان کا مقام یہ ہے کہ ھُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:62) اے رسول! خدا نے تیری مدد کی تیری تقویت کا سامان بہم پہنچایا اپنی طرف سے مدد دے کر اور یہ جماعت جو تیرے ساتھ ہے اس کی بنا پر۔ یہ جماعت رسول کی تقویت کا موجب ہے۔ یہ آیات بڑی اہم ہیں یعنی خدا کی نصرت اور ان کی رفاقت کہا اس سے تیری تقویت کا موجب یہ دو چیزیں ہیں۔ اس کے بعد باہم ان کا تعلق کیا ہے؟ وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ط (8:63) ان کی باہمی کیفیت یہ ہے کہ ان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ جو جماعتی حیثیت سے آتے ہیں تو یہ نہیں کہ محض موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ ہو رہا ہے۔ زندہ باد کی تقریر بھی سن لی' مردہ باد کی تقریر بھی سن لی' کپڑا جھاڑ کے گھر کو آ گئے "کسی نے کہیا آج بڑا سواد آیا' دوئے نے کہیا نئیں کل بڑا سواد آیا ہیگا سی"۔ بیٹھے ہوئے ہیں لاکھ کی تعداد میں تَحۡسَبُہُمۡ جَمِیۡعًا وَّ قُلُوۡبُہُمۡ شَتّٰی ط (59:14) تو دیکھے گا جیسے ایک جماعتی زندگی بسر کر رہے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں بیٹھے ہوئے تو ہیں قُلُوۡبُہُمۡ شَتّٰی ط (59:14) دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ط (8:63) دل جڑے ہوئے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ۔ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ لا وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیۡنَہُمۡ ط (8:63) یہ ایک بہت بڑی چیز ہے جو قرآن یہاں کہہ گیا ہے۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ اے رسول! اگر تو ساری دنیا کی دولت بھی خرچ کر لیتا تو یہ کیفیت نہ پیدا ہوتی خدا نے یہ کر دیا۔ یعنی بس ایسے ہو گیا کہ صاحب! ان کے لیے تو خدا نے کر دیا تھا ہو گیا' اب ہمارے لیے خدا نہیں کرتا تو ہم کیا کریں پھر؟ یہی مقام ہیں کہ جہاں غلط مفہوم جو ہے انسان کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔ برادرانِ عزیز! غلط مفہوم بھی معاف رکھیے گا' بدنیتی کا ہی نتیجہ ہوتا ہے 'تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہوں' ورنہ قرآن سے تو غلط مفہوم نہیں لیا جا سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ جو اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ط (8:63) جو کہا ہے خدا نے یہ کیا' دوسرے مقامات کے اوپر ہے کہ جو قوم ایک ضابطۂ حیات کے تابع زندگی بسر کرتی ہے' جن کا مطمحِ نگاہ ایک ہو جاتا ہے' ان کے دل آپس میں مل جاتے ہیں (3:103)۔ یہ ہے طریقہ' یہ تھی چیز خدا نے جو پیدا کیا ہے' باہمی دلوں کے اندر تالیف اور الفت جو پیدا کی۔ وہ یہ ہے ایک ضابطۂ خداوندی کے تابع سارے زندگی بسر کرنے والے اور اس گول کو منتہائے نگاہ رکھنے والے جو ان کے لیے اس ضابطے نے مقرر کیا ہے' یوں دلوں کے اندر تالیف پیدا ہو جاتی ہے۔ اِن کی باہمی یہ کیفیت۔ عزیزانِ من! آگے سنیے اس جماعت کا مقام جن کے لیے کہا ہے کہ پروں کے نیچے حفاظت میں ان کو لے لے ان کی طرف سے بے رخی نہ برت ان کے

لیے رؤف ورحیم رہ ان کے لیے لِنۡتَ لَهُمۡ ج کی کیفیت تمہاری ہونی چاہیے۔اس جماعت کا مقام بھی دیکھیے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسۡبُکَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ(8:64) تیرے لیے اللہ اور یہ جماعت جو ہے یہ کافی ہے۔تنہا خدا نہیں کہا۔ یہ ہے جماعت کی زندگی' یہ ہے دین۔ مذہب انفرادی چیز ہوتی ہے اس میں ضرورت ہی نہیں ہوتی کسی کو کسی دوسرے کی۔ وہ الگ بیٹھا ہوا بھگتی کرر ہا ہے' وہ ادھر بیٹھا ہوا کوئی پرستش کرر ہا ہے' وہ اُس حجرے میں اللہ اللہ کرر ہے ہیں' یہ یہاں بیٹھے ہوئے یا رحیم کا ورد کرر ہے ہیں۔سوال ہی نہیں ہے۔دین کے اندر ضابطۂ خداوندی کی رو سے حاصل کردہ تقویت وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ(8:64) یہ دو چیزیں ہیں جو تیرے لیے کافی ہیں۔کس قدر INDISPENSABLE رکھا ہے اس جماعت کو ان کے ساتھ۔اور اس جماعت کو جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے خود اس جماعت کے اندر بھی یہی خصوصیات جو رسول کے اندر بتائی گئی ہیں' لِنۡتَ لَهُمۡ ج (3:159) بھی ہیں اشدآء علی الکفار بھی یہ ہیں۔ یہ دونوں چیزیں جمع ہوں گی تو پھر وہ نظام قائم ہوگا جو نظام قرآن چاہتا ہے' خدا چاہتا ہے کہ اس دنیا میں قائم کیا جائے۔ایک طرف اس قسم کی نرمی دوسری طرف اس قسم کی صلابت اور سختی فولاد کی سی کیفیت۔وہی جو اقبالؒ نے ان دونوں چیزوں کو لیا ہے کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا
گذر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئیں تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ(48:29)۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (48:29).

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَ لَوۡ کُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِکَ ج (3:159) اب یہ دیکھیے اسی مقام میں یہ جو نرمی میں نے عرض کیا فولاد کی سی کہ جب وہ اتنا نرم ہوتا ہے کہ وہ ہاتھوں میں موم کی طرح سے اس کو پکڑ لیتے ہیں پانی کی طرح بہہ رہا ہوتا ہے اپنی خصوصیت جو سختی کی ہوتی ہے وہ اس میں بدستور قائم ہوتی ہے۔یہاں اس نرمی کے بعد کہا فَاعۡفُ

عَنۡهُمۡ (3:159) خدا کے متعلق یہاں کہا تھا نا (3:155) میں وَ لَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ (3:155) چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں لغزشیں خطائیں سہوانسیان' یہ چیزیں ہو جاتی ہیں وہ ایسا نہیں ہے کہ اتنی اتنی سی باتوں کے اوپر بھڑک اٹھے۔ میں نے حلیم بتایا تھا آپ کو کہ کیا معنی اس کے ہوتے ہیں۔ وہ ان چیزوں کو دیکھتا ہے اور یوں کہہ کے نہیں اوئے ایسا نہیں کرنا چاہیے تمہیں' آگے بڑھ جاتا ہے' حفاظت کا سامان بہم پہنچا تا ہے۔ یہاں رسول کے متعلق کہا ہے فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ (3:159) ان کوتاہیوں سے درگذر کر کے آگے چلا جا ان سے جو نقصانات ہوئے ہیں چھوٹے موٹے ان سے حفاظت کا سامان بہم پہنچا' یہ انتظام کر۔ یہ سب کچھ کس طرح سے ہوگا؟

اسلامی نظام وحی کی حکمرانی کا ہی دوسرا نام ہے نہ کہ شخصیت پرستی کا

عزیزانِ من! اب آیا جسے کہتے ہیں اسلامی نظام آپ کے ہاں۔ الفاظ دہرانے کو ورد کی دہرائے چلے جاتے ہیں' کوئی متعین طور پر بتاتا نہیں کہ یہ ہے کیا۔ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ‌ ۚ (3:159) یہ ہے مقام صحابہؓ کا جماعت کا۔ نبی ہے خدا سے علم پا رہا ہے' خدا سے وحی لے رہا ہے لیکن وہ وحی وہ اصول وہ ہدایات اصولی طور پر اس کو ملتی ہیں۔ اب اس نے ان ہدایات کے مطابق ایک نظام قائم کرنا ہے' اس میں زندگی کی جزئیات سامنے آتی ہیں کہ ان اصولوں کو ان قوانین کو APPLY کیسے کیا جائے؟ ان حالات کے مطابق عملی پروگرام کیا چاک آوٹ کیا جائے؟ اب یہ دیکھیے کہ جہاں رسول موجود ہو' وہاں جو ہمارے ذہن میں نقشہ ہے' وہاں گنجائش ہی نہیں کسی دوسرے کے لیے کہ بات بھی کر سکے۔ وہ تو رسول کا مقام ہے کہ جس پہ ایمان لانا فرض ہو جاتا ہے۔ آپ کسی حضرت جی کی محفل میں جا کے دیکھیے یہ بڑے بڑے آپ کو نظر آئیں گے سارے سر جھکائے ہوئے ''گگھو ہو کے بیٹھے ہوئے ہوندے ہیگے'' یعنی جرأت ہی نہیں ہے کہ وہاں صاحب اس محفل کے اندر حضرت جی کے مقابلے میں کوئی ایک بات زبان سے کہیں۔ وہ حضرت جی تو معیار اتنا بن چکے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے ہاں کے جو FOLLOWERS ہیں' تصور بھی نہیں کرتے اس معیار سے کسی طرح سے بھی آگے جانے میں کہ صاحب! وہ آپ کو فرما دیں' گفتگو کا یارا نہیں' بات نہیں وہاں کر سکتے۔ یہاں کیفیت یہ ہے۔ مقام ہے نبی کا اور اسے حکم دیا جاتا ہے وَ شَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ‌ ۚ (3:159) معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔ اللہ اکبر۔ یہ ہے وَ يُزَكِّيۡهِمۡ (3:164) ان کی صلاحیتوں کی نمود اس طرح سے ہوگی وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ (3:159)۔ یہ بھی نہیں آپ کی صوابدید پہ یہ چھوڑ دیا ہے' حکم دیا ہے۔ اس جماعتِ مؤمنین کے متعلق یہ ہے کہ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ۖ (42:38) سورۃ شوریٰ میں یہ ہے کہ یہ معاملے اسی طرح سے باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔ لیکن یہ چیز نہیں ہے

کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ نظام کی کیفیت ہوگی۔ خود رسول اللہ ﷺ موجود ہیں امت کے اندر جماعت کے اندر موجود ہیں۔

معاشرے میں جرأت کا فقدان ہمیشہ قوموں کی تباہی کا باعث بنتا ہے

عزیزانِ من! میں پھر دہرادوں آپ ذرا دیکھیے تو سہی جس کو ذرا بڑا مان لیا جاتا ہے' جب وہ موجود ہوتا ہے تو اس کی موجودگی میں کسی کو جرأت ہی نہیں پڑتی بات آگے جا کے کرے۔ دیکھ رہے ہیں غلط چل رہا ہے' پیچھے والے ایک دوسرے سے کہتے ہیں تو جا تو جا' یعنی وہ کھا جائے گا۔ لوگ موجود ہیں اپنے اپنے ان لیڈروں کی غلطیوں پر' غلط نگہیوں پر' غلط فیصلوں کے متعلق' دوسروں سے آ آ کے یہ چیز کہتے ہیں کہ صاحب! یہ دیکھیے نا یہ کر رہا ہے' یہ ہو رہا ہے۔ ارے اسے کہتے کیوں نہیں؟ کون کہہ سکتا ہے وہاں کسی نے اپنی جان گنوانی ہے' وہاں تو عزت کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت ہے۔ یہ لِنْتَ لَهُمْ ج (3:159) والا جو ہے اس کی کیفیت یہ ہے شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج (3:159)۔ عزیزانِ من! یہ ہے وہ نظامِ مشاورت اسلام نے جو قائم کیا تھا جسے آج جمہوریت کہہ کر حق کو باطل سے بدل دیا جاتا ہے۔ جمہوریت کا تصور خالص مغرب کا تصور ہے۔ اس جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ ہر معاملہ ان نمائندگان کے سامنے پیش کیا جائے۔ (اگر ان کو نمائندہ کہا جائے تو) ورنہ آپ کو تو معلوم ہے جس طرح سے وہ نمائندہ ان کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے یعنی کارخانے کے جتنے مزدور ہیں ان کا نمائندہ کارخانے کا مالک ''بندر کا وہ رکھوالا''۔ اور پھر یہ جو جمع ہو جائیں اس کے بعد ان کا فیصلہ کس طرح؟ حق کسے کہا جائے گا؟ 51 کے ووٹ جس کی طرف ہو جائیں۔ آج یہ حق' رات ہی رات انہوں نے ذرا سے ان کے حقوق اِدھر کیے' دوسرے دن وہ ادھر آیا' جو آج باطل تھا کل حق' پھر 51 ووٹس اُدھر چلے گئے صاحب! چل رہا ہے۔ یہ ہے ڈیماکریسی کا نظام مغرب کا۔ حق اور باطل کے لیے کوئی معیار INTRINSIC نہیں ہے' کوئی حقیقی معیار' غیر متبدل اصول نہیں ہے کوئی کہ اس کے مطابق جو فیصلہ ہے وہ حق جو اس کے خلاف جاتا ہے' وہ باطل ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک لفظ مشاورت کا لغوی مفہوم' اسکی اہمیت اور اسکی ضرورت

حق اور باطل کا معیار جب یہ ہو جائے کہ حق اپنے مقام پہ حق ہے وہ تو جس دن رسول اللہ ﷺ نے پہلے دن آ کے آواز دی تھی جب کوئی دوسرا (آج کے الفاظ میں) سیکنڈ کرنے والا بھی نہیں تھا' حق اس دن بھی حق تھا۔ آپ 51 کی ووٹس کہہ رہے ہیں' اس دن تو 100% ووٹس جو تھیں وہ مکے والوں کی حق کے خلاف جا رہی تھیں۔ آج کا ڈیماکریسی کا نظام ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ہمیشہ ہی MINORITY میں رہتے اور MAJORITY RULE کرتی۔ کیا کہا جائے ان کے متعلق؟ اور ہر شخص کہہ رہا ہے

اسلامی نظام۔قرآن کے غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے جتنی جزئیات' جتنے عملی پروگرام آپ نے ان اصولوں کو نافذ کرنے کے لیے طے کرنے ہوں' ان معاملات کے اندر باہمی مشورہ کرو۔اور جوں ہی اس حادثے کے قریب آئے **تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا**(2:187) یہ بھی نہیں ہے کہ تجاوز نہ کرنا' ذرا پرے پرے ہٹ کے رہنا۔ہوسکتا ہے کہ ایک قدم تم غلطی سے ہی ایسا اٹھادو کہ اس سے تجاوز کر جاؤ۔یہ ہے مشاورت کا نظام آپ کے ہاں کا۔اس مشاورت کے نظام میں یہ مشاورت جو ہے کیا بات ہے ان عربوں کی' کہاں یہ استعمال کرتے تھے؟ شہد کا چھتا شہد کی مکھیاں ان میں سے ایک ایک مکھی ہزار ہا میل کا سفر کر کے' جسے تسبیح کہا جاتا ہے عربی زبان میں' سرگرداں پھر کے ایک ذرا سا کہیں سے قطرہ پھول کے جوس کا لے کے آتی ہے' خیانت نہیں کرتی راستے میں' اٹھائے اٹھائے لیے آتی ہے اپنے مرکز میں۔ہر ایک آ کر اس کے اندر جمع کر دیتا ہے اپنی اپنی CONTRIBUTION وہاں کر دیتا ہے۔پھر انہیں یہ حق نہیں ہوتا کہ اس کے بعد یہ فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں کہ اس میں سے اتنا مجھے ملے اور یہ مجھے ملے اور وہ اس کو ملے۔انہوں نے اپنی ڈیوٹی PERFORM کر دی۔وہ جسے یہ حق دیا ہوا ہے وہ اس کی پھر تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے مطابق یہ کرتا ہے۔چھتے میں اس طرح اس پروسیس سے شہد کا جمع کرنا یا نکالنا اس کے لیے عربوں میں شوریٰ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ہر ایک اپنی اپنی فکر اپنی اپنی صلاحیت کی CONTRIBUTION لا کے پیش کر دے صاحب! میں یہ سمجھتا ہوں' اس معاملے میں میرا خیال یہ ہے' میری دلیل یہ ہے کہ ٹھیک ہے۔وہ سب کچھ آتا چلا جائے' یہ سارا کچھ آ گیا سامنے۔وہ جس کے سامنے وہ حدود ہیں وہ BOUNDRY LINES ہیں وہ اصول ہیں اس کے بعد؟ عزیزانِ من! یہاں **لِنْتَ** کا لفظ آیا تھا جو ہم نے کہا تھا کہ نرم ہونا چاہیے اس کو۔اور میں نے کہا تھا کہ ایک لفظ میں یہ خوبی آ گئی کہ نرم ہونا چاہیے مشاورت جب باہمی کر رہا ہے' تو اس مشاورت کے بعد **فَاِذَا عَزَمْتَ** (3:159) آہاہا! آ گئی فولاد کی سیرت۔عزیزانِ من! ایک ہی نشست کے اندر نرم ہے تو باہمی مشاورت کر رہا ہے' ہر ایک کو اجازت ہے جو کچھ وہ بہتر سمجھتا ہے کہے' سنے گا یہ جھڑکے گا نہیں کسی کو' ڈانٹے گا نہیں جرأتیں سلب نہیں کرے گا۔ہر ایک کو اجازت ہے۔اور یہ کچھ کرنے کے بعد جو نرم ہوتا ہے اس کا تو عزم ہی کچھ نہیں ہوتا'

زندگی کے معاملات میں فیصلہ تو مشاورت سے ہوگا لیکن تمام ذمہ داری مرکزی اتھارٹی پر ہوگی

عزیمت تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ جب ایک فیصلہ کر لیا جائے تو پھر چٹان کی طرح سخت ہو جائے۔**فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ** ط (3:159) دیکھا نرمی اور سختی **لِنْتَ** کی کس طرح سے ایک ہی آیت میں سامنے آ رہی ہے۔سخت ہی سخت یہ ہوتا تو مستبد حاکم ڈکٹیٹر ہوتا۔نرم ہی نرم ہوتا تو جوں اکاون نے جو کہا اس کے پیچھے چل پڑتا۔وہ کہتے کہ صاحب! یہ غلط ہے وہ کہتا کہ''میں

کی کراں بھائی اے جو کہندے ہوئے''۔نرم ہے اس مشاورت میں بریشم کی طرح محفل یاراں ہے اور جب پھر فیصلہ کرلیا ہے فَاِذَا عَزَمۡتَ (3:159) یہاں دیکھیے یہ عزمتم نہیں ہے' فیصلہ یہ سارے نہیں کررہے' شاورھم تو ہے سب کے لیے۔عزمت جو ہے یہ اس کے لیے ہے یہ VERB اس کے لیے آیا ہے جب تو فیصلہ کرلے پھر۔عزیزانِ من! اسی سے تو ذمہ داری LOCATE ہوتی ہے۔جو فیصلہ کرتا ہے' وہ ذمہ دار ہوتا ہے' وہ RESPONSIBLE ہوتا ہے وہ ACCOUNTABLE ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے میں نے یہ فیصلہ دیا ہے۔اس سے پوچھا جاسکتا ہے' نقصان کیوں ہوا' یہاں کیوں یہ چیز کی گئی۔ورنہ اگر یہ چیز نہ ہو آپ کو یاد ہے اس جمہوریت کے اندر RESPONSIBILITY ہی کسی کی نہیں ہوتی۔وہ تو پھر بھی کسی پارلیمنٹ کے اندر کی چیز ہے یہاں تو آپ جس سے پوچھا جائے' کیا ہے؟ کہ صاحب! حکومت کی پالیسی یہ ہے۔''او کوئی لبھدی نئیں او حکومت ہے کتھے' بڑی پردہ نشین ہے کتھے اندر وڑی ہوئی جناب مجال ہے کتھے سامنے آجائے''۔یعنی حکومت کے سارے کارپرداز جتنے ہیں ان میں سے کسی سے بات کیجیے۔کہ جی! وہ حکومت ہی بدل جائے بگڑ جائے''تے فیر کتا کی جائے حکومت ای خراب ہوگئی اے ساری دی ساری''۔ یہ ہے نقصان کہ RESPONSIBILITY یا ذمہ داری آپ LOCATE نہیں کرتے۔وَشَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ج(3:159) تو ہے' فَاِذَا عَزَمۡتَ (3:159) جب تو فیصلہ لے لے۔

لفظ توکل کا بنیادی مفہوم خود اعتمادی کے سلسلہ میں بولا جاتا ہے

توکل کے معنی پھر میں نے بتائے تھے کہ فارمولے کی محکمیت کے اوپر جب یقین ہو کہ ہم نے صحیح فارمولا ADOPT کیا ہے پھر اس کے اوپر جو SELF CONFIDENCE ہوتا ہے خود اعتمادی جو اس کے بعد انسان کی ہوتی ہے' اسے توکل کہتے ہیں۔لِنۡتَ(3:159) کی یہ کیفیت کہ مجلسِ مشاورت میں دو دو ٹس بھی اپنے اس وقت نہیں کہ ووٹس کا تو حساب ہی نہیں ہے' وہاں مشاورت ہے کھلی ہوئی ہے۔سیرتِ فولاد کی کیفیت یہ ہے کہ جب فیصلہ کرلیا ہے' عزمت فتوکل علی اللہ پورے SELF CONFIDENCE کے ساتھ چل نکل۔اس لیے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ (3:159) نتائج صحیح تو وہ وہی فارمولا پیدا کرسکتا ہے جس کو APPLY کرنے والا اس یقینِ محکم کے ساتھ اس کے اوپر چلے کہ یہ ایسے نتائج پیدا کرکے رہے گا۔کہا کہ اس طریق سے اگر تم چلے تو جسے کہا ہے ناخدا کی نصرت' تمہیں مل جائے گی۔قانون کی صحت کے مطابق اگر آپ کام کرتے ہیں تو وہ قانون کے اندر ایک قوت ہوتی ہے۔وہ فارمولا جو ہے نتیجہ پیدا کرکے رہتا ہے' اسے کہتے ہیں قانون کی قوت' اسے کہتے ہیں خدا کی نصرت۔یہ ہوتی ہے نصر۔اتنی بارش پڑ جائے کہ جس سے یہ سبزیاں اور کھیتیاں ایسی ہوں جو یہ سبز رنگ ہے' وہ آپ دیکھیں ذرا سا

گہرا ہوجاتا ہے' سیاہی مائل ہوجاتا ہے اس قدر بھرپور طریقے کے اوپر اگنے والی یہ جو چیزیں ہیں لیکن یہ بارش اتنی بڑی کھیتی کس زمین سے پیدا کرتی ہے؟ جس زمین میں زرخیزی کی صلاحیت ہوتی ہے ''بنجر زمین تے سارا پانی آپ ای پی جاندی ہیگی اے لکھ وی نئیں اگدا او ہدے وچ''۔ اور اگر وہی بارش ''رُوڑی اُتے پے جائے تے سارا علاقہ متعفن ہوجانداا ے۔ گلاب دے پھُلاں تے پے جائے تے مہک اٹھد اہیگا اے''۔

قدرت نے تو انسان کے اعمال کو زمین سے تشبیہ دی ہے

بارش تو یکساں ہی آتی ہے آسمان سے' سوال آگے یہ ہے کہ وہ زمین کس قسم کی ہے۔ یہ ہے انسان کا ایمان اور قوتِ عمل جس کو زمین کہا گیا ہے۔ اِنۡ یَّـنۡـصُرۡکُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ ج (3:160) اس انداز سے نصرتِ الٰہی جب تمہیں ملے گی۔ یہ سارا طریقہ بتادیا اس کا: قانون کی پابندی' وہ جو ایک لیڈر ہے اس کی یہ شان خطرے کے وقت پروں کے نیچے لینے والا' ان کی کیفیت یہ کہ وہ خطرے کے اندر ہے تو جانیں نچھاور کردینے والے' معاملہ سامنے آیا ہے تو بزمِ مشاورت قائم ہو رہی ہے اس کے بعد جب فیصلہ لے لیا ہے تو ایک عزمِ صمیم کے ساتھ اس کو پھر ENFORCE کیا جا رہا ہے۔ اب رعشہ دار ہاتھ سے نہیں پستول چل رہا۔ کہا کہ یہ اس انداز سے جب نصرت تمہیں خدا کی ملے گی فَلَا غَـالِـبَ لَكُمۡ ج (3:160) کوئی شخص دنیا کا تمہارے اوپر غالب نہیں آسکتا۔ اور اس کے مقابلے میں وَ اِنۡ یَّـخۡـذُلۡـكُمۡ (3:160) اگر یہی قانون یہی چیز تمہارا ساتھ چھوڑ دے یعنی تم اس کی خلاف ورزی کرو اس کے ساتھ نہ چلو تو پھر؟ فَـمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ط (3:160) اس کے بعد کون ہے وہ جو پھر تمہاری مدد کرسکے گا؟ عزیزانِ من! کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ بھیک کے ٹکڑے بھی چند دنوں تک مل سکتے ہیں' وہ بھی جب تک ان کی مصلحت ہو کہ کم از کم جب تک یہ فقیر دروازے پہ کھڑا رہے گا ''کتیاں نوں نئیں اون دے گا لاگے''۔ نصرت نہیں پھر کہیں مل سکتی اگر آپ خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں' کوئی نہیں بچاسکتا۔

نبوت کے فرائض میں یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ وحی کے کسی حصہ کو دوسرے سے چھپائے رکھے

چاند تک کمندیں ڈالنے والوں کے اگر انجن میں قانون میں ذرا سا نقص واقع ہوجائے' انہیں پھر دنیا کی کوئی قوت بچا نہیں سکتی۔ وَعَـلَـی اللّٰهِ فَلۡیَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (3:160) وہاں یہ کہا تھا متوکلین' یہی ہیں مؤمنون لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ فارمولے کے سارے اجزا پورے کے پورے دیانت داری ایمان داری سے آپ کے سامنے آجائیں۔ اگر اس میں سے کوئی ایک

جز بھی چھپا کے رکھ لیا گیا تو آپ کی ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ لہٰذا یہ جو آپ کے ہاں سربراہ ہے یہ جو آپ کے ہاں کا پروفیسر ہے یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ج (3:164) والا ہے وَيُزَكِّيهِمْ (3:164) والا ہے بڑا ضروری ہے کہ وہ اس پورے فارمولے کو سارے کے سارے کو نہایت فراخ دلی سے تمہارے سامنے رکھ دے۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (5:67) جو کچھ تیری طرف نازل کیا ہے (عزیزانِ من! وحی نازل ہوتی ہے تو وہ صرف اس کی ذات تک ہوتی ہے کسی دوسرے کو اس کا علم بھی نہیں ہوسکتا' بھنک کان میں نہیں پڑسکتی وہ تو القا اس طرح سے ہوتا ہے' یکسر SUBJECTIVE چیز ہوتی ہے) اسے کہا گیا ہے کہ اس چیز کو عام کرو ہر ایک کو پہنچاؤ۔ اس پہنچانے کے اندر وہ ذرا سی بھی خیانت کر جائے اس میں تو یہ سارے ان کے تمام کاروبار سارے اعمال ان کے' بے نتیجہ رہ جائیں صاحب! فارمولے کا ایک جز چھپایا ہوا۔ کہا یہ اسی صورت میں ہوسکتی ہے وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ط (3:161) نبی کے یہ شایانِ شان نہیں ہوتا کہ وہ اس میں سے کوئی چیز چھپا کے رکھ لے۔ عزیزانِ من! کتنی بڑی فراخ حوصلگی ہے' کتنی بڑی قیمتی متاع' جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ کانوں کان کسی کو خبر بھی نہیں اس کی ہوتی کہ یہ کیا علم ہے جو مل گیا ہے لیکن وہ پورے کا پورا اپنا خزانہ جو ہے اس کو عام کر دیتا ہے' لٹاتا چلا جاتا ہے۔ اور جب یہ خزانہ عام کر دیتا ہے تو پھر بشریت کی حیثیت سے یہ اور دوسرے یکساں ایک سطح پہ آ جاتے ہیں۔ اسی لیے تو اس کے لیے کہا ہے کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (18:110) تمہارے جیسا ایک انسان ہوں میرے طرف وحی آتی ہے اور جب وحی کے CONTENTS جو ہیں' وہ میں دے دیتا ہوں تمہیں اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) پھر میرے پاس بھی وہی ضابطہ ہوتا ہے تمہارے پاس بھی وہی ضابطہ ہوتا ہے پھر ایک نظام ہے اس کے تابع چلنا ہے' ٹھیک ہے۔ اس لیے نبی کے لیے یہ شایانِ شان ہی نہیں' وہ نبی ہی نہیں رہ سکتا کہ جو اس میں خیانت کر جائے' نہیں کرتا۔ لیکن نبی کے بعد تو پھر قدم قدم پر خیانت ہوتی ہے۔ اس لیے آگے کہا وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ج (3:161) کوئی بات نہیں جو پھر اس میں خیانت کر کے کچھ چھپا کے رکھ لیتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ قیامت اور یہ ساعت اور یہ چیزیں جو ہیں جب وہ مقام آئیں گے تو میں ان کے متعلق عرض کروں گا' اب تو اتنا ہی سمجھ لیجیے کہ یہ چیز چھپی نہیں رہ سکے گی' نمایاں ہو کے رہے گی اور وہ تو ہو جاتی ہے۔ فارمولے کے مطابق آپ کام کریں اس میں کوئی چیز چھپا کے رکھی ہوئی ہو' نتیجہ خود بتا دے گا کہ نہیں صاحب! صحیح صحیح فارمولا سامنے نہیں آیا۔

قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ دیکھا جائے آخر ہزار سال سے ہمارے یہ اعمال بے نتیجہ کیوں ہیں؟

یہ ہزار برس سے آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اعمال کی حیثیت سے یہ قوم اب بھی مذہب پرست قوموں میں سب سے زیادہ

اپنے ان ارکان پہ سختی سے پابند ہوتی ہے' یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ مئی جون کی تپ تپاتی ہوئی گرمیوں کے اندر اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے مزدور روزہ رکھتا ہے۔ اس چلچلاتی دھوپ کے اندر سر پہ اینٹیں اٹھا کے اوپر اور نیچے چل رہا ہوتا ہے' پانی کا قطرہ منہ میں نہیں ڈالتا' آسان کام نہیں ہے۔ پھر پابندیاں نماز کی' دولت میں سے بھی کچھ دینا' حج کے لیے چلنا' صعوبتیں برداشت کرنا اور بھی جتنی چیزیں آپ کے ہاں کی' یہ وصول کرتے ہیں۔ اعمال کے اعتبار سے تو یہ کیفیت لیکن حالت دن بہ دن آپ کی سقیم سے سقیم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر آپ کو فریب دے دیا جاتا ہے کہ جی! روحانیت آپ کی بڑھ رہی ہے۔ جتنی جسمانیت کم ہوتی جاتی ہے سکڑتا چلا جاتا ہے' روحانیت بڑھ جاتی ہے پھر ایک دن سارا جسم ختم ہو جاتا ہے روح ہی روح رہ جاتی ہے''او پھر کر کے اڑ جاندی اے لے لاہن کی لینا ایں''۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔''آ روحانیت ودھن ڈئی ہوئی ہیگی اے''۔ یہ کیا ہے؟

ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی اصل وجہ باطنی علم کے خود ساختہ تصور کی آبیاری اور مولانا رومؒ کا فرمان

عزیزانِ من! اور کیا کہہ کے بہلائیں کیا' کہہ کے فریب دیں؟ بات ساری یہ ہے اس فارمولے کے نسخے میں سے چھپایا ہوا ہے' خیانت کی ہوئی ہے اس کے اندر۔ اور اجزا املائے ہوئے ہیں اس کے اندر' کیسے وہ نتیجہ نکل آئے گا۔ اور یہ چیز بعد کی نہیں۔ بڑے فخر سے بیان ہو رہا ہے بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا (سب سے زیادہ حدیثیں ان کی طرف سے مروی ہیں) کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے دو برتن دیے تھے' دونوں بند تھے۔ ایک برتن کا منہ تو میں نے کھول دیا ہے اور اگر دوسرے برتن کا منہ کھول دوں تو اس کے بعد آپ ﷺ نے اشارے سے کہا کہ گلا کٹ جائے۔ اندازہ لگایے۔ وہ بند کا بند ہی رکھا۔ اگر 50% بھی اس میں تھا تو 50% یہ غل تو یہاں ہو گیا آپ کے ہاں کہ آدھا ہی ملا۔ وہ آدھا کہاں چلا گیا؟ وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے' وہ باطنی علم ہے وہ لوگوں کے سامنے کھولا نہیں جا سکتا۔ وہ علم وہ ہے کہ جو یہ حضرت صاحب یہ خدا سے براہِ راست پاتے ہیں۔ چپکے سے سینے میں ہوتا ہے' چپکے سے منتقل کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک پورا برتن بھرا ہوا۔ یہ سارا باطنی علم اس کے بعد آپ کے ہاں چلا آ رہا ہے۔ اور وہ جو تھا برتن اتفاق سے بقول مولانا روم کے جو مغز تھا وہ اس برتن میں تھا اس دوسرے میں ہڈیاں ہی تھیں وہ کہتے ہیں۔

ما زِ قرآں مغز را برداشتیم
اُستخواں پیشِ سگاں انداختیم

اور رفتہ رفتہ تو اس کے بعد یہ جسے دوسرا آپ برتن کہہ رہے ہیں' اس کی بھی کیفیت یہ رہ گئی کہ وہ محض تلاوت کے لیے رہ گیا آپ کے

ہاں۔ نسخے میں وہ جو چند اجزا اس کے تھے وہ بھی بے کار سمجھ لیے گئے' ان کو دہراتے رہا کرو' کاغذوں پہ لکھتے رہا کرو' گھول کے پیتے رہا کرو۔ سمجھنا سوچنا بھی اس کے لیے اگر ہو تو تم سمجھ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس خدا کی کتاب کو سمجھنے کے لیے خدا کی طرف سے علم پانا پڑتا ہے۔ اندازہ لگایے! کتاب میں لکھوں تو میری کتاب کو سمجھنے کے لیے میرے پاس آنا پڑے گا' مجھ سے سیکھنا پڑے گا صاحب یہ چیز۔

وحی کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو تاکیدی ہدایت

یہ ہے وہ جو چھپایا ہوا علم ہوتا ہے۔ پہلے دن سے آپ کے ہاں یہ روایتیں چلی ہیں اور سارا سلسلہ آپ کے ہاں روحانیت کا اسی کے اوپر ہے۔ یعنی پھر ان کی جرأتیں ملاحظہ فرماؤ کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی یہ چیزیں جو تھیں عام نہیں دے کے گئے تھے جن کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے کہ بَلِّغۡ مَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ (5:67) اگر تم نے نہ پہنچایا تو تم منصبِ رسالت پہ پورے نہیں اترے' یہ کہہ رہا ہے خدا رسول سے وَ مَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ھُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ (3:161) پھر وہاں یہ کیفیت ہوگی' ہر فیصلہ عمل کے مطابق ہوگا۔ یہ عقیدت مندیاں وہاں کچھ کام نہیں دیں گی۔ یہ ایک ناقص فارمولے کو' جھوٹے فارمولے کو سچا سمجھ کے سینے کے ساتھ لگا کے' اس کے مطابق عمل کرتے چلے جانا' کرتے چلے جانا' سمجھنا یہ کہ یہی مقصود وہی مفہوم تھا' میں صحیح کچھ کر رہا ہوں۔ کہتا ہے ٹھیک ہے جب تک تم اپنے آپ کو فریب دینا چاہتے ہو' دے لو۔ دوسروں کو فریب دینا چاہتے ہو' دیتے چلے جاؤ۔ جب نتائج نکلیں گے تو اس وقت تو بات صاف سامنے آ جائے گی کہ یہ سارے کام اس فارمولے کے مطابق تو نہیں ہوئے یہ تو چیز قرآن کے مطابق نہیں ہوئی' نتائج بتا دیں گے۔

قرآنِ حکیم کی انفرادی تعلیم کی عظمت کے معیار کے عملی ثبوت کے باوجود ہماری کم فہمی اور اس کا علاج

قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ (6:135) تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو' مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو' نتائج خود بتا دیں گے کہ حق و صداقت کس کے ساتھ ہے۔ عزیزانِ من! ہزار برس کے آپ کے اعمال کے نتائج بتا رہے ہیں نا آپ کو کہ کس چیز پہ عمل ہو رہا ہے؟ نسخہ آپ کے سامنے نہیں پیش کیا جا رہا ہے موجود' قدم قدم پہ الجھاؤ۔ جب کہا جائے کہ صاحب! یہ قرآن جو ہے بہر حال خدا کی ایک مکمل کتاب ہے' سند اور حجت اور دلیل اب دین میں

یہی ہے'اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔یعنی وہ اس کی طرف سے شبہات لوگوں کے دلوں کے اندر وساوس پیدا کرنے کی جو مہم ہے یہ بھی کہہ دیا جائے تو یہ تو جرأت نہیں ہوتی کہنے کی کہ نہیں صاحب! یہ مکمل نہیں اختلاف نہیں اس میں' کہتے ہیں صاحب! اس کی INTERPETITION میں بڑے اختلافات ہیں صاحب۔یعنی وہ کہتے دھڑلے سے یہ ہیں کہ کوئی چیز اب ہے ہی نہیں ہمارے پاس کہ جو اختلافی نہ ہو'جو سند اور حجت قرار پا سکے۔قرآن پہ ہی آتے تھے نا اور قرآن کی بات اس قرآن کہنے والے سے ایسے کہتے ہیں جیسے یہ اس کا قرآن ہوتا ہے'ان کا کوئی تعلق اس سے نہیں۔اور اس میں اتنے نقص نکالتے ہیں' اتنے عیب نکالتے ہیں اس کے اندر اور بڑے خوش ہوتے ہیں اس سے عزیزانِ من! یہ سب کچھ کر کے دیکھ لیا اس قوم نے ہزار برس سے' اگر یہ فی الحقیقت زندہ قوموں کی صف میں کم از کم آنا چاہتی ہے (وہ مقامِ بلند تو آگے جا کے آئے گا) ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ صحیح فارمولا جو دیا تھا اس خدا نے' وہ جو قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے بغیر آمیزش کے' اس کے اندر محفوظ ہے۔خالصتاً اس فارمولے کے مطابق عمل کیا جائے گا پھر نتائج وہ مرتب ہوں گے جو اس دور میں مرتب ہوئے تھے۔ورنہ جو جی میں آئے آپ کر کے دیکھ لیجیے گا' کبھی کسی طرح سے بھی وہ نتائج مرتب نہیں ہو سکتے۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ ' رِضْوَانَ اللّٰهِ ' کا لغوی مفہوم اور لفظ اطاعت کی وضاحت

عزیزانِ من! فارمولے کے سارے اجزا بعینہ وہی ہونے چاہئیں۔یہ ہے وہ چیز اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ (3:162) اب یہ پھر آ گیا رضوان اللہ کا لفظ۔وہ قرآن کی اصطلاحیں کون سی ہیں جو اپنے مقام پہ انہوں نے رہنے دیں۔رضا جوئی باری تعالیٰ۔یعنی آپ دیکھیں گے اس قسم کے ABSTRACT TERMS کہ متعین طور پہ کوئی بات ہی نہ بن سکے۔خوشنودئ باری تعالیٰ۔یعنی یہ سارا کچھ کیا اس لیے جا رہا ہے کہ اللہ خوش ہو جائے کسی طرح سے۔یعنی وہ ناراض بھی ہوتا ہے' وہ خوش بھی ہوتا ہے' وہ غصے میں بھی آتا ہے' وہ مہربانیاں بھی کرتا ہے۔یہ تصور ہے ہمارے ہاں خدا کا۔عزیزانِ من! دین کی بنیاد خدا کے صحیح تصور پہ ہے۔وہ تو کہتا ہے کہ غنی عن العالمین ہے۔مستغنی ہے تمام کائنات سے۔یہ تو دنیا کے بادشاہ ہوتے ہیں جن کو اس کی احتیاج ہوتی ہے کہ لوگ ان کی ہاں میں ہاں بھریں' ان کی مرضی کے مطابق کام کریں۔لوگوں کا مقصد ہوتا ہے ان کی خوشنودی حاصل کرنا۔وہ خوشنودی سے پھر وہ پوچھیے نہیں' زر و جواہر لٹاتا ہے' سب کچھ بخشتا ہے۔تصور یہ آ گیا جب یہ تصور آ جائے تو پھر قانون کی بات بیچ میں سے نکل جاتی ہے۔جب سوال کسی کو خوش ہی کرنا ہے تو قاعدہ قانون تو اس میں ہوتا ہی نہیں ہے۔رضوان' مرضات' رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ جتنے الفاظ یہ آتے ہیں اس کے معنی ہو گئے وہ اللہ سے راضی ہو گئے' اللہ ان

سے راضی ہوگیا۔ انہوں نے خدا کو خوش کر دیا' خدا نے ان کو خوش کر دیا۔ بس خوش کرنے کا مسئلہ ہی ہے سارا۔ سوال یہ نہیں ہے۔ رضی کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا۔ جو خدا کے قوانین کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا۔ اطاعت ایک چیز ہے جس سے یہ ہوتا ہے انسان لیکن اطاعت اس انداز کی ہو پورے دل کی رضامندی کی جس میں قرآن نے کہا ہے کہ پھر اپنے دل میں بھی وہ گرانی محسوس نہیں کرتے۔

خدا کے رنگ میں رنگے جانے کا مفہوم اور اس کا طریق

یہ جو اطاعت کا درجہ ہوتا ہے' اسے ہم آہنگ ہو جانا کہتے ہیں اس کے ساتھ۔ یکسر ہم نگہی' ہم آہنگی' یک رنگی اس کے ساتھ۔ یہ جسے کہتے ہیں خدا کے رنگ میں رنگا گیا۔ وہ یہاں آپ کو پتہ ہے خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے کون ہوتے ہیں؟ ''او جیہڑی گودڑی پائی ہوئی ہوندی اے نا او ہناں نیں' اک اک ٹا کی دا رنگ وکھرا وکھرا ہوندا۔ اے خدا دے رنگ اچ رنگی ہوئی ہوندی ہیگی۔ ڈبی نال ڈبی نہیں ملدی''۔ عزیزانِ من ! رِضۡوَانَ اللّٰہِ (3:162) قوانینِ خداوندی کے ساتھ کامل ہم آہنگی' یک جہتی علیٰ حدِ بشریت صفاتِ خداوندی' قوانینِ خداوندی۔ یہ جو ہو کیا اس جیسا ہوگا؟ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ (3:162) وہاں رضوان کے معنی خوشنودی ہوئی اور سخط جو ہے اس کے معنی پھر ناراضگی ہوگئی صاحب۔ یہ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ (3:162) جو ہے یہ الفاظ بھی مختلف مقامات پہ قرآن میں آئے ہیں غضب کے الفاظ آئے ہیں' سخط کے الفاظ آئے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے نا کہ بات ساری یہ ہے کہ بہر حال قرآنِ کریم اترا تو انسانوں کی زبان کے اندر ہے' الفاظ تو وہی آئیں گے۔ پہلے تو یہ ہے کہ مادے کے اعتبار سے محاورۂ عرب میں دیکھیے کہ الفاظ وہ کس طرح استعمال کرتے تھے۔ پھر دیکھیے قرآن نے ان الفاظ کو کس طرح سے استعمال کیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بات قرآن کے قوانین یا اس کی تعلیم کی اتباع یا اطاعت کرنا اور اس سے سرکشی برتنا' یہ ہے مفہوم اس کا۔ اس کے مطابق چلنا ہے جسے رضوان اللہ کہا جائے گا۔ اس سے برخلاف جانا' اس سے خلاف ورزی کرنا' یہ ہے کہ جس کا نتیجہ جسے آپ سَخَط کہتے ہیں۔

لفظ ' سخط اللہ ' خدا کا غصہ اور اس کے غضب سے مراد انسان کے اعمال کا رائیگاں ہو جانا ہے

دیکھیے قرآن نے اس کے متعلق کیا کہا ہے؟ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوۡا مَآ اَسۡخَطَ اللّٰہَ وَ کَرِھُوۡا رِضۡوَانَہٗ (47:28) یہ اس لیے کہ یہ اتباع کرتے ہیں ان چیزوں کا (دیکھیے اتباع کی بات ہے) پیچھے پیچھے چلتے ہیں ان چیزوں کے' یہ وہ چیزیں جو خدا کی

طرف سے نازل کردہ نہیں ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ کَرِھُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ سَنُطِیْعُکُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ(47:26) یہ نا پسند کرتے ہیں اس کو جو خدا نے نازل کیا ہے اور اتباع کرتے ہیں اس چیز کا کہ جس سے سخط اللہ جو ہے' وہ وارد ہوجاتی ہے۔ برادرانِ عزیز! بات تو صاف ہے۔ ما نزل اللہ جو ہے اس سے کراہت برتی جائے' اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے' اس کا اتباع کیا جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے جس کو ہم نے کہا ہے کہ خدا کی ناراضگی یا اس کا غضب یا اس کا غصہ (ہمارے الفاظ میں) ہوتا کیا ہے وہ؟ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَھُمْ (47:28) ان کے اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں نتیجہ نہیں برآمد کرتے۔ یہ ہے جسے خدا کا غضب کہا ہے۔ غضب کے معنی بھی ہیں جھلس جانا کسی چیز کا۔ کھیتیاں جھلس جاتی ہیں حبطِ اعمال ہوجاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ جتنی چیزیں ہوتی ہیں یہ انسان کے اپنے اعمال سے ہوتی ہیں' باہر سے نہیں آتیں۔ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَھُمْ اَنْفُسُھُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ (5:80) جو کچھ یہ اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے کرتے ہیں وہ اتنا برا ہوتا ہے کہ جس کا نتیجہ سخط اللہ ہوتا ہے۔ اعمالِ انسانی کا نتیجہ اگر وہ نتائج اس فارمولے کے مطابق ہیں جو اس نے وعدہ کیا ہے تو یہ چیز ہے جو رضوان من اللہ ہے اگر وہ اس کے خلاف جاتے ہیں' حبطِ اعمال ہوتے ہیں' یہ ہے جسے خدا کا غضب کہا گیا ہے وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (3:162)۔

خدا کے ہاں ہر شخص کا رتبہ اس کے اعمال کی بنیاد پر ہی متعین کیا جاتا ہے

اور ان کے متعلق کہا ھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰہِ ط (3:163) ان کے مدارج ہیں خدا کے ہاں۔ اب ان مدارجِ خداوندی کے لیے وہی تصور جو ہمارے ہاں اگر وہ ہے خوشنودیٔ باری تعالیٰ کا حصول اور اس کے حصول کے پھر ان کے اپنے اپنے طریقے۔ تو اس میں تو یہ ہے کہ تم کچھ کرتے چلے جاؤ' وہ اگر اس سے راضی ہوگیا تو تمہارے مرتبے بلند کردے گا۔ وہ اگر راضی نہ ہوا جو جی میں آئے تم کرتے رہو۔ یہ جتنی بھی دنیاوی بادشاہتیں ہوتی ہیں' حکام ہوتے ہیں ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے نا وہ خوش ہوگئے ''تے پنڈ دے پنڈ بخش دتے اوہناں نے' ناراض ہوگئے تے گھان بچہ کوہلو کردتا اوہناں نے'' نہ یہ معلوم کہ خوش کیسے کیا جائے' نہ یہ معلوم ناراضگی کس طرح سے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ کہتے ہیں'' بھولے بادشاہ اور بچے آں نال اوہناں نو تشبیہ دیندے نیں۔ گل وی ٹھیک ہیگی اے پتہ ای نئیں لگدا بچے دا۔ ضد اچ پیا ہویا اے' ماں نوں کہن ڈیا اے پئی چن جیہڑا اے میری ایس کجی اچ پادے۔ او چند کجی اچ نئیں پیندا رون ڈیا ہے''۔ مزاجِ شاہاں سعدی کہتا ہے

گاہے به سلامے برنجند
گاہے به دشنامے خلعت بخشند

مزاج ہے کبھی ان کو گالی دیجیے خلعت بخش دیتے ہیں کبھی سلام کیجیے گھان بچہ کو ہلو کر دیتے ہیں مزاج ہے۔

اوتھے کی پروا اے راکب اوتھے بے پرواہیاں

پھڑ لے عملاں والیاں نوں چھڈ دے او گنہگاراں

اللہ الصمد کا ترجمہ ہی کیا جاتا ہے اللہ بے پرواہ ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے وہ بخل کا نتیجہ وہ جو چھپا کے رکھ لیا ہوا ہے' یہ اس کے نتیجے ہیں۔ پتہ نہیں کیا تھا اور کیا کیا ہمیں اس کے نام پہ دے دیا جاتا ہے۔ **ھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰہِ** ط (3:163)۔ **وَ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا** ط **وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ** (6:132) ہر ایک کے مدارج اس کے کاموں کے اعتبار سے مرتب ہوتے ہیں۔ البتہ مرتب کرنے والا جو خدا ہے اس کی کیفیت یہ ہے اس کی نگاہوں سے کسی کا کام اوجھل نہیں رہتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کچھ کر رہا ہے اچھے کام اور اس کو پتہ ہی نہ چلے اور ''او جھوٹی سی آئی ڈی دی رپورٹ تے ای فیصلے کردا پھردا رہے''۔ **لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا** ط (6:133) ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق مرتب ہوں گے۔ عزیزانِ من! کیا نظام ہوگا یہ؟ جس میں کیفیت یہ ہو کہ **وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ** (6:133)۔ عزیزانِ من! اس دنیا کے نظام کہ جس میں جو کچھ کوئی کرتا ہے' اس کی صحیح صحیح خبر ہے وہاں جہاں ان چیزوں کے متعلق فیصلے ہوتے ہیں اور پھر دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر ایک کے مقامات ہر ایک کے منصب' ہر ایک کے مدارج اس کے کام جو ہیں' اس کے اعتبار سے آن میرٹ متعین ہوتے چلے جائیں۔

خدا تعالیٰ کی ذات نے ہر چیز کے لیے قوانین بنا رکھے ہیں وہ کسی کی خوشنودی کا محتاج نہیں

ھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰہِ ط (3:163) میں نے کہا تھا کہ میں نے اس کی تفسیر قرآن سے کی ہے۔ وہ کہتا ہے یہی نہیں کہ یوں ہی جس کے جی چاہے درجے متعین کر دیے جائیں **لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا** ط **وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ** (6:132)۔ **وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ** (17:70) ہر انسانی بچہ انسان ہونے کی جہت سے تو واجب التکریم ہے' اس کی تذلیل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن مقام جو ہیں معاشرے کے اندر' مدارج جو ہیں' وہ اس کے پھر جوہر ذاتی اور اعمال کی بنا پر متعین کیے جائیں۔ اور نظام یہ ہو کہ **وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ**(6:132)۔ باقی رہا یہ کہ صاحب وہ خوش ہو جائے تو یہ کہا **وَ رَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَۃِ** ط (6:133) ہم تو مستغنی ہیں ان چیزوں سے۔ ہم پہ نہیں کچھ اس کا اثر ہوتا کہ تم کیا کرتے ہو' کیا نہیں کرتے۔ ہم مستغنی ہیں۔ آہاہا۔ **ھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰہِ** (3:163) پھر ان کے ہاں کی زبان اور قرآن کے الفاظ سامنے آ جاتے ہیں۔ غور

کیجیے یہ درجات کا لفظ جو ہے۔ان کے ہاں دو لفظ ہیں درجات اور درکات۔عزیزانِ من! سیڑھی ایک ہی ہوتی ہے اسی سیڑھی سے پستی سے بلندی پہ بھی چڑھ جاتا ہے' اسی سے بلندیوں سے پستی پہ بھی آ گرتا ہے۔یہ تو سوال اس حرکت کرنے والے کا ہے۔یہ اوپر کی طرف حرکت کرتا ہے تو وہی سیڑھی اس کو بلندیوں کی طرف لے جاتی ہے۔یہ حرکت نیچے کی طرف کرتا ہے وہی زندگی کی سیڑھی جو ہے اس کو پستیوں تک لے جاتی ہے۔وہی اس کے ڈنڈے ہوتے ہیں' وہی وہ سیڑھی ہوتی ہے۔یہ ڈنڈے وہی ہوتے ہیں۔جب وہ اوپر جا رہا ہوتا ہے تو وہ عربوں کے ہاں ان ڈنڈوں کو درجات کہتے ہیں اور جب وہ نیچے اترتا ہے تو ان ہی ڈنڈوں کو درکات کہتے ہیں ۔منافق جو درکِ اسفل میں کہا ہے نا۔کیا زبان ہے صاحب یہ؟ عزیزانِ من! نیچے اترنے اور اوپر چڑھنے کی یہاں سیڑھیاں الگ الگ نہیں ہوتیں۔ایک ہی زندگی کا میدان ہوتا ہے ایک ہی وہاں پروگرام ہوتا ہے ایک شخص اس میں ایک نیت سے کچھ کرتا ہے' دوسرا دوسری نیت سے کچھ کر رہا ہوتا ہے ''او پوڑیاں دے ڈنڈے اُتاں نوں چڑھن ڈیا ہویا ہونداا ے' اے او ہو ڈنڈے تھلے اترن ڈیا ہونداا ے''۔هُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ اللّٰهِ (3:163) پھر میں دہرادوں کہ دو سیڑھیاں نہیں ہوتیں ایک ہی OPPORTUNITY آتی ہے دونوں کے سامنے' ایک ہی تلوار ہوتی ہے ظالم کے ہاتھ میں بھی' مجاہد کے ہاتھ میں بھی۔وہی دولت ہوتی ہے سرمایہ دار کے ہاتھ میں بھی' وہی دولت ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں جس نے رب العالمین بننا ہے۔ایک ہی سیڑھی ہوتی ہے سوال یہ اترنے اور چڑھنے والے کا کہ وہ کس طرف چلتا ہے۔دو الگ الگ سیڑھیاں نہیں ہیں کہ ''اے اُتے چڑھن واسطے تے اے تھلے اترن واسطے''۔''اوتے سردار جی دا غسل خانہ سی نا' سردار جی نے کوٹھی بنوائی نئی تے اوہناں سمجھیا پئی ایتھے حوض ہونے چاہیدے ہیگے نیں۔اوہناں دیکھیا پئی تین حوض بنوائے ہوئے سن۔اوتھے دکھان واسطے لے گئے دوستاں نوں۔کہن لگے جی بڑا اچھا کیتا تین حوض بنائے۔کہن لگے جی اے حوض کی ہے؟ کہن لگے جی ایہدے وچ گرم پانی ہوئے گا' گرم اچ نہان نوں جی کرے گا ایہدے اچ نہاؤ۔کہن لگے ایدھرلا جیہڑا ہیگا اے؟ کہن لگے جی ایہدے اچ ٹھنڈا پانی ہوئے گا جس دن ٹھنڈے پانی ناں نہان نوں جی کرے تے اوس دن ایہدے اچ نہاؤ۔کہن لگا اے دو ہو گئے تے اے تیسرا کی اے؟ کہن لگا اے سکا رہے گا جس دن نہ نہان نوں جی کرے''۔زندگی میں دو قسم کی سیڑھیاں نہیں ہوتیں ''اے سرداراں دے ہوندیاں نیں۔تے اوسکھ چلے نئیں گئے بوچھڈ گئے نیں ایتھے بادشاہو''۔زندگی میں چڑھنے اور اترنے کے لیے دو الگ الگ سیڑھیاں نہیں ہوتیں۔یہ حرکت کرنے والے کے اپنے اوپر ہے' بلندیوں کی طرف جانا چاہتا ہے تو وہی سیڑھی وہی ذرائع جو اسے میسر ہیں' بلندیوں کی طرف لے جائیں گے۔پستیوں کی طرف آنا چاہتا ہے تو وہی ذرائع اس کو پستیوں کی طرف لے آئیں گے۔هُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ (3:163) بات بس اتنی

ہے راز کی کہ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (3:163) بس وہ چاہیے کہ جو دیکھ رہا ہو۔صحیح اور غلط نظام کا بڑا راز اس پہ دارومدار اس پہ ہے فیصلہ کرنے والے بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (3:163) ہیں یا نہیں۔

خلافت وملوکیت وہ بنیادی فرق جسے حضرت عمر فاروقؓ کے دو لفظوں نے واضح کر دیا

یہ جو گناہگار پستے ہیں، حق وصداقت کے اوپر رہنے والے شکنجوں میں جکڑے جاتے ہیں، وہ تو کبھی ہوتا ہے اس قسم کی چیز جو ہم نے کہی کہ گاہے بہ سلامے رنجند ورنہ اکثر وبیشتر ہوتا اسی طرح سے ہے فیصلہ کرنے والا جو ہے بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (3:163) نہیں ہوتا، اس کی یہ مشینری غلط ہوتی ہے۔اس کو ہم غیر ذمہ دار نہیں قرار دے سکتے وہ یہ کہہ دے کہ مجھے کیا پتہ تھا، مجھے کیا اس کا علم ہے۔حضرتِ عمرؓ جیسے باریک بین نے کہا تھا، اتنا بڑا سربراہ تاریخ میں جس کی نظیر نہیں ملتی، آج تیرہ چودہ سوسال کے عرصے کے بعد بھی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی اس کی۔اس نے بتایا تھا اس نے کہا تھا کہ مجھے خلافت کا راز کس نے بتایا۔اور وہ یہ کہ شام کے میدانوں میں جب واپس آئے ہیں وہاں ایک رات ڈیرہ ڈالا۔عادت تھی بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (3:163) ہونے کے لیے جا کے خود دروازوں پہ کھڑے ہو کے سنا کرتے تھے کہ باتیں کیا ہو رہی ہیں۔جنگل میں تنہا جھونپڑی کے اندر بڑھیا ایک تھی وہ بھی اندھی، اس سے جا کے پوچھا کہ مائی کیا حال ہے تمہارا؟ اس نے کہا تمہیں کیا میرے حال سے جسے میرے حال کے متعلق علم ہونا چاہیے، اسے ہی معلوم نہیں ہے تو میں تمہیں کیا بتاؤں گی۔انہوںؓ نے کہا کہ مائی کس کے متعلق کہہ رہی ہو؟ کہنے لگی وہ کہ جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ میری مملکت میں اگر دجلہ کے کنارے کتا بھی بھوک سے مر جائے گا تو مجھ پہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کی طرف اشارہ کر رہی ہوں۔کہنے لگے مائی خلیفہ کے متعلق کہہ رہی ہو؟ اس کے متعلق کہہ رہی ہوں۔کہنے لگے تم نے اپنے دکھ کو درد کو پریشانیوں کو خلیفہ تک پہنچایا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ میرا ذمہ نہیں ہے۔اور اگلا اس کا فقرہ تھا کہ اگر اس کا انتظام نہیں ہے کہ وہ ہر فرد کے متعلق صحیح اطلاعات اس کو پہنچتی رہیں ملتی رہیں، وہ حاصل کرے تو خدائے بصیر کا نمائندہ کس طرح بن سکتا ہے۔بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (3:163)۔

خلیفۂ وقت کی ذمہ داریوں کی نشاندہی ایک بڑھیا کی زبانی

عمر کا باقی حصہ جب آپ کو یاد آتا تھا تو کہتے تھے کہ خلافت کا مفہوم اس بڑھیا نے مجھے سمجھایا ہے کہ یہ میرا کام نہیں ہے، یہ اُس کا کام ہے کہ وہ معلوم کرے کہ کس پہ کیا گذر رہی ہے۔وہ اگر ایسا انتظام نہیں کر سکتا تو خدائے بصیر کا نمائندہ کیسے کہلاتا ہے۔اللہ اکبر۔عزیزانِ من! قرآن نے یہ چیزیں پیدا کی ہوئی تھیں۔

گھروں میں بہو کے انتخاب کے لیے حضرت عمرِ فاروقؓ کی طرف سے راہنمائی کا طریق

اسی کے زمانے میں اس خیمے کے اندر جب سوتے وقت وہ مائی نے بیٹی سے کہا کہ بیٹا وہ دودھ آیا ہے دوہ کے آ گیا ہے نا' اس کو چولہے پہ رکھ دینا۔ اور آپ کو پتہ ہے نا وہ تھوڑا سا پانی اس میں ڈال دیتی ہیں عورتیں' عام طور پہ اس میں ڈال دیتی ہیں تا کہ وہ آگ پہ جتنا جلنا ہو پانی جلے تو وہ دودھ ویسا ہی رہ جائے۔ تو اس نے کہا کہ بیٹی! آگ پہ وہ دودھ رکھ دینا اور اس میں پانی آدھا گلاس ڈال دینا۔ اس نے کہا کہ امی! دودھ تو میں رکھ دوں گی چولہے کے اوپر' پانی نہیں ڈالوں گی۔ اس نے کہا کیا ہوا پانی نہیں ڈالو گی؟ اس نے کہا کہ آج ہی خلیفہ نے کہا تھا کہ دودھ میں پانی ڈالنا بڑا جرم ہے۔ تو یوں ہی اس نے یہ کہہ دیا بھولے پن سے کہ تم وہ پانی ڈال کے رکھو کون سا خلیفہ دیکھ رہا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں اماں جی! خلیفہ نے اس کے بعد کہا تھا کہ یاد رکھنا! خدا دیکھ رہا ہوتا ہے' اس لیے میں پانی نہیں ڈال سکتی۔ خلیفہ سیدھے آئے گھر میں بیوی سے کہا کہ جس قیمت میں ہو سکے' اس بیٹی کو بہو بنا کے گھر میں لے آؤ۔ عمر کا گھر منور ہو جائے گا اس بچی سے۔ ویسے تو نسب کی کوئی بات نہیں ہوتی' تربیت کی بات ہوتی ہے۔ یہی بیٹی تھی کہ جس کے نسب میں عمر بن عبدالعزیز جیسا خلیفہ پیدا ہوا۔ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (3:163)۔

قرآنِ حکیم میں صفاتِ خداوندی بیان کرنے کا مقصد

عزیزانِ من! یہ خدا ہی کی صفات نہیں قرآن بیان کر رہا' وہ بیان کر رہا ہے کہ جو خدا کے نام کے اوپر یہاں حکومت قائم کرنے والے' ہیں جن کو یہ دعویٰ ہے حکومتِ خداوندی قائم کریں گے' نظام اس کا قائم کریں گے' یہ ساری صفات علیٰ حدِ بشریت ان کے اندر ہونی چاہئیں پھر یہ نظم و نسق انسانی زندگی کا ویسے چلے گا جیسا خدا کی کائنات میں اس کا چلتا ہے۔ پھر کہا جائے گا کہ تیری بادشاہت جو آسمانوں پہ ہے وہ زمین پر بھی آ جائے گی۔ عزیزانِ من! اس کے سوا کوئی دوسرا طریق نہیں ہے۔ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (3:163)۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت 163 تک آ گئے اور اس کے بعد پھر بتائیں گے جو خدا نے کہا ہے کہ کتنا بڑا احسان ہم نے تمہارے اوپر کیا جو یہ چیزیں تمہیں دے دی ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

اٹھائیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 164 تا 168)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1970ء کی 12 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی 164 ویں آیت سے ہوتا ہے: (3:164)۔

نظامِ ربوبیت کی تکمیل کی خاطر انسانیت کے لیے ہر دو شعبوں کی راہنمائی کی وضاحت اور ان کی اہمیت

آپ ذرا تصور میں لایے ایسے منظر کو کہ انسان کی پیدائش کا زندگی کا دار و مدار ہو مثلاً ہوا پر' انسان کو پیدا تو کر دیا جائے اور ہوا یہاں موجود نہ کی جائے تو یہ کیا چیز ہوگی؟ زیست کا دار و مدار ہو پانی پر اور پانی دنیا میں پیدا نہ کیا جائے' جانداروں کو پیدا کر دیا جائے 'می نہ سزد خدائے را'۔ خالق کے لیے ضروری ہے کہ وہ رب بھی ہو۔ تخلیق کرتا ہے سامانِ ربوبیت بھی بہم پہنچائے۔ یہ سامانِ ربوبیت یہ ہوا اور پانی کی تو میں نے مثال دی یہ تو انسان کی طبعی یا حیوانی زندگی کے لیے ضروری ہیں' اس کی جسمانی پرورش اور نشو ونما کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن انسان کی زندگی حیوانی زندگی نہیں ہے اس سے آگے اس کی انسانی زندگی بھی ہے۔ اس کی انسانی زندگی کے لیے بھی اسی طرح سے سامانِ نشو ونما کی ضرورت تھی اور یہ سامانِ نشو ونما جسے کہا گیا یہ وہ اصول اور قوانین تھے وہ مستقل اقدار

تھیں، جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اس کی انسانیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ تو جہاں یہ سامانِ ربوبیت کہ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی جب اس میں کچھ کھانے کی طبعی استعداد نہیں ہوتی، رزق کے سرچشمے بہ نکلتے ہیں اور اس انداز سے اس کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ اس کی شانِ ربوبیت ہے۔ تو انسانوں کے لیے اس قسم کی مستقل اقدار، قوانین، راہنمائی ان چیزوں کا مل جانا بھی خدا کی ربوبیت ہے۔

انسانی آنکھ کے لیے روشنی اور انسانیت کی راہنمائی کے لیے وحی کے بغیر تو اس پوری کی پوری کائنات کا وجود ہی بے کار اور بے سود تھا

آنکھیں دی جائیں اور روشنی نہ دی جائے، شانِ ربوبیت کے خلاف ہے۔ یہ تو جسمانی آنکھوں کے متعلق ہے اور انسان کی انسانیت کی آنکھیں تو دی جائیں لیکن اسے زندگی میں چلنے کے لیے رہنمائی کے لیے روشنی نہ دی جائے، یہ تو خدا کی ربوبیت سے بعید تھا۔ اس لیے اس روشنی کے لیے بھی اس نے کہا کہ جہاں ہم نے آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے لیے، روشنی بھی دی ہے۔ اور اسی روشنی کو اس نے وحی سے تعبیر کیا ہے اور یہ وحی رسول کی وساطت سے ملتی ہے اس لیے آغازِ کلام ہی اس سے کیا کہ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (3:164) ایک اندھا ہو اسے کچھ دکھائی نہ دیتا ہو ایک حاذق ڈاکٹر اس کا آپریشن کرے اس کا علاج کرے اور اسے دکھائی دینے لگ جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی زندگی میں یہ دن کتنا قابلِ یادگار دن ہوگا، اس ڈاکٹر کا یہ احسان کتنا بڑا عظیم احسان ہوگا۔ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (3:164) اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے پیشتر تم انسانیت کی آنکھوں میں بینائی نہیں رکھتے تھے، اس نے بینائی عطا کی خارج میں روشنی عطا کی۔ کتنا بڑا احسان ہے اس پیدا کرنے والے کا۔ اس میں پہلی چیز جو یہ کہی گئی کہ یہ رسول کا جو پیدا کرنا ہے یہ ہے جسے یہ احسان کے طور پہ اس لفظ سے تعبیر کیا کہ جسے از خود تم کہیں سے نہ پا سکتے تھے، نہ خرید سکتے تھے۔ بلا مزد و معاوضہ خدا کی طرف سے یہ وحی رسول کو ملی۔

وحی کے حقائق کو تسلیم کرنے والا شخص خدا تعالیٰ یا رسول پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوتا

اور اگلی چیز جو ہے وہ اس سے بھی اہم۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر آپ کا آپریشن کرتا ہے اگر وہ اس کی فیس چارج کر لیتا ہے عوض معاوضہ لے لیتا ہے، نہ دار دیہ احسان نہیں ہے۔ رسول آ کر رسول، خدا سے یہ نبوت یا رہنمائی مفت پاتا ہے، بلا معاوضہ پاتا ہے اور

اس کے لیے کہا یہ گیا کہ جہاں تم اس رہنمائی کو پہنچاؤ' اس کے ساتھ اس کا اعلان کرو کہ وَمَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ج (26:109) میں اس کی کوئی فیس تم سے نہیں مانگتا۔ اتنی بڑی نعمت وہ دیتا ہے بلا اجر کے' بلا معاوضہ کے' بغیر صلے کے' وہ دیتا ہے۔ یہ رسول کی خصوصیت ہے۔ خدا نے یہ رہنمائی دی تو بلا صلہ کے' بلا اجر کے دی۔ رسول نے اسے آگے پہنچایا بغیر معاوضے کے اور بغیر اجر کے پہنچایا۔ اور بہت بڑی چیز ہے جس کا ذکر خدا نے کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پہ خاص طور پہ اس کا ذکر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بھی تھے جن کے ذہنوں میں ابھی یہی تھا کہ یہ اسلام یا امتِ مسلمہ کے اندر داخل ہو جانا اسلام لے آنا کچھ ان لوگوں پر احسان کرنا ہے۔ وہ جیسا کسی POLITICAL PARTY میں شامل ہو جائے بالخصوص الیکشن سے قریب زمانے میں تو یہ بہت بڑا احسان ہوتا ہے اس پارٹی پر اس پارٹی کے لیڈر پر کہ ان کی اتنی ووٹس بڑھ جاتی ہیں اس سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس لیڈر کو اور اس پارٹی کو ہر آن ان کی خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں' جائز ناجائز منتیں سماجتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ان کی ہر بات ماننی پڑتی ہے کہ اگر یہ ساتھ چھوڑ گیا تو اتنے ووٹس کم ہو جائیں گے۔ رسول کی رسالت میں تو یہ بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے ایسے لوگ یہ سورۃ حجرات میں وہ جو بدوؤں کے قبائل تھے' ابتدا میں تو وہ اسلام نہیں لائے۔ اسلام کی مملکت قائم ہوئی' یہ نظام قائم ہوا اس کے نتائج سامنے آئے' اس کی شوکت و سطوت کو انہوں نے دیکھا اور اس بنا پر وہ اس امت میں شریک ہو گئے' اس مملکت کے افراد بنے۔ تو وہاں بات یہاں سے شروع کی تھی کہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں آ کر کہ ہم ایمان لائے ہیں قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا (49:14) ان سے کہو کہ یہ ابھی تم ایمان نہیں لائے وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا (49:14) یہ کہو کہ ہم اس مملکت کی شان و شوکت و سطوت کو دیکھ کر اس کے سامنے جھک گئے ہیں ہم نے اس کی SOVEREIGNTY قبول کر لی ہے' یہ ایمان کی بات ابھی نہیں آئی۔ اور خود ہی آگے واضح کر دیا کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (49:14) ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں کے اندر ابھی نہیں اترا۔ یہ نہیں کہ اس کے بعد بھی یہ اترے گا نہیں' یہ پروگرام اگلا جو ہے وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (49:14) اب اس نظام کی یہ اطاعت کرتے چلے جاؤ گے تو آہستہ آہستہ یہ کیفیت ہو جائے گی کہ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ لیکن جب تک وہ نہ کیفیت پیدا ہو یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ یہاں اتنی سی بات ان کے متعلق کہی اور نظر آتا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جن کے دل میں غالباً یہ احساس بیدار ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ ملنے میں ان کی جماعت میں شامل ہونے میں ان کی تقویت بڑھ جائے گی' ان کی طاقت بڑھ جائے گی' کچھ ہمارا احسان ان کے اوپر ہوگا۔

خدا کا رسول وحی کے پیش کردہ حقائق کو عام کرنے کے سلسلہ میں کسی معاوضوں کا طلب گار نہیں ہوتا

یہیں دو آیات کے بعد یہ کہا کہ یَمُنُّوۡنَ عَلَیۡکَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا ؕ (49:17) اس طرح سے یہ جو SURRENDER کر کے تمہاری جماعت میں شامل ہوگئے ہیں یہ تم پہ احسان رکھ رہے ہیں اس بات سے کہ ہم اسلام لے آئے ہیں' احسان جتاتے ہیں اس بات کا۔ پھر سمجھ لیجیے کہ یہ جو بینائی اس ڈاکٹر نے دی تھی اس کا کوئی اجر اور معاوضہ نہیں لیا تھا مفت ملا تھا' مفت دیا تھا۔ یہ لوگ جو اس طرح سے اسلام لانے میں سمجھتے تھے کہ ہم نے کوئی احسان کیا ہے ان کے اوپر' کہا کہ قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَکُمۡ (49:17) ان سے کہہ دو کہ تم اپنے اسلام کا کوئی احسان مجھ پہ نہ جتلاؤ۔ میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں' کوئی اپنی اغراض و مقاصد نہیں کوئی POLITICAL PARTY اس قسم کی نہیں کہ ان میں ممبروں کی تعداد کی کثرت جو ہے وہ میرے لیے کسی طرح سے مفید ہو جائے گی' سوال ہی یہ نہیں ہے۔ یہ تو حق اور صداقت کو قبول کرنا' اسے آگے پہنچانا ہے۔ مجھے بلا معاوضہ ملا میں نے بلا معاوضہ دیا۔ تم آگے اس کو بلا معاوضہ دوسروں تک پہنچاؤ۔ یہ تو یہ پروگرام ہے۔ اس لیے اس میں یہ کیا سوال کہ تم اسلام لائے ہو تو تم نے کوئی احسان کر دیا۔ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ ھَدٰکُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (49:17) حقیقت یہ ہے کہ خدا نے خود تم پہ احسان کیا ہے کہ اس نے صحیح راہنمائی تمہیں دے دی ہے۔ ایک شخص جو بھٹکتا پھر رہا ہو' راستہ اسے معلوم نہ ہو۔ کبھی اِدھر جائے کبھی اُدھر جائے' وقت توانائی ضائع ہو رہی ہو' اگر کوئی شخص اس کو یہ بتا دے کہ بھائی! تم نے جہاں جانا ہے یہ راستہ اس کی طرف جائے گا سیدھا۔ اور اس کے لیے پھر اس سے کوئی اجر اور معاوضہ بھی نہ طلب کرے تو درحقیقت یہ اس کا اس پر احسان ہے نہ یہ کہ اس راستے کے اوپر چلتا جائے اور اس سے کہتا جائے کہ دیکھا میں نے تم پہ کیسا احسان کیا کہ میں صحیح راستے پہ چل رہا ہوں۔ لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ اس کے اندر وہ شرط ہے وَمَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ (26:109) دینے والا اس کا کوئی اجر نہ مانگتا ہو۔

اجر کی وصولی اپنے ہاں کئی ایک روپ اختیار کیے ہوتی ہے

اجر روپے اور پیسے ہی میں وصول نہیں کیا جاتا' اجر کی تو بڑی شکلیں ہوتی ہیں۔ کسی سے اپنی اطاعت لے لینا' ان کا ایک امیر بن جانا' ان کا لیڈر بن جانا' ہر وقت اپنا ان پہ حکم چلاتے چلے جانا' ان کے دلوں میں اپنی ارادت اور عقیدت اس انداز کی پیدا کر لینا کہ وہ ہر وقت اس کے اشاروں پہ جھکتے چلے جائیں۔ یہ سب اجر کی مختلف قسمیں ہیں۔ رسول نے جب یہ کہا تھا اور وہ کہتا تھا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا تو وہ ان میں سے کوئی چیز ان سے نہیں چاہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی کی سیرت اور کریکٹر کی بلندی کی بنا پر آپ

کے دل میں اس کا احترام پیدا ہوتا ہے' اس کی تکریم پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ تو قرآن نے خود کہا ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ (49:13) جو زیادہ سے زیادہ ان قوانین کی اطاعت کرے گا' زیادہ سے زیادہ واجب التکریم ہوتا چلا جائے گا۔ تکریم اور احترام کا جذبہ اور وہ بھی کسی کے حسنِ عمل کی بنا پر' سیرت کی پاکیزگی کی بنا پر' کریکٹر کی بلندی کی بنا پر' اگر دل میں یہ پیدا ہوتا ہے تو یہ ہونا چاہیے اور یہ نہایت ضروری چیز ہے۔

خدا کے ہاں سے وحی پانے والی عظیم شخصیت کی عظمت اور وحی کی اہمیت کا ذکرِ خیر

آپ اس میں اس شخصیت کی تکریم نہیں کر رہے' اس کے حسنِ سیرت کی تکریم کر رہے ہیں' اس کے کریکٹر کی بلندی کا اعتراف کر رہے ہیں' اس کو APPRECIATE کر رہے ہیں' اسے اس کا اجر نہیں کہتے۔ اس لیے احترام و تکریم تو اور شے ہے لیکن کسی سے صلہ اور معاوضہ کی توقع رکھنا اس کا طلب کرنا وہ کسی شکل کے اندر بھی کیوں نہ ہو جو خدا کے قوانین اور اس کی تعلیم کو آگے پہنچانے والا ہے' اس کے لیے قطعاً یہ جائز نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس تک وہ پیغام پہنچاتا ہے وہ پھر یہ نہیں کہتے کہ ہم تم پر اپنا احسان رکھتے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ احسان تو ہمارا ان پر ہے کہ ہم نے انہیں یہ صحیح راستہ دکھا دیا اور اس طرح سے ان کی آوارگی کو سفر میں بدل دیا۔ انہوں نے جو یوں ہی ناحق تھک کر چور ہو جانا تھا' ان کی محنتوں کو ہم نے بچا دیا۔ عزیزانِ من! وحی کرتا ہی یہی ہے دنیا میں' وہ انسان کی EFFORTS کو' انسان کی محنت کو ECONOMIZE کر دیتا ہے اقبالؒ کے الفاظ میں۔ تو یہ جو چیز کسی کی طرف سے مل رہی ہے اور بلا مزد و معاوضہ بلا صلہ اور ستائش کے مل رہی ہے' یقیناً اگر سوچا جائے تو یہ اس کا احسان ہے' نہ یہ کہ ایسا راستہ دکھانے والا مفت میں بینائی دینے والا جو ہے' خود اس کے سر پہ ہم احسان الٹا دھریں۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا (3:164) رسول ایک ان میں بھیجا پیغامبر ہم نے بھیجا اس میں آگے ایک خصوصیت اس رسول کی پہلی یہ بتائی ہے رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (3:164) بڑی عظیم بات ہے۔ تم میں سے ہی ایک رسول۔ نظر بظاہر تو کوئی خاص بات دکھائی نہیں دیتی کہ یہ ٹھیک ہے تم میں سے ایک رسول ہے۔ اور پھر قرآن بار بار زور دیتا چلا جاتا ہے ان کی زبان سے کہلوا رہا ہے اس رسول کی زبان سے کہلا رہا ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ (18:110) بس فرق صرف یہ ہے کہ میری طرف خدا کی طرف سے مجھے وحی ملتی ہے' وہ میں وحی تم تک پہنچا دیتا ہوں اور اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110)۔

قرآنی تعلیم کے برعکس مذہب کی دنیا میں شخصیات کو فوق الفطرت قوتوں کی حامل قرار دینے کے تصور کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہ بڑی غور طلب چیز ہے کہ اس پہ اتنا زور کیوں دیا گیا۔ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ (3:164)۔ آپ دیکھیں گے مذاہبِ عالم جو اس دین کی شکل نہیں ہے جو انہیں خدا کی طرف سے ملا تھا' انسانی خیالات ارادت مندیوں عقیدت مندیوں کا جس کے اندر رنگ شامل ہو گیا' اس میں آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے اپنے بانیانِ مذاہب کو خواہ وہ انبیائے کرامؑ میں سے کیوں نہیں ہیں' ان انبیائے کرامؑ میں سے جن کا نام قرآن نے دیا ہے' ان میں سے کیوں نہ ہو' انہیں انہوں نے انسان کے درجے سے ہمیشہ اونچا کر کے رکھ دیا ہے' انہیں فوق الفطرت خصوصیات کا حامل بتا دیا۔ یعنی ان کی شخصیت سامنے آتی ہے تو نظر آتا ہے کہ صاحب! وہ کوئی الگ مخلوق تھے۔ خدا نے خاص طور پہ ان کو ان خصوصیات کا حامل پیدا کیا تھا۔ وہ تو یہ کچھ کر گئے' انہوں نے تو یہ کچھ کر کے دکھا دیا لیکن ہم تو بھئی بندے بشر ہیں' ہم سے یہ چیز کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر مذہب میں یہ کیفیت ہے کہ انہوں نے اپنے بانی مذہب کو فوق الفطرت قوتوں کا حامل بتایا ہے' عام انسان نہیں ان کو رکھا انہوں نے۔ آپ کو معلوم ہے اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ ایک شخص آپ کے سامنے آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی باتیں آپ دیکھیے بھنگڑ خانے کا فقیر' میلے کچیلے کپڑے' الجھی ہوئی لٹیں' آنکھوں کے اندر پتہ نہیں کس قسم کا وہ نشہ پیا ہے جس میں سرخی کے انگارے نکل رہے ہیں۔ کوئی شخص اس کے قریب جانے کو تیار نہیں۔ آپ چلے جا رہے ہیں اور وہ کھڑا ہو کے کہتا ہے اوئے ٹھہرو' دیکھو میں کیا کر سکتا ہوں؟ بالوں کو نچوڑتا ہے اس میں سے دودھ کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں۔ آپ کی عقل و فکر کے سارے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ آپ انہیں فوراً خدا کا کوئی بزرگ بہت پہنچا ہوا فقیر کرامات والا مانتے ہیں۔ فوراً اس کے پاؤں پڑ جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب وہ آپ سے کہتا ہے کہ یہ کرو جو میں تم سے کہتا ہوں' آپ نہ سوچتے ہیں نہ سمجھتے ہیں' نہ غور و فکر اس میں کرتے ہیں' ایک رعب طاری ہو جاتا ہے آپ کے اوپر۔ جو وہ کہتا ہے آپ کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ وہ بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (18:110) نہیں رہا۔ وہ کچھ ایسی بات کر گیا ہے جو تم نہیں کر سکتے تھے' جسے تم سمجھ نہیں سکتے تھے۔ یہ جب بھی کسی کو آپ بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (18:110) سے اوپر لے جائیں گے تو وہ جو کچھ کہے گا' جو کچھ کرے گا' وہ آپ عقل و بصیرت سے نہ سمجھیں گے نہ سمجھ سکیں گے۔ لیکن جب وہ بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (18:110) کے لیول کے اوپر آپ سے کہے گا۔ وہ بھی بات کہے گا کہ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ ۚ قف عَلٰى بَصِيۡرَةٍ (12:108) یں جو تمہیں دعوت دیتا

ہوں خدا کی طرف عقل وبصیرت کی بناپہ دعوت دیتا ہوں اورتم سے بھی وہ کہتا ہے تَتَفَکَّرُوْا (34:46) جو کچھ میں کہتا ہوں' غور وفکر سے اس کو سوچو اور سمجھو۔ یہ نہ کہو کہ میں نے کوئی مافوق الفطرت چیزیں اپنے ہاں رکھی ہیں' وہ تم سے منوانا چاہتا ہوں' غور وفکر کے دیے گل کرنا چاہتا ہوں' میری کرامات کے زور کے اوپر تم یہ چیزیں مانو۔ وہ یہ نہیں کہتا۔ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (3:164) تم میں سے ایک رسول' تمہارے جیسا ایک انسان۔ میں کہتا ہوں یہ ہے بہت بڑا احسان۔ سوچیے کہ اگر کوئی رسول مافوق الفطرت سا پیکر لیے ہوئے عجیب وغریب سی اس کی ہیت کذائی ہو' انسانوں میں سے ہو ہی نہ۔ عجیب مخلوق ہو' عجیب عجیب اس سے کارنامے سرزد ہوں' وہ آ کے آپ سے جو کچھ کہے' آپ مجبور ہو جائیں گے اس کو ماننے کے لیے۔ ایک ڈر ایک دہشت ایک خوف طاری ہو جائے گا۔ عقل وبصیرت کی رو سے آپ کوئی بات اس کی نہیں مانیں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جتنے یہ جن کو آپ حضرت صاحب کہتے ہیں' ان کے ہاں جو باتیں آپ سن کے آتے ہیں' عقل وفکر کی رو سے نہیں آپ ان کو مانتے۔ آگے آپ بات کرتے بھی ہیں تو ان میں عقل وفکر ہوتی نہیں۔ جب آپ سے پوچھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو عالمِ بالا کی باتیں ہیں' باطنی علم ہے۔ میں اور آپ اس کو سمجھ نہیں سکتے لیکن کرنا ہمیں وہی چاہیے جو حضرت صاحب کہتے ہیں۔ رسول اس طرح سے اپنی بات نہیں منواتا۔ اور یہ بہت بڑا احسان ہے انسانیت کے اوپر کہ وہ ان کے عقل وفکر کے چراغوں کو گل کر کے اپنی بات نہیں منواتا۔ ان دیوں کی روشنی کو وہ اور زیادہ اجالا دیتا ہے اور بڑھاتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں' غور وفکر کی بنا پر اس کو سوچو اور پھر اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے تو اسے تم تسلیم کرو۔ اس کی تعلیم انسانی صلاحیتوں کو نشو ونما دینے والی تعلیم۔

مذہب کی دنیا میں معجزہ طلبی کا تصور عقلِ انسانی کو مسلوب کر دیتا ہے

سب سے پہلی صلاحیت انسان کی تو غور وفکر کی ہے اگر وہ غور وفکر کی صلاحیت کو ہی آپ کے ہاں مفلوج کر دیتا ہے' PARALYSE کر دیتا ہے' اس کا احسان کیا ہے ہم پہ؟ اس نے تو تباہ کر کے رکھ دیا انسانیت کو۔ انسانیت پہ احسان یہ ہے کہ انسانیت کی پہلی خصوصیت جو مابہ الامتیاز ہے' وہ غور اور فکر اور عقل اور تدبر اور تعقل اور شعور کی ہے' وہ ان صلاحیتوں کو نشو ونما دیتا ہے۔ کوئی ایسی بات کر کے نہیں دکھاتا جسے آپ مافوق الفطرت سمجھیں۔ کوئی اس قسم کی اس کی شکل وشباہت' اس کا پیر' اس کا رہنا وہ قطعاً ایسا نہیں ہوتا کہ جس کے رعب میں آ کے فکر اور تدبر کی قوتوں کو مسلوب کر کے' اس کی بات ماننے کو تیار ہوں۔ اَنَـــا بَشَـــرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110)۔ مخالفین جن کے متعلق کہا وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (3:164) اس سے پیشتر تم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ کھلی ہوئی گمراہی کیا تھی؟ وہ اس رسول ﷺ سے بار بار یہ کہتے تھے کہ اگر تم خدا کی طرف سے رسول ہو تو کوئی معجزہ

دکھاؤ۔ تم بتاؤ کہ تمہارے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ مجھے خدا کی طرف سے یہ علم ملتا ہے' اس میں تم سچے ہو' ثبوت دو اس کا کہ تم سچے ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا ثبوت کیا پیش کیا گیا تھا؟ عزیزانِ من! کوئی معجزہ نہیں' کوئی کرامت نہیں' کوئی مافوق الفطرت بات نہیں۔ کہا تم مجھ سے ثبوت مانگتے ہو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس دعویٰ کرنے میں سچا ہوں یا نہیں؟ **فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ** (10:16) میں کہیں باہر سے نہیں آیا میں نے تو ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے' میری زندگی پہ غور کرو اور سوچو کہ یہ زندگی جھوٹے کی زندگی ہے یا سچے کی زندگی۔ جس نے ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے' وہ اپنی اس پوری گذشتہ عمر کو تمہارے سامنے اپنے دعوے کی صداقت کے ثبوت میں پیش کر رہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے معجزہ کہ ہرقل کے دربار میں ابوسفیان گیا ہوا ہے ان کے خلاف مدد لینے کے لیے اور وہاں وہ شخص' وہ بھی غیر مسلم ہے' یہ سخت ترین مخالف ہے۔ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ وہ شخص کہیں باہر سے آیا ہے تمہارے ہاں؟ اس نے کہا کہ نہیں! وہ ہم میں سے ہی ہے' ہمارے اندر اس نے زندگی بسر کی ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ پھر اس کی زندگی کیسی گذری اس سے پیشتر؟ عزیزانِ من! صداقت یہ ہوتی ہے منوا لیتی ہے اپنے آپ کو۔ اور اسے جرأت نہیں وہاں کہ ایک لفظ بھی کہے۔ کہا کہ اس کی زندگی تو بڑی پاکیزہ گذری ہے۔ اس شخص نے کہا کہ جو چالیس سال تک اس قسم کی زندگی بسر کرتا ہے وہ OVERNIGHT شبا شب جھوٹا نہیں ہوسکتا اس لیے میں تمہیں اس کے خلاف مدد نہیں دے سکتا۔ یہ ہے معجزہ۔ اپنی زندگی پیش کرو' اپنے دعوے کی صداقت کے اندر۔ ٹھیک ہے غلط معاشرے میں خرافات کے جھکڑ جو ہیں' بعض اوقات ان چیزوں کے اوپر گرد و غبار طاری کر دیتے ہیں۔ تھوڑا سا وقت اس کے لیے چاہیے' استقامت چاہیے' پھر آپ دیکھیں گے کہ گرد و غبار چھٹ جاتا ہے۔ صداقت دیانت کی سیرت کی بلندیٔ کردار کی زندگی پھر آئینے کی طرح سامنے آ جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عقلِ انسانی کا مقام اور خاصۂ نبوت

یہ ہے رسول **مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ** تم میں سے ہی ایک شخص ہے تمہارے جیسا بشر ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو تمہارے سامنے اپنے دعوے کی صداقت میں پیش کرتا ہے اور تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ جو کہتا ہے اس کے متعلق ساتھ ہی تلقین کرتا ہے کہ یہ بات ایسے ہی نہ مانو۔ مومن کی DEFINITION قرآن میں یہ ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کی آیات پیش کی جاتی ہیں **لَمۡ يَخِرُّوۡا عَلَيۡهَا صُمًّا وَّعُمۡيَانًا**(25:73) وہ آیاتِ خداوندی کے سامنے بھی آنکھیں بند کر کے' کان بند کر کے نہیں جھک پڑتا۔ اللہ اکبر۔ چہ جائیکہ لٹوں سے دودھ نکال کے جھکا لیا جائے' اپنی ہر بات منوا لی جائے وہ کہتا ہے مومن تو وہ ہے کہ اور تو اور خدا کی آیات بھی اس کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو وہ انہیں بھی آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرتا۔ یہ ہے **رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا**

عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ (3:164) وہ خدا کے قوانین کو پیش کرتا ہے ان لوگوں کے سامنے۔ پہلی بات یہ۔ پھر اس کے بعد وہ کرتا کیا ہے؟ جیسا میں نے ابھی ابھی عرض کیا انسانی صلاحیتوں کو مسلوب کرتا ہے؟ دباتا ہے ان کو؟ بالکل نہیں۔ عزیزانِ من! پہلی چیز یہاں یہ کہی اور دیکھیے قرآن کا اعجاز کتنی بڑی چیز کہی وَ يُزَكِّيْهِمْ (3:164) وہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے۔ یہ وَيُزَكِّيْهِمْ (3:164) اس لفظ کا مادہ جو ہے (عربی زبان میں ہر لفظ کا مادہ ہوتا ہے) ''زک ی یا زک وٗ' اس کے معنی ہوتا ہے بڑھنا پھولنا پھلنا نشوونما پانا تربیت حاصل کر کے آگے بڑھتے چلے جانا۔ اونچے ہوتے چلے جانا GROWTH اس کے معنی DEVELOPMENT اس کے معنی ہوتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ان ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وَ يُزَكِّيْهِمْ (3:164) وہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان بہم پہنچاتا ہے۔

معاملہ انسانی ذات کا ہو یا جسمِ انسانی کی نشوونما کا' قرآنِ حکیم ان ہر دو شعبوں کے باہمی ربط کو لازم وملزوم قرار دیتا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ نہیں ہے کہ قرآن کا نظام انسانی جسم کی نشوونما کی طرف سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں مذہب نہیں ہوں کہ مجھے ان دنیا کے دھندوں سے کیا کام؟ وہ تو انسان کے جسم کی نشوونما کا پورا نظام دیتا ہے' جسے آپ معاشی نظام کہتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسا حسنِ نظم ہے کہ جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ اس لیے کہ انسان کی ذات کی نشوونما اس کی انسانیت کی نشوونما اس جسم کے اندر ہی ہونی ہے۔ اس مسافر نے یہ سفر اس گھوڑے پہ طے کرنا ہے۔ تو آپ سوچتے ہیں کہ گھوڑے کو بھوکا مار دیا جائے اور مسافر سے کہا جائے منزل پہ پہنچ جاؤ؟ کر دو نہ ختم پٹرول موٹر میں سے پھر دیکھیے کیسے وہ آپ کو منزل پہ پہنچاتی ہے۔ موٹر اور اس کا پٹرول مقصود بالذات نہیں ہیں وہ سواری کو منزل تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں' بس اتنا ہی فرق ہے۔ مادی نظریۂ حیات میں انسان کا جسم اور اس کی نشوونما مقصود بالذات ہو جاتی ہے۔ موٹر اور اس کے پرزے اور اس کا موبل آئل مقصود بالذات ہوتا ہے' سواری بیٹھے نہ بیٹھے وہ چلے جا رہی ہے۔ لیکن قرآنی نظریۂ حیات کی رو سے یہ ذرائع ہیں انسانیت کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے جسے انسانی ذات یا PERSONALITY یا نفس یا خودی کہا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے یہ جو زکیٰ یا یزکیھم ہے اس میں دونوں چیزیں آ جاتی ہیں انسان کی طبعی زندگی کی نشوونما کے لیے بھی سامان مہیا کرنا اور اس کی انسانیت کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے بھی نظم و نسق پیدا کرنا۔ رسول کا یہ فریضہ بتایا ہے وَ يُزَكِّيْهِمْ (3:164)۔

انسانی جسم کے مقابلے میں ذاتِ انسانی کی نوعیت اور اس کی اہمیت

قرآنِ کریم میں جیسا میں نے عرض کیا ہے' اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لیجیے کہ دین کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ انسان کی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں ہے اس کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے' جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے' وہ انسانی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے لیکن اسے نشوونما یافتہ شکل میں نہیں دیا جاتا۔ وہ ہر انسان کو ملتی ہے ایک POTENTIAL FORM کے اندر ہوتی ہے' غیر نشوونما یافتہ شکل کے اندر ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے' منتہا اس کا یہ ہے کہ یہ جو انسانیت کی نشوونما کی حامل شے ہے' جسے اس نے انسانی ذات کہہ کر پکارا ہے' اس کی نشوونما کرنا یہ انسانی زندگی کا مقصد ہے' یہ اس کا فریضہ ہے۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (91:7) بات یہاں سے شروع ہوتی ہے اب دیکھیے اس سے یہ نظر آتا ہے یہ ایک مستقل ENTITY ہے انسان کی جسے نفس یا ذات کہا گیا ہے' یہ ایک شے ہے۔ شے ہی کہا جائے گا اب ہمارے ہاں زبان کی کمی ہے اس میں کوئی لفظ اور نہیں ملتا ہمیں۔ یہ اپنا ایک وجود رکھتی ہے' یہ چیز جسے نفس کہا گیا ہے۔ یوں ہی وہ چیز نہیں کہ وہ قوتِ فکر ہے' قوتِ عقل ہے' انسان کے جسم کی مشینری کی پیدا کردہ چیز ہے' جب انسان کا جسم ختم ہو جائے گا تو یہ بھی ساتھ ختم ہو جائے گی' شے یہ نہیں کہا۔ یہ الگ ایک چیز کہی ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (91:7) بات میں یہاں کہہ رہا ہوں۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (91:9-10) اس کی کھیتی پروان چڑھتی ہے' کامیاب زندگی اس کی ہے جو اپنی اس نفس یا اس ذات کی نشوونما کر لیتا ہے۔ اور وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (91:10) عام معنی وہ تباہ ہو جاتا ہے وہ کامیاب نہیں ہوتا من دَسّٰهَا (91:10) جو اس کو مٹی کے تلے دبا ہوا رہنے دیتا ہے ابھرنے نہیں دیتا' تدسیہ کے معنی ہوتا ہے کسی ایسی شے کو جو زندہ ہو یا زندہ ہونے کی اس میں صلاحیت' ہو اسے مٹی کے نیچے دبا دینا۔ عرب جو زندہ لڑکی کو دبایا کرتے تھے زندہ در گور' زندہ ہی دبا دیا کرتے تھے اس کے لیے بھی لفظ قرآن نے یہ استعمال کیا ہے (16:59)۔ یہ بیج جو مٹی میں دبایا جاتا ہے جس میں صلاحیت ہوتی ہے ابھرنے کی اگر اس بیج کے اوپر اتنا بڑا اڈلا مٹی کا رکھ دیا جائے کہ جس کے بوجھ تلے وہ دبا رہے تو اس میں سے کونپل پھوٹ نہیں سکتی۔ مٹی کے بغیر بیج فصل میں نشوونما نہیں پا سکتا لیکن مٹی اگر بوجھل بن جائے اور اس کے نیچے وہ دب جائے تو اس میں جو اگنے کی صلاحیت ہوتی ہے' وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔

لفظ خاب کا لغوی اور قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! الفاظ میں نے عرض کیا ہے نا ان پہ غور کرنا چاہیے۔ یہ خاب کیا چیز ہے؟ میں نے کہا ہے نا کہ افلح ابھر آنا باہر

آ جانا اس کے مقابلے میں خاب ہے۔ اس زمانے میں یہ آگ جلانے کے لیے ابھی یہ ماچس' یہ تیلیاں یہ تو نہیں تھیں۔ چقماق پتھر ہوتا تھا اس چقماق کو رگڑ کے دوسرے پتھر سے' اس میں سے ایک شعلہ نکلتا تھا۔ اس شعلے سے آگے آگ جلتی تھی۔ یہ آگ یا شعلہ پیدا کرنے کی صلاحیت چقماق کے اندر ہوتی تھی لیکن باہر آگ تو اسی صورت میں وہ پیدا کر سکتا تھا کہ یہ چنگاری اس کی رگڑ سے ابھر کر باہر آ جائے۔ وہ پتھر کہ جس میں سے یہ چنگاری باہر نہ آئے' اندر کی اندر دبی ہوئی رہ جائے' اس کے لیے خاب کا لفظ ہوا کرتا تھا۔ اس کی چنگاریاں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن ہے وجد میں آ جاتا ہے انسان۔ اللہ اکبر۔ چنگاریاں پیدا کرنے کی استعداد تو ہر ایک میں دی ہوئی ہے بس فرق اتنا ہی ہے کہ کون ان چھپی ہوئی حرارتوں سے عمل کی FRICTION کے ذریعے' اسے باہر لے آتا ہے اور باطل کے تمام نظامِ کہن کو خس و خاشاک کی طرح جلا کے رکھ دیتا ہے اور کون وہ ہے کہ جس کی یہ چنگاریاں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں' پتھر کا پتھر ہوتا ہے۔ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ (2:24) جو قرآن نے کہا ہے جہنم کا ایندھن یہ پتھر ہوتے ہیں۔ جو خود دبی ہوئی چنگاریاں نکال کے باطل کو نہیں جلاتے' خود جل جاتے ہیں دوسروں کی آگ کے اندر۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (91:10) جس نے اس کو مٹی کے بوجھ کے تلے دبا دیا اس کی چنگاریاں یوں دبی کی دبی رہ گئیں جیسے اس چقماق کی کہ جس میں سے آگ نہ نکل رہی ہو۔

انسانی ذات کی نشوونما کے لیے ' دَسّٰهَا (91:10)' پر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ اَفْلَحَ ہوتا ہے

اور پھر میں نے عرض کیا یہ دَسّٰهَا (91:10) کا لفظ مٹی میں دبانے سے ہی بیج کی نشوونما ہوتی ہے' نمود ہوتی ہے لیکن اگر وہ مٹی اتنی اس کے اوپر آ جائے کہ مٹی ہی غالب ہو جائے' بوجھ ہو جائے تو اس کی وہ جو صلاحیت نشوونما پانے کی ہوتی ہے' وہ بھی دب کے رہ جاتی ہے۔ مٹی کی ضرورت لاینفک لیکن مٹی کے نیچے دبنا نہیں ہے۔ مادی ضروریاتِ زندگی نشوونما کے لیے نہایت ضروری ہیں لیکن اگر ان ہی کو مقصود سمجھ لیا اور ان ہی کے نیچے دب کے رہ گیا تو اس سے پھر انسانی صلاحیتیں دب کے رہ جائیں گی' ابھر نہیں سکیں گی۔ انسانی زندگی کا مقصود اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (91:9) جس نے اس کو نشوونما دے دی۔ افلح کا لفظ ہی ادھر استعمال کیا ہے اس کے معنی ہوتا ہے اس کی کھیتی پک گئی۔ اور جس نے اس بیج کو ہی اس مٹی کے تلے دبا کے رکھ دیا' ابھرا ہی نہیں وہ کہتا ہے ''قد خاب'' پتھر کا پتھر رہ گیا۔ الفاظ کیا ہیں قرآن کے؟ کوئی ہے زبان جو ان کا ترجمہ لفظوں کے اندر کر دے؟ مفہوم تو سمجھایا جا سکتا ہے ترجمہ کون سی زبان اس کا کرے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (91:9)۔ اس کے لیے پروگرام دے دیا کہ یہ کس طرح سے یہ کیفیت پیدا ہوگی؟ یہ نشوونما کس طرح سے ہوتی ہے؟

انسان کے لیے تقویٰ شعار بننے کا ایک ہی طریق ہے کہ وہ معاشرے کے لیے' دیتا گیا ہے' اس کے لیے کرتا گیا ہے

ایک جگہ تو پہلے یہ ڈانٹ کے کہا کہ دیکھو یہ بہت بڑا مقصدِ زندگی ہے' بہت بڑا پروگرام ہے' اس کے لیے خوامخواہ کے لیے دعوے نہ کرتے پھرا کرو فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ ط (53:32) اپنے آپ کو خوامخواہ ہی پیر بنا کے نہ پھرتے رہا کرو' یہ نہ دعوے کرتے پھرا کرو کہ بڑے مزکی واقع ہوئے ہیں صاحب۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (53:32) وہ جانتا ہے کون ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ نظر آیا یہاں کہ مزکی اور اتقیٰ' متقی ایک ہی بات ہے۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ لیکن بات آگے بھی نہ ہوئی یہ کہا کہ وہ ٹھیک ہے ہم جانتے ہیں۔ طریقہ اس کا کیا ہے؟ اس کے لیے طریقہ یہ بتایا۔ یہاں تقویٰ تھا۔ کہا کہ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى . وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (6-5-92:5) یہاں کہا گیا ہے اور یہ بڑی عجیب آیات آتی ہیں انسان کی کوششیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں لیکن ہم بتائیں کہ اصولی طور پر دو سمتوں میں جاتی ہیں ایک تو یہ ہے وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى . وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (9-8-92:8) جو سب کچھ اپنی ذات کے لیے سمیٹ کر رکھ لیتا ہے اور اس طرح سے معاشرے کے حسن کی تکذیب کرتا ہے' ایک تو وہ ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (92:5) کہ جو دیے چلا جاتا ہے دوسروں کی نشوونما کے لیے اور یوں تقویٰ شعار بنتا چلا جاتا ہے وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (92:6) اس طرح سے وہ معاشرے کے حسن اور اپنی ذات کے حسن کی تصدیق کرتا چلا جاتا ہے۔

اپنی ذات کو جہنم کے عذاب سے بچانے کا طریق دوسروں کی نشوونما کے ابدی اصول میں ہے

یہیں آگے چل کے یہ بتایا کہ جہنم سے کن لوگوں کو دور رکھا جائے گا وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى (92:17) یہاں پھر وہ تقویٰ کا لفظ آیا ہے میں نے عرض کیا تھا کہ وہاں قرآن نے یہ زکی کہا ہے اس کے ساتھ تقویٰ کہا ہے۔ وہ کہا ہے کہ جہنم سے اس کو دور کیا جائے گا' دور رکھا جائے گا الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ (92:18) جو جان مار کر محنت کرتا ہے اور اس سے جو حاصل ہوتا ہے' اس میں صرف اپنی ضروریات کے لیے رکھتا ہے اور باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے دے دیتا ہے۔ یہ ہے يَتَزَكّٰى (92:18) جس کی اپنی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ بڑی اصولی بات ہے۔ انسان کے جسم کی نشوونما ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے یہ خود کھاتا ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ گھی اور دودھ آپ کا بیٹا کھاتا چلا جائے اور تر و تازہ آپ جوان ہوتے چلے جائیں۔ جسم

کی پرورش ہراس شے سے ہوتی ہے جو انسان لیتا ہے۔ اور اس نے کہا انسانی ذات کی پرورش اس سے ہوتی ہے جو دوسروں کو دیتا ہے۔ **الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی** (92:18) یوں ہے جونشوونما ہوتی ہے۔ اور یہاں جو کہا **وَ یُزَکِّیْهِمْ** (2:129) یہ ان کی نشوونما کا سامان کرتا ہے تو دیکھیے کہاں یہ بات کہی قرآن نے؟ جماعت بن گئی ہے اس جماعت کے افراد محنت کر رہے ہیں۔ قرآن کا نظام یہ ہے کہ اپنے محنت کی کمائی میں سے صرف اپنی ضرورتوں کے لیے وہ رکھتا ہے اور باقی نظام کے حوالے کرتا ہے۔ نظام تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ ہے اسلامی نظام۔ اس کے لیے کہا کہ **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ** (9:103) یہ جو اپنی کمائی میں سے لاتے ہیں تمہارے پاس انہیں وصول کرو یہی ان کے دعویٰ ایمان کی صداقت ہے۔ یہ آپ کے ہاں جواب صدقہ ہے" آ کالے بکرے دی سری جیہڑی چوراہے اچ پا دیندے ہیگے' تھوڑی جئی ہلدی اوہدے تے لاندے ہیگے' جان دا صدقہ"۔ وہ مریض زیادہ بیمار جب ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس کی جان کا صدقہ دیتے ہیں" یعنی بکرے نوں ذبح کر دیو' اوہدی جان بچ جائے گی"۔ صدقہ یہ ہے قرآن کی رو سے یہ تو لفظ ہی صدق صداقت ہے جو اپنے دعویٰ ایمان کی سچائی کے ثبوت میں اپنی کمائی کا بہترین حصہ لا کے تیری خدمت میں پیش کر دیتے ہیں کہ اس کو صرف کیجیے محتاجوں کے لیے ضرورت مندوں کے لیے۔ یہ ہے جو صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ** (9:103) میں ابھی عرض کروں گا یہ دو لفظ کیا آئے۔ اس طرح سے ان کی زندگی کو پاکیزہ بناتا چلا جا۔ ریاء الناس کے لیے نہیں لا رہے' دکھاوے کے لیے نہیں لا رہے' معاوضہ لینے کے لیے نہیں دے رہے۔ محنت کرتے ہیں جی مار کر نہایت دیانت سے اپنے دعوے کی صداقت کی ثبوت میں لا کے یہ پیش کرتے ہیں' اس سے زیادہ تطہیر سیرت اور کیا ہوگی۔ ان کی سیرت کی پاکیزگی کا سامان بہم پہنچاتا جا۔ اور اس کے بعد ہے **وَ تُزَکِّیْهِمْ بِهَا** (9:103) دیکھیے دو لفظ ہیں۔ اور اس طرح سے یہ جو لا رہے ہیں یہ یہ نہیں کہ اس سے اپنا گھر سونے کا بناتا چلا جا' اپنے لیے عیش کے سامان فراہم کرتا چلا جا' **وَتُزَکِّیْهِمْ بِهَا** (9:103) ان ہی کے اس مال سے ان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا چلا جا۔ رسول تو صلہ ہی نہیں مانگتا' معاوضہ ہی نہیں مانگتا۔ ایک اجتماعی نظام ضرور ہے۔ یہ انفرادی خیرات اور صدقے یہ تو باطل کے نظام کے اندر کی چیزیں ہیں۔ **وَ تُزَکِّیْهِمْ بِهَا** (9:103) ان کے اسی مال سے ان ہی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا چلا جا۔ یہ ہے وہ طریقہ جو قرآن نے بتایا۔

تزکیۂ نفس کا قرآنی تصور لیکن تصوف کی دنیا میں پائے جانے والی سوچ کے خدوخال

آپ کو معلوم ہے کہ اس کے بعد جب پھر آپ کا دین مذہب میں بدلا تو آپ کے ہاں ایک بڑی عام اصطلاح "تزکیۂ نفس

کرنے کی بھی ہے'۔ آ گئی نا بات سمجھ میں۔ وہ یہیں سے لیا ہوا ہے کہ جی تزکیۂ نفس ہو رہا ہے۔ تزکیہ کے لفظی معنی آپ نے دیکھ لیے' چھپی ہوئی صلاحیتوں کی برومندی ان کی نشوونما ان کو ابھارنا ان کو زندہ کرنا بڑھانا' ان میں پھولنے پھلنے کی صلاحیت پیدا کرنا جو ہے تو یہ تزکیہ کے معنی ہیں۔ اور یہی تزکیۂ نفس آپ کے ہاں جب تصوف میں آیا تو اس کے معنی ہیں نفس کشی' مارنا نفس کو' انسانی ذات کو مارتے چلے جانا' یہ تزکیہ اس کا نام ہے۔ یا اللہ۔ آپ نے دیکھا کوئی ان الفاظ پہ بھی غور نہیں کرتا کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں۔ خودی ایک ایسا لفظ ان کے ہاں آ گیا کہ معلوم نہیں کہ کتنی بڑی یہ برائی کی چیز ہے جو کسی طرح سے اندر رکھ دی گئی ہے' اس کو مارتے چلے جاؤ' کچلتے چلے جاؤ۔ نفس کشی کے عجیب عجیب پھر طریقے ریاضتیں مراقبات زاویے چلے' چالیس چالیس دن پانی کے پیالے پہ جینا پہلی چیز۔ یعنی ان کے ہاں سب سے بڑی چیز یہ ہے

سفر سامان ابد دا کریے
مرنے توں پھر پہلے مریے

یعنی اس مرنے پہ اپنا کوئی بس نہیں چلتا نا' وہ تو اس نے مارنا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟ خوبی تو یہ ہے ''مرنے توں پھر پہلاں مریئے'' اس زندگی میں جیتے جی مر جانے والی بات جو ہے۔ یہ سارے طریقے جو ہیں اس کا نام ہے تزکیۂ نفس۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جب بھی دین مذہب میں بدلتا ہے اس کی TECHNIQUE یہ ہوتی ہے کہ الفاظ وہ ہمیشہ اپنے ہاں دین کے رکھتا ہے' لیکن ان کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ کوئی ان سے پوچھتا نہیں کہ صاحب! زبان کے اعتبار سے ہی فرما دیجیے۔ تزکیہ کے تو معنی ہوتے ہیں نشوونما دینا بڑھانا پھولنا پھلنا ابھرنا' یہاں آپ نفس کشی کا نام رکھ رہے ہیں تزکیۂ نفس۔ کیا ہوا جی؟ کہ جی تزکیہ کے اصلی معنی جو ہیں نا وہ ہے پاک کرنا اور نفس کو ان آلائشوں سے پاک کیا جاتا ہے اس اعتبار سے اس کو ہم تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ قرآن کی اس آیت میں پہلے لفظ آتا ہے خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ (9:103) یہ تو طہارت آپ کو معلوم ہے پاک کرنا یہ لفظ تو پہلے آ گیا وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا (9:103) یہ دوسرا لفظ پھر کاہے کے لیے آیا؟ کیا یہ شاعری ہو رہی ہے؟ کہ یہ لے لو تُطَهِّرُهُمۡ (9:103) تاکہ تو ان کو پاک کرے تو ان کو بہتا سارا پاک کرے۔ یعنی ایک لفظ تُطَهِّرُهُمۡ (9:103) آ گیا پھر آ گے اس کے ہے تُزَكِّيۡهِمۡ (9:103)۔

رہبانیت کی تو بنیاد ہی مادے کو آلائش سمجھنا جبکہ دین اس تصور کو کفر کہتا ہے

عزیزانِ من! قرآن تو کہیں بھاگنے کا راستہ ہی نہیں دیتا۔ یہ ساری اصطلاحات آپ کے ہاں غیر قرآنی ہیں' غیر اسلامی

ہیں۔ دوسروں کے ہاں سے لی ہوئی ہیں۔ مادے کو آلائشیں تصور کرنا خالص رہبانیت کا تصور ہے۔ اپنے آپ کو ان آلائشوں سے پاک رکھنا اس کا نام تزکیہ۔ اس سے ہوتا کیا ہے؟ انسان کی ذات نفس یا خودی مرجاتی ہے یہ مقصودِ زندگی ہے مرنے سے پہلے مرنے والی بات۔ قرآن کہتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا آپ دیکھتے ہیں یہ تدسیہ جو ہے دبا دینا اس کو حتیٰ کہ مار ہی دینا' قرآن نے اس کو کفر کی زندگی کہا ہے۔ یہ اس کو عینِ اسلام نہیں' مغزِ اسلام بتا رہے ہیں' تزکیہ نفس ہو رہا ہے۔ رسول کا فریضہ یہ تھا وَتُـزَكِّيْهِـمْ (9:103) ایسا نظام قائم کرنا کہ جس سے انسانیت کی صلاحیتیں اس کی ذات کے اندر چھپی ہوئی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی ابھرتی چلی جائیں۔ اور اس کا طریقہ تھا خُـذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (9:103) یہ جو کچھ لاتے ہیں تمہارے پاس اس کے ذریعے سے ان کی نشوونما کا سامان کرتا چلا جا۔ غور فرمایا۔ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ کیا بتایا جائے۔

رسالت کے فریضے کے متعلق قرآنِ حکیم سے پوچھیے کہ کتاب وحکمت کے سلسلہ میں اس نے کیا کچھ کرنا ہوتا ہے

قرآن سے پوچھیے کہ اس کے ہاں کا کیا نظام ہے؟ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (9;103)۔ پہلی چیز یہ کہی رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَـلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (3:164) اگلی بات یہ کہی سامانِ نشوونما دیتا ہے (بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی) فریضہ ہے رسالت کا تعلیمِ کتاب وحکمت۔ یہ رسول صرف پہنچاتا ہی نہیں ہے یہ تو پہلی چیز آ گئی نا يَتْـلُـوْا عَـلَيْهِـمْ اٰيٰتِـهٖ (3:164) یہ نہیں ہے کہ ادھر سے اس کو وحی آئی اور اس نے ادھر پہنچائی اور پھر اس کے بعد ختم۔ ہمارے ہاں یہ ایک ایسا تصور بھی پیدا ہوا ہوا ہے کہ رسول کی حیثیت تو صرف آلہَ ابلاغ کی ہے۔ آپ کو پتہ ہے کیا معنی ہوئے؟ آلہ کے معنی INSTRUMENT یعنی وہ معاذ اللہ بس بات پہنچانے کا INSTRUMENTE ہوتا ہے جیسا یہ ریڈیو کا ہمارے ہاں سیٹ۔ اپنی تو اس کی کوئی حیثیت نہیں' براڈ کاسٹنگ سٹیشن سے ایک آواز ابھرتی ہے' یہ اس آواز کو ذرا بلند کر کے ہم تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہاں سے آواز بند ہو جاتی ہے' یہ ڈبے کا ڈبہ رہ جاتا ہے۔ رسول کی یہ حیثیت (معاذ اللہ)۔ رسول کی یہ حیثیت ہے کہ پہلے تو ایسا نظم ونسق قائم کرتا ہے جس میں یہ سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (3:164) عزیزانِ من! یہ ہے وہ طریقہ جس سے وہ نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے ان افراد کے اندر' ان کے قلب ونگاہ کو بدل دیتا ہے اور قلب ونگاہ صحیح

تعلیم سے بدلتے ہیں۔تعلیم دیتا ہے کس چیز کی؟ الکتاب کی الحکمت کی۔ یہاں پھر وہی ہمارے ہاں گڑبڑ ہوتی ہے کہ صاحب! کتاب تو ہوئی نا کتاب اللہ' یہ جو الحکمت ہے یہ کیا ہوئی؟ اب اس کے لیے پھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔

انسانوں کے قانون کی طرف سے منہ موڑنے کا بنیادی سبب اور اس کا علاج

قرآن اس کو واضح کر دیتا ہے کہ یہ دو چیزیں ہیں ہی نہیں۔کتاب یہ BOOK جو ہے اس معنی میں تو بعد میں استعمال ہوتا ہے یہ لفظ' جیسا میں نے کئی دفعہ بتایا آپ کو' کتاب کے معنی ہی قانون کے ہیں۔تعلیم دیتا ہے قانون کی۔آپ کو معلوم ہے کہ یہ ہمارے ہاں جو قانون کی عام طور پہ فرماں برداری نہیں ہو رہی' لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام نہیں ہے' تو اس کی وجہ کیا ہوتی ہے؟ قانون دینے والا اگر لوگوں کو یہ سمجھا دے کہ اس قانون سے غرض و غایت یہ ہے اس کا مقصد یہ ہے' اس کا تمہیں فائدہ یہ پہنچے گا' اس سے معاشرے میں اس طرح کا حسن پیدا ہو جائے گا' اس کی غرض و غایت اگر ساتھ سمجھا دی جائے تو کوئی دیوانہ ہے پھر جو اس قانون کی اطاعت یا پیروی نہ کرے۔یہ ڈاکٹر جب آپ کو دوائی دینے کے بعد یہ کچھ سمجھاتا ہے' ڈائریکشن دیتا ہے کہ یوں اس کو استعمال کرنا' اس سے یہ فائدہ ہوگا تمہیں۔آپ اس کے بعد پھر اس کا علاج کرتے ہیں۔یہ جتنے عطائی ہوتے ہیں ان کے ٹوٹکوں سے کیوں بچنے کو کہا جاتا ہے؟ وہ دوائی تو دیتے ہیں اول تو انہیں خود ہی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کیا کرے گی' کیوں دی جاتی ہے' غایت اس کی کیا ہے' غرض اس کی کیا ہے' کن چیزوں سے یہ مرکب ہے کیسے ہوئی ہے۔نقصان ہوگا تو کیا کیا جائے گا؟ عطائی اور ڈاکٹر میں تو فرق اتنا ہی ہوتا ہے۔وہ جو قانون دیتا ہے قانون کی علتِ غائی اس کا RATIONALLE جو ہے وہ بھی ساتھ سمجھاتا ہے THE WHY OF IT سمجھاتا ہے کیوں یہ قانون دیا جاتا ہے۔عزیزانِ من! قانون کو اس انداز سے دیا جائے آپ دیکھیں گے اگر فی الواقعہ وہ قانون لوگوں کی منفعت کے لیے ہے' اس کا احترام دلوں میں پیدا ہو جائے گا۔قرآنِ کریم نے قانون دیا تو اس قانون کی حکمت بھی خود بتا دی ہے۔کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ(2:183) یہ قانون ہے تم پہ روزے فرض کیے گئے لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ(2:185) تاکہ تمہاری محنتیں پورے پورے نتائج برآمد کریں۔"تاکہ یہ ہو" یہ اس کی حکمت ہے یہ اس کی غایت ہے یہ اس کا مقصود ہے۔اگر صرف قانون ہی دیا جاتا اور اس کی حکمت ساتھ نہ بتائی جاتی تو میں نے عرض کیا کہ اس قانون میں اور ایک ڈکٹیٹر کے حکم میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ڈکٹیٹر کا حکم بھی اس لیے ناقص ہوتا ہے کہ آپ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ یہ کیوں ایسا کہتا ہے۔وہ کہتا ہے ہمارا حکم ہے تمہیں کرنا پڑے گا' اچھا جی کرنا پڑے گا۔جب تک اس کا ڈنڈا سر پہ ہے آپ کیے جاتے ہیں۔جہاں ڈنڈے میں SLACKNESS پیدا ہوئی' سارے کے سارے سرکش ہو جاتے ہیں کہ اس قانون یا اس حکم کی حکمت سمجھ میں نہیں آئی ہوتی۔

لیکن جس قانون کی حکمت ساتھ سمجھا دی جائے پھر اس قانون کا احترام پیدا ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے بیان کردہ فلسفۂ حیات پر عمل کرنے کا طریق

حکمت سمجھنے کا سب سے بڑا طریقہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ اس کے اوپر عمل کر کے دیکھو اس کے نتائج تمہیں خود بخود بتا دیں گے کہ یہ کیوں قانون دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر دوائی کی جو وہ حکمت سمجھا رہا ہوتا ہے' اس کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ جب آپ اسے استعمال کریں تو اس کے وہ نتائج مرتب ہو جائیں جو اس نے کہا تھا کہ ایسا ہوگا۔ دوائی دیجیے تین گھنٹے کے بعد ٹمپریچر اتنا LOW ہو جائے گا اس کے نتائج۔ اگر آپ کو قانون بتایا جائے اور اس کے نتائج خود متعین کر کے نہ بتائے جائیں تو اس کے بعد ہوتا کیا ہے؟ آپ ان الفاظ کی تعمیل کرتے چلے جاتے ہیں' نتیجہ کوئی مرتب نہیں ہوتا۔ آپ سے کہا یہ جاتا ہے کہ آپ کا کام اس کی تعمیل کیے چلے جانا ہے' نتیجہ قیامت میں جا کے مرتب ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے دلوں میں جو قانونِ خداوندی کا بھی احترام باقی نہیں رہا عام طور پہ ہمارے ہاں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نتائج سے اس کی صداقت کا ثبوت نہیں بہم پہنچایا جاتا۔ یہ ہوتا کب ہے؟

علاج کے دوران مطلوبہ نتائج سامنے نہ نکلنے کی صورت میں نسخہ کی صداقت یا اپنے طریق استعمال پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے

جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو قانون کے الفاظ تو اسی طرح سے رکھے جاتے ہیں لیکن ان کی حکمت جو ہے انہیں بیان نہیں کیا جاتا وہ سامنے نہیں لائی جاتی۔ ورنہ اگر اس کی حکمت بھی قرآن سے سامنے لائی جائے' قدم قدم کے اوپر ہم اپنا جائزہ لیتے چلے جائیں گے کہ صاحب! اس سے وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے یا نہیں جو قرآن نے کہا تھا؟ اگر نہیں ہو رہا تو ہم کھڑے ہو کے سوچیں گے کہ صاحب! کہیں غلطی ہو رہی ہے۔ اس نے تو یہ کہا تھا کہ دوائی پلانے کے تین گھنٹے کے بعد ٹمپریچر LOW ہوگا۔ پہلی بات یا تو یہ ہے کہ نسخہ غلط ہے۔ قرآن کو قرآن ماننے والا یہ تو نہیں کہے گا۔ اگلی بات یہی کہی جائے گی کہ دوائی صحیح نہیں ملی۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا کہ وہ دوائی پلاتا چلا جائے اور وہ ٹمپریچر LOW نہ ہو اس کے بعد بھی پلاتا چلا جائے' نہ دوائی بدلے' نہ نسخے میں تبدیلی پیدا کرے' نہ ہی یہی دیکھے کہ کہیں دوائی تو غلط نہیں آ گئی اور دیے چلا جائے۔ جب کہا جائے کہ صاحب! اس کا نتیجہ کیا ہے؟ نتیجہ تو موت نظر آتا ہے کہتے ہیں موت کے بعد ہوگا نتیجہ اس کا۔ قرآن یہ نہیں کہتا۔ رسول جب قانون دیتا ہے تو اس کے بعد یہ کہتا ہے قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ (6:135) تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے چلے

جاؤ مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو' نتائج بتا دیں گے کہ کس کا قانون صحیح ہے اور کس کا قانون غلط ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ صدیوں سے آپ کے ہاں یہ ہو رہا ہے' بڑی نیک نیتی سے آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم قوانینِ خداوندی پہ عمل کر رہے ہیں لیکن چونکہ یہ نہیں آپ کو بتایا جاتا کہ ان قوانین کا اس زندگی میں کیا نتیجہ مرتب ہوگا' اس لیے آپ کبھی کھڑے ہو کے سوچتے نہیں ہیں کہ ہم اس پہ عمل صحیح کر رہے ہیں یا نہیں کر رہے۔ اگر قرآن نے جو ساتھ اس کے نتیجہ بتایا تھا حکمت بتائی تھی' غایت بتائی تھی اگر وہ بھی سامنے ہوتی تو کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم صدیوں تک یہ کرتے چلے جاتے اور کبھی کھڑے ہو کے سوچتے ہی نہیں کہ عمل صحیح ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔ یہ ہے حکمت جسے قرآن نے کہا ہے۔ اور یاد رکھیے یہ قرآن سے باہر کوئی چیز نہیں ہے۔ کتاب: قانون' حکمت: اس قانون کی غرض و غایت۔ آپ دیکھیے وَ مَآ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ (2:231) خدا نے جو کچھ نازل کیا ہے تمہارے اوپر مِّنَ الۡکِتٰبِ وَالۡحِکۡمَۃِ (2:231) کتاب اور حکمت دونوں منزل من اللہ ہیں دونوں خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ اب یہ سوال تھا کہ کیا یہ دو الگ الگ کوئی چیزیں ہیں؟ اور اس کے ساتھ ہی لفظ ہے یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ (2:231) آپ دیکھتے ہیں یہاں بہ کی ضمیر کے اندر SINGULAR ضمیر استعمال ہوا ہے۔ اس کے ذریعے سے تمہیں خدا اس طرح سے نصیحت کر رہا ہے۔ کتاب اور حکمت قانون اور اس کی غایت بات وہ ایک ہی ہے' خدا کی طرف سے وحی جس میں قانون بھی دیا ہے' قانون کی غرض و غایت بھی دی گئی ہے۔ رسول کرتا یہ ہے قانون سمجھاتا ہے قانون کی غرض و غایت بتاتا ہے پھر اس پہ عمل کرنے سے وہ نتائج مرتب کر کے دکھا دیتا ہے۔ یوں دلوں کے اندر قانون کا احترام پیدا ہوتا ہے۔

فریضۂ رسالت اور سیرت کی بلندی نیز میدانِ جنگ میں کمانڈر کے حکم کی اہمیت

عزیزانِ من! رسول کا فریضہ پھر عرض کر دوں رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ (3:164) تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے اس کی صداقت کا نشان اس کی سیرت کی بلندی۔ فریضہ اس کا؟ وَیُزَکِّیۡہِمۡ (3:164) انسانیت کی مضمر صلاحیتوں کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ طریقہ اس کا؟ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ۚ (3:164) قانون اور قانون کی غرض و غایت کی تعلیم دینے والا۔ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (3:164) خواہ اس سے پیشتر تم کتنی ہی کھلی ہوئی گمراہی میں کیوں نہیں تھے وہ تمہیں یہ کچھ کرتا ہے۔ لَقَدۡ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (3:164) وہ کہتا ہے کہیے یہ احسان ہے یا نہیں اس قسم کا نظام دے دینا؟ اب اس نظام کے اندر مشکلات آئیں گی۔ مخالفتیں آئیں گی ٹکراؤ ہوگا تصادم ہوگا' اس میں نقصانات بھی ہوں گے۔ بات تو آپ کو معلوم ہے نا جنگِ احد سے چلی آ رہی تھی جس میں تیراندازوں کے ایک دستے نے جہاں اپنے کماندار کے حکم کی خلاف

ورزی کی تھی، فتح مبدل بہ شکست ہوگئی تھی، بڑا ہی نقصان ہوا تھا۔ کہا کہ اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ (3:165) پہلی بات تو یہ کہی کہ تمہیں ایک نقصان اٹھانا پڑا حالانکہ اس سے پیشتر اس سے دوگنا نقصان تم مخالفین کو پہنچا چکے ہوئے تھے۔ پہلی بات تو یہی کہی کہ یہ تم نے دیکھ لیا کہ پہلے تمہاری تعداد بھی اس سے کم تھی، سامان بھی تمہارے پاس ان سے کم تھا، اس کے باوجود تمہیں فتح بھی ہوئی تھی۔ نقصان ان کا ہوا تھا اس سے بھی دوگنا جتنا تمہارا ہوا ہے۔ اب اس سے کچھ زیادہ ہی نفری تھی تمہارے پاس کچھ زیادہ ہی سامان تھا، یہاں نقصان اٹھانا پڑا، کیوں نقصان اٹھانا پڑا؟ تم نے اپنے کمانڈر کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ بات تو یہ تھی۔

مسئلہ تقدیر کی وضاحت اور ہمارے ہاں صدیوں سے پائے جانے والے غلط تصورات کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہاں ایسی عظیم چیز سامنے آتی ہے کہ آپ کے سامنے یہ جو تقدیر کا مسئلہ جس میں آپ کو صدیوں سے الجھائے چلے آرہے ہیں، قرآن کے چار لفظوں میں طے ہو جاتا ہے۔ کہا کہ یہ مصیبت آئی تمہیں نقصان اٹھانا پڑا شکست ہوئی قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ (3:165) تو تم نے کہنا شروع کیا کہ یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ کس کی طرف سے ہوا؟ کہاں سے یہ مصیبت آئی؟ ہم سے آج کوئی پوچھے سیدھی بات کہیں گے کہ صاحب! اللہ کی طرف سے ساری مصیبتیں آتی ہیں اور کہاں سے آئی خدا کی طرف سے آتی ہے۔ صبر کرو شکر کرو جیسے اللہ کی مرضی ''اوہدی مرضی دے اگے دم مارن دی جا کوئی نئیں، بیگا او بے نیاز ہے قادرِ مطلق ہے'' ہر مصیبت رنج و راحت اس کی طرف سے آتا ہے۔ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ (3:165) ان کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ کہاں سے یہ مصیبت آگئی؟ میں نے عرض کیا ہے کہ ہم میں سے جتنا زیادہ کوئی اللہ والا ہوتا ہے وہ اتنا ہی مرضیٔ مولا کے تابع چلتا ہے۔ کہتا ہے کہ مصیبت جو ہے اس کے سامنے جھکنا یہ سمجھنا خدا ہی کی طرف سے آتی ہے۔ انتہا اس کے لیے یہ ہوتی ہے کہ

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

ٹھیک ہے جب وہ مصیبت پہنچانا چاہتا ہے تو اس کے لیے اپنی طرف سے تدبیر تو ایک طرف رہی کسی کی طرف دعا کی بھی کرانا وہ تو مرضیٔ یار کے خلاف ہوگئی بات۔

قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ (3:165) میں نے کہا ہے کہ جتنا زیادہ کوئی ہمارے نزدیک خدا کا مقرب ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ یہ کہتا ہے کہ اللہ کی طرف سے آیا۔ سوال یہ ان کے ذہن میں پیدا ہوگیا ان سے بڑے خدا پرست اور کون ہو سکتے تھے۔ عزیزانِ من! اس

کا جواب خدا دیتا ہے جس کے متعلق ہم یہ کہتے ہیں کہ صاحب اس کی طرف سے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ کہتے ہیں قُلْتُمْ اَنّٰی هٰذَا ط(3:165) اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کہاں سے یہ آ گئی؟ قُلْ (3:165) ان سے کہو هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ط (3:165) تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ہے اور کون ذمہ دار ہے۔ اللہ اکبر۔ تقدیر کا مسئلہ الجھا ہوا مسئلہ، خدا کی طرف سے سب کچھ ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر تو ایک ذرہ نہیں ہل سکتا، ایک پتا نہیں ہل سکتا۔ اور کس کی طرف سے آ رہا ہے۔ عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں یہ چار لفظوں میں حل ہوتا ہے یا نہیں؟ قُلْ (3:165) خدا کہنے والا رسول ﷺ سے کہلوایا، صحابہؓ کو کہا یعنی خود خدا اور ان سے زیادہ مقرب اور مرضاتِ خداوندی کا جاننے والا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ کہا هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ط (3:165) ۔آگے ایک اور بات آ گئی جس کا اتنا ہی ٹکڑا ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ سنیے آگے کیا ہے؟ ہیں آپ کے سامنے قرآن کی آیات دیکھیے تو اس کے آگے عجیب و غریب چیزیں ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:165) چلیے اسی روش پہ جس پہ سمجھتے چلے آئے ہیں قرآن۔ نظر آ رہا ہے نا (معاذ اللہ) دو بالکل متضاد باتیں اکٹھی کر دیں۔ مصیبت کیسے آئی؟ ان سے کہو تمہارے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی۔ اور آگے اس کے ''اللہ ہر چیز پہ قادر ہے''۔ ان سے پوچھو یہ تو بالکل دو متضاد باتیں ہیں۔ اس کا جواب یا تو یہ ہونا چاہیے تھا قل انی کہاں سے آئی؟ کہنا چاہیے تھا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:165) سیدھی بات ہے وہ ہر چیز پہ قادر ہے اس نے مصیبت بھیج دی یا تو یہ ہونا چاہیے تھا۔ اور اگر یہ تھا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ط(3:165) تمہاری طرف سے آئی تو پھر یہ ساتھ کیا بات ہوئی۔ غور فرمایا آپ نے۔ اسی سے ہی یہ چیزیں ہیں صاحب ان کے ذہن میں کہ قرآن وہ ایسا ہی ہے بس خدا کا کلام جو ہوا جی ''بندہ بشر جیہڑا ہیگا' ایہہ انا ریل اینوں سمجھ سکدا اے؟ اے اللہ ہویا' اے بندہ ہویا' کی کریے''۔ عزیزانِ من!

بیاں میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

قرآنِ حکیم میں کوئی ایک بات بھی متضاد نہیں ہے اس نے ہر چیز کے لیے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں

ان بتوں کو نکال دیجیے دماغ کے اندر سے' قرآن پہ آیے بات سمجھا دیتا ہے وہ۔ قدیر کے معنی ہم نے کہا ہے کہ وہ قادر' قادر کا تصور اپنے ذہن میں یہ کہ وہ لاپرواہ جو جی میں آئے کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآن سے پوچھیے عربی زبان سے پوچھیے قدیر کے معنی کیا ہیں پھر بات سمجھ میں آئے گی۔ سمجھ میں آئے گا کہ اس جگہ یہی کہنا چاہیے تھا یہاں اس کے بعد۔ قدیر ق د ر: اس کے معنی ہی پیمانے

کے ہوتے ہیں۔قدیر کے معنی ہیں جس نے ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کر دیے MEASURES دے دیے۔اسی کو ہماری زبان میں قانون کہتے ہیں اسی کو فارمولا کہتے ہیں، اسی کو ڈاکٹر کا نسخہ کہتے ہیں، پانچ بوندیں سٹرکنیاں کی، چار بوندیں ٹنکچر آیوڈین کی، اتنا اس کے اندر یہ ٹنکچر، اتنی اس میں کونین یہ کیا ہے اتنا اور اتنا؟ یہ "اتنا" کیوں ضروری ہے اس کے لیے؟ یہ پیمانے مقرر ہیں اس دوائی کے شافی ہونے کے لیے۔ پیمانے ادھر اُدھر کر دیجیے، ساری چیز بگڑ جاتی ہے۔اس نے کہا کہ یہ چیزیں جو تمہیں شکست ہوئی ہے یہ بھی کچھ یوں ہی نہیں ہوگئی۔انہیں جو اس وقت ذرا پلٹا لیا ہے، یہ بھی ایسے نہیں ہو گیا ان سب چیزوں کے لیے ہم نے قانون مقرر کیے ہوئے ہیں۔سنکھیے کا پیمانہ یہ تھا کہ دس بوندوں تک وہ ممد حیات ہے۔ پیمانہ یہ ہے کہ پچاس بوندیں دے دیجیے۔وہی سنکھیا موت وارد کر دیتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (3:165) خدا نے ہر شے کے پیمانے مقرر کیے ہوئے ہیں فتح اور شکست کے بھی پیمانے مقرر کیے ہوئے ہیں۔تم نے ان پیمانوں میں گڑبڑ کی، یہ نتیجہ نکل آیا۔ان پیمانوں کے مطابق پھر اپنی محنتوں کو استوار کر لیجیے، وہ نتیجہ نکل آئے گا۔ ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ (3:165)، عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ ط(3:165) کے معنی یہ نہ سمجھ لیجیے کہ قانون تو کوئی اور ہو، سنکھیے کے لیے قانون تو یہ ہے کہ وہ مہلک ہوتا ہے سنکھیا کھاؤ اور خود ہی پیمانہ مقرر کرو کہ اس سے زندگی بڑھ جائے گی کہا یہ بات نہیں۔اپنے ہاتھوں سے تم بگاڑتے ہو۔خدا کا پیمانہ بدلتا نہیں ہے تمہارے لیے۔وہ وہیں ہوتا ہے۔

ذاتِ خداوندی اپنے مقرر کیے ہوئے اٹل پیمانوں کو کسی کی خاطر بھی نہیں بدلتی

یہ دستہ فوج کا جس نے وہاں سے جگہ چھوڑی ہے۔وہ فوج کا دستہ صحابہ کبارؓ کا دستہ ہوتا، ہمارے جیسے گناہ گاروں کا دستہ ہوتا، پیمانہ مقرر یہ ہے کہ اگر اس نے اس کمانڈر کے حکم کی نافرماں برداری کی ہے تو اس کا نتیجہ شکست ہوگا۔یہ پیمانہ اٹل ہے تمہارے لیے بھی یہی پیمانہ تھا، کفار کے لیے بھی یہی پیمانہ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (3:165)۔یہ جو تم سمجھ رہے ہو اپنے ذہن کے اندر کہ بڑے ہم مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں (میں اپنی طرف سے یہ بات کر رہا ہوں) اس لیے تم پیمانوں کی خلاف ورزی بھی کرو گے تو وہ کچھ نہیں کہے گا، کہا یہ بات نہیں ہے۔ہمارے پیمانے مقرر ہیں۔اور یہ وہی پیمانہ تھا کہ جس کی رو سے تیر اگر محمد رسول اللہ ﷺ کے بھی رخسار میں آیا ہے تو وہاں بھی اس نے اسی طرح سے زخم کر دیا جس طرح ہر انسان کے رخسار میں تیر زخم کیا کرتا ہے۔ پیمانے ہمارے مقرر ہیں۔آتا ہے سب انسان کے ہاتھ سے آتا ہے ہمارے پیمانے کے حساب سے، یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی کی خاطر اس پیمانے کو بدل دیں۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (3:165)۔بات سامنے آگئی تو یہ بھی سمجھ لیجیے۔پیمانے اشیا کے مقرر ہوئے ہوئے جتنی شے ہیں ان کے لیے اٹل یہ ہیں۔اس کی اتنے کی یہ تاثیر اتنے کی یہ تاثیر۔یہ جتنی چیزیں ان کی مقرر کی ہوئی

ہیں' اشیائے کائنات مجبور ہیں' سنکھیا مجبور ہے' وہ اپنا پیمانہ نہیں بدل سکتا' پانی مجبور ہے' وہ یہ پیمانہ نہیں بدل سکتا کہ نشیب کی طرف بہے گا۔ انسان صاحبِ اختیار ہے وہ اپنے لیے صحیح راہ بھی اختیار کر سکتا' ہے غلط بھی اختیار کر سکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اِنَّ اللّٰـهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:165) جہاں جہاں آیا ہے عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:165) آیا ہے سارے قرآن میں۔ یہ ہے خدا کا کلام۔ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:165)۔ میں اس پہ صاحبِ اختیار ہوں جتنا جی چاہے زہر پھانک لوں' سنکھیا اس چیز کے اندر مختار نہیں ہے کہ وہ اپنے نتیجے کو خود بدل دے۔ اس لیے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:165)۔

لفظ اذن کے متعلق ہمارے ہاں کے غلط تراجم کے برعکس قرآنی مفہوم کا پیش کردہ تصور

آگے بات صاف ہوگئی' ہمارے یہ ہوتا ہے صاحب! کہ ہر چیز خدا کے اذن سے ہوتی ہے اذن کے معنی حکم ہوتا ہے ہر چیز خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ (3:165)۔ آگے آگیا وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (3:166) یہ جب دو لشکر آمنے سامنے آئے تھے یہ اس دن جو تمہیں نقصان پہنچا ہے فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (3:166) پھر وہی بات آگئی کیجیے وہ ترجمہ جو عام آپ کو کرایا جاتا ہے کہ خدا کے حکم سے یہ ہوا۔ اب اس کے بعد هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (3:165) تمہاری طرف سے ہوا عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:165) ہر چیز کے پیمانے مقرر ہیں۔ تو اذن کا یہ غلط ترجمہ ہے جو ہم نے کیا ہے نا اس کی رو سے بات پھر گڑبڑ ہوگئی پھر فٹ نہیں بیٹھ سکتی۔ پھر ان سے پوچھیے تو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو انسان کی تصنیف میں بات ہوتی ہے کہ وہ LOGICAL بات ملتی جلتی کرتا جائے' یہ تو خدا کی تصنیف ہوئی نا (معاذ اللہ)۔ کہتے ہیں قرآن تو معجزہ ہے نا جی یعنی ''معجزہ ہے تے کوئی گل دوئے نال ملے ای نہ اوہدی''۔ نہ عزیزانِ من! ہماری نگاہ کا نقص ہے یہ' ہم نے ہی ان الفاظ کے معنی جو ہیں غلط کیے ہوئے ہیں۔ میں اس سے پیشتر اذن کے متعلق کہہ چکا ہوا ہوں کہ یہ خود قانون کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ زمین سے کھیتی ہمارے اذن کے مطابق اگتی ہے اور خود ہی اس نے بتایا ہے کہ زمین سے کھیتی کس طرح سے اگاؤ۔ خود ہی اس نے کہا ہے کہ زمینِ بنجر اگر تم رکھو گے تو تمہارا یہ بیج جو ڈالتے ہو' یہ بھی ناس ہو جائے گا۔ زمینِ طیب پہلے رکھو پھر اس کے لیے یہ طریقے اختیار کرو۔ یہی اِنَّ اللّٰـهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:165) ہے۔ میں نے اس دن یہ عرض کیا تھا کہ حکم اگر ایسا ہو کہ اب کچھ اور ہو' دوسرے وقت میں کچھ اور ہو' تیسرے وقت میں کچھ اور ہو' اسے آپ حکم کہہ لیجیے لیکن ایک دفعہ کا دیا ہوا حکم اگر قیامت تک کے لیے اٹل ہو تو اسے قانون کہتے ہیں' سیدھی سی بات ہے۔ اگر حکم ہی آپ نے کہنا ہے تو اس نے ایک دفعہ یہ حکم دے دیا تھا کہ تیر اگر آ کے کسی انسان زندہ کے جسم میں کھبے گا تو اس سے یہ کیفیت پیدا ہوگی اور وہ حکم کہہ دیا کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ

تَبۡدِیۡلًا (33:62) اس میں تبدیلی کبھی نہیں ہوگی۔تو اپنی زبان میں ہم اسے ہی کہتے ہیں قانونِ خداوندی کہ تیر جب آ کے حلق میں لگتا ہے تو اس سے خون نکلتا ہے۔وہ کہا کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (3:165) اس نے تمام اشیا کے پیمانے مقرر کیے ہوئے ہیں۔اسی کا نام اذنِ خداوندی ہے۔ان چیزوں کے اندر پیمانے از خود مقرر نہیں ہو گئے۔

مادہ پرست اور خدا پرست میں فرق

اب یہاں آ کے پھر مادہ پرست اور خدا پرست میں فرق پیدا ہو گیا۔سائنٹسٹ MATERIALIST وہ بھی اس مقام پہ پہنچ چکا ہے کہ ہر شے کے لیے پیمانے ہیں MEASURES ہیں وہ تو بڑا STRICTLY MEASURE کے مطابق چلتا ہے۔یہ MEASURES کا علم ہی تو ہے جس نے آج رات پھر تیسری بار پھر ایک جہاز کو چاند کی طرف اڑا دیا ہے۔بدلتے نہیں ہیں یہ پیمانے' یہی ہے اذن۔

انسانی زندگی میں مختلف تصادمات قوت ارادی میں اضافے کا موجب بنتی ہیں

کہا یہ سارا کچھ اس قانون کے مطابق ہوا۔کہا کہ اس کا ایک نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے اگر ادھر تمہاری نگاہ جائے گی تو معلوم ہوگا کہ ٹھیک ہے جسمانی طور پر طبعی طور پر تو کچھ نقصان ہوا اس سے' ایک فائدہ بھی ہوا ہے وَلِیَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ . وَ لِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ نَافَقُوۡا (3:166-167) اس قسم کے جو دھچکے لگتے ہیں یہ چیزیں جو پیدا ہوتی ہیں تو اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ صحیح ایمان رکھنے والا کون ہے منافق کون ہے۔جس کو ان قوانین کی صداقت پر یقینِ محکم ہے وہ ایسے مقام پر کھڑے ہو کر یہ کہتا ہے کہ مجھ سے کہیں غلطی ہوئی۔کوئی بات نہیں ہے اگر مجھے تکلیف پہنچی میں دوبارہ اسے ٹرائی کروں گا پھر میدانِ جنگ میں آ وں گا پھر کوشش کروں گا۔اسے یقین ہے اس پہ۔اور جو اس لیے آیا ہوا ہو کہ صاحب! نقصان وان کوئی نہ ہو فائدہ سارا ہمارا ہو جوں ہی نقصان ہوا اسی وقت ساتھ چھوڑ کے چلا جائے۔کہا اس قسم کے تصادمات جو آتے ہیں ان سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس بات کی پرکھ ہو جاتی ہے تم اس بات کو پرکھ لیتے ہو۔اے سربراہِ مملکتِ خداوندی تمہیں یہ پتہ چل جاتا ہے ایسے مقامات پہ کہ کون تھا جو دل کی صداقت سے تمہارے ساتھ تھا اور کون تھا جو صرف اپنے منفعت اور اغراض کے لیے تمہارے ساتھ ہوا تھا۔ وَ قِیۡلَ لَھُمۡ تَعَالَوۡا قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَوِ ادۡفَعُوۡا ؕ (3:167) یہ وہ لوگ ہیں جب ان سے کہا گیا کہ آ ؤ خدا کی راہ میں جنگ کرنے کے لیۓ مالِ غنیمت کی خاطر نہیں شہرت کی خاطر نہیں مکے والوں سے خاندانی بدلے لینے کے لیے نہیں فی سبیل اللہ جانیں دینے کے

لیے آ ؤ۔ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ (3:167) وہ لڑائی OFFENCE کی ہو DEFENCE کی ہو دونوں چیزیں آ گئیں جو کچھ بھی اس میں کرنا پڑے۔تو کہا اس وقت تو انہوں نے مختلف قسم کے بہانے بنائے ادھر اُدھر کھسک گئے اور اس کے بعد جب تک فاتح اور منصور حیثیت سے واپس آ رہے ہو قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ (3:167) کہہ رہے ہیں کہ واہ! ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تم یوں ہی مذاق کرر ہے تھے اللہ کی قسم اگر معلوم ہوتا کہ واقعی جنگ ہونی ہے "لے اسی ساریاں توں پہلاں ہوندے"۔عزیزانِ من! کوئی چودہ سو سال پہلے کی بات نہیں ہو رہی' روز ہوتا ہے یہ۔

کفر اور ایمان میں امتیازی نشان کی وضاحت

سنیے قرآن کیا کہتا ہے؟ یہاں پھر کفر اور ایمان کا ایک امتیاز سامنے آ تا ہے۔کہتا ہے هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ج (3:167) یہ ایسا کہنے میں آج کے دن ایمان کے مقابلے میں کفر سے زیادہ قریب آ گئے۔کیوں آ گئے یہ؟ کیا انہوں نے کہا؟ کیا انہوں نے کیا تھا جو کفر ہے؟ کفر یہ ہے کہ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ (3:167) کفر یہ ہے زبان سے وہ بات کہتے ہیں جو دل میں نہیں ہے۔عزیزانِ من! سوچ رہے ہیں ایمان اور کفر کسے کہتے ہیں۔اس نے ایمان تو یہ کہا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ (9:111) مومن بیچ دیتا ہے اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھوں۔ہم بھی پڑھتے ہیں اس آیت کو ہم بھی زبان سے الفاظ دہراتے ہیں۔سوچیے کبھی دل میں ٹٹو لیے کبھی یہ کیفیت ہماری ہوتی ہے کہ میری نہ جان میری ہے نہ مال میرا ہے یہ تو بیچی ہوئی چیز ہے کسی کے ہاتھوں مال بھی میرا جان بھی میری۔ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ (3:167) یہ جس قدر فسادات مچ رہے ہیں دنیا کے اندر اس کی بنیاد اس پہ ہے يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ (3:167) ۔دوسروں کو تو چھوڑ دیجیے' وہ تو میکیاولی سیاست کا نام ہی یہ ہے کہ دل کی بات کبھی زبان پہ نہ آنے دیجیے' یہ جو اپنے آپ کو مومن کہہ رہے ہیں یہ جو اسلامی نظام کے قیام کے لیے ساری جدوجہدیں ہو رہی ہیں اور آج کونسا آپ کے ہاں پارٹی یا گروہ یا فرد ہے جو یہ نہیں کہہ رہا۔سوچیے تو سہی وہاں بھی یہ نہیں ہو رہا؟ کہ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ (3:167) قرآن کہتا ہے یہ کفر کے قریب ہو گیا ایسا کرنا۔ایمان یہ نہیں ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

مومن کا طریق یہ ہوتا ہے دل اور زبان میں کامل ہم آہنگی۔کہا کہ یہ چھپاتے ہیں چھپانے دیجیے وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا

یَکْتُمُوْنَ ج (3:167) اس سے کہاں چھپا کے لے جائیں گے اس چیز کو وہ تو دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانتوں تک سے واقف ہے۔ یہ لوگ ہیں اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا (3:168) کہا ان کی کیفیت یہ کہ خود بھی گھر میں بیٹھے رہے اور جو چلے گئے ان کے بھائی ساتھ جنگ میں ان کے متعلق کہتے ہیں لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ط (3:168) دیکھو نا جی! اگر ہماری بات مان لیتے کیوں مرتے وہاں جا کے۔ روزمرہ کی ہماری باتیں ہو رہی ہیں۔ خوامخواہ کے لیے جان دے دی صاحب وہاں، ہماری بات مانتے تو کیوں ہوتا۔ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (3:168) ٹھیک ہے ''کیوں مرتے'' کہتے ہو نا کہ تمہاری مانتے تو کیوں مرتے۔ کہا تم اپنے آپ کو ذرا موت سے بچا کے رکھ لو نا۔ یعنی انہیں تو کہتے ہو نا کہ ہماری مانتے تو کیوں مرتے تم تو اپنی مان رہے ہو نا پھر ذرا بچ کے بتا نا موت سے۔ کیا بات ہے قرآن کے انداز کی؟ سوال تو یہ ہے نہیں کہ وہ وہاں گئے تو مر گئے تم یہاں رہ کے اپنے گھروں میں بیٹھ کے پھر ذرا اپنے آپ کو موت سے بچا کے بتاؤ۔ باقی رہا یہ کہ وہ جو گئے جنہیں تم نے کہا کہ مر گئے وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ط (3:169) اے چلتی پھرتی لاشو! انہیں کہہ رہے ہو کہ وہ مر گئے۔ لیکن بات بڑی سامنے آ گئی، وقت آج ختم ہو گیا اگلے درس پہ اٹھا رکھیں گے۔ اس طرح جان دینے والوں کی بارگاہ میں اور کچھ نہیں کم از کم ایک درس میں ہی ہدیۂ عقیدت پہنچا دیا جائے، ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس چیز کو اگلے درس پہ میں اٹھا رکھتا ہوں کہ قرآن کی رو سے موت اور زندگی کی DEFINITION کیا ہے وہ کسے موت کہتا ہے کسے زندگی کہتا ہے؟ ہم سورۃ آلِ عمران کی آیت 168 تک آ گئے۔ برادرانِ عزیز! 169 آیت سے اگلے درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

انتیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 169 تا 178)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقامِ انسانیت کے لیے اقدار کے تحفظ کی اہمیت

عزیزانِ من! آج اپریل 1970ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی 169 آیت سے ہوتا ہے: (3:169)۔

موت وحیات کے بنیادی فرق کی وضاحت کے علاوہ طبعی زندگی سے انسانی زندگی کی طرف سفر

سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ لوگ یہ منافقین، مخالفین جہاد سے جی چرانے والے۔ خود تو یہ بیٹھے رہے اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ یہ لوگ جو میدان میں گئے وہاں انہوں نے جانیں دیں تو خوامخواہ کے لیے انہوں نے موت کو سہیڑ لیا اگر یہاں ہمارے پاس

ہی رہتے' کا ہے کومرتے۔تو قرآن نے ایک چیز تو یہ کہی تھی کہ جہاں تک موت کا تعلق ہے'ان سے کہیے کہ ذرا اپنے آپ کو موت سے بچا کے بتائیں وہ تو ایک دن آئے گی۔اوراس کے ساتھ یہ کہا کہ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے'وہ جہاد کے لیے نکلے'میدانِ جنگ میں انہوں نے جانیں دیں'ان کے متعلق گمان بھی نہ یہ کرو کہ یہ مرگئے۔میں نے عرض کیا تھا کہ یہ اہم مقام ہے اوراسی لیے ہم نے اسے آج کے درس پر اٹھا رکھا تھا بات بڑی غور طلب ہے۔قرآنِ کریم نے بڑی اہمیت دی ہے انہیں جو جہاد کے لیے نکلتے ہیں اور وہاں جان تک دے دیتے ہیں۔درس کے انداز میں آج میں یہ بات کروں گا آپ سے۔انسانی زندگی حیوانی زندگی کی ہی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے جسے طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کہتے ہیں یہی کچھ نظر آتا ہے ہمیں۔لیکن انسانی زندگی حیوانی زندگی سے آگے ہے'حیوانی زندگی سے اونچی ہے۔وہ جسے ہم انسانی زندگی عام طور پہ کہتے ہیں اس کی مابہ الامتیاز خصوصیات کیا ہیں؟ یعنی کیا زندگی ہے؟ ہم حیوانی زندگی یا طبعی زندگی کو تو سمجھتے ہیں'وہی چیزیں جو حیوانات میں ہیں'وہی انسانوں کے اندر ہیں۔کھانا پینا سونا آرام کرنا افزائشِ نسل اس طبعی مشین کا انسان کے جسم کی مشینری کا PHYSICAL LAWS کے ماتحت چلنا چلتے چلتے ایک دن ختم ہو جانا'اسے موت کہا جاتا ہے۔جب تک وہ چلتی ہے'اسے زندگی کہا جاتا ہے۔یہ کوئی انسانی خصوصیت نہیں ہے'ہر حیوان کی زندگی اسی طرح سے چلتی ہے اور ایسے ہی ختم ہوتی ہے۔

حیوانی زندگی میں اقدار کا یا Values کا تصور ہوتا ہی نہیں

جسے ہم انسانی زندگی کہتے ہیں وہ زندگی کیا ہے؟ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ جو فلسفے کے مابعد الطبیعاتی مسائل (META PHYSICS) کے ہیں'ان سے تعلق ہے اس کا' نہ ہی کوئی ایسی چیز ہے جسے آپ کہیں کہ صاحب! یہ عالمِ روحانیت کی لاہوتی باتیں ہیں'عالمِ ناسوت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے' کچھ اس قسم کی بات نہیں ہے۔سیدھے سیدھے الفاظ میں بات سمجھ میں آجاتی ہے۔اور وہ بات یہ ہے کہ حیوانی سطحِ زندگی جو ہے اس میں صرف طبعی ضروریات ہوتی ہیں PHYSICAL NEEDS صرف ہوتی ہیں۔انسانی سطحِ زندگی کے اوپر VALUES کا تصور آتا ہے'اقدار کا تصور آتا ہے۔حیوان میں VALUES کا تصور نہیں ہوتا' وہاں صرف طبعی زندگی کی ضروریات کا تصور ہوتا ہے۔صداقت' امانت' دیانت' غیرت' حمیت' ایثار' APPRECIATIVE VALUE' یہ چیزیں حیوانات میں نہیں ہوتیں۔یہ VALUES کی جو APPRECIATION ہے VALUES کا جو تصور ہے'انہیں اقدار کہتے ہیں۔

طبعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اقدار (Values) کی اہمیت اور اس کے تحفظ کی ضرورت

یہ جو مستقل اقدار کا تصور ہے یہ صرف انسانی زندگی میں آ کر ہوتا ہے۔ حیوان کے لیے ایک ہی چیز ہے کہ بھوک لگے جہاں سامنے چارہ آئے' وہاں وہ منہ مارے اور چارا کھالے۔ بیل چلا جا رہا ہے۔ دو کھیت دائیں اور بائیں اس کے ہیں۔ ایک طرف اپنے مالک کا ہے' دوسری طرف بیگانے کا ہے۔ اسے بھوک لگتی ہے' یہ امتیاز اس کے ذہن میں نہیں ہے کہ مجھے کس طرف کے کھیت میں منہ مارنا چاہیے۔ اسے چارے سے غرض ہے' اسے کھانے سے غرض ہے' اپنی بھوک مٹانے سے غرض ہے۔ یہ امتیاز کہ اس کھیت سے مجھے لینا چاہیے' اس سے نہیں لینا چاہیے یہ VALUE ہوتی ہے' انسان اس چیز میں امتیاز کرتا ہے' یہ انسانی سطح کی ہے۔ اگر وہ اس میں امتیاز نہیں کرتا تو حیوانی سطح کے اوپر ہے کہ جہاں سے ملے' میاں لو مقصد تو یہ ہے کہ بھوک مٹانی ہے ہم نے۔ جیسے مل سکتا ہے' لیجیے' جہاں سے مل سکتا ہے' لیجیے' یہ حیوانی سطح ہے۔ انسانی سطح کے اندر ایک امتیاز ہوتا ہے۔ یہ کرنا چاہیے یہ نہیں کرنا چاہیے' یہ ٹھیک ہے' یہ غلط ہے' اسے VALUE کہتے ہیں۔ VALUES کا تصور انسانی سطح کے اوپر شروع ہوتا ہے آ کر۔ اب اگلی چیز لیجیے۔ عام معاشرے کے اندر کیفیت یہ ہے کہ کسی VALUE کی حفاظت کے لیے طبعی زندگی کی ضروریات پر کہیں نہ کہیں جا کے زد پڑ جاتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ آپ کو اگر بھوک لگ رہی ہے اور آپ کے سامنے کوئی کھانے کی بھی چیز ہے تو اسے اگر آپ بددیانتی سے لیتے ہیں' کھانے کے لیے وہ مل جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ اس VALUE کا احترام کرتے ہیں کہ نہیں! مجھے یہ چرا کے نہیں لینی چاہیے' ظاہر ہے کہ آپ کی بھوک نہیں مٹ سکتی' آپ کو بھوک کی مشقت برداشت کرنی پڑے گی۔ ہر VALUE یا ہر قدر کے DEFEND کرنے کے لیے' اس کی حفاظت کے لیے' اس پر کار بند رہنے کے لیے آپ کی کسی نہ کسی طبعی زندگی کی ضرورت' اس میں نقصان واقع ہوگا' اس پہ زد پڑے گی۔ اس چیز کو آگے بڑھایے جتنی VALUE زیادہ آپ کے ہاں کی زیادہ قابلِ قدر ہوتی چلی جائے گی' اسی قدر حیوانی زندگی یا طبعی زندگی کی ضروریات جو ہیں آسائشیں' BASIC NECESSITIES بھی جن کے اوپر زندگی کا دارومدار ہے' اس کے بعد آسائشیں' آسانیاں' بہت سی ایسی چیزیں طبعی زندگی میں جنہیں ہم بڑا عزیز رکھتے ہیں' اچھے اچھے مکانات' موٹریں' اچھی اولاد یہ تمام چیزیں' سامانِ زیبائش' سامانِ آرائش' آسائش یہ جتنی بھی چیزیں ہیں حتیٰ کہ میں نے عرض کیا بنیادی ضروریاتِ زندگی' ان کے اوپر بھی اثر پڑتا ہے۔

جبلت کے بنیادی تقاضوں پر ہونے والے ریسرچ' اس کا مشاہدہ اور پھر اس کا نتیجہ

یہ طبعی زندگی سے متعلق جو چیزیں ہیں ان کی طرف ذرا آیے۔ ہر جاندار کے اندر ایک BASIC INSTINCT ان کو کہتے ہیں بنیادی جبلت۔ یعنی وہ کہیں سے انہوں نے حاصل نہیں کی ہوئی ہوتی' اندر کا تقاضا ایک ہوتا ہے۔ اندر کے تقاضوں کے متعلق یہ جو ریسرچ کرنے والے ہیں' ان کا مطالعہ یہ ہے' مشاہدہ یہ ہے' وہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اس میں سب سے زیادہ شدید تقاضا SELF PRESERVATION کا ہوتا ہے اپنی جان کی حفاظت۔ تین تقاضے BASIC قرار دیے گئے ہیں SELF PRESERVATION , SELF AGRESSIOIN , SELF REPRODUCTION (حفاظتِ خویش' غلبہ اور تغلبِ خویش اور افزائشِ نسل)۔ یہ افزائشِ نسل کے تقاضے تو آج کل آپ کے سامنے آ رہے ہیں یہ چڑے اور چڑیا یہ جو گھونسلے بناتے ہیں گھروں میں۔ آپ دیکھتے ہیں صبح سے شام تک کیسے آپ کی اور ان کی ایک جنگ ہو رہی ہوتی ہے۔ اور وہ سارا دن کس جنون کے ساتھ اس میں لگے رہتے ہیں کہ تنکے اٹھا اٹھا کے گھونسلا بنائیں۔ کا ہے کے لیے؟ یہ رہائش کے لیے گھونسلا نہیں بناتے' بچے دینے کے لیے گھونسلا بناتے ہیں۔ دن میں آپ بیس مرتبہ ان کے تنکوں کو بکھیریں وہ تیس مرتبہ ان تنکوں کو لا کے وہاں اکٹھا کرتے ہیں۔ اندر ان کے ایک تقاضا ہے کسی نے ان سے یہ نہیں کہا کہ بھئی! تم نے بچے دینے ہیں' اسے کہتے ہیں INSTINCT اندر کا تقاضا۔

مرگِ باشرف کی خاطر اقدار (Values) کا تحفظ جان سے بھی زیادہ قیمتی شے ہے

جان کی حفاظت کا تقاضا PRESERVATION OF SELF یہ بنیادی تقاضا ہے۔ ننھی سی جان چیونٹی کی' وہ جا رہی ہو آپ اس کے سامنے ایک تنکا کھڑا کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ کس طرح وہ اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اگر آپ اور مدافعت یا اس کے مقابلے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں' چیونٹی ہی سہی کاٹتی ہے وہ' اپنی جان کی حفاظت کرتی ہے وہ۔ ہر ذی حیات اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے یہ BASIC INSTINCT ہے بنیادی جبلت ہے' بنیادی تقاضا ہے طبعی زندگی کا۔ اور جان سب سے زیادہ قیمتی شے گنی جاتی ہے اسی لیے ہر جاندار کے نزدیک۔ تو میں نے کہا یہ تھا کہ VALUE کی حفاظت کے لیے (VALUE ہی کو حق اور صداقت کہا جاتا ہے) کسی قدر یا VALUE کی حفاظت کے لیے' طبعی زندگی کے کسی نہ کسی تقاضے کے اوپر زد آ کر پڑتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ انسانی سطح پہ زندگی بسر کر رہا ہے یا حیوانی سطح پہ زندگی

بسر کر رہا ہے۔ اگر وہ اس VALUE یا قدر کی حفاظت کے لیے طبعی زندگی کے نقصان کو برداشت کر لیتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے تو وہ انسانیت کی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ اگر وہ VALUE کی قدر اس وقت نہیں کرتا طبعی زندگی کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے' وہ حیوانی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور جتنی زیادہ کوئی انسانی زندگی بسر کرتا چلا جائے گا

قرآنِ حکیم کے ہاں اقدار کی مدافعت کا ثمر اپنے اندر تو ایک نئی زندگی کی شکل لیے ہوئے ہے

قرآن کے الفاظ میں یعنی ایک تو زندگی (LIFE) جسے آپ کہتے ہیں وہ تو سانس لینا ہے اور ایک انسانی زندگی ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ جتنا کوئی شخص ان VALUES یا اقدار کی مدافعت میں حیوانی زندگی کے نقصانات برداشت کرتا ہوا' ان کی مدافعت کرتا چلا جائے گا' اتنا ہی وہ زیادہ زندہ انسان گنا جائے گا۔ سانس لینے کے اعتبار سے تو ہر انسان زندہ ہے' ہر حیوان زندہ ہے لیکن وہ زندگی اور موت کی ایک نئی DEFINITION دیتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ زندگی نفس شماری کا نام نہیں ہے' سانس لینے کا نام نہیں ہے' سانس تو ہر حیوان لیتا ہے۔ حیاتِ بے شرف جسے وہ کہتا ہے جس میں VALUES کو قربان کر کے انسان طبعی زندگی کی حفاظت کرے۔ اور اس کے مقابلے میں اقبالؒ کے الفاظ میں مرگِ باشرف کہ VALUE کی حفاظت میں جان بھی دیدے۔ قرآن کہتا ہے یہ زندہ' وہ مردہ ہے۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک تو زندگی اور موت' انسان کی زندگی اور موت ہے۔ حیوان کی زندگی اور موت جو ہے وہ تو آپ دیکھتے ہیں ایک برسات میں کروڑوں کی تعداد میں حشرات الارض پیدا ہو جاتے ہیں۔ رات کو آپ دیکھیے تو ہزاروں کی تعداد میں ایک شمع کے گرد پروانے رقص کر رہے ہوتے ہیں۔ شاعری کی تو بات اور ہے۔ صبح کو دیکھیے تو ڈھیر ہو گیا ہوا ہوتا ہے ان کا۔ حیوانی سطح کی زندگی' یہ نہ زندگی ہے نہ موت ہے۔

موت وحیات کا قرآنی معیار اور عقلِ انسانی کی غلط نگہی کا نتیجہ

قرآن یہ کہتا ہے کہ زندگی کہلانے کی مستحق انسانی سطح کی زندگی ہے۔ اور جتنی زیادہ قیمتی چیز حیوانی سطح کی زندگی میں سب سے زیادہ قیمتی چیز جان ہے انسان کی' وہ کہتا ہے جتنی زیادہ قیمتی چیز کی ایثار سے VALUE کی مدافعت اس نے کی' اتنا ہی یہ زیادہ زندہ ہو گیا۔ اور وہ جو اپنی جان دینے کے لیے جہاد میں نکل آتا ہے کسی اپنی ذاتی غرض یا حیوانی زندگی کے کسی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ کسی VALUE یا قدر کی مدافعت کے لیے جان دینے کے لیے آ جاتا ہے' وہ کہتا ہے کہ وہ مردہ کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ وَلَاتَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ (3:169) جو یوں جان دے دیتا ہے اسے مردہ تصور بھی نہ کرو۔ انہوں نے

کہا یہ تھا کہ میدانِ جنگ میں اگر یہ نہ جاتے تو مرتے کیوں۔ وہ کہتا ہے اے غلط فہمیوں میں رہنے والو! مردہ تو تم ہو جن کو انسانی زندگی کی ہوا تک نہیں لگی۔ زندہ یہ ہیں کہ جنہوں نے حق کی مدافعت کے لیے' اقدار کی مدافعت کے لیے' حیوانی زندگی کی سب سے قیمتی متاع جسے جان تم کہتے ہو' وہ دے کے اس کی حفاظت کر لی' زندہ یہ ہیں' تم زندہ نہیں ہو۔ عزیزانِ من! موت اور زندگی کا یہ نیا معیار ہے جو قرآن نے قائم کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھیں گے ٹھیک ہے زندگی میں جسے آپ نیکیاں کہتے ہیں وہ ویسے ان کی کئی قسمیں ہیں' بہت سے شمار ہیں لیکن قرآنِ کریم میں آ کے آپ دیکھیے یہ جو میدانِ جنگ میں نکلنے والے ہیں' جان ہتھیلی پہ رکھ کر باہر نکلنے والے تاکہ VALUE کی مدافعت کی جائے' اقدار کی مدافعت کی جائے۔ عزیزانِ من! اسی کو حق کہتے ہیں' اس کی مدافعت کی جائے اور اس میں اگر وہ جان بھی دے دیتے ہیں' آپ دیکھیے قرآنِ کریم حقیقت میں جسے نیکی کہتا ہے وہ ان ہی کی نیکی شمار کرتا ہے۔ کس کس انداز میں یہ باتیں کرتا ہے چند ایک آیات دیکھیے۔ سارا قرآن بھرا پڑا ہے صاحب ان ہی لوگوں کے محاسن سے ان ہی کے اوصاف سے۔ اور ہے بھی یہ بات' وہ تو بات ہی زندہ سے کرتا ہے' مردے کے متعلق وہ بات نہیں کرتا۔ یہ جو چلنے پھرنے والی لاشیں ہیں' ان کو وہ مردے کہتا ہے۔ زندہ انسان ہیں جن کے متعلق وہ یہ کہتا ہے۔ سنیے کس قدر والہانہ انداز سے بات شروع کرتا ہے۔

مذہبی طور پر انفرادی نیکی کے برعکس دین کے عطا کردہ اجتماعی نظام کی عملی زندگی میں بنیادی فرق ہے

بڑی خوبصورت آیات ہیں صاحب۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (9:119) پہلے ہی آپ دیکھیے بات کتنی عظیم کہہ گیا ہے۔ اے ایمان لانے والو۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ مخاطب ہی ایمان والوں سے ہے۔ صرف ایمان لے آنا ہی کافی نہیں ہے' ان کو تو صرف مخاطب کیا گیا ہے۔ کیا کہا گیا ہے؟ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ (9:119) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اگلا ٹکڑا اس کے ساتھ ملا کے مذہب اور دین میں فرق پیدا کر دیا۔ مذہب تو کہتا ہے کہ انفرادی طور پر اپنے اپنے طور پر تم جو کچھ بھی نیکی کا کام کرتے جاؤ' وہ نیکی کا کام ہوتا ہے۔ یہ خدا اور بندے کا پرائیویٹ تعلق ہے۔ اس لیے کر سکتے ہو۔ وہ اتَّقُوا اللّٰہَ(9:119) کہنے کے بعد کہتا ہے وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (9:119) سچوں کے ساتھ ملو۔ زندگی اجتماعی ہے انفرادی طور پہ متقی نہیں ہوا جا سکتا۔ ہمارے ہاں چونکہ دین کا تصور نہیں رہا' وہی مذہب کا تصور ہو گیا ہے' نیک آدمی متقی پرہیزگار انفرادی زندگی ہے۔ وہ کہتا ہے نہیں! اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (9:119) یہ صادقین کون ہیں؟ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ طبعی زندگی کے نقصانات سے بے نیاز ہوتے ہوئے مستقل اقدار جسے حق اور صداقت کہتے ہیں' ان کی مدافعت کرنے والے یہ ہیں

جنہیں قرآن نے صادقین کہا ہے۔صادقین کے ساتھ ہو جاؤ تم۔ سنیئے صادقین کون ہیں؟ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ (9:120) وہ کہا کہ ایک گروہ تو یہ تھا مدینے میں رہنے والوں کا بھی اور ان کے اردگرد جو باہر کے قبیلے کے یہ بدو جنہیں کہا جاتا ہے' ان کی یہ کیفیت۔ جہاد کے لیے پکار ہوئی ہے اب وہ پیچھے رہ گئے ہیں' کہا انہیں یہ نہیں چاہیے تھا۔اور اگلی بات یہ کہی ہے کہ انہیں اپنی زندگی کی آسائشوں کو اپنی زندگی کے مفاد کو ترجیح نہیں دینی چاہیے تھی اس کے اوپر (وہ جو رسول جسے کہا گیا ہے)۔اب اس گروہ کے مقابلے میں دوسرا گروہ ہے کہ جنہوں نے اس آواز پر لبیک کہا صادقین کے گروہ کے ساتھ شامل ہوئے۔

صادقین کا تو ایک ایک قدم اور ایک ایک لمحہ خدا کے ہاں محفوظ کیا جاتا ہے

عزیزانِ من! سنیئے ان کی نیکیاں کس طرح قرآن شمار کر رہا ہے۔کہا ہے یہ وہ جماعت ہے' یہ وہ گروہ ہے' یہ وہ لشکر ہے' یہ وہ فوج ہے کہ جو یہاں سے جب چلے ہیں ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ (9:120) کہا ہے یہ جو جیش نکلا ہے' یہ جو اللہ کے سپاہی فی سبیل اللہ نکلے ہیں۔مختصر طور پر یہی سوچ لیجیے کہ کسی طبعی یا اپنی حیوانی زندگی کے کسی مفاد کی خاطر نہیں' مستقل اقدار کی مدافعت کے لیے جو کام کیا جائے گا' قرآن اسے فی سبیل اللہ کہتا ہے۔یہ فرق ہے دونوں کے اندر۔تو کہا ہے کہ اس غرض کے لیے یہ جو لشکر نکلا ہے اس لشکر کو بھوک' پیاس' تکان' مشقت یہ چیزیں راستے میں آئیں گی۔کہا ان میں سے ایک ایک تکلیف جو ذرا سی بھی ان کو آئے گی اور اس کے بعد کہا ہے کہ ہر وہ قدم جو بظاہر زمین کے سینے پہ پڑ رہا ہے لیکن درحقیقت دشمنوں کی چھاتی پہ پڑ رہا ہے ان کا۔ ہر وہ نقصان خواہ چھوٹے سے چھوٹا بھی کیوں نہ ہو جو انہیں اس راستے میں اٹھانا پڑ رہا ہے' بھوک کا پیاس کا تکان کا مشقت کا چلنے کا اور جس قسم کے بھی نقصانات دشمن کی طرف سے بھی انہیں پہنچ رہے ہیں' یہ تمام چیزیں كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ (9:120) ان کے ہر ایک قدم کو ہم عملِ صالح کی میزان میں لکھتے چلے جا رہے ہیں۔یہ ہے صادقین کا لشکر۔ ایک ایک قدم اٹھ رہا ہے اور وہاں لکھا چلا جا رہا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (9:120) تم پوچھتے ہو کہ حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والے کون ہیں؟ یہی تو ہیں جو چلے جا رہے ہیں فرشتوں کے جلو میں' یہ بڑھے چلے جا رہے ہیں اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر اپنی کسی غرض کے لیے نہیں صرف اس لیے کہ کلمۃ اللہ جو ہے' وہ بلند ہو دنیا کے اندر' اقدار جو ہیں دنیا کے اندر ان کی مدافعت ہو' اس کے لیے یہ چلے جا رہے ہیں۔ان کا کوئی اجر خدا ضائع نہیں کرتا۔وَ لَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا

کَبِیْرَۃً وَّ لَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (9:121) اس راستے کے اندر جو کچھ بھی یہ صرف کرتے ہیں، تھوڑا ہو بہت ہو، ہر وہ وادی جس کو یہ قطع کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں، ابھی میدانِ جنگ میں پہنچے نہیں، ابھی راستے میں منازل قطع کر رہے ہیں، وہ کہتا ہے وہاں جا کے ہی نہیں شروع ہوتا، یہ تو گھر سے قدم انہوں نے نکالا اور ان کے نام پہ یہ کچھ ان کے رجسٹر میں یہ کریڈٹ آنا شروع ہو گیا۔ ہر وادی جسے یہ قطع کرتے ہیں کُتِبَ لَھُمْ (9:120) ان کے لیے یہ سب چیزیں لکھی جاتی ہیں تا کہ خدا ان کے اعمال کا بہترین اجر جو ہے وہ انہیں دے۔ آپ نے غور فرمایا جسے ہم عام اصطلاح میں نیکی کہتے ہیں وہ نیکی کیا ہے قرآن کے نزدیک؟ اور اسی کا تقابل اسی سورۃ میں۔ ایک تو یہ ہیں کہ ان کا ایک ایک قدم اٹھنا، جو ہے وہ قرآن کہتا ہے کہ وہ ایک حسنِ عمل ہے، عملِ صالح ہے جسے ہم لکھتے جاتے ہیں اور ان کا ایک قدم بھی ضائع نہیں کیا جاتا۔

قرآنِ حکیم کے ہاں مذہبی تصورات کے تحت کی گئی نیکیوں کا ذکر

اس کے مقابلے میں وہ نیکیاں جو ہم اپنے تصور کے مطابق نیکیاں گنتے ہیں۔ سبیلیں لگا دیں، نیاز بانٹ دی، مسجد میں قالین بچھوائے جا رہے ہیں، جھاڑ فانوس لٹکائے چلے جا رہے ہیں اور اپنے ذہن کے اندر خوش ہیں کہ یہ بڑی نیکیاں ہیں جو ہم کر رہے ہیں۔ کہتا ہے اَجَعَلْتُمْ سِقَایَۃَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَۃَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط (9:19) کہتا ہے کیا سمجھ رہے ہو تم؟ حاجیوں کے لیے سبیلیں لگا دینا، مساجد میں آرائش کے سامان بہم پہنچا دینا، تم سمجھتے ہو کہ یہ تمہاری نیکیاں اس کے برابر ہو جائیں گی جو اللہ اور رسول پر ایمان لانے کے بعد جٰھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط (9:19) اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے ایمان کے لیے نکل آیا کیا تم ان دونوں کو برابر درجے پہ رکھ رہے ہو؟ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ ط (9:19) تم اپنے ذہن میں جو جی آئے فیصلہ کرو خدا کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جو ایسا سمجھتا ہے اس نے ان چیزوں کو اپنے مقام پہ نہیں رکھا۔ اسی لیے وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (9:19) جو کسی شے کو اس کے مقام کے اوپر نہیں رکھتا اس کی کشاد کی راہ نہیں دکھائی دی جا سکتی۔ اپنے اپنے مقام پہ ان کو رکھو۔ اپنے ذہن میں یہ سمجھ لینا کہ یہ بہت بڑی نیکیاں جو ہم کر رہے ہیں ان کے مقابلے میں جو کفن بدوش میدانِ جنگ میں چلے جا رہے ہیں حق کی مدافعت کے لیے جان جیسی چیز عزیز ترین متاع کو لیے جا رہے ہیں، ان کے برابر سمجھ رہے ہو؟ تم اپنے ذہن میں جس طرح سے جی میں آئے سمجھو خدا کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ ھَاجَرُوْا وَ جٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ لا اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ ط وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ (9:20) جو اس کی راہ میں نکل پڑیں، ہر وہ شے جس کو چھوڑنے کی ضرورت پڑی اسے چھوڑ دیا، جہاد کے لیے اس

کے راستے میں آگے بڑھ گئے مال کا ہو یا جان کا ہو' ان کے درجات اللہ کے نزدیک بہت عظیم ہیں اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں کچھ حاصل کریں گے۔ ACHEIVEMENT جسے آپ کہتے ہیں انگریزی میں یہ کچھ حاصل کریں گے نجات کا سوال نہیں ہے POSITIVE چیز ہے' مثبت چیز ہے' یہ ہیں جو کچھ حاصل کریں گے۔ یُبَشِّرُهُمۡ رَبُّهُمۡ بِرَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَ رِضۡوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمۡ فِيۡهَا نَعِيۡمٌ مُّقِيۡمٌ . خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ (9:21-22) کیسے وجد آمیز انداز میں قرآن مجاہدین کے متعلق بات کرتا ہے؟ یہ وہ ہیں ان کا خدا ان کو خوش خبریاں دیتا ہے اس چیز کی اپنی طرف سے رحمت کی رضوان کی جنت کی جس میں نعیم مقیم ہیں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ان کو ان کے اندر ملتی ہیں' ہمیشہ اس کے اندر وہ رہیں گے' اللہ کے نزدیک ان کا اجر عظیم ہے۔ غور فرما رہے ہیں آپ کہ ان کے مقام قرآن کیا بتا رہا ہے؟ اور پھر اس نے دوٹوک فیصلہ کر دیا دو کیٹگریز اس نے کر دیں ایک وہ کہ جو اس مقصد کے لیے میدانِ جنگ میں جانے کے لیے جب بھی انہیں آواز دی جاتی ہے' مشتاقانہ اس کی طرف ان کا قدم اٹھ جاتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں دوسرے وہ ہیں جو بیٹھے رہتے ہیں۔

نیکیوں کی ہر دو قسموں کے لیے قرآنِ حکیم نے دو مختلف اصطلاحات بیان کی ہیں

قرآن نے دو اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ یہاں تو ان دونوں کے متعلق کہا تھا کہ اپنے ذہن میں جو سبیلیں لگانے والے' نیازیں بانٹنے والے' مساجد میں آرائش کا سامان پہنچانے والے' وہ ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ یہاں کہا کہ لَا يَسۡتَوِى الۡقٰعِدُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ غَيۡرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالۡمُجٰهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِيۡنَ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ عَلَى الۡقٰعِدِيۡنَ دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الۡحُسۡنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِيۡنَ عَلَى الۡقٰعِدِيۡنَ اَجۡرًا عَظِيۡمًا . دَرَجٰتٍ مِّنۡهُ وَمَغۡفِرَةً وَّرَحۡمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا (4:95-96) یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے بیٹھے رہنے والے اور جان ہتھیلیوں پر رکھ کر نکل پڑنے والے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ مجاہدین کو خدا نے قاعدین کے مقابلے میں بڑے درجات عطا کیے ہوئے ہیں۔ مذہب میں سب سے بڑی نیکی بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔ جو حضرت صاحب سب سے زیادہ بیٹھے رہیں' وہ سب سے زیادہ مقرب ہوتے ہیں۔ حجرے سے نکلے ہی نہیں' مصلے سے اٹھے ہی نہیں۔ یہ سب قاعدین کے اندر آتے ہیں قرآن کی رو سے۔ ان کے مقابلے میں قرآن نے مجاہدین کو کہا ہے ان کے مدارج بڑے بلند ہیں دَرَجٰتٍ مِّنۡهُ (4:96) اس کی طرف سے بڑے مدارج ان کو ملتے ہیں مغفرت' رحمت ہر ایک چیز جو خدا کی طرف سے انعام کے طور پہ' رحمت کے طور پہ' مغفرت کے طور پہ مل سکتی ہے' ہر ایک چیز ان کے لیے مختص کی جا رہی ہے۔ عزیزانِ من! بات بھی کچھ چھوٹی نہیں۔ طبعی زندگی کے ہر تقاضے کو

قربان کرتے ہوئے محض اقدار کی خاطر VALUES کی خاطر حق کی خاطر جان جیسی عزیز ترین متاع کو قربان کرنے کے لیے اٹھ کے نکلنے والا اس سے اگلا مقام کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

زندگی بھر کے لیے جماعتِ مؤمنین کا بنیادی شعار

اسی لیے قرآنِ کریم نے اسی سورۃ توبہ میں جس کی آیتیں میں نے پہلے پیش کی ہیں ایک آیت اس کی اور دیکھ لیجیے (9:24) یہ وہ آیۂ جلیلہ ہے کہ جسے جماعتِ مؤمنین کا شعار ہونا چاہیے' ہر وقت سامنے رکھنا چاہیے اسے۔ کہا کہ قُلْ ان سے کہہ دو اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ (9:24) ان سے کہہ دو اعلان کر دو کہ اگر تمہارے ماں باپ' تمہاری اولاد' تمہارے بہن بھائی' تمہاری بیویاں یا خاوند' تمہارے اہلِ خاندان' تمہاری مال و دولت کہ جس کو تم نے اس طرح سے اکٹھا کیا ہے' تمہاری وہ تجارت کہ جس کے مندا پڑ جانے سے ہر وقت تم خائف رہتے ہو' تمہارے بڑے بڑے محلات کہ جن کو تم بہت پسند کرتے ہو۔ عزیزانِ من! سن لیا اس لسٹ کو۔ پھر آگے کیا بات ہے؟ اگر ان میں سے کوئی چیز اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ (9:24) اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ عزیز ہوگئی فَتَرَبَّصُوْا (9:24) انتظار کرو حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط (9:24) تا آنکہ خدا کا فیصلہ تمہارے اوپر آجائے۔ عزیزانِ من! دیکھتے ہیں کیا کہا گیا ہے؟ اس لسٹ کے اندر قرآن نے دنیا کی کوئی جاذبِ نگاہ چیز چھوڑی نہیں۔ ان میں سے کوئی شے بھی اگر تمہارے نزدیک جہاد کے مقابلے میں زیادہ عزیز ہوگئی تو پھر اس کے بعد انتظار کرو تا آنکہ تمہارے پاس اس کا فیصلہ پھر آجائے۔ خدا کے فیصلے تو پھر آپ جانتے ہیں کیا ہوا کرتے ہیں۔ اور آگے ہے وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (9:24) اس کے ذہن میں ان سے کوئی شے بھی جہاد کے مقابلے میں زیادہ ہوگئی تو پھر وہ فاسقین میں سے ہے اور ان پہ تو کشادگی راہیں نہیں کھلا کرتیں۔ یہ ہے وہ جو انتظار کہتا ہے کہ تھوڑی دیر ٹھہرو ہمارا فیصلہ آجانے دو۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جن کے متعلق یہ کہا کہ تمہیں یہ نظر آتا ہے کہ انہیں موت آگئی۔ ٹھیک ہے حیوانی سطح یا طبعی سطح کے اوپر تم یہی کہو گے ڈاکٹر CERTIFICATE دیدے گا کہ DEATH واقع ہوگئی ہے طبعی سطح کے اوپر یہی ہوگا۔ لیکن انہوں نے ان اقدار کی مدافعت کے لیے اپنی سب سے زیادہ عزیز شے جو تھی' اس کے عوض میں انہوں نے ایک زندگی خریدی ہے۔ زندگی نام ہی اسی زندگی کا ہے مر کر زندگی خرید لینا۔ کس قدر حسین TERMS ہیں قرآن کی؟ تمہاری نگاہوں کے اندر یہ موت ہے درحقیقت یہی زندہ ہیں ان کے متعلق خیال تک بھی یہ نہ کرو کہ وہ مر گئے ہیں۔ قُتِلُوْا فِيْ

سَبِیۡلِ اللّٰهِ (3:169) پھر میں نے عرض کیا تھا کہ شرط یہ ہے اس میں کوئی اور مقصد سامنے نہ آ جائے مقصد صرف حق کی مدافعت ہو مستقل اقدارِ خداوندی کی مدافعت ہو۔ چھوٹے سے چھوٹے نقصان سے لے کر بڑے سے بڑے ایثار تک اس لسٹ کے اندر یہ چیز آ جائے گی۔ یہ لوگ ہیں درحقیقت جو کہا کہ زندہ ہیں۔

شہید کی اصطلاح کا قرآنی مفہوم اوراس کی وضاحت

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کہتا یہ ہے کہ ان کو مردہ خیال بھی نہ کرو۔ کیا یہ طبعی طور پر جو PHYSICAL LIFE ہے یا PHYSICAL DEATH ہے اس کے متعلق یہ ہے؟ یہاں سے خیال یہ آتا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ مر چکے ہوئے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتے ہیں، مردہ ہوتے نہیں ہیں۔ ان کے لیے ہمارے ہاں شہید کا لفظ ہے اصطلاح ہے۔ قرآن نے مقتولینِ فی سبیل اللہ ہی کہا ہے ان کے متعلق خدا کی راہ میں جان دینے والے۔ اور میں ابھی آگے جا کر عرض کروں گا کہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں جائیں تو سچ مچ ان کا سر کٹ جائے۔ ایک سپاہی جو میدانِ جنگ میں جاتا ہے وہ غازی اور منصور واپس آ جاتا ہے تو یہ نہیں کہ اس کا مرتبہ اس کے مقابلے میں جس کو وہاں گولی لگ جاتی ہے اور وہ وہاں مر جاتا ہے، اس کے مقابلے میں اس کا درجہ کچھ کم ہوتا ہے۔ قرآن نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تو ہمارے سامنے نظر آ رہا ہے DEATH ان کی واقع ہو گئی، موت تو ہو گئی۔ یہ جو کہا ہے انہیں مردہ سمجھو نہیں اور پہلے (2:154) میں کہا تھا کہ انہیں مردہ کہو نہیں، کہو نہیں یا سمجھو نہیں۔ تو یہ موت یہ نہیں ہے یہ جو PHYSICAL DEATH ہے یہ ان کے اوپر وارد نہیں ہوئی، جہاں تک طبعی موت کا تعلق ہے وہ تو قرآنِ کریم نے کہہ دیا ہے کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ (3:185) ہر ذی حیات کو موت آئے گی۔ حتیٰ کہ یہ تو وہ موت ہے کہ جس میں نبی کی بھی استثنا نہیں ہوتی۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمۡ مَّيِّتُوۡنَ (39:30) رسول کی بھی استثنا نہیں ہے۔ انہوں نے بھی مرنا ہے اے رسول تم نے بھی مرنا ہے۔ تو جہاں تک اس موت کا تعلق ہے یہ تو نہیں کہا گیا یہاں نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ان پہ طبعی موت (PHYSICAL DEATH) وارد نہیں ہوئی جو خدا کی راہ میں جان دینے والے ہیں۔ وہاں تو استثنا کسی کی نہیں ہے ہر ذی حیات نے مرنا ہے حتیٰ کہ رسول کی بھی استثنا نہیں۔ یہ تو ہوئی موت کی بات۔ اب یہ ان کے لیے کہا ہے بَلۡ اَحۡيَآءٌ (2:154) کہ وہ تو زندہ ہیں۔

قرآنِ حکیم نے مرنے کے بعد کی زندگی کو دو کیٹگر یز میں تقسیم کیا ہے

مرنے کے بعد زندگی جو ہے وہ بھی قرآن نے کہا ہے کہ وہ ہر ایک کے لیے ہے۔ جہاں ہر ایک کے لیے موت کہا ہے وہاں یہ بھی چیز کہی ہے (2:28) ہی دیکھ لیجیے بہت سی آیات ہیں اس کے لیے۔ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا (2:28) تم خدا کی خدائی کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ تم اس حالت میں تھے کہ جہاں زندگی تمہیں نصیب نہیں تھی پھر اس نے تمہیں زندگی عطا کی ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ (2:28) پھر وہ تمہیں مارے گا ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ (2:28) پھر تمہیں زندگی عطا کرے گا ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ (2:28) اس کی طرف لوٹو گے۔ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ (2:28) یہ ہر ایک کے لیے یہ کہا گیا ہے لہٰذا یہ چیز کہ یہ جو مقتولین فی سبیل اللہ ہیں انہیں زندگی عطا ہوئی ہے' یہ زندگی تو قرآن کہتا ہے ہر ایک کو عطا ہوتی ہے۔ پھر یہ خصوصیت کیا ہے؟ عزیزانِ من! وہی خصوصیت جس کے متعلق میں نے کہا ہے کہ قرآن کی رو سے زندگی اور موت کی DEFINITION ہماری DEFINITION سے مختلف ہے۔ مرنے کے بعد میں نے عرض کیا ہے ابھی ابھی قرآن کی رو سے ہر ایک کے لیے زندگی کہا ہے۔ لیکن وہاں دو کیٹگر یز ہیں دو شقیں سامنے ہمارے آتی ہیں وہاں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک گروہ ہے فَاِنَّ لَہٗ جَہَنَّمَ ؕ ان کے لیے جہنم ہے اور اس میں کہا یہ ہے لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَ لَا یَحۡیٰی (20:74) وہ اس میں نہ مردہ ہوں گے نہ زندہ ہوں گے وہ' موت بھی نہیں آئے گی عذاب ایسا ہے۔ موت سے تو عذاب کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو اس کا تو خاتمہ نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے تو موت نہیں آئے گی۔ تو جب موت نہیں آئے گی تو ہم کہیں گے نا زندہ ہے وہ کہتا ہے وَ لَا یَحۡیٰی (20:74) زندہ نہیں ہیں۔ اب یہ دیکھیے فرق آ گیا ہمارے سامنے زندگی اور زندگی کا فرق جو ہے۔ بلکہ ان کے متعلق جہاں تک زندہ رہنے کا تعلق ہے یہاں یہ کہا تھا کہ اس میں نہ وہ زندہ ہیں نہ وہ مردہ ہیں یہاں کہا ہے یَاۡتِیۡہِ الۡمَوۡتُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ وَّ مَا ہُوَ بِمَیِّتٍ (14:17) کیفیت یہ ہوگی کہ ہر طرف سے موت آتی دکھائی دے گی انہیں لیکن مریں گے نہیں۔ توبہ توبہ توبہ۔ عزیزانِ من! اس سے بڑا جہنم کیا ہو سکتا ہے؟ کہ جہاں کھڑا ہوا انسان ہر طرف سے اسے موت آتی دکھائی دے اور مرے نہیں وہ۔ یہ عذاب تو سخت تریں اذیت کا عذاب ہوتا ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

مرنے کے بعد تو اذیت ختم ہو جاتی ہے پھر۔ عذابِ مقیم تو یہ ہے کیا الفاظ ہیں قرآن کے؟ پھر دہراؤں یَاۡتِیۡہِ الۡمَوۡتُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ وَّ مَا ہُوَ بِمَیِّتٍ ؕ (14:17) ہر گوشے سے موت چلی آ رہی ہے نظر آ رہی ہے مرا صاحب مرا صاحب وَمَا ہُوَ

بِـمَيِّتٍ ط(14:17) مرے گا بھی نہیں۔تو زندہ تو یہ ہے لیکن وہ قرآن کہتا ہے کہ وہ زندہ بھی نہیں ہیں تو آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے موت اور زندگی میں خود کتنا فرق پیدا کر دیا ہے۔ایک زندگی یہ ہے اور ایک زندگی ہے وَ لَا تَـحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ط (3:169) جو اللہ کی راہ میں اس طرح سے جان دے دیتا ہے اسے مردہ مت تصور کرو۔

موت کے بعد کی زندگی یہاں کی زندگی سے مختلف ہوگی اور وہاں کی جنت بھی کوئی آخری مقام نہیں ہوگا

عزیزانِ من! آگے ہے بات۔یہاں تو وہ مر گیا ہے نظر آ رہا ہے کہتا ہے بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (3:169) وہ اپنے خدا کے ہاں زندہ ہیں۔پھر وہ زندگی ان کی جہنم والوں کی زندگی نہیں ہے کہ ہر طرف سے موت نظر آتی ہے' آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے' مرتے نہیں ہیں۔ایک تو یہ بات یاد رکھیے بَلْ اَحْيَـآءٌ عِـنْدَ رَبِّهِمْ (3:169) ان کی جو زندگی ہے وہاں کی زندگی ہے' یہاں کی زندگی نہیں ہے۔یہ تصور غلط ہے کہ شہید یہیں ہمارے ہاں زندہ رہتے ہیں' ہر جگہ موجود ہوتے ہیں' ہر ایک کی مدد کو پہنچتے ہیں' یہ ساری چیز قرآن کے خلاف ہے۔ بَلْ اَحْيَـآءٌ عِـنْدَ رَبِّهِمْ (3:169) پھر زندہ ہی نہیں ہیں یہ جہاں وہ پہنچے ہیں وہ زندگی کے ارتقا میں EVOLUTION میں آخری منزل نہیں ہے کہ وہاں پھر مزید آگے بڑھنے کی گنجائش نہ ہو۔یہ تو میں پہلے بھی کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں۔جنت کی تفاصیل میں ہم آئیں گے تو وہاں پھر ہم دیکھیں گے کہ جنت بھی آخری مقام نہیں ہے' آگے بڑھنے کے لیے ایک منزل ہے۔اسی لیے کہا يُرْزَقُوْنَ (3:169) وہاں بھی ان کو سامانِ زیست ملے گا سامانِ نشو ونما وہاں بھی ان کو ملے گا۔ فَرِحِيْنَ بِـمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ لا (3:170) وہ خوش ہوتے ہیں وہاں جو کچھ بھی اللہ انہیں اپنے فضل سے عطا کر رہا ہوتا ہے' اس سے خوش ہوتے ہیں۔عزیزانِ من! آگے ہے بہت بڑی چیز۔یہاں تک تو یہ نظر آتا ہے نا کہ وہ انہوں نے یہ جان جیسی چیز دی' انہیں خدا کے ہاں سے یہ کچھ ملا وہ بہت خوش ہیں اس سے۔اس میں بھی کچھ بلند غرض ہی سہی اپنی غرض جسے ہم کہتے ہیں' کچھ وہی پائی گئی' انہیں ملا اور وہ خوش ہو گئے۔عزیزانِ من! سنیے قرآن ہے۔اور یہ ہیں وہ لوگ جن کا مقام یہ ہے وَ يَسْتَبْشِـرُوْنَ بِـالَّـذِيْنَ لَمْ يَلْـحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ لا اَلَّا خَـوْفٌ عَـلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (3:170) وہ خوش ہیں اس بات سے يَسْتَبْشِرُوْنَ (3:170) ہیں بہت زیادہ وہ خوش ہیں' اس بات سے خوش ہیں کہ ان کی جان دینے سے وہ لوگ جو ان کے پیچھے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کو کسی قسم کا خوف باقی نہیں رہا۔تم جیو ہم تمہاری خاطر اپنی جان دیتے ہیں۔

اقدار (Values) کی محافظت کا احساس اپنے اندر ایک عجیب لطف لیے ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ ہے VALUE کی محافظت۔یعنی وہاں یہ بھی تصور نہیں کہ اس جان دینے سے ہم جنت میں پہنچتے ہیں۔ کہتا ہے وہ بھی بڑی چیز ہے ان کے لیے لیکن یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (3:170) جن چیزوں سے فی الحقیقت یہ خوش خبریاں اپنے لیے لیتے ہیں بڑے خوش ہیں وہ اس احساس سے ہیں ان لوگوں کے متعلق جو ان سے ابھی آ کے نہیں ملے' جو پیچھے ہیں ابھی ان کے متعلق جب یہ دیکھتے ہیں کہ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (3:170) ہم نے اپنی جانیں دے کے ان کے لیے یہ کیفیت پیدا کر دی کہ ان کو کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہے کہتا ہے کہ وہ اس چیز سے خوش ہوتے ہیں۔

اقبالؒ کے الفاظ میں مردِ مومن حصولِ جنت کی سوداگری کے تصور سے ماورا ہوتا ہے

اسے کہتے ہیں VALUE کی مدافعت۔صرف اپنے لیے جنت کا تصور بھی جو ہے' وہ اقبالؒ کے الفاظ میں سوداگری ہے۔ وہ اس سے بھی اونچے ہوتے ہیں خوش یہ ہوتے ہیں کہ ہمارے خون کی قیمت ان لوگوں نے وصول کی ہے اور اس طرح وصول کی ہے کہ انہیں اب کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ یہ چیز تھی نا کہ اس کے بعد اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (3:170) کون تھے یہ؟ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِھِمۡ (3:170) جو ان کے ساتھ ملے نہیں تھے ابھی جا کے' جو پیچھے رہے ہوئے تھے یہ جو ہم تھے وہ کہتا ہے کہ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے خون کا صدقہ یہ ہوا کہ ان پہ خوف وحزن نہیں ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں ان سے۔ یہ ہیں فی سبیل اللہ موت۔ کیا بات ہے قرآن کی؟ مذہب کی دنیا والا منتہا یہی قرار دیتا کہ انہیں جنت مل گئی وہ خوش ہو گئے اس سے۔ یہی ان کو چاہیے تھا' یہ مقصد حاصل ہو گیا۔عزیزانِ من! قرآن ہے وہ اتنی سی بات پہ خوش نہیں ہوتے کہ ہمیں جنت مل گئی وہ خوش ہیں اس بات سے کہ ہم نے جان دی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جو پیچھے رہ گئے ہیں ان پہ کسی قسم کا خوف وحزن باقی نہ رہا۔ دوسروں کے خوف اور حزن کو مٹانے کے لیے اپنی جان دے دینا' اس سے بڑا مقام اور کس کا ہو سکتا ہے دنیا کے اندر۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک میدانِ جنگ میں مجاہدین کے مقام کی وضاحت

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے صرف یہی نہیں کہا کہ جو وہاں جان دے دیتے ہیں۔قرآن ہے۔ ورنہ ہمارے ہاں تو عام طور پہ اتنا ہی کہتے ہیں نا کہ وہ جو جان دینے والے ہیں مقتولینِ فی سبیل اللہ' شہدآء جو ہیں ان کا یہ مقام ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو سپاہی میدانِ جنگ کے اندر جاتے ہیں اسی مقصد کے لیے جاتے ہیں کہ وہ اگر فاتح اور منصور ہیں وہاں وہ کامیاب لوٹتے

ہیں‘ ان میں سے کچھ بھائی وہاں میدانِ جنگ میں اپنی جان دے دیتے ہیں‘ باقی فاتح ومنصور لوٹتے ہیں تو کیا ان کا مقام ان سے کم ہوگا؟ **وَ لَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَوۡ مُتُّمۡ لَمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَحۡمَۃٌ** (3:157) وہاں میدانِ جنگ میں جان دے دی یا زندہ بچ آئے اس کے بعد طبعی موت پھر مر گئے‘ کچھ فرق نہیں پڑتا اس سے‘ وہ تو اپنی متاع لے کے چلے گئے تھے دینے کے لیے‘ ضرورت پڑی ہے جان کی جان دے دی ہے۔ ابھی ضرورت نہیں پڑی ہے‘ لے کے واپس آ گئے ہیں۔ لیکن جان امانت ہے ان کے پاس۔ اس نے کہا تھا لے آؤ یہ لے گئے‘ آواز پڑی تھی حاضر ہو گئے۔ کس حسین انداز میں یہ شخص کہہ گیا ہے اس کو بات کہنی آتی تھی۔ عزیزانِ من! بات تو غزل کی ہے لیکن بڑی اونچی بات ہے۔

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو

آواز پڑی ہے کہ کون ہیں جان دینے والے؟ تم بھی حسرت اٹھو انہیں سلام کرو۔ یہ ہیں وہ لوگ **اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ** ج (8:24) جب آواز پڑتی ہے ان کو لبیک کہتے ہوئے چلے جاتے ہیں پروانہ وار‘ سلام کرتے ہیں حاضر ہیں سرکار۔ ٹھیک ہے جان حاضر ہے۔ ضرورت پڑی ہے وہیں میدانِ جنگ میں دے دی۔ سرِ دست ضرورت نہیں پڑی امانت لے کے پھر واپس آ گئے۔ اس لیے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے خواہ انہوں نے جان دے دی خواہ واپس آ گئے ان کے مقام برابر ہیں۔

شہادت کے مقام تک پہنچنے والوں کی زندگی تو ایک نیا روپ اختیار کیے ہوئے ہوتی ہے

لیکن میں یہ عرض کر دوں کہ وہ جو تصور ہے نا کہ وہ یہاں زندہ ہیں ہر وقت ہم میں موجود ہوتے ہیں‘ ہماری بات سنتے ہیں‘ ہماری مدد کو پہنچتے ہیں‘ یہ قرآن کی رو سے غلط ہے۔ قرآنِ کریم اس باب میں بالکل واضح ہے۔ ایک ہی آیت اس کے متعلق سرِ دست پیش کروں گا بہت سی آیات اس کے متعلق ہیں کہ جو یہاں سے چلا گیا **اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡا دُعَآءَکُمۡ** ج (35:14) مردے جو ہیں انہیں اگر تم آواز بھی دو تو وہ تمہاری دعا کو نہیں سن سکتے۔ **وَ لَوۡ سَمِعُوۡا مَا اسۡتَجَابُوۡا لَکُمۡ** ط (35:14) اور اگر وہ سن بھی پاتے تو تمہاری دعا کا جواب نہیں دے سکتے۔ بات صاف ہو گئی۔ سوال ہی نہیں ہے یہ جو مردوں کے متعلق یہ تصور کرنا ہر وقت وہ حاضر اور ناظر ہیں‘ ہماری دعاؤں کو سنتے ہیں‘ ہماری مرادیں پوری کرتے ہیں‘ جواب دیتے ہیں ان چیزوں کا‘ قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے۔ یہاں سے جو طبعی موت کی رو سے چلا گیا یہاں سے اس کا اس زندگی والوں سے ہمارے ساتھ تعلق کوئی نہیں

رہتا۔ وہ الگ اس کی دنیا ہے، ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اور جہاں تک کسی کے کام آنے کا تعلق ہے وہ تو قرآن صاف کہتا ہے کہ وہاں تو ہر شخص کے اپنے اعمال جو ہیں، ان ہی کو وہ لے کے جاتا ہے، ان ہی کی رو سے فیصلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ جو تصور ہمارے ہاں ہے قرآنِ کریم نے اس تصور کی بھی نفی کر دی ہے۔ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (3:169) وہاں ہے ان کی زندگی۔ البتہ یہ جو ان کا احساس ہے کہ ہماری جان دینے سے ہمارے جو پیچھے رہنے والے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (9:119) والے تھے ان پہ خوف و حزن نہیں رہا بہت خوش ہوتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لا وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ (3:171) خوش ہوتے ہیں ان نعمتوں سے جو خدا نے ان کو دی ہیں خدا نے جو فضل ان پہ کیا۔ اللہ مؤمنین کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا۔ انہیں مومن قرار دیا ہے قرآن نے۔ کون لوگ؟

قرآنِ حکیم کے مطابق مومن کی شناخت ہر آن زندگی کے حصول میں مصروفِ کار رہنا ہے

عزیزانِ من! مومن کی DEFINITION سن لیجیے اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (3:172) مومن وہ ہیں میدان میں گئے وہاں سخت نقصان اٹھایا، کچھ تھے جنہوں نے جانیں دے دیں، کچھ تھے جن کو زخم آئے، مشقتیں اٹھایں، مصائب کا سامنا کیا، زندہ ہیں ابھی لوٹ آئے، پھر آواز پڑی پھر لبیک کہا۔ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (3:171)۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا آپ کو کہ قرآن کے نزدیک زندگی اور موت کی DEFINITION مختلف ہے۔ یہاں اسْتَجَابُوْا (3:171) ہے لبیک کہنا وہ جو میں نے ابھی کہا تھا اس انداز میں "تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو"۔ قرآن نے کہا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ج (8:24) اے ایمان والو! جب تمہاری طرف بلاوا آئے خدا اور رسول کا، وہ تمہیں بلائے کس چیز کی طرف؟ اس شے کی طرف جو تمہیں زندگی عطا کرنے والی ہے۔ یعنی یہ زندہ ہی تو ہیں جن سے کہا جاتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (8:24) قبرستان میں جا کے تو نہیں کہا جا رہا، زندہ انسانوں کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ عزیزانِ من! دیکھیے کتنا باریک فرق ہے قرآن جو کر جاتا ہے۔ اے وہ جو ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو جب تمہیں بلاوا آئے اس کا، میدانِ جنگ کا، لبیک کہتے ہوئے اٹھ کے چلے جایا کرو کس چیز کی طرف؟ اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی عطا کرنے والی ہے۔ او زندہ انسانو! او سانس لینے والے انسانو! اٹھو آواز پڑی ہے جاؤ اس آواز پہ لبیک کہو جو تمہیں حقیقی زندگی عطا کر دے گی۔ یوں کہو اے طبعی زندگی پر سانس لینے والے انسانو! اٹھو اس زندگی کی طرف جاؤ کہ جس میں پھر موت نہیں ہے۔ عزیزانِ من! اس زندگی کے بعد موت نہیں ہے لِمَا يُحْيِيْكُمْ ج (8:24)۔ مومن وہ ہیں کہ مصیبتیں بھی برداشت کیں، مصائب بھی جھیلے ہیں،

تکلیفیں بھی اٹھائی ہیں' شکست بھی وہاں ہوئی ہے' زخم بھی آئے ہیں۔ اس کے بعد ہمت ہاری نہیں ہے اس کے بعد پھر آواز پڑی پھر لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے اس طرف چلے گئے۔ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْھُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ج (3:172) جی ہاں! یہی لوگ ہیں جنہوں نے اس حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی قوانینِ خداوندی کی یوں نگہداشت کی' ان کے لیے اجرِ عظیم ہے۔ اور سنیے ان کی صفات ان کی خصوصیات۔ اَلَّذِیْنَ (3:172) میں پھر دہرادوں کہ یہ مؤمنین الذین کہا ہوا ہے مومن جن کی یہ کیفیت ہے یہ مومنین کی صفات ہیں کہ جب بھی آواز پڑتی ہے اس کے لیے لبیک کہتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ پھر؟ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ (3:173) یہ وہ لوگ ہیں کہ آواز پڑی مخالفین نے دشمنوں نے ان کا راستہ روکنے والوں نے' جاذبیتوں نے' کششوں نے گھربار والوں نے' اولاد نے' اہلِ خاندان نے' بیویوں نے' مردوں نے' (وہ سب قرآن نے لسٹ گنائی تھی) ان کو بددل کرنے کے لیے کہا کہ صاحب تمہیں ہم روکتے نہیں ہیں لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ مقابلے میں دشمن نے بڑا لشکرِ جرار تمہارے لیے اکٹھا کرلیا ہے' بہت بڑے لشکر سے آرہا ہے۔ سترہ ڈویژن ہے انڈیا کے پاس جس سے وہ حملہ آور ہو رہا ہے۔ دل دہل جاتا ہے۔ کس کا دل دہل جاتا ہے؟ جو اس زندگی کو عزیز رکھتا ہے۔ کہا ہے یہ لوگ وہ ہیں (مومن کی DEFINITION ہو رہی ہے) کہ جب یہ اٹھے اور لوگوں نے ان سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے؟ کہ دشمن نے کتنا بھاری لشکر تمہارے لیے تیار کیا ہے فَاخْشَوْھُمْ (3:173) ڈرو اس سے۔ ان کا ری ایکشن کیا تھا؟ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا (3:173) اس خبر سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ اس لیے کہ یہاں تو جتنی زیادہ سختی سے تصادم ہوتا ہے' اتنی ہی رفتارِ نہر کی اور زیادہ تیز ہوتی ہے۔ فال جو ہے اس کے سامنے بڑے سخت پتھر رکھے جاتے ہیں جتنی بلندی سے پانی گرے گا اور جتنی سختی سے ٹکرائے گا' اتنی ہی اس کی رفتار میں تیزی آجائے گی۔ انہوں نے کہا کہ بڑی سختی کا مقابلہ ہے انہوں نے کہا اللہ اکبر! اس سے زیادہ خوش کن مقام کیا ہے ہماری رفتار بجلیوں جیسی اس سے ہوجائے گی۔ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ (3:173) کوئی بات نہیں! انہوں نے اگر اتنا سامان اکٹھا کرلیا ہے اتنی تعداد زیادہ ہے ان کے لشکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم جن قوانین کے اوپر چل رہے ہیں خدا کے قوانین کے اوپر اگر ان کے مطابق ہمارے قدم اٹھے تو تم دیکھیے گا وہ کافی ہوجائے گا ہمارے لیے بہترین وکیل۔ وکیل کہتے ہیں جس پہ بھروسہ کیا جائے۔ جس بات پہ ہمیں بھروسہ ہے بہت بڑی چیز ہے۔ مومن خدا کے ان قوانین پہ بھروسہ کرتا ہے اور خدا اپنے حق کے پرچم کو بلند کرنے کے لیے مؤمنین پر بھروسہ کرتا ہے۔

اللہ کو پامردئ مومن پہ بھروسہ

مکہ کے مظلوم مسلمانوں کی اہلِ مدینہ سے پکار اور خدا کی طرف سے اس کا حل

یہ بات شاعری کی نہیں کہہ گیا' بڑی اونچی کہہ گیا ہے۔قرآنِ کریم میں یہ ہے۔ یہ جو مدینے میں چلے گئے اور وہاں جا کے انہوں نے اپنی تقویت کا سامان بہم پہنچایا' حفاظت بھی اپنی کی' مملکت بھی قائم کی۔ مکے میں جو رہ گئے تھے پیچھے وہ ابھی مظلوم تھے ان پہ طرح طرح کے ستم ہوتے تھے' ظلم ہوتے تھے۔قرآن میں یہ ہے ان سے کہا گیا ہے مدینے والوں سے تم تو بالکل محفوظ ہو گئے' ہو اطمینان سے بیٹھ گئے' تم سنتے نہیں ہو کہ وہ مکے کے مظلوم بچے بوڑھے عورتیں جن کے اوپر اس قدر ان کی ایذائیں پہنچائی جا رہی ہیں' آگے وہ ہے کہ وہ ہمیں پکارتے ہیں کہ یا اللہ ہماری کچھ مدد کر۔ خدا ان سے کہتا ہے او تم سنتے نہیں ہو وہ ہمیں پکار رہے ہیں تم چپکے بیٹھے ہوئے ہو۔ وہ ہمیں پکار رہے ہیں تم چپکے بیٹھے ہوئے ہو۔ کیا بات ہے؟

اللہ کو پامردئ مومن پہ بھروسہ

یہ اگر نہیں اٹھیں گے' ان کے مظالم ختم نہیں ہو سکتے۔ یہ تو اس کا انتظام ہی عجیب ہے۔ ختم کرنے کو تو وہ قادرِ مطلق ایسا ہے ایک اشارے سے وہ یوں کر دے تو یہ پوری کی پوری دھرتی یہ ساری کائنات پلٹ جائے۔ کرتا نہیں ہے اس طرح سے۔ اسی لیے اس نے کہا ہے سورۃ حج میں کہ اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ انسانوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں سے دوسری جماعت کی روک تھام کا انتظام اگر نہ کرے' دنیا کے اندر کوئی معبد باقی نہ رہے۔ انسانوں کی ایک جماعت کے ہاتھ سے دوسروں کا تحفظ۔ یہی وجہ ہے میدانِ بدر میں قرآن نے یہ کہا تھا کہ یہ لوگ جو تلواریں چلا رہے تھے' ہاتھ ان کے تھے حقیقت میں تلواریں خدا کہہ رہا ہے ہماری تھیں' کمانیں ان کی تھیں' تیر ہمارے تھے۔ وہ تو یوں یارانہ بنا لیتا ہے ان کے ساتھ۔ خدا کے پروگرام اس دنیا کے اندر CARRY OUT ہوتے ہیں جماعتِ مؤمنین کے ہاتھوں سے۔ اس لیے یہ ایک عجیب چیز ہے وہ کمان کی سی' ایک سرکل سا ہے کہ مومن خدا کے قوانین کے اوپر بھروسہ کر کے اٹھتے ہیں خدا اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے مؤمنین پر بھروسہ کرتا ہے۔ وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضۡلٍ لَّمۡ یَمۡسَسۡہُمۡ سُوۡٓءٌ (3:173-174) یہ اس طرح سے جو بڑھے ہیں جھولیاں بھر بھر کے خدا کے انعامات کی اور فضل کی لے کر لوٹے ہیں' کوئی نقصان انہیں نہیں پہنچا۔ پہنچا کیوں نہیں؟

مومن کے ہاں فائدے اور نقصان کا معیار ہی دوسرا ہوتا ہے

میدانِ جنگ میں آ کے انہوں نے گنا تو ان میں سے اتنی گنتی کم ہو گئی بہت ہیں جو زخمی ہو گئے یہ تو ہے نا۔ لیکن اس کے نزدیک

تو فائدے اور نقصان کے بھی معیار مختلف ہیں۔ یہ سارے نقصانات طبعی زندگی کے ہوئے ہیں ان کی انسانی زندگی کو جو مفاد پہنچے ہیں وہ اس کے مقابلے میں کہیں آگے بڑھ گئے۔ **وَّ اتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰہِ** ؕ (3:174) اس لیے کہ یہ ہم آہنگ ہوگئے تھے خدا کے پروگرام سے، خدا کے قوانین کے ساتھ۔ **وَ اللّٰہُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِیۡمٍ** (3:174) بہت بڑے فضل والا ہے وہ۔ **اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیۡطٰنُ یُخَوِّفُ اَوۡلِیَآءَہٗ** ۪ (3:175) کہتا ہے ایسے وقت میں جنہوں نے آ کے کہا تھا کہ بڑا لشکرِ عظیم ہے ڈر جاؤ اس سے، سترہ ڈویژن ہیں ان کے۔ کہا یہ پتہ ہے کون ہیں؟ یہ شیطان ہے اپنے حوالیوں موالیوں سے تمہیں ڈرا رہا ہے۔ یہ کیا ہے شیطان؟ وہ دلوں کے اندر وسوسے ڈالنے والے خیالات جو پیدا کرنے والے ہیں یہ WHISPRING COMPAIGN کرنے والے جتنے بھی ہیں، یہ ہیں شیاطین، یہ ہیں دلوں کو کمزور کرنے والے۔ یہ ڈراتے ہیں تمہیں اپنے آپ سے نہیں خود تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہیں وہ جو اپنے ساتھی ہیں نا، دوسروں کی سازش کے اوپر، دوسروں کی شہ کے اوپر جو کچھ یہ کر رہے ہیں، ان سے ڈراتے رہتے ہیں کہ ہاں وہ انڈیا والے پوچھو نہیں بڑا اسامان ان کے پاس ہے اب کے تو پوچھو نہیں ان کی تیاریاں کس طرح ہو رہی ہیں۔ یہ خود نہیں کہتے کہ ہم کچھ ہیں یہ نہیں۔ **ذٰلِکُمُ الشَّیۡطٰنُ یُخَوِّفُ اَوۡلِیَآءَہٗ** ۪ (3:175) یعنی اپنے متعلق نہیں کہتا کہ مجھ سے ڈرو، وہ بہت طاقت ور ہے۔ **فَلَا تَخَافُوۡہُمۡ وَ خَافُوۡنِ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ** (3:175) مومن ہو، ان سے مت ڈرو، ڈرو اس بات سے کہ میرے قانون کی خلاف ورزی تم سے نہ کہیں ہو جائے، اس سے خوف کھاؤ۔ **وَ لَا یَحۡزُنۡکَ الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡکُفۡرِ ۚ اِنَّہُمۡ لَنۡ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیۡئًا** ؕ **یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَلَّا یَجۡعَلَ لَہُمۡ حَظًّا فِی الۡاٰخِرَۃِ** ۚ **وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ** (3:176) یہ لوگ جو اس طرح سے دوڑ دوڑ کر بھاگ بھاگ کر کفر کی آغوش میں جا رہے ہیں ان کی وجہ سے تمہیں افسردہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ خدا دارم چہ غم دارم۔ وہ خدا کے پروگرام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے یاد رکھو۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں یہ ٹھیک ہے ان کو کچھ دنیاوی مفاد حاصل ہو جائیں گے لیکن یہ مفاد حیوانی سطحِ زندگی کے مفاد ہیں۔

حیات الدنیا اور حیات الآخرت کا بنیادی مفہوم

عزیزانِ من! یاد رکھیے قرآن جب حیات الدنیا حیات الآخرت کہتا ہے، اس کے معنی یہی دو TERMS ہوتی ہیں جو میں نے ابھی عرض کی ہیں حیوانی سطحِ زندگی، انسانی سطحِ زندگی۔ جسے وہ مستقبل کہتا ہے اسے وہ قریبی پڑے ہوئے، پاؤں میں پڑے ہوئے مفاد کہتا ہے۔ پیش پا افتادہ مفاد کہتا ہے، عاجلہ مفاد کہتا ہے۔ سن رکھیے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ جو طبعی زندگی ہے اس کے مفاد اس کی آسائشوں کا خیال نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ نہایت ضروری ہے اگر آپ اپنی توپ اور بارود کا خیال نہیں رکھیں گے تو آپ قدرکی

مدافعت کیسے کرسکیں گے۔اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ اپنی سرحدوں کو بڑا مضبوط رکھو وہاں گھوڑے باندھ کر رسالے باندھ کر رکھو بڑا ضروری ہے اس کے لیے۔اسی لیے اس نے اقدار جب نازل کی ہے **وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ** (57:25) اس کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف بھی اس نے نازل کی ہے۔تو یہ طبعی زندگی اس کی ضروریات' اس کے تقاضے' ان کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔ریل یا ٹرین مقصود بالذات نہیں ہے لیکن یہ تو یاد ہے آپ کو کہ اگر وہ ریلوے ٹرین جو ہے اس میں نقص ہوں تو اس کے اندر جو آپ سفر کریں گے تو آپ منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔وہ گاڑی ہی نہیں ٹوٹے گی آپ بھی ساتھ اس کے ختم ہو جائیں گے۔اس لیے جس گاڑی میں آپ سفر کر رہے ہیں اس کا MOST EFFICIENT ہونا نہایت ضروری ہے۔اسی لیے قرآنِ کریم نے حضرتِ طالوت کے متعلق جب کہا تھا کہ ہم نے ان کا انتخاب کمانڈر کی حیثیت سے کیا۔اور پوچھا گیا کہ صاحب! کیا آپ نے انتخاب کیا ہے اس کے پاس تو کچھ دولت وولت ہے نہیں کچھ بڑا آدمی نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس کا انتخاب اس لیے کیا ہے **وَ زَادَهٗ بَسۡطَةً فِى الۡعِلۡمِ وَ الۡجِسۡمِ** ط (2:247) کہ یہ جسمانی طور پہ بھی بڑی قوت رکھتا ہے اور اس کو فوج کے رموز کا علم بھی حاصل ہے۔

انسانی خودی' اس کی ذات یا اس کے نفس کی بالیدگی کے لیے صرف (Value) کا تحفظ ہی ایک زادِ راہ ہے

یہ جسمانی قوت' مادی ضروریاتِ زندگی' ساز وسامانِ حیات' جتنے بھی اس مقصد کے لیے آپ کو درکار ہیں' ان سب کا پورا کرنا بڑا ضروری ہے۔لیکن مقصد یہ نہیں ہیں وہ' یہ مقصد بلند ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے یہ ذرائع ہیں اور مقصد ہے VALUES کا تحفظ۔اگر یہ سب کچھ حاصل ہے اور آپ کے ہاں کی VALUE کہیں ٹوٹ گئی ہے تو یاد رکھیے! یہ خسرانِ عظیم ہے۔اور اگر آپ نے VALUE کا تحفظ کیا ہے اور ان میں سے ہر شے قربان ہوگئی ہے یہ ہے سب سے بڑا سودا جو آپ نے کیا ہے' یہ ہے آپ کے لیے عظیم تریں فائدہ جسے آپ کہیں گے۔عزیزانِ من! قرآن کی رو سے اگر آپ معیار دیکھ لیں زندگی اور موت کے معیار' مفاد اور نقصان کے معیار تو آپ دیکھیں گے' بات بڑی صاف ہوتی چلی جائے گی۔وہ جو قرآن نے کہا ہے **عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ لَا يَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَيۡتُمۡ** ط (5:105) بڑی عظیم چیز ہے تم یہ خیال رکھو کہ تمہاری اپنی ذات جو ہے اس کو تو نقصان نہیں پہنچ رہا۔اور انسانی ذات کو نقصان پہنچتا ہے قدر یا VALUE کو جہاں نقصان پہنچتا ہے۔

انسان کے لیے سب سے اہم سوال اس ' میں' کی قدر و قیمت کا ہے جو اس حیوانِ ناطق کے اندر بولتی ہے

عزیزانِ من! انسانی ذات خودی یا PERSONALITY کی صرف حفاظت اقدار کی حفاظت سے ہوتی ہے۔ جتنا کوئی شخص اقدار کی VALUES کی حفاظت کرتا ہے' اتنا اس کی ذات کی حفاظت اور نشو و نما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں کسی قدر کو ضعف پہنچتا ہے' اس کی ذات جو ہے اس کو ضعف پہنچ جاتا ہے۔ کہا کہ تم نگہ داشت کرو اپنی ذات کی' پھر اگر تم اس طرح سے صحیح راستے پہ ہو تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ تمہاری چیزوں کو تو نقصان پہنچ جائے گا' تمہیں نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور یہ بڑا ہی باریک فرق ہے جو قرآن نے کیا ہے تم میں اور تمہاری چیزوں میں۔ جسے تم اپنی چیزیں کہتے ہو ان کا تعلق حیوانی سطحِ زندگی' طبعی سطحِ زندگی سے ہے۔ میری دولت' میرا مکان' میرا جسم' میری اولاد' میری آسائش' میرا آرام' میرا کھانا پینا حتیٰ کہ میری زندگی میری جان یہ تو سب میری ہے۔ یہ میں کیا ہے؟ یہ وہ میں ہے جسے قرآن کہتا ہے عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (5:105) اس میں کے اوپر دھیان رکھا کرو' اسے نقصان نہ پہنچ جائے۔ اگر تم نے اس کو دھیان میں رکھا تو پھر کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا لَا يَضُرُّكُمْ (5:105) تمہاری چیزوں کو نقصان پہنچے گا۔ دیانت اور امانت سے زندگی بسر کرنے والے (کئی دفعہ یہ بات آ چکی ہے آپ کے سامنے) ٹھیک ہے غلط معاشرہ ان کو نقصان پہنچا دیتا ہے' ان کی چیزوں کو نقصان پہنچا دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان نقصانات میں چٹان کی طرح کھڑے رہتے ہیں' ثابت قدمی کے ساتھ۔ ان کا جو نفس اور ذات ہے اس کو نقصان نہیں کوئی پہنچا سکتا۔

ذات جیسی قیمتی شے کو نقصان سے بچائے رکھنے کے سنہری اصول کے علاوہ کفر اور ایمان کے فرق کی وضاحت

قرآن نے کہا ہے کہ اپنی ذات کو تم خود نقصان پہنچاتے ہو' کوئی غیر نہیں پہنچا سکتا۔ یہ خود کب نقصان پہنچاتا ہے؟ جب کسی VALUE کے مقابلے میں اپنی طبعی زندگی کے مفاد کو ترجیح دے دیتا ہے تو اپنی ذات کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور جب اس کی حفاظت کرتا ہے یعنی VALUES کی حفاظت کرتا ہے' جو نقصان پہنچتا ہے پہنچنے دیجیے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ان نقصانات سے ڈر کے اگر میں نے پہلے دیانت کی زندگی بسر کی تھی تو اب میں دیانت کی زندگی چھوڑ دوں گا کہ نہیں صاحب! دیکھ لیا دیانت دار بن کے بھی اس میں کیا ملتا ہے' آ گیا پست سطح کے اوپر۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ یہ لوگ جو محض دنیاوی یا طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد

پہ ہی نگاہ رکھتے ہیں' مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اسے مستقبل کہا ہے کہ موت سے جو چیز میری ہے وہ تو یہاں رہ جائے گی اور میں تنہا آگے جاؤں گا۔ میری چیزیں ساری یہاں رہ جائیں گی' میں آگے جائے گی۔ کہا دیکھنا یہ کہ جو آگے ہمارے سامنے آئے گا' اس میں تو کوئی ضعف اور نقصان نہیں ہے۔ میری والی چیزیں تو ساری یہاں رہ جائیں گی۔ عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں دین کی باتیں کتنی صاف صاف ہیں۔ BASIC CONCEPTS جو اس کے بنیادی تصورات ہیں' ان کو صاف کر لیجئے' ہر بات صاف ہو جاتی ہے قرآن کی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ج وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (3:177) یہ لوگ جو اس سطحِ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں کسی VALUE کے مقابلے میں' درحقیقت یہ کفر خریدتے ہیں' ایمان بیچ ڈالتے ہیں۔ تو اب کفر اور ایمان کی بھی ہمارے سامنے امتیازی چیز آ گئی ایمان کسے کہتے ہیں کفر کیا ہوتا ہے؟ وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ان کے اپنے ہی لیے ایک دردناک انجام ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل کا نتیجہ خیز ہونے کا طریق

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صاحب! یہ تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ VALUE کو پامال کرنے والے' بددیانتی کی زندگی بسر کرنے والے' کرپشن کی لائف بسر کرنے والے' یہ تو بڑے مزے میں زندگی گذارتے ہیں۔ وہ جب یہ کچھ ایسا کرتے ہیں تو اللہ ان کا ٹینٹوا کیوں نہیں دبا دیتا؟ اسی وقت پکڑ کیوں نہیں لیتا؟ ظالم جب ہاتھ اٹھاتا ہے خنجر لے کے مظلوم کے سینے میں گھونپنے کو تو وہ ہاتھ اس کا پتھر کا کیوں نہیں ہو جاتا؟ یہ بات نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ یہ سارا کچھ ہمارے قوانین کے تابع ہوتا ہے' جنہیں قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔ اور اس کی بنیادی چیز یہ ہے کہ بیج کے بونے میں اور فصل کے پکنے میں' درمیان میں ایک عرصہ ہوتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ برآمد ہونے میں' مرتب ہونا تو وہ اسی وقت شروع ہو جاتا ہے اللہ سریع الحساب' جس بیج نے فصل بننا ہے اس میں تغیر تو اسی دن شروع ہو جاتا ہے جب اسے آپ مٹی میں دباتے ہیں لیکن فصل بننے تک ایک عرصہ لگتا ہے اور یہی وہ چیز ہے کہ جس سے انسان فریب کھا جاتا ہے۔ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ط (3:178) یہ بات نہ یہ سمجھ لینا جو اس قسم کے اقدار کو پامال کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو اتنی موج ہی موج ہے۔ کہا یہ مہلت کا وقفہ ہے' یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں بہت بہتر ہو رہا ہے۔ ایک بات قرآن نے آگے ایک لفظ استعمال کیا ہے اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا اِثْمًا ج (3:178) یہ جو ان کو مہلت زیادہ ملتی چلی جا رہی ہے' مال و دولت کی فراوانیاں' آسائشوں کی فراوانیاں' یہ تمام چیزیں اکٹھی ہو رہی ہیں۔ وہ کہتا ہے اس سے اتنا مہلت کا عرصہ زیادہ ہوتا ہے ان کے اندر جو قوتیں ہیں' اقدار کو بلند رکھنے کی'

مدافعت کو بلند رکھنے کی' ان قوتوں میں زیادہ سے زیادہ اضمحلال آتا چلا جاتا ہے۔خوب بات کہی ہے۔ یہ جتنا زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے' گرفت نہیں ہوتی اس دوران میں ان کی یہ ساری قوتیں جو ہیں ان میں اضمحلال آتا ہے۔اثم کا لفظ قرآن یہاں لایا ہے: تکان' مضمحل۔تو اس لیے یہ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ط (3178) ان کی ذات کے لیے فائدہ مند چیز نہیں ہے یہ' ان کی ذات کی تقویت اس کی قوت وہ کم ہوتی چلی جاتی ہے' کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔

نتائج کے لحاظ سے اعمالِ انسانی کے دو رُخ

عزیزانِ من! عمل یا کام کی دو ہی قسمیں ہیں انسان کے وہ کام جو اس کی ذات کو تقویت دیتے ہیں' اسے اعمالِ حسنہ یا اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔وہ اعمال جو اس کی ذات کی کمزوری کا باعث بنتے ہیں' ضعف کا باعث بنتے ہیں' انہیں اعمالِ سیئہ یا برائیاں کہا جاتا ہے۔معیار ہی یہ ہے عمل کا۔عمل میں دیکھنا ہی یہ ہے کہ آپ کسی بلند قدر کی حفاظت کے لیے کتنا ایثار کرتے ہیں' کتنی مصیبت جھیلتے ہیں۔اس سے تمہاری ذات میں تقویت ہوتی ہے۔اگر اس قدر پر ترجیح دے دیتے ہیں آپ کسی مادی فائدے کے لیے' اسی درجے تک آپ کی ذات میں کمزوری واقع ہو جائے گی۔عمل کی قسمیں ہی یہ ہیں ان کا معیار ہی یہ ہے۔حتیٰ کہ جب اس میں آپ آگے بڑھتے ہیں تو قرآن نے جو کہا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (91:8) کہ یہ اعمال جو ہیں تقویت دینے والے یہ کرتے جاتے ہیں تو وہ محفوظ رہتی ہے ہر قسم کے نقصان سے۔اور اگر ضعف پہنچانے والے کام زیادہ ہوتے ہیں فُجُوْرَهَا (91:8) DISINTIGRATE ہو جاتی ہے۔

انسانی ذات وہ قطرۂ نیساں ہے جسے مادیت کے پیکر میں رہ کر گوہرِ تابدار بننا ہوتا ہے

وہ جو چیز ہے کہ اس انسان کی ذات اور خودی کی حفاظت سے حقیقی زندگی ملتی ہے وہی چیز ہے اقبالؒ کے وہ دو شعر بڑے جامع ہیں۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی

یہ مادی زندگی جو ہے وہ سیپی کی طرح ہے۔ایک مشہور بات ہے نا کہ موتی بنتا اس طرح ہے کہ وہ ابرِ نیساں برستا ہے اس کا ایک قطرہ سیپی وہ منہ کھولتی ہے اس میں چلا جاتا ہے۔پھر وہ سیپ اس قطرے کی پرورش کرتی ہے' ربوبیت کرتی ہے۔عربوں کے ہاں اس کو ربوبیت کہتے تھے۔وہ آہستہ آہستہ وہ قطرۂ آب تقویت پکڑ کر اپنے اندر مستحکم ہوتا ہوا موتی بن جاتا ہے۔کہتا ہے کہ زندگانی ہے صدف یہ مادی زندگی وہ سیپ ہے۔قطرۂ نیساں ہے خودی۔اس کے اندر انسانی ذات وہ قطرۂ نیساں ہے

وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

خودی کوضعف پہنچانے والے اعمال کا نتیجہ وہ عذاب ہے کہ جس میں نہ زندگی ہوتی ہے نہ موت

یہ مرنہ سکے والی بات وہ زندگی ہے جو اہلِ جنت کو ملتی ہے' جہنم کی زندگی نہیں۔ اسی لیے کہا کہ یہ جو اس قسم کے اعمال ہیں جو تمہاری خودی کو ضعف پہنچاتے چلے جاتے ہیں آہستہ آہستہ پھر وہ مقام آجاتا ہے کہ یہ خودی DISINTIGRATE ہو جاتی ہے اس کے بعد جینا تو ہے لیکن جینا وہ ہے جہنم والوں کا کہ جس میں نہ زندگی ہے نہ موت' موت چاروں طرف سے آتی دکھائی دیتی ہے' یہ مرتا بھی نہیں ہے۔ اور دوسرے مقام پہ یہ لوگ جو ہیں جن کی ذات میں اس طرح ارتقا واقع ہو جاتا ہے' تقویت آجاتی ہے' استحکام واقع ہو جاتا ہے' وہ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ (3:169) وہ ہیں زندہ اپنے خدا کے ہاں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ انسانی ذات کی تقویت یا استحکام یا نشو ونما ہر اس عمل سے ہوتی ہے کہ جو کسی قدر کی حفاظت کے لیے کیا جائے۔ اور جتنا بڑا ایثار اس کے لیے ہوگا اتنا ہی تیزی سے اس کی نشو ونما ہوگی۔ اور جب جان دے دیتا ہے تو یہ ایک عمل وہ ہے جس سے یہ قطرہ اسی آن میں موتی بن جاتا ہے۔ یہ ہے بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ (3:169) وہ لمبا پروسیس اس کے لیے نہیں پھر ہوتا۔ اسی لیے کہا کہ یہ لوگ جن پہ یوں جلدی گرفت نہیں ہو رہی' آہستہ آہستہ ان کی خودی میں ضعف آ رہا ہے لِيَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ج (3:178) ضعف آ رہا ہے ان کی خودی کے اندر۔ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ (3:178) اور اس کے بعد آگے آگے جب بڑھیں گے۔ مہین عجیب لفظ آیا ہے بڑی عزت کے مالک بنے پھرتے ہیں' چوہدری بنے پھرتے ہیں' سرفرازیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں' مال جو اکٹھا ہو گیا' دولت جو اکٹھی ہو گئی' کسی طرح سے مناصب جو حاصل کر لیے۔ کہتا ہے ٹھیک ہے ضعف آنا شروع ہوگا تو ان کے لیے وَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ (3:178) ذلیل کرنے والا انجام ہوگا۔ کیا بات مہین کا لفظ قرآن لایا ہے؟ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ عَلٰى مَاۤ اَنۡتُمۡ (3:179) بات پھر آگے بڑی اہم آ گئی ہے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے دین کی زندگی اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ جماعت اس نے بنائی ہے' کونوا مع الصدقین کی زندگی ہے' انفرادی زندگی نہیں ہے۔ صادقین کی DEFINITION خصوصیات یہاں آ گئیں میدانِ جنگ میں سر بکف جانیں دینا۔ لیکن اجتماعی زندگی جب آپ اس کی ابتدا کرتے ہیں تو اس میں تو ہر قسم کے لوگ آ کے مل جاتے ہیں۔ اور قرآنِ کریم نے یہ رسول اللہ ﷺ سے یہ کہہ دیا کہ ہم ایسا نہیں کریں گے کہ ان کے ماتھے کے اوپر لکھ دیں گے کہ یہ

بے ایمان ہیں' کسی اور ارادے سے اندر آیا ہے۔ کہتا ہے یہ کچھ تو خود ہی اپنے تجربے سے' اپنے مشاہدے سے فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ لوگ بڑا نقصان پہنچا جاتے ہیں اندر آ کے۔ یہی چیز یہ جو صدرِ اول کی جماعتِ مؤمنین کی زندگی تھی ان کے اندر بھی یہ چیز پیدا ہوئی تھی۔ کیا یہ چیز آخر تک رہی یا کچھ معاملہ؟؟؟ کے ساتھ ہوا؟ بڑا اہم سوال ہے یہ۔ بعض تو یہ کہتے ہیں نا کہ ان کے اندر خالص ایمان والے معدودے چند ہی تھے' باقی سب کے سب اسی انداز کے تھے۔ دیکھیں کہ قرآن اس کی بابت کیا کہتا ہے؟ اسے ہم آئندہ درس پہ اٹھا رکھتے ہیں کیوں کہ بات بڑی اہم آ گئی ہے۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ آلِ عمران کی 178 آیت تک آ گئے 179 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ(2:127)

❀......❀......❀

تیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 178 تا 179)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صحابۂ کرامؓ کا مقامِ بلند اور پیشین گوئیوں کی حقیقت

عزیزانِ من! آج اپریل 1970ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی 179 سے ہوتا ہے: (3:179) ۔

فکرِ قرآنی کے سلسلہ میں آغازِ اسلام کے عہد میں پیش آنے والی مشکلات کی نوعیت اور نبی اکرم ﷺ کی بلند نگہی

یہاں اس جماعت کا ذکر چلا آ رہا ہے جسے نبی اکرم ﷺ نے تشکیل فرمایا۔ اس تحریک کا ذکر چلا آ رہا ہے جس نے آخرالامر قرآن کو ایک عملی نظام کی صورت میں قائم اور متشکل کرنا تھا۔ آہستہ آہستہ بتدریج یہ کارواں اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا بڑھتا ہوا ' قدم بڑھاتا ہوا۔ لیکن جیسا کہ ہر تحریک میں ہوتا ہے تحریک کی ابتدا میں اس کے اندر ہر قسم کے لوگ شامل ہو جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحریک میں شامل کیے جانے والے جو تھے ان کی تعلیم ہوتی تھی' تربیت ہوتی تھی۔ لیکن اس شمولیت سے پہلے اگرچہ وہ وہیں کے رہنے والے تھے لیکن کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کن عزائم کو' کن مقاصد کو لے کر اس میں شامل ہو رہا ہے۔ مکے کی زندگی میں یہ شکل بہت کم ہوئی اس لیے کہ وہاں یہ مرحلہ ہی ہنوز تعلیم و تربیت کا تھا۔ مدنی زندگی میں آ کر اس نے ایک عملی تحریک کی شکل اختیار کی تھی۔ مملکت کی بنیاد ڈالی گئی۔ وہ مسلسل مصائب' تکالیف' مشقتوں کا دور قریباً ختم ہوا۔ یہ دور ایسا تھا جس میں فصل پکنے والی تھی۔ اگرچہ اس میں بھی ٹکراؤ بہت ہوا مخالفین کے ساتھ لیکن ٹکراؤ کے معنی یہ تھے کہ ادھر بھی ایک منظم جماعت وجود میں آ گئی ہوئی تھی۔ مکے کی زندگی میں ابھی یہ شکل بھی نہیں تھی۔ تو مدینے کی زندگی میں آ کر نظر آ رہا تھا کہ اب یہ جماعت' ایک مملکت قائم کر

رہی ہے ایک نظام قائم کر رہی ہے۔ بہت سے لوگ اس کے اندر مختلف قسم کے ارادے لے کر شامل ہو گئے۔ قرآنِ کریم نے انہیں منافقین کہہ کر پکارا ہے کہ وہ لوگ کہ دل میں مقاصد اور ارادے کچھ اور رکھتے تھے بظاہر ان لوگوں کے اندر ان ہی میں سے اپنے آپ کو کہہ کر شامل ہو جاتے تھے۔ اور قرآنِ کریم نے پھر یہ بتایا ہے کہ مختلف مواقع پہ یہ لوگ کس قدر راذیتوں کا مصیبتوں کا تکلیفوں کا موجب بن جاتے تھے۔ خاص طور پر میدانِ جنگ میں تو آپ سمجھتے ہیں فوج کے اندر اگر دو چار آدمی بھی ایسے شامل ہو جائیں جن کے عزائم کچھ اور ہوں اور وہ وہاں وسوسہ انگیزیوں سے بد دلی پھیلانے کے مختلف طریقے اختیار کرنے سے شکایات سے نزاعات سے جھگڑے کھڑے کرنے سے جماعت کی وحدت میں اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے بدنیت آدمی ہزار قسم کی خرابیاں پیدا کر سکتا ہے۔ یہ لوگ بھی ایسا کرتے تھے یہ لوگ ان میں شامل تھے۔

نبی اکرم ﷺ کی ساری زندگی بحیثیت بشر انسانیت کے لیے ایک ماڈل تھی آخر کیوں؟

اب اس کی ایک شکل تو یہ ہو سکتی تھی کہ نبی اکرم ﷺ رسول تھے خدا پہلے سے انہیں بتا دیتا کہ یہ لوگ جو ہیں فلاں فلاں شخص اس کو جماعت میں شامل نہ کرنا یہ منافق ہے۔ یہ شکل جسے آپ مافوق الفطرت کوئی طریقہ کہیں گے یہ اختیار ہی نہیں کیا گیا تھا اور یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ جو کچھ کر کے دکھا رہے تھے اسے عام انسانوں کے لیے ایک نمونہ بننا تھا۔ وحی تو ایک ایسی چیز تھی کہ جو دوسرے انسانوں کو براہِ راست نہیں ملتی تھی اور جب اس وحی کو آپ دوسروں تک پہنچا دیتے تھے تو وہ ساری ایک ہی بات ہو جاتی تھی۔ وحی پہنچانے کے بعد اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) کی کیفیت تھی۔ اور یہ بہت عظیم حقیقت ہے جو قرآن کہہ جاتا ہے اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) وحی کے بعد جو کچھ نبی اکرم ﷺ نے کیا وہ سارا ایک بشر کی حیثیت سے تھا اور وہ اس لیے تھا کہ بشر کے لیے ہی اسے نمونہ بننا تھا۔ یعنی انسانوں کے لیے اسے نمونہ بننا تھا۔ اگر اس میں کوئی چیز بھی ایسی ہوتی جو نبی اکرم ﷺ کے لیے مخصوص تھی عام انسان اس چیز کو نہیں کر سکتے تھے وہ دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ بن ہی نہیں سکتی تھی۔ اسی لیے آپ کی زندگی میں کوئی فوق الفطرت شے SUPERNATURAL جسے آپ کہتے ہیں SUPRARATIONAL جسے آپ کہتے ہیں کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ پھر دہرا دوں کہ اگر کوئی اس قسم کی چیز ہوتی جو رسول کے ساتھ مختص تھی مافوق الفطرت (SUPRANATURAL) تو وہ دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ نہیں ہو سکتی تھی۔ ہمیں تو وہ چیز میسر نہیں تھی تو ہمارے لیے وہ نمونہ کیسے بنتی؟ ہم کہہ سکتے کہ صاحب! رسول اللہ ﷺ نے تو یہ کچھ کیا اس لیے کہ آپ ﷺ کو تو اس طرح سے ایک مافوق الفطرت قوت حاصل تھی خدا نے اپنے طور پر یہ کر دیا۔ اب ہمیں تو وہ حاصل نہیں ہے اس لیے اس باب میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہمارے

لیے اسوہ کیسے بن سکتی ہے؟ ماڈل کیسے بن سکتی ہے وہ ہمارے لیے؟ ماڈل بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو کچھ حضورﷺ نے کیا ہے وہ دوسرے انسان بھی کر سکیں بشرطیکہ وہ اس پروگرام کو FOLLOW کریں‘ اپنے اندر وہ سیرت پیدا کریں وہ خصوصیات پیدا کریں‘ وہ کریکٹر کی بلندی پیدا ہو جائے‘ وہ تدبر ہو وہ بصیرت ہو۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو انسان حاصل کر سکتا ہے یہ وہ نہیں ہیں کہ کسی ایک انسان کو خدا کی طرف سے ملی ہیں‘ باقی انسان اس سے محروم ہوتے ہیں۔ دوسرے انسان وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے زندگی کے کسی اہم معاملے کو بھی واضح کیے بغیر نہیں چھوڑا

یہ بڑی بنیادی حقیقت ہے جسے ذہن میں رکھیے گا کہ حضورﷺ کی سیرت یا جو کچھ آپﷺ نے کر کے دکھا دیا تھا وہ ہمارے لیے ماڈل یا اسوہ اسی صورت میں بن سکتی ہے کہ ہم بھی وہ کچھ کر کے دکھا سکنے کے قابل ہوں۔ ورنہ آپﷺ کی سیرت آپﷺ نے جو کچھ کر کے دکھایا تھا وہ ہمارے لیے ماڈل یا اسوہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وجہ ہے قرآنِ کریم نے یہ بات ہمارے قیاس پہ نہیں چھوڑی اور اہم امورِ دین کے جو ہیں وہ قیاسات پر چھوڑتا ہی نہیں ہے‘ ان کی وضاحت خود کر دیتا ہے۔ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ اَنۡ لَّنۡ یُّخۡرِجَ اللّٰہُ اَضۡغَانَہُمۡ (47:29) کیا یہ لوگ جو دل میں کسی قسم کا یہ نفاق کا مرض لے کے آتے ہیں‘ منافقین کی حیثیت سے اس جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں‘ کیا یہ سمجھ رہے ہیں کہ جو کچھ یہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں‘ وہ ظاہر ہی نہیں کرے گا اللہ۔ اب اس کے بعد یہ چیز تھی کہ جب خدا نے ظاہر کرنا ہے تو وہ ٹھیک ہے ایسے عنوانات ایسے علامات ایسے آثار پیدا کر دے گا کہ جس سے یہ نظر آ جائے ان کی پیشانیوں پہ لکھا ہوا معلوم ہو جائے کہ ہاں یہ منافق ہے‘ یہ منافق ہے‘ یہ منافق ہے۔ کر تو سکتا تھا خدا لیکن پھر عرض کر دوں اگر وہاں یہ چیز کرتا‘ ہمارے آپ کے لیے تو وہ یہ چیز نہیں ہو سکتی تھی تو پھر ہم منافقین کو کیسے پہچان سکتے؟ اور اگر یہ چیز رسول اللہﷺ اس طرح سے پہچانتے کہ خدا ان کی پیشانیوں پہ لکھ دیتا اور وہ بھی ایسے الفاظ اور حروف میں اور ایسی روشنائی میں جسے دوسرے لوگ تو نہ پڑھ سکتے صرف ایک رسول کی آنکھ ہی دیکھ سکتی تو ہمارے آپ کے لیے تو رسولﷺ کا یہ جو عمل تھا کہ منافق کو کیسے پہچانا جاتا ہے‘ وہ ہمارے لیے نمونہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارے سامنے تو جو منافق آتا اس کی پیشانی پہ تو ان حروف میں وہ لکھا ہوا نہ ہوتا۔ اب یہ دیکھیے اَنۡ لَّنۡ یُّخۡرِجَ اللّٰہُ اَضۡغَانَہُمۡ (47:29) کہا ہے کہ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے اندر چھپی ہوئی اس قسم کی منافقت اور اس قسم کی خباثتوں کو نکالے گا ہی نہیں؟ طریقہ دیکھیے وَلَوۡ نَشَآءُ لَاَرَیۡنٰکَہُمۡ فَلَعَرَفۡتَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ (47:30) اگر ہمارا قانونِ مشیت ایسا ہوتا اگر ہم چاہتے تو یہ کر سکتے تھے کہ ہم انہیں سامنے لا کے تمہیں دکھا دیتے کہ یہ دیکھیے یہ ہیں‘ منافق یا ان کے ماتھے پہ لکھ دیتے اور جھٹ سے تو پہچان لیتا۔

منافق کی پہچان کا احسن طریق عقل وبصیرت اور کڑی نگاہ کا متقاضی ہے

وہی الفاظ آ گئے ہیں جو میں نے ابھی کہا تھا۔ لَوْ نَشَآءُ (47:30) ہم چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ کیا کیا؟ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ ط (47:30) اے رسول اور اس کی جماعت کے لوگو! تمہیں تو ان لوگوں کے انداز سے' بات چیت سے' گفتار ورفتار سے' ان چیزوں سے پہچاننا پڑے گا کہ منافق کون ہیں۔ اب یہ وہ چیز ہے جس سے ہم بھی جان سکتے ہیں' یہ ہمارے لیے بھی اسوہ بن سکتا ہے' ہمارے لیے بھی نمونہ بن سکتا ہے۔ یہ طریقہ ہے' ہر انسان کے لیے یہ طریقہ دے دیا گیا ہے۔ اس میں خصوصیت سے یہ نہیں کہا گیا کہ ایک ایسا طریقہ رسول سے کہا کہ ہم تمہیں بتاتے ہیں' چپکے سے تمہارے کان میں کہہ دیا کریں گے یا وہ جو نہ دیکھے جانے والی روشنائی ہوتی ہے اس سے لکھ دیا کریں گے بس چپکے سے تم نے پہچان لینا اور باقی انسان تو اس سے محروم ہو جاتے پھر۔ اور یہ جو طریق بتایا ہے کہا یہ ہے کہ خدا تمہارے دل کی باتوں کو باہر لے آئے گا اور خدا کے لانے کے دو طریقے ہوئے' ایک تو یہ جو پہلے کہا کہ اگر ہم چاہتے تو یوں بھی کر سکتے تھے کہ ان کی پیشانیوں پہ لکھ دیتے لیکن ہم نے یہ نہیں کیا۔ اب دوسرا طریقہ یہ ہے خدا کس طرح سے ان منافقین کے دل کی باتوں کو باہر لائے گا۔ تمہیں ان کے انداز سے' ان کی گفتار ورفتار سے' ان کے چلن سے' یہ چیز خود اپنی بصیرت سے پہچاننی ہوگی۔ ویسے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (47:30) خدا تو جانتا ہے اس کی بات چھوڑو۔ وہ اپنے علم کی بنا پر تمہیں نہیں بتا دے گا کہ یہ منافق ہے تمہیں تو اس طرح سے پہچاننا ہوگا۔ اب یہ دیکھیے صورت یہ ہوئی کہ جماعت کے اندر یہ لوگ آتے ہیں' شامل ہوتے ہیں جیسے ہر جماعتوں میں ہوتا ہے۔ ان کے ماتھے پہ لکھا نہیں جاتا' اس انداز سے انہیں پہچاننا ہوگا اپنے قیاسات سے' تجربات سے' مشاہدات سے' ان پہ بڑی کڑی نگاہ رکھنی پڑے گی' VIGILANCE رکھنی پڑے گی۔ ان کی حرکات وسکنات کے متعلق علم حاصل کرنا پڑے گا پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ جماعت کے اندر اس قسم کے لوگ کون کون سے ہیں' جو شامل ہو گئے ہیں۔

انسانوں کی دنیا میں نظامِ خداوندی کے نفاذ کا طریق

اب سوال یہ ہوا کہ کیا اس جماعت کے اندر یہ لوگ آخر تک اسی طرح سے رہے یا ایسا ہو گیا کہ جو انداز بھی خدا نے کہا تھا' اس انداز کی رو سے یہ چھٹ کے الگ کر دیے گئے' الگ ہو گئے اور یہ جماعت جو تھی مخلصین کی جماعت یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہی' کیا ایسا ہو گیا تھا؟ یہاں سے یہ بات شروع ہوتی ہے مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ (3:179) نہیں!

خدا ایسا نہیں کرے گا کہ جس حالت میں یہ جماعت اس وقت ہے کہ جس میں یہ مختلف قسم کے عناصر ملے جلے ہیں‘ تمیز ایک دوسرے کی نہیں ہوئی الگ چھٹ کے وہ نہیں ہوئے تو کیا یہ ایسا ہوگا کہ اسی حالت میں خدا چھوڑ دے اس جماعت کو؟ مَا کَانَ اللّٰهُ نہیں ایسا نہیں ہوگا یہ صورت نہیں ہوگی کہ ایسے ہی چھوڑ دیا جائے۔ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ط (3:179) ہوگا یہ کہ خبیث و طیب بالکل الگ الگ ہو جائیں گے۔ یہ کرے گا خدا‘ یہ کیفیت ہوگی۔ پھر دیکھ لیجئے‘ کرے گا خدا لیکن کرنے کا طریقہ وہ بتایا ہے کہ تم خود اپنے انداز قیاسات‘ مشاہدات مطالعہ‘ سے خبر رسانیوں سے‘ تحقیقِ احوال سے‘ تفتیش سے‘ تجسس سے‘ معلوم کرو گے۔ لیکن وہ یہ کہہ دیا کہ صورت یہ پیدا ہو جائے گی بالآخر حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ط (3:179) خبیث اور طیب الگ الگ ہو جائیں گے۔ یہی وہ چیز ہے جو دوسری جگہ خدا نے کہا ہے ہم جسے قیامت تک اٹھا رکھتے ہیں کہ وہ ایک معاشرہ عدل و انصاف کا صحیح انداز کا قائم ہوگا جس میں کہا جائے گا وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (36:59) معاشرہ میں بسنے والے بدمعاش جو ہیں اب تو وہ بڑے معتبر بنے پھرتے ہیں‘ کوئی پہچان ہی نہیں سکتا کہ وہ کون ہیں؟ ایسی صورت ہوگی کہ ان کو الگ کر کے دکھا دیا جائے گا تاکہ شریف انسانوں کو پتہ چل جائے کہ بدمعاش کون کون سے یہاں بستے ہیں۔ اور اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ (55:41) ماتھے کے اوپر لکھا ہوا تو نہیں ان کے ہوگا لیکن ایسا انداز ان کا ہوگا اور تم میں وہ بصیرت پیدا ہو جائے گی یا اس نظام کے اندر یہ چیزیں پیدا ہو جائیں گی کہ مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانا جائے۔

انسان کے ماتھے پر نمودار ہونے والی لکیریں انسانی کریکٹر کی ترجمان ہوتی ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اگر تھوڑا سا بھی سائیکولوجی کا علم ہو تو واقعی پیشانیوں سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ جیسا اندر کا طیب‘ سیرت کی پاکیزگی‘ اخلاص‘ یہ ماتھے پہ لکھا جاتا ہے جس کے لیے قرآن نے صحابہؓ کبارؓ کے متعلق کہا یہ چیز کہ ان کی پیشانیوں سے ان کے سجدوں کے نشان جو ہیں وہ ظاہر ہیں۔ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط (48:29) وہ جو ہم نے کہا سجدوں کے نشان تو سجدوں کے یہ نشان ”اوجنوں کیندے نیں محراب پے گیا متھے تے“ یہ بات نہیں ہے۔ خالص اطاعت گذاریوں کی علامات اور نشانات چہروں سے واضح ہو جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! ذرا نگاہ کی بصیرت ہو اور PREJUDICE نگاہ نہ آدمی کی ہو کہ پہلے سے ہی اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کر لے کہ اس کے متعلق کہ یہ تو ہے ہی ایسا۔ یہ نگاہ نہ ہو اور ذرا سی بھی بصیرت ہو انسان کی تو انسان کے اخلاص کی نیک نیتی‘ نیک فطرتی‘ بلند سیرت‘ پاکیزگی جو ہے‘ واقعی ماتھے سے جھلک پڑتی ہے۔ جسے کہتے ہیں نا وہ نور برستا تھا ان کے چہروں کے اوپر۔ اب تو کیا بتائیں آنکھیں ترس جاتی ہیں ان چہروں کو دیکھنے کے لیے جن پہ نور برستا تھا۔ کیا کہوں اسے خوش بختی

کھوں اپنی یا بدنصیبی ہم نے وہ دور دیکھا ہے کہ جس میں واقعی چہروں کی نورانیت سے پہچانا جاتا تھا کہ ان کی سیرت کتنی پاکیزہ ہے۔ بدبختی میں نے اس لیے کہا تھا کہ اس کے بعد جس نے یہ دور دیکھا ہو اور اس کے بعد یہ دور بھی اس کے سامنے ہو تو واقعی یہ چیز بڑی تلخ ہوتی ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ چیزیں جو ہیں' یہ عنوانات سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی شکل تھی' انتظام تھا' اس نظام کا' اس جماعت کا' اور انتظام تو کرنا پڑے گا جماعت کو کہ اس قسم کی SUBVERSIVE ACTIVITIES والے اندر داخل اگر ہو چکے ہیں سازشی' ان کے متعلق جماعت کے لیۓ نظام کے لیۓ ضروری ہوگا کہ وہ تحقیقات کرے' تجسس کرے اس کے متعلق۔ اور پھر عام آپ کا مشاہدہ بھی ہو' مطالعہ بھی ہو' نگہ بصیرت بھی ہو' فراست بھی ہو اس کے اندر۔ جو کچھ بھی تھا ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ کیا کیا طریقے اختیار کیے گئے تھے؟ خدا نے یہ DEFINITELY کہا ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ اس جماعت کو اس شکل میں چھوڑ دیا جائے کہ اس میں جو خبیث گھس آئے ہیں' وہ طیب سے الگ نہ ہو جائیں۔ لہٰذا قرآن کی اس آیۂ جلیلہ کی رو سے ہمارا ایمان ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں یعنی جب تک قرآن نازل ہو رہا تھا اس زمانے میں اس دور میں ہی سہی آخر میں ہی سہی' یقیناً یہ چیز پیدا ہو گئی تھی کہ خبیث اور طیب الگ ہو گئے تھے۔ اب جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے وہ طیبین کی جماعت تھی' اس میں خبیث نہیں باقی رہے تھے۔ اسے ذہن میں رکھیے یہ اہم چیز ہے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کا عقیدہ کہ ''میں صرف مسلمان ہوں اور میرا کسی فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہے''

میں دہرا دوں جسے عام طور پہ دہرایا کرتا ہوں' میرا تعلق کسی مذہبی فرقے سے نہیں ہے۔ مذہبی فرقہ بندی قرآن کی رو سے شرک ہے میں صرف مسلمان ہوں۔ فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہے' فرقوں کے عقائد سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں قرآن کا طالب علم ہوں۔ قرآن ہاتھ میں لے کے آپ کے سامنے آتا ہوں تو ایک چیز جو ہے میرے اور میرے خدا کے درمیان ہوتی ہے کہ قرآن ہاتھ میں لے کے کوئی شخص اگر کسی قسم کی کوئی چیز ایسی کرتا ہے جس میں اپنے رجحانات اور خیالات کو دخل ہوتا ہے تو یہ بھی شرک ہے۔ اور دوسری چیز یہ کہ جو چیز بھی قرآن کے خلاف جاتی ہے' اگر کسی مداہنت یا مصلحت یا مفاہمت کی بنا پہ' اعراض برتا ہے' اس میں مفاہمت COMPROMISE پیدا کرتا ہے' یہ بھی مشرک ہے۔ مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہ قرآن لے کے اور اتنی زحمت اٹھاؤں اور یہ اہتمامات کروں' اپنا وقت دوں دماغ سوزیاں کروں' یہ سارا کچھ اور پھر خدا کی میزان کے اندر یا میں کتمانِ حقیقت کا مجرم قرار پاؤں' یا مشرک قرار پاؤں' کیا پڑی ہے مجھے اس کے لیے میرا پروفیشن تو ہے نہیں۔ تو یہ سن رکھیے قرآن جب میرے ہاتھ میں ہوگا کوئی خلافِ قرآن عقیدہ مسلک مشرب جو رائج ہوگا آپ کے ہاں' وہ کسی کے ہاں ہو' کسی فرقے میں ہو' کسی فرد

میں ہو میرا فریضہ ہے کہ میں یہ عرض کروں کہ خلافِ قرآن ہے۔ ہر خلافِ قرآن عقیدے کے مسلک کی مخالفت کروں گا۔ اور سب سے پہلے تو میں خود ہوں میری زندگی کا آدھا دور اس میں گذرا جس میں خلافِ قرآن عقائد مسالک سارے شامل تھے۔ اپنی ذات تک ہی نہیں' ان کی تبلیغ بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن جب قرآن سامنے آیا ہے (یہ نہیں تھا کہ قرآن اس زمانے میں پڑھتا نہیں تھا' اس زمانے میں پڑھتا تھا) اس کے بعد اللہ کا فضل ہے کہ اسے سمجھنا شروع کیا۔ قرآن سامنے آیا ہے تو اپنے بے شمار عقائد اور مسالک جو تھے' ان کو خیر باد مجھے کہنا پڑتا۔ تو جب اپنے عقائد جو عزیز ترین متاع ہوتی ہیں انسان کی' اسے چھوڑنے میں مجھے کوئی باک نہیں ہوا تو اگر وہ کسی اور کا عقیدہ ہے تو مجھے تو یہ بتانا ہے کہ قرآن کی رو سے وہ غلط ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک صحابہؓ کبارؓ کی عظمت کا ذکرِ خیر

ہمارے ہاں یہ ایک عقیدہ چلا آ رہا ہے اور بڑی بنیادی چیز جس سے سب سے پہلے دو شاخوں کے اندر جو آپ کا مسلمان بٹا ہے تو وہ اس بنا پہ تھا کہ یہ صحابہؓ کبارؓ تھے رسول اللہ ﷺ کے جو ساتھی تھے ان میں سے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد معدودے چند 'انگلیوں پہ گننے کے قابل تو واقعی اس میں مخلص مومن تھے اور باقی جتنے تھے وہ سب (معاذ اللہ) منافقین تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ سب سے پہلی چیز یہ ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ط (3:179) دعویٰ ہے مَا كَانَ اللّٰهُ 'یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا ایسا کرے۔ بڑی تحدی کے ساتھ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ پھر اگلی چیز یہ نہیں ہے کہ یوں ہی کوئی چیز مبہم سی وہ کرے گا۔ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ط (3:179) تمیز کر کے رکھ دے گا۔ ہمارا ایمان ہے قرآن کے ماننے والوں کا کہ خبیث اور طیب کو الگ الگ کر کے رکھ دیا گیا تھا رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اندر۔ اس لیے جن کو قرآن نے والذین معہٗ کہا ہے' وہ سارے طیبین کے اندر وہ شامل ہو چکے ہوئے تھے' وہ خبیث کے اندر نہیں تھے ان کے اندر۔ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ۔ اب یہ جو ہیں والذین معہٗ دیکھیے قرآن ان کے متعلق کیا کہتا ہے؟ کیا شہادت دیتا ہے ہمیں ان کے ایمان کے متعلق؟ ان میں دو جماعتیں شامل ہیں ایک وہ تھے جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مکے سے ہجرت کر کے مدینے آئے یا اس کے بعد ہجرت کر کے مدینے آئے یعنی مکے سے مدینے کی طرف تشریف لائے ہجرت کر کے' انہیں مہاجرین کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ تھے جو مدینے میں موجود تھے یہ مسلمان' انہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی' ان کی نصرت کی ان کو انصار کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں TERMS جو ہیں قرآنِ کریم کے اندر موجود ہیں مہاجرین اور انصار۔ سنیے قرآن ان دونوں کے متعلق کیا کہتا ہے؟ مکے سے آنے والے' مدینے میں پہلے سے جو موجود تھے۔ مہاجر اور انصار یہی دو کیٹگریز تھیں۔ اب منافقین جو ہیں ان کو تو

قرآن نے چھانٹ کے الگ کیا ہے۔ یہ دو کیٹگریز ہیں ساری مسلمانوں کی ان ہی میں وہ شامل تھے۔ سنیئے قرآن کیا کہتا ہے؟ **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (8:74) یہ لوگ جو ایمان لائے انہوں نے ہجرت کی پھر جہاد کیے اللہ کی راہ میں' ایک کیٹگری آ گئی مہاجرین کی۔ **وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا** (8:74) اور یہ لوگ جنہوں نے ان جو آنے والے مہاجر تھے ان کو پناہ دی ان کو مدد دی **نَّصَرُوْٓا** انصار ہو گئے۔ دونوں کیٹگریز آ گئیں۔ عزیزانِ من! سنیے **اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا** (8:74) یہ سب پکے اور سچے مومن تھے۔ عزیزانِ من! قرآن کی شہادت ہے۔ مومن ہی نہیں کہا قرآن نے **الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا** ط **لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ** (8:74) مغفرت' رزقِ کریم' مومنِ حقا۔ یہ تو وہ چیز تھی پہلی کھیپ کے اندر جو ہجرت کر کے آ گئے۔ اس کے بعد ہے **وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ** (8:75) جو لوگ ان کے بعد بھی ایمان لائے پھر انہوں نے بھی ہجرت کی' انہوں نے بھی تمہارے ساتھ مل کے پھر جہاد کیا مخالفین کے خلاف **فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ** ط (8:75) وہ بھی تم میں سے ہیں' وہ بھی مومن حقا ہیں۔

صحابۂ کبارؓ کے احترام میں کسی قسم کے فرق کا خیال بھی قرآنِ حکیم کی شہادت کا انکار ہے

تو قرآن جن کے متعلق یہ شہادت دے رہا ہے کہ مومنِ حقا ہیں' ان کے متعلق تو ہمارے دل میں ذرا سی بھی کوئی بات گذرے میں یہ عرض کر دوں' جسے ہم کہتے ہیں نا کہ یہ توہینِ صحابہؓ ہے تو یہ یوں نہیں' میں تو کہتا ہوں کہ یہ خدا کی شہادت سے انکار ہے' قرآن پر ایمان سے انکار ہے۔ قرآن نے جس بات کی شہادت دے دی ہے یہ تو بڑی چیز ہے۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی ان کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کے لے آئے تھے۔ اگر ہم میں سے کوئی یہ کہے کہ نہیں! وہ سچا خون تھا تو قرآن سے انکار ہو گیا یہ۔ قرآن پہ ایمان کے معنی یہ ہیں۔ تو قرآن جنہیں مومنِ حقا کہتا ہے ان کے متعلق اگر دل میں ہمارے ذرا سا بھی کچھ اور وسوسہ گذرے کہ وہ حقا نہیں رہے تو ہین کو تو چھوڑ دیجیے' میں کہتا ہوں قرآن کی شہادت سے انکار ہے' قرآن سے انکار ہے یہ۔ ہم انہیں مومنِ حقا ماننے کے لیے اس لیے مجبور نہیں ہیں کہ کچھ ہماری ان سے عقیدت اور محبت کچھ اس قسم کی ہے۔ وہ تو میں بعد میں عرض کروں گا کہ وہ کیوں ہے۔ انہیں یہ ماننا اس لیے ضروری ہے کہ قرآن نے اس کی شہادت دی ہے' خدا یہ کہہ رہا ہے۔ ہمارا قرآن پہ ایمان ہے۔ قرآن کے لفظ لفظ پہ ایمان ہے۔ قرآن کی ہر شہادت پہ ایمان ہے۔ باقی رہی عقیدت اور محبت جسے کہتے ہیں وہ ان کے کریکٹر کی وجہ سے' ان کے ایمان کی وجہ سے' ان کی صداقت کی وجہ سے ہے۔ دنیا میں ہر صاحبِ کردار کا احترام آپ کے دلوں میں ہونا چاہیے۔ آپ اس فرد پیکر کا احترام نہیں کرتے اس کے کریکٹر کا احترام کرتے ہیں۔ احترام اس لیے ہے۔

صحابۂ کبارؓ سے خدا کے راضی ہونے کا مفہوم

یہاں مومنِ حقا قرآن نے کہا آگے چلیے وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ (9:100) مسابقت کرنے والے پہل کرنے والے ہجرت میں اور یہ مدینے کے انصار۔ پھر وہی دونوں کیٹگریز آ گئیں اس میں۔ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) یہاں کہا ہے پہلے۔ ذہن ادھر جا سکتا تھا کہ صاحب! وہ جو PIONEERS تھے جنہوں نے شروع میں پہلے ہی یہ کچھ کیا' یہ ان کے ہی متعلق کچھ کہے گا قرآن لیکن یہ تو قرآن ہے وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ لا (9:100) اور وہ جنہوں نے اسی طرح حسن کارانہ انداز سے ان کا اتباع کیا اسی طرح بعد میں کرتے گئے جو رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (9:100) (بات صاف ہوگئی عام ترجمہ ہی کر لیجیے اچھا ترجمہ ہے) اللہ ان سے راضی ہوا وہ اپنے اللہ سے راضی ہو گئے۔ بات پھر کچھ ABSTRACT سی رہ جاتی تھی کہ ہوا کیا یہ؟ سنیے راضی ہوئے کے کیا معنی ہیں؟ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ط (9:100) ان کے لیے خدا نے جنتِ ابدی کے انعامات تیار کر رکھے ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (9:100) بہت بڑی ACHEIVEMENT ہے جس کے حصے میں یہ آ جائے صاحب' بہت بڑی چیز ہے۔ قرآن یہ شہادت دے رہا ہے مومنِ حقا' رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ' ان کے لیے جنت دے دی گئی ہے ان میں ہمیشہ رہیں گے الفوز العظیم ہے ان سب کے لیے' السابقون الاولون کے لیے بھی ان کے بعد آنے والوں کے لیے بھی۔

صحابۂ کبارؓ کو شروع کے دور میں پیش آنے والی مشکلات کی نوعیت

عزیزانِ من! قرآن کی شہادتیں موجود ہیں۔ پھر اس جماعت کی عظمت اس جماعت کے مدارج جو ہیں اندازہ لگایئے۔ ایک انقلاب آفریں آواز اٹھتی ہے بالکل نئی آواز' آواز کا اٹھانے والا تنِ تنہا' نہ کوئی مملکت پاس ہے' نہ کوئی فوج ساتھ ہے' نہ اس کے پاس کوئی خزانے ہیں' نہ غیب سے اس قسم کی دولت کے انبار در انبار چلے آتے ہیں' کوئی چیز وجۂ کشش نہیں ہے۔ کچھ لوگ ہیں کہ اس آواز کی صداقت پر غور کرتے ہیں' اسے سچا پاتے ہیں' اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہونے کے ساتھ ہی دنیا بھر کی مصیبتیں مشکلات ساری ہجوم کر کے آ جاتی' ہیں مخالفتوں کا تصادم آتا ہے' اندوہ آتا ہے' ہجوم آتا ہے' گھیر لیتی ہیں چاروں طرف سے وہ۔ یعنی ملتا ہے یہ انہیں بے چاروں کو۔ اچھے بھلے زندگی بسر کرتے تھے' قوم میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اتنی بڑی ممتاز حیثیت حضرتِ عمرؓ ' ابوبکرؓ ' عثمانِ غنیؓ یہ احباب یہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ یہ صحابہؓ کو دیکھیے قبل از اسلام ان کی کیفیت یہ تھی' بڑی ممتاز حیثیت رکھتے

تھے۔ ایسی ممتاز حیثیت کہ وہ حضرتِ عمرؓ تو پھر کہیں ادھار تو رکھتے نہیں تھے نا ابھی قریش میں سے ان ہی کے ساتھی جو پہلے تھے' یہ سردارانِ قریش میں سے یہ لوگ تھے۔ جو ان کے ساتھی ابھی نہیں تھے وہ ابھی ایمان نہیں لائے تھے وہ جب اسلام کی شان وشوکت بڑھی اور اس کے بعد ان کو یہ چیزیں حاصل ہوئیں تو چلے جا رہے تھے تو ان میں سے ایک نے یہ کہہ دیا کہ ہاں صاحب! دیکھیے نا یہ مسلمان ہونے کے بعد کتنے بڑے لوگ ہو گئے ہیں۔ آپؐ نے مڑ کے دیکھا ان سے کہا کہ ہم اسلام لانے سے پہلے بھی تمہارے معاشرے میں بڑے لوگ تھے۔ اس لالچ کی وجہ سے ادھر نہیں آئے تھے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے البتہ بڑائیوں کے معیار اور ہو گئے ہیں اس وقت معیار اور تھے۔ اس وقت کے معیار کے مطابق بھی ہم بڑے لوگ تھے۔ آج معیار اور ہو گئے ہیں میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ لوگ اپنے ہاں اپنے معاشرے کے اندر ممتاز شخصیتیں رکھتے تھے۔ ادھر آئے ہیں' دنیا بھر کی مصیبتیں دنیا بھر کی مشقتیں ساری ساتھ آئیں' ساتھ دیا ہے ان لوگوں نے۔ تو آپ سوچیے کہ جو ان حالات میں ساتھ دینے والا ہو' وہ جب مملکت بن گئی' شان وشوکت آ گئی' اس کے بعد تو اس مملکت کی جاذبیت اور کشش اتنی ہو جاتی ہے کہ پھر تو یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ (110:2) یہ تھے آنے والے جن کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ ان اعراب سے کہہ دو جو کہتے ہیں ہم اٰمَنَّا (49:14) کہ ہم ایمان لائے ان سے کہو کہ ابھی یہ بات نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ اَسۡلَمۡنَا (49:14) ہم نے اس مملکت کے سامنے سرنڈر کر دیا ہے وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ (49:14) ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں اترا نہیں ہے۔ یہ بعد کی بات ہے جب مملکت بن گئی تھی۔ یہ السابقون الاولون جن کے حصے میں مشقتیں اور مصیبتیں اور مخالفتیں ہی مخالفتیں تھیں' اس وقت ساتھ دینا۔

صحابہؓ کرامؓ کی شب وروز کی تگ وتاز آخر کار ثمر بار ہونا شروع ہو گئی

عزیزانِ من! یہ ان ہی کی ہسٹری ہے اس تئیس سال کے عرصے کے اندر اتنی مصیبتیں اور مشقتیں' بتائیں ایک فرد ان میں سے نہیں ہے جو ساتھ چھوڑ گیا ہو۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ جو ہیں ان کا مقام ان کے مدارج کیا ہوں گے؟ اتنے بڑے مدارج سنیے قرآن کے الفاظ میں خدا ان کے متعلق کیا کہتا ہے؟ نبیﷺ سے کہہ رہا ہے هُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِهٖ (8:62) خدا وہ ہے کہ جس نے اے رسول اپنی نصرت سے تمہیں تقویت دی۔ ٹھیک ہے نصرتِ خداوندی ہے' اس سے تقویت دی تو کافی ہو جاتی ہے بات۔ کافی نہیں ابھی ہو گئی بات هُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِهٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:62) خدا نے اپنی نصرت سے اور ان مؤمنین کی جماعت سے تیری تقویت کا سامان پہنچایا۔ نصرتِ خداوندی اور جماعتِ مؤمنین متوازی چل رہے ہیں یہاں۔ ساتھ چلنے والوں کی بات تو ذرا اگلی آیت میں اور آتی ہے ساتھ چلنے والوں کا نقشہ قرآن ساتھ دے دیتا ہے وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ (8:63) ساتھ

یوں ہی انبوہ کی حیثیت سے نہیں داخل ہو گئے' ووٹر کی طرح نہیں ہو گئے یہ۔ کیفیت یہ ان کی ہے کہ وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ط (8:63) ان کے دلوں کو جوڑ دیا ہوا ہے خدا نے۔

ووٹوں کی خرید و فروخت سے تشکیل پائی جانے والی حکومت' حسین نتائج پیدا کر ہی نہیں سکتی

لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ط (8:63) ساری دنیا کی دولت بھی تو صرف کر دیتا' دلوں کو نہیں جوڑ سکتا تھا۔ ووٹس خرید سکتا تھا تو دولت سے دلوں کو نہیں جوڑ سکتا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں دولت کے ذریعے سے جو پارٹیاں بنائی ہوئی ہوتی ہیں' ان میں ان کے افراد کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیۡنَہُمۡ ط اِنَّہٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ (8:63) یہ ایمان تھا جس کی بنا پہ یہ دل جڑے ہیں ان کے' یہ کیفیت ہے ان کی' یہ ہے اللہ نے اپنی نصرت اور اس قسم کی جماعت سے تیری تقویت کا سامان بہم پہنچایا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اتنا کہنے سے کوئی ''جی ٹھنڈا نئیں ہجے ہو یا اللہ میاں دا کہ نئیں اوئے گل کچھ ہورا ے وچوں''۔

انسانوں کی دنیا میں انتظامی امور چلانے کی خاطر خدا تعالیٰ کے ساتھ انسانوں کی رفاقت کی اہمیت

یہاں تو کہا تھا کہ تقویت کا سامان بہم پہنچایا آگے کہتا ہے یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ حَسۡبُکَ اللّٰہُ (8:64) اے نبی تیرے لیے اللہ کافی ہے۔ ٹھیک ہے اللہ کافی ہے۔ حَسۡبُکَ اللّٰہُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:64) صرف اللہ کافی نہیں یہ جماعتِ مؤمنین جو تیرا اتباع کرتی ہے' دونوں مل کے تیرے لیے کافی ہیں۔ دیکھتے ہیں اس جماعتِ مؤمنین صحابہؓ کبارؓ کا مقام۔ بہرحال خدا تو خدا ہے اس کے مقام میں تو کوئی شریک نہیں ہو سکتا لیکن خدا نے جنہیں خود اپنی نصرت کے ساتھ متوازی چلایا ہے' ان کا مقام دیکھیے کہ کیا ہے؟ جن کے متعلق یہ کہا ہے کہ اکیلا خدا کافی نہیں ہے تیرے لیے۔ اللہ اکبر۔ اس لیے کہ یہاں محسوس طور پہ رفاقتوں کی ضرورت تھی۔ اگر یہ رہبانیت کی زندگی والا کہیں دین ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ روحانیت کے عالم میں اکیلا خدا ہی کافی ہوتا ہے' وہ تو پتہ نہیں وہ ساتھ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا لیکن بہرحال سمجھا تو یہی جاتا ہے کہ وہ اکیلا کافی ہے۔ لیکن یہ تو ایک نظام کی تشکیل کا سوال تھا یہ تو انقلاب آفریں ایک نظم تھا جو قائم کرنا تھا۔ اس لیے یہ کہا کہ ٹھیک ہے قانونِ خداوندی کی صداقت کی مدد بڑی کافی مدد ہوتی ہے لیکن تنہا وہی کافی نہیں ہوتی حَسۡبُکَ اللّٰہُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:64)۔

جماعتِ مومنین کو خالقِ کائنات کی طرف سے وجد آفریں الفاظ میں خراجِ تحسین

عزیزانِ من! یہ مقام دے رہا ہے قرآنِ کریم اس جماعتِ مؤمنین کا' ان کو مومنِ حقا کہہ رہا ہے' رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ' کہہ

رہا ہے ان کے متعلق' یہیں بشارت دے رہا ہے ان کی جنت کی زندگی کی اور ان کی مغفرت کی۔ اور پھر وہ تو ایسے وجد آفریں الفاظ ہیں اور میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ یہاں بھی جو میں نے گذارش کیا تھا کہ ابھی کچھ جی ٹھنڈا نہیں ہوا بھرپور انداز سے کہا ہے کہ خدا ہی نہیں یہ جماعت تمہارے لیے کافی ہے۔ نظر آتا ہے وجد و مسرت میں جھومتا ہوا یعنی اپنی زبان میں' میں یہ عرض کر رہا ہوں' خدا کے متعلق تو یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیفیت جس سے اظہار ہوا ہے اس کا نظر آتا ہے کہ وجد و مسرت میں جھومتا ہوا کہہ رہا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) محمد اللہ کے رسول اور یہ ان کے ساتھیوں کی جماعت' اللہ اللہ کیا کارواں جا رہا ہے رشد و ہدایت کا' پھول برسا رہا ہے خدا آسمان سے۔ میں نے کہا ہے پھول برسا رہا ہے خدا۔ ہمیں تو یہی پتہ ہے نا کہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ جہاں قرآن نے یہ کہا ہے آپ کو معلوم ہے (33:56) وہیں یہ قرآن نے کہا ہے مؤمنین سے کہ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43) اے جماعتِ مؤمنین اللہ اور اس کے فرشتے تم پر بھی درود و سلام بھیجتے ہیں۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ۔ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (33:56) اسی کے ساتھ ہی چار پانچ آیتیں پہلے یہ ہے هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43) اکیلے نبی پہ ہی نہیں اے جماعتِ مؤمنین تم پہ خدا اور اس کے فرشتے پھول تحسین و آفرین کے نچھاور کر رہے ہیں ''اوئے جیئو! اللہ خوش رکھے تہانوں'' کیا کر کے دکھا دیا تم نے۔ کیا کر کے دکھا دیا تھا؟

قصۂ آدم میں کائنات کے اندر تخلیقِ آدم کے مقامِ بلند کا ذکر اور ملائکہ کا اعتراض

ایک چیز خدا کے ذمے چلی آ رہی تھی۔ قرآن نے قصۂ آدم میں جو بات کہی ہے اپنے خاص انداز میں' تمثیلی انداز میں کہ ملائکہ نے یہ کہا تھا کہ جسے تم زمین میں خلافت دے رہے ہو' ہم دیکھ رہے ہیں آگ اور خون کی چنگاریاں اس کے پیکر کے اندر پنہاں ہیں' یہ زمین میں فساد برپا کرے گا وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ (2:30) ہم تو تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں اس میں تو یہ چیزیں نظر آ رہی ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا تھا اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (2:30) ہم جانتے ہیں' تم نہیں جانتے کہ یہ جو آدم' یہ جو انسان بنا کے بھیجا جا رہا ہے دنیا میں اب' باقی مخلوق کے اوپر قبضہ رکھنے والا' تمہاری نگاہوں نے اس کے اندر فساد انگیزیاں' ہنگامہ پروریاں' شورشیں' خون اور آگ کے چھینٹے ہی دیکھے ہیں' ہماری نگاہ کچھ اور دیکھ رہی ہے۔ ملائکہ اس پہ سر جھکا کے خاموش تو ہو گئے تھے' اس کی عملی شہادت ابھی ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ خدا بھی انتظار میں تھا' ملائکہ بھی انتظار میں تھے کہ ابنِ آدم میں سے اس کی شہادت ملے کہ کیوں ان کو دیا گیا تھا؟ عزیزانِ من! یہ وہ جماعتیں ہیں جو اس کی شہادت پیش کر دیتی ہیں جو خدا فرشتوں

سے کہہ سکے کہ تم نے دیکھا ہم نے کہا تھا نا۔ ہم جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔ یہ ہے ابنِ آدم جن کے لیے ہم نے ان کو پیدا کیا تھا۔ اور یہ وجہ ہے کہ جو کہا ہے کہ خدا اور اس کے فرشتے تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ خدا نچھاور کرتا ہے ''اوتسی میری گل راہ رکھی ہے جیہڑی میں گل کہی سی ایناں نوں' کر کے وکھا تا سی جنے او'' اور فرشتے بھی اس کو جان لیتے ہیں کہ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اس قابل تھا کہ اس کو یہ مقام عطا ہوتا۔ دونوں پھول نچھاور کر رہے ہیں تحسین و آفرین کے۔ **هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ** (33:43)۔ یہی ہے وہ پھول نچھاور کرنے کا مقام جس میں کہا ہے کہ **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز** (48:29) **تَرٰهُمْ** یہاں لفظ آیا ہے۔ محسوس طور پہ تو ان کو دیکھے گا کس طرح تیری اطاعتوں کے اندر سرِ تسلیم خم کیے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ نہیں کہ رہبانیت کی فقیروں کی گداگروں کی کوئی جماعت ہے۔ **یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ** (48:29) تلاشِ معاش کے اندر بھی وہ تمام دنیا کے اندر پھرتے چلے جا رہے ہیں دین اور دنیا دونوں کو اکٹھا کر رہے ہیں۔ بلکہ اقبالؒ کے الفاظ میں

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی لے کے دنیا کا ہر دروازہ کھولتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز (48:29) دونوں چیزیں: صرف معیشت ہی حاصل کرنے کی فکر نہیں ہے' ساتھ یہ بھی ہے کہ قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی بھی رہے ہر قدم کے اوپر' یہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ **سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط** (48:29) جو میں نے کہا تھا یہ جو تسلیم و رضا' یہ جو خدا کے قوانین کے سامنے جھکنے کی کیفیتیں ہیں' وہ ان کے آثار ان کے چہروں پہ نظر آ جاتے ہیں' ڈھکے چھپے ہوئے نہیں ہیں یہ صاحب۔

ایک جامع مثال میں صدرِ اول کی تاریخ کا نچوڑ

ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ (48:29) اس قسم کے اللہ والوں کی مثالیں نئی بات نہیں ہے۔ جہاں جہاں بھی یہ اس قسم کی جماعتیں بنی ہیں' وہاں ان کی مثالیں ملیں گی۔ انجیل اور تورات میں ان کی مثالیں تمہیں ملیں گی۔ وہاں بھی یہ چیز پیدا ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد ہے محسوس مثال **کَزَرْعٍ** (48:29) ساری تاریخ جو تھی اسلام کی' وہ صدرِ اول کی' چند لفظوں میں سمٹا دیا۔ ایک طیب بیج وہ تم نے بویا' اس نے ایک ننھی سی سوئی نکالی **اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ** (48:29) اس کی پرورش کی نگہ داشت کی' اس کے اپنے اندر یہ صلاحیت تھی بڑھنے پھولنے کی' مناسب ماحول ملا' وہ ٹہنی آگے بڑھی **فَاسْتَغْلَظَ** (48:29)

مضبوط ہوئی فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ (48:29) جم کے کھڑی ہوگئی اپنے تنے کے اوپر بھرپور‘ وہ پھل لائی‘ فصل دی اور اس کیفیت سے کہ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (48:29) کسان کا دل اس کو دیکھ کے باغ باغ ہوگیا۔ اگر یہ کسان خود خدا ہے‘ اس کا دل باغ باغ ہوتا ہے‘ اگر خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ ہیں‘ ان کا دل باغ باغ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں پوری انسانیت اس کے لیے کسان تھی‘ ساری انسانیت کے لیے یہ رحمت للعالمین تھا‘ انسانیت کے دل باغ باغ ہوگئے۔ کیسی حسین‘ کیسا عمدہ طیب بیج بویا‘ کیسی حسین فصل اگی‘ کیسا رحمت للعالمین پھل دیا اس زمین نے۔ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ط (48:29) مخالفین کے سینے کے اوپر مونگ دَلے جانے لگے‘ جل اٹھے ان کے سینے جو حسد کرتے ہوئے تھے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (48:29) اور آگے بات جو قرآن کا انداز ہوتا ہے کہ یہ کچھ مختص ان ہی تک نہیں تھے‘ وہ ہوئے چلے گئے‘ جو بھی تم میں سے ایمان لائے گا ان کی روش اختیار کرے گا یہی کچھ ان کے لیے بھی ہوگا۔ عزیزانِ من! یہ جماعت ہے محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کی۔ اب ان کے متعلق قرآن کہتا ہے حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ط (3:179) چھانٹ کے الگ کر دیا۔ اس لیے ان شہادات کی بنا پر‘ ہمارا ایمان ہے‘ قرآن کے بیان کردہ حقائق کی بنا پر ہمارا ایمان ہے‘ محض کسی ذہنی عقیدت یا جذبے کی بنا پر نہیں ہے قرآن کی شہادت کی بنا پر ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں حضور ﷺ کی تشریف براری سے پہلے یہ کیفیت پیدا ہو چکی تھی کہ طیب اور خبیث الگ ہوگئے تھے۔ جنہیں قرآن نے والذین معہٗ کہا ہے‘ وہ یہی طیبین کی جماعت تھی جن کے متعلق کہا ہے کہ مومنِ حقا تھے جن کے متعلق کہا ہے کہ ان کو مغفرت‘ اجرِ عظیم‘ جنت کی بشارتیں یہ ساری کی ساری قرآن نے ان کے لیے بیان کر دی ہیں۔

قرآنِ حکیم کی شہادت کے برعکس ہمارے ہاں کے تاریخی بیانات کی نوعیت

قرآن یہ کہتا ہے اور اس کے بعد ہمارے ہاں تاریخ آ جاتی ہے۔ تاریخ اٹھا کے دیکھیے تو یہی جو جماعت جس کے متعلق قرآن یہ کچھ کہہ رہا ہے‘ ان کے متعلق وہ کچھ لکھا ہوا ہے کہ کوئی شخص جو قرآن پہ یوں ایمان رکھتا ہے‘ وہ تو چھوڑ دیجیے کوئی شخص جو کریکٹر اور سیرت کو کوئی عظمت دیتا ہے دل کے اندر‘ وہ ان چیزوں کو پڑھ نہیں سکتا انہی صحابہؓ کے متعلق۔ ان کے متعلق جن کے متعلق کہا کہ اے رسول! تیرے لیے خدا اور یہ جماعت کافی ہے‘ اس جماعت کے متعلق یہ کچھ لکھا ہوا ہے۔ دو چار پانچ سات تو اس میں سے استثنا کر دی گئی ہے اور باقیوں کے متعلق پوچھو ہی نہیں صاحب کیا کیفیت ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ سب کے سب (معاذ اللہ) منافق ہی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی آنکھ بند ہوئی اور سارے کے سارے پھر سے اسی کفر کی روش کے اوپر چل پڑے (معاذ اللہ)۔ میں تفصیل میں

نہیں جانا چاہتا' تفصیل میں آپ دیکھنا چاہتے ہیں میں نے اسے لکھا ہوا ہے ''سلیم کے نام خطوط'' میری ایک کتاب ہے' اس میں یہ تفصیل درج ہے کہ ہماری تاریخ میں ان کے متعلق کیا کچھ لکھا ہوا ہے۔

تاریخ کے میدان میں ملتِ اسلامیہ کے ساتھ ہونے والی سب سے بڑی اور گہری سازش کا ذکر اور اس کی نوعیت

یہ سوال بڑا اہم ہے لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر بات صاف کرتا جاؤں تاکہ آپ کے ذہنوں میں خلجان کوئی نہ رہے۔ اسلام کے متعلق اور صدرِ اول کے یہ جو مؤمنین حقا تھے جو اسلام کا مثالی نمونہ انہوں نے قائم کیا تھا کہ یہ عملی نظام اس قسم کا ہوگا۔ ذہنوں کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے جو ہمارے ہاں ایک بڑی سازش ہوئی وہ تاریخ ہے آپ کی۔

تاریخ آپ کی تین سو سال کے بعد مرتب ہوئی ہے۔ پہلی تاریخ آپ کے ہاں جو جامع ہے' امام طبری کی ہے۔ تین سو سال کے بعد بغیر کسی WRITTEN RECORD کے کوئی لکھا ہوا میٹریل نہیں۔ تو سوچیے کہ اس کی حیثیت کیا ہوتی؟ ایک انسان ایک شخص ہے وہ اٹھتا ہے' خدا کا نبی نہیں ہے' وہ ایک تاریخ مرتب کرتا ہے بغیر کسی WRITTEN RECORD کے۔ اور اس کی پوزیشن آپ کے ہاں پھر یہ ہو جاتی ہے کہ قرآن کی صحیح آیت ایک طرف آپ رکھیے اور اس کے خلاف تاریخ میں جو ہوتا ہے اس کو بیان کر دیتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ دیکھیے نا یہ تھے وہ لوگ تو۔ ارے بھئی! کہاں سے تم نے لیا؟ کہنے لگے دیکھیے نا فلاں تاریخ میں ہے۔ بس ان تاریخ لکھنے والوں کے نام کے ساتھ امام آپ نے لگایا آخر میں کہا رحمتہ اللہ علیہ اور وہ قرآن سے بھی اوپر ہو گئی۔ اب آپ کا قرآن ان تاریخوں کے نیچے چل رہا ہے۔ قرآن کی جو آیت آپ کے تاریخ کے کسی بیان کی تائید کرتی ہے' وہ تو ٹھیک ہے قرآن کی آیت ہے اور جہاں دونوں میں تضاد واقع ہوتا ہے' تاریخ کا بیان صحیح ہے قرآن کی آیت اس کے تابع چلے گی اور اکثر و بیشتر تو منسوخ ہی ہو جائے گی۔ ایک طرف خدا کی کتاب وحی کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو ملی۔ حضور ﷺ نے اس کو مکمل شکل میں امت کے حوالے کیا خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اور دوسری طرف ایک انفرادی کوشش کسی شخص کی' وہ اٹھ کے آپ کی تاریخ لکھتا ہے' تین سو سال کے بعد لکھتا ہے۔

صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کے مابین سر پھٹول کی بنیادی وجہ ہماری مرتب شدہ تاریخ ہے

یہ جتنی چیزیں مستند آپ کے ہاں جسے میں نے تاریخ کہا ہے' کتبِ روایات بھی اس میں شامل ہیں' کتبِ تاریخ بھی اس میں

شامل ہیں۔ نام ہی مختلف ہیں' ان کے دونوں میں تاریخ ہے دونوں اسی طرح سے لکھی ہوئی ہیں۔ کوئی اڑھائی سو سال بعد' بخاری شریف اڑھائی سو سال بعد' طبری کی پہلی تاریخ جو ہے وہ تین سو سوا تین سو سال کے بعد۔ اور قرآن کی پہلی تفسیر بھی امام طبری نے لکھی ہوئی ہے تین سو سال کے بعد' وہ قرآن کی آیت کی تفسیر اپنی تاریخ سے کرتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کہاں گھپلا ہے۔ یہ جتنے آپس میں سر پھٹول ہو رہے ہیں نا' یہ سارے تاریخی شواہد کی بنا پر ہو رہے ہیں۔ یہی جماعتِ مؤمنین' یہی جماعتِ صحابہؓ قرآن کے الفاظ میں جن کی یہ پوزیشن میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے' ان ہی کے متعلق ان تاریخوں میں ان سنیوں کو بھی مواد مل جائے گا مخالف میں' شیعہ حضرات کو بھی مواد مل جائے گا۔ تاریخ کو یہ مقام ہی آپ نے کیوں دیا؟

تاریخ کو پرکھنے کا معیار

تاریخ کا مقام تاریخ ہے۔ انسانوں کی ایک کوشش ہے' غلط بھی ہے' صحیح بھی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوگا کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے؟ اگر تو عام انسانوں کی کوئی تاریخ یعنی انسانوں کے متعلق تاریخ' عام انسانوں کے متعلق کوئی تاریخ' ہو تو ٹھیک ہے ہسٹری کی بنا پر تاریخ کے جو معیار ہیں' ان معیاروں کے مطابق تاریخ کو پرکھو۔ روز HISTORIAN یہ کرتے ہیں دنیا میں ہسٹری اسی طرح سے لکھی جاتی ہے اس کو پرکھا بھی جاتا ہے۔ کئی معیار ہیں اس کے۔ ہمارے ہاں ایک دور ایسا ہے جس کو ایک خصوصیت حاصل ہے' دورِ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ ان کے متعلق قرآن میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ ان حضرات کی تاریخ جو ہے وہ قرآن کی رو سے مرتب ہوگی۔ تاریخ میں جو کچھ آیا ہے' اسے قرآن کی روشنی میں پرکھو۔ جو اس کے مطابق وہاں نظر آتا ہے سمجھ لو کہ وہ صحیح ہو سکتا ہے۔ جو اس کے خلاف جاتا ہے' اٹھا کے پھینک دو اس لیے کہ خدا کی کتاب کے خلاف جاتا ہے۔ دلیل یہ ہے ہمارے پاس' ہمارا ایمان ہے اس کے اوپر کہ اس کا ایک ایک لفظ سچا ہے ہمارا ایمان قرآن پہ ہے ہمارا ایمان قرآن لانے والے پہ ہے۔ ہمارا ایمان نہ امام بخاری پہ ہے نہ امام طبری پر ہے۔ وہ انسان تھے انہوں نے اپنی کوشش کی غلط بھی ہے' صحیح بھی ہے۔ معیار یہ ہے اس دور کے متعلق جو کچھ اس میں آئے جس کے متعلق قرآن نے کچھ کہہ دیا ہے' یہ معیار ہو گیا۔ اور اس کے بعد جو باقی دور آتا ہے وہ عام انسانوں کی تاریخ ہے' عام انسانوں کی تاریخ کی طرح پرکھتے پھرو۔ ان کے متعلق ہم نہ مکلّف ہیں کسی قسم کے' نہ ہم پہ کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم ان کی DEFENCE پیش کرتے چلے جائیں' ان کی مدافعت پیش کرتے چلے جائیں۔ قرآن تو ایسے مقام پہ لے آتا ہے۔ یہ جو ہیں ان کے متعلق یہ کہا تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ج لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ج وَ لَا تُسْــَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:141) بڑی عظیم چیز ہے قرآن نے جو بیان کی ہے۔ کہا خواہ مخواہ کے لیے تاریخی بیانوں کے اوپر آپس میں سر پھٹول کیوں

ہوتے ہو؟ یہ کہو کہ یہ کچھ قومیں تھیں جو اس سے پیشتر چلی گئیں جو کچھ انہوں نے کیا' ان کے وہ ذمہ دار ہیں۔ اچھا کیا' اچھے نتائج مل جائیں گے' خراب کیا تھا' خراب نتائج مل جائیں گے۔ جو کچھ تم کرو گے تم اس کے ذمہ دار ہو۔ اور اگلی چیز ہے وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:141) ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ کہا وہ تمہارے نصاب میں ہی نہیں ہے ہم پوچھیں گے نہیں۔ اور ہماری ہزار سال سے پوری کوشش امت کی یہ ہے کہ ان ہی کے متعلق یہ سب کچھ کرتے چلے جا رہے ہیں' پوچھا جائے گا کہ پہلا خلیفہ کس کو ہونا چاہیے تھا؟ وہ کہتا ہے ہم نہیں پوچھیں گے۔ پوچھا جا رہا ہے فلاں امام کے متعلق تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ کہتا ہے ہم نہیں پوچھیں گے۔ یہ ٹیکسٹ سے باہر ہے اور یہ امت یہ کہہ رہی ہے ''تیرا کی اعتبار ہیگا اے او تھے سارا کچھ پوچھیں توں ایہد ے متعلق فیر اسی فیل ہو جایئے' تے فیر کی کراں گے''۔ کہتا ہے وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:141) او بابا! ہم نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا۔ ساری آپ کی امت کی کوشش ہزار سال کے اندر ان حضرات کے متعلق جن کے متعلق وہ ہم سے پوچھے گا ہی نہیں۔ ان ہی کے متعلق کہ ان کا عقیدہ کیا تھا' وہ کفر تھا' وہ شرک تھا' وہ یہ تھا ان ہی حضرات کے متعلق اشخاص کے متعلق۔ اور جن کے متعلق قرآن نے شہادت دی ہے' قرآن کی شہادت کے خلاف تاریخ کی شہادت کو سند پیش کیا جا رہا ہے۔ ''یا اللہ اس قوم نوں کی ہو گیا ہیگا اے''۔ ہو کیا گیا ہے؟ عزیزانِ من! ذرا سی فکر کی بات جو تھی سوچنے کی چیز جو تھی جب وہ چھوڑ دیا جائے تو اس کے بعد پھر یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے تاریخ اور قرآن کی باہمی پوزیشن۔ پھر سن لیجیے قرآنِ کریم میں جس شخص' جس شئے' جس واقعہ' جس حقیقت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے' قرآن پر ایمان لانے والے کا ایمان ہے کہ وہ صداقت اور سچائی ہے۔ ساری دنیا کی شہادتیں اس کے خلاف لے آیئے' اس کو ہم ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں وہ آپ کی کتبِ روایات میں ہو' وہ آپ کی کتبِ تاریخ میں ہو' ہم نہیں مانیں گے۔ قرآن کو ماننے والا سیدھی سی بات ہے' جس چیز کے متعلق قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے' وہ دین نہیں ہے' وہ عام بات ہے۔ اس کے متعلق عام طریقے جتنے بھی ہیں دنیا میں علوم کے سائنس کے اس کے مطابق پرکھتے پھرو۔ ٹھیک ہے کسی کو مومن ثابت کرو کسی کو کافر ثابت کرو۔ مجھ سے تو میرا خدا پوچھے گا نہیں کہ تمہارا ان کے متعلق کیا عقیدہ ہے۔ تمہیں اگر یہ ہے کہ تم سے پوچھے گا تو جاؤ سر کھپاؤ اپنا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اشخاص پرستی سے کتنا اونچا لے جاتا ہے قرآن۔ صرف قرآن۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرت دنیائے انسانیت کے لئے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے

عزیزانِ من! یہ وہ چیز ہے کہ قرآن نے جن کے متعلق وہ چاہتا تھا کہ یہ صحیح عقیدہ یا صحیح خیال رکھتے ہیں' انہیں چھوڑ نہیں دیا۔ ان کے متعلق خود قرآن کے اندر یہ چیزیں دے دی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت' اس کو اسوہ قرار دیا ہے' ماڈل قرار دیا ہے۔ کبھی

آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ڈرائنگ کی کلاس میں وہ ماسٹر بچوں سے یہ کہے کہ اس ماڈل کے مطابق سکیچ کھینچو اور بچے دیکھیں تو ماڈل ہو ہی نہ سامنے؟ اسے وہ ماڈل سامنے رکھنا ہوگا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے اندر خدا یہ کہے کہ رسول کی زندگی تمہارے لیے ماڈل ہے اور پھر ہم اس ماڈل کو تلاش کرتے پھریں کہ صاحب کہاں ہے؟ اور پھر وہ ماڈل سنیوں کا ماڈل کچھ اور شیعوں کا کچھ اور حنفیوں کا کچھ اور فقیروں کا صوفیا کا کچھ اور اہلِ طریقت کا کچھ اور یعنی وہ ماڈل ہی مختلف۔ می نہ سزد خدائے را۔ اگر اس نے کہا ہے کہ وہ ماڈل ہیں تو اس کا فریضہ ہے کہ اس ماڈل کو دے۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر لکھی جانے والی کتاب از پرویزؒ

عزیزانِ من! اس ماڈل کو اس نے قرآن کے اندر دیا ہے۔ سیرتِ محمد ﷺ ایک اصولی اعتبار سے پوری کی پوری قرآن کے آئینے کے اندر سامنے آجاتی ہے۔ یہ چیز محض عقیدے کی بنا پہ نہیں کہہ رہا اللہ کی توفیق کے سامنے سرِ نیاز جھکا کے یہ کہتا ہوں میں نے یہ کوشش کی کہ قرآنِ کریم سے سیرتِ نبوی ﷺ مرتب ہو جائے۔ پانچ سو صفحے کی ضخیم کتاب موجود چھپی ہوئی آپ کے سامنے ہے ''معراجِ انسانیت'' اس میں آپ کو قرآن اور تاریخ کا صحیح تطابق نظر آئے گا۔ اوپر عنوان ہے قرآن کی ایک آیت رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے متعلق اس کے نیچے روایات اور تاریخ سے جو چیزیں اس کے مطابق ملتی ہیں' اس کے اندر وہ لاتا چلا جا رہا ہوں۔ ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی سیرت نظر آجاتی ہے۔ خدا نے ماڈل دیا ہوا ہے کوئی بات ہے؟ وہ کہے کہ ماڈل ہے تمہارے لیے اور ماڈل ہی نہ دے وہ۔ عزیزانِ من! یہ ہے تاریخ کا اور ہمارا تعلق کہ وہ حصہ جس کے متعلق قرآن نے کچھ کہا ہے معیار اور سند یہ ہے۔ جس کے متعلق قرآن نے کچھ نہیں دیا ہے' وہ دین نہیں ہے۔ اس کو عام معیاروں اور سندوں کے متعلق پرکھو اور اس کے متعلق ہم سے سوال نہیں ہوگا۔ فلاں امام کے فلاں عقیدے کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ معتزلہ کیسے تھے اور خوارج کیسے تھے؟ کہیں گے کہ صاحب! قرآن میں یہ چیز نہیں ہے' تاریخ کا سوال ہے۔ ان کے عقائد جو ان کی طرف منسوب ہیں' ان کو بھی ہم قرآن کی روشنی میں دیکھیں گے' جو صحیح نظر آئے گا' کہیں گے صحیح ہے۔ جو غلط نظر آئے گا کہیں گے غلط ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ ان کے مومنِ حقا ہونے کی شہادت قرآن دیتا ہے۔ کوئی ایسی چیز جو ان کے مومنِ حقا ہونے کی شان کے ذرا خلاف جائے گی ہم اس کو اٹھا کے پھینک دیں گے اس لیے کہ قرآن کی شہادت کے خلاف ہے۔ **حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ** ط (3:179)۔ یہیں بات قرآن نے جو میں نے ابھی کہا تھا نا کہ اس کے لیے قرآن نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان کے نام بتا دیے ہوں ان کو۔ یہیں ہے آیت کا باقی حصہ دیکھیے وہی (3:179) جہاں سے درسِ قرآن شروع کیا ہے آگے آیے اس کے بعد۔ **وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ**

عَلَی الْغَیْبِ (3:179) ہم یہ نہیں کرنے کے کہ تمہیں غیب کی بات بتا دیتے کہ فلاں فلاں منافق ہیں، ان سے بچ کے رہنا، ہم یہ نہیں کرتے غیب کی بات ہم کسی کو نہیں بتاتے۔

غیب کا علم صرف رسولوں کو صرف وحی کے ذریعے ہی دیا جاتا تھا

عزیزانِ من! صحابۂ کبارؓ کے متعلق پہلی چیز اہم وہ آئی ہے جو میں نے ابھی بتائی ہے اور یہ ہمارا ایمان ہے۔ یہ اگلی اور بڑی اہم آئی ہے بڑی غور طلب ہے یہ۔ خدا تمہیں غیب کا علم نہیں دیتا۔ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَجۡتَبِیۡ مِنۡ رُّسُلِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ص (3:179) ہاں غیب کا علم رسولوں کو وہ دے دیتا ہے۔ اب یہاں ایک بڑی اہم بات آئی۔ غیب کا علم قرآن نے کہا ہے کہ کسی کو نہیں دیا جاتا، کسی کو غیب کا علم نہیں دیا جاتا، صرف رسولوں کو دیا جاتا ہے۔ یاد رکھیے گا ان چیزوں کو بڑا اہم نتیجہ اس کا اس کے سامنے آئے گا۔ ایک تو یہی آیت جو (3:179) میں نے کہی ہے مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطۡلِعَکُمۡ عَلَی الۡغَیۡبِ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَجۡتَبِیۡ مِنۡ رُّسُلِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ص (3:179)۔ یہیں سے معلوم ہو گیا۔ دوسری آیت عٰلِمُ الۡغَیۡبِ (72:26) خدا کی صفت ہے غیب کا جاننے والا۔ فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا (72:26) وہ اپنے غیب کی بات کسی کو نہیں بتاتا۔ الفاظ یاد رکھیے گا فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا لا (72:26) کسی کو نہیں بتاتا۔ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ (72:27) سوائے اپنے رسولوں کے اور وہ بھی ان معاملوں میں جن میں وہ چاہے کہ وہ دے۔ یہ اور بات ایک اہم کہہ دی۔ یہ بات جو کہی گئی کہ رسولوں میں سے بھی جس بات کو وہ چاہے یا جس بات کو پسند کرے، صرف وہ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ رسول کی بھی ساری زندگی یہ نہیں ہوتی کہ وہ ہر بات غیب کی جانتا ہے وہ، نہ۔ جتنا علم غیب کا خدا کو دینا مقصود ہوتا ہے، وہ اتنا ہی رسول کو دیتا ہے۔ اور جب خدا رسول کو یہ علم دیتا ہے تو اسے وحی کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے وضاحت سے یہ بات کہہ دی کہ رسول کو بھی جو غیب کی بات بتائی جاتی ہے تو وہ صرف وحی کے ذریعے بتائی جاتی ہے۔ حضرتِ مریمؑ کے واقعات، کوائفِ زندگی بیان ہوتے چلے آ رہے ہیں اور اس کے بعد یہ کہا جا رہا ہے کہ ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ ط (3:44) اے رسول! یہ غیب کی خبریں ہیں نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ (3:44) ہم وحی کے ذریعے تمہیں بتا رہے ہیں۔ اور آگے چلیے۔ یعنی یہاں سے معلوم ہوا کہ خدا غیب کا علم کسی انسان کو نہیں دیتا، صرف رسولوں کو دیتا ہے۔ رسولوں کو بھی وحی کے ذریعے جتنا دیتا ہے، صرف اتنا دیتا ہے، اس سے زیادہ نہیں دیتا۔

علمِ غیب اور نبی اکرم ﷺ کی عظیم ہستی کا مقام

رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے جو علم ملا وہ قرآن کے اندر آ گیا۔ اس سے زائد نہیں۔ کتنی صاف باتیں ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ''اس سے زائد نہیں'' میں نے عرض کیا ہے قرآن کی آیت ہے قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ (6:50) ان سے کہہ دو کہ میرے پاس اللہ کے کوئی خزانے نہیں ہیں۔ اعلان کرایا جا رہا ہے رسول کی زبان سے کہ میرے پاس کوئی خزانے نہیں ہیں۔ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (6:50) اور نہ ہی میں غیب کا علم جانتا ہوں۔ اندازہ لگایئے کتنا بڑا اعلان ہے اور اپنی طرف سے بھی نہیں قرآن کے اندر یہ اعلان کرا دیا کہ قیامت تک محفوظ رہے یہ کہ نہیں بھئی نہیں جانتا۔ اور وضاحت ہے آگے۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ (7:188) ان سے کہہ دو کہ تمہارے لیے تو ایک طرف رہا میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع نقصان پر اقتدار نہیں رکھتا بجز خدا کی مشیت کے قانون سے۔ کیا مقام ہیں؟ اور آگے ہے وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ (7:188) اگر مجھے کہیں غیب کا علم ہوتا تو دنیا بھر کی دولت سمیٹ لیتا میں۔ مجھے غیب کا علم نہیں ہے۔ وَ مَا مَسَّنِىَ السُّوْٓءُ (7:188) دنیا کی دولت بھی سمیٹتا اور کوئی تکلیف ہی مجھے نہ پہنچتی کہ پہنچنے والی تکلیف کے متعلق پہلے علم ہو جاتا بس ٹھیک ہے' پہنچتی کیسے۔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (7:188) ارے بھئی! میں تو ایمان لانے والوں کے لیے صرف بشیر اور نذیر کی حیثیت رکھتا ہوں۔ یہ بتاتا ہوں کہ اس عمل کا نتیجہ یوں خرابی ہوگا' اس عمل کا نتیجہ یوں بھلائی ہوگا۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں اتنا ہی کرتا ہوں' میں غیب کا علم نہیں جانتا۔ اور خدا نے کہہ دیا کہ جتنا حصہ تمہیں غیب کے علم میں سے دینا ہوتا ہے' وحی کے ذریعے تمہیں بتایا جاتا ہے۔ یہاں کہا حضرتِ مریمؑ کے کوائفِ زندگی میں کہ یہ غیب کی باتیں ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ماضی کے واقعات' تاریخ کے واقعات جن کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو' علم حاصل کرنے کا' ان کے متعلق بھی خدا جو کچھ بتاتا ہے اسے غیب کہا اور جو آنے والے واقعات ہیں وہ تو سارے غیب میں ہوتے ہیں۔ اسی لیے خدا نے اپنے آپ کو عالم الغیب والشہادۃ کہا ہے۔ شہادت جو مشہود ہو کے سامنے آ جائے۔ غیب جو ہنوز سامنے نہ آئے ہوئے ہوں' آنے والے مستقبل کا ہر واقعہ جو ہے وہ غیب کا علم ہوتا ہے۔ یہ آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ کسی کو بھی خدا غیب کا علم نہیں دیتا بجز رسولوں کے اور رسول کو بھی وہ جو وحی کے ذریعے دیا گیا ہو۔ بات صاف ہوگئی۔

آنے والے واقعات کے متعلق علمِ غیب کی نوعیت اور انسانی علم کی حدود

اب آنے والے واقعات کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط (31:34) بات سامنے آئی ہے تو کچھ ذرا سی اور بات کرہی دوں شروع میں اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ج (31:34) الساعت جو ہے اس کا علم خدا ہی کو ہے وہ جو آنے والا انقلاب ہے اتنا بڑا یعنی اس کا علم کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ط (31:34) وہ بارش برساتا ہے وہ جانتا ہے کہ رحموں کے اندر کیا ہے۔ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب! بارش کے متعلق بھی SCIENTIFICALLY بتایا جاسکتا ہے اور یہ چیز کہ رحم میں کیا ہے وہ تو اب یوں دیکھا جاسکتا ہے سائنس اتنی ترقی کرگئی ہے۔تو یہ کیسے ہوا؟ عزیزانِ من! قرآن ہے اتنے حصے کے متعلق خدا نے صرف کہا ہے اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ج (31:34) آنے والا وہ جو انقلاب ہے اسے قیامت کہیے یا جو ہونے والے واقعات ہیں صرف اس کے متعلق کہا ہے کہ صرف خدا کے پاس ہے۔ یہ جو دو چیزیں ان کے متعلق یہ نہیں کہ ان کا علم صرف ہمارے پاس ہے' تمہیں نہیں علم ہوسکتا۔ میں یہ بات کہہ رہا تھا کہ آج کل یہ چیز کہی جاتی ہے کئی لوگ اعتراض لائے اس کے متعلق کہ صاحب! وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ط(31:34) ٹھیک ہے خدا کو بھی اس کا علم ہے انسانوں کو بھی اس کا علم دے دیا گیا ہے' انسان سائنس کے ذریعے علم حاصل کرسکتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں کہا ہے کلّی طور پہ کہ اس کا بھی ہمیں ہی علم ہے' تمہیں نہیں علم ہوسکتا یا در کھیے قرآن کی اس آیت کو۔ بات آگئی جو میں کہنا چاہتا تھا۔"کل کیا ہوگا؟" اسے کہتے ہیں نا مستقبل کا علم' اسے کہتے ہیں نا غیب کا علم۔ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط (31:34) کوئی شخص نہیں یہ بات جان سکتا' یقین سے کہہ سکتا کہ میں کل کیا کروں گا۔ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ط (31:34) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا' جان سکتا کہ کس سرزمین میں اس کو موت آئے گی۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (31:34) علیم اور خبیر خدا ہی ہے۔ یہاں یہ چیزیں کہی ہیں مستقبل کے علم کے متعلق کہ کوئی شخص نہیں جان سکتا۔

مستقبل کے علم کے متعلق پیشین گوئیاں کرنے والوں کا مقام قرآنِ حکیم کی نظر میں

عزیزانِ من! قرآن کی یہ آیات ہمارے سامنے ہیں۔ پھر دہرادوں کہ غیب کا علم خدا کو ہے' وہ کسی کو نہیں دیتا صرف رسولوں کو دیتا تھا وہ بھی جو وحی کے ذریعے دیتا تھا۔ رسالت ختم ہوگئی' نبوت ختم ہوگئی لہٰذا یہ بات ختم ہوگئی علم دینے والی جو ہے مستقبل کے متعلق۔ لیکن اس کے بعد آپ کو معلوم ہے کہ اسی قرآن کی حامل قوم' روز پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں آپ کے ہاں۔ یہ اللہ کے بڑے

بڑے جو مقرب بنے پھرتے ہیں اور پھر مامور من اللہ ہمارے ہاں آ جاتے ہیں' مجدد سہی نبی کا دعویٰ کرنے والے۔ سارے دعوے کی بنیاد پیشین گوئیوں کے اوپر۔ پیشین گوئی کے معنی ہیں کل کے آنے والے مستقبل کے آنے والے واقعات کا علم رکھنا' غیب کا علم رکھنا۔ عزیزانِ من! قرآن کی موجودگی میں پیشین گوئی' نہ کہنے والا سوچتا ہے نہ سننے والے سوچتے ہیں۔ یہ نصوصِ صریحہ قرآن کی۔ عزیزانِ من! جو شخص بھی پیشین گوئی کا دعویٰ کرتا ہے (خدا کو ماننے والوں کی میں پہلے بات کر رہا ہوں) ان میں سے جو شخص بھی قرآن پہ ایمان رکھتا ہے اگر وہ پیشین گوئی کا دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے علم ہو گیا ہے مستقبل میں آنے والے کسی واقعہ کا تو وہ رسالت کا دعویٰ کرتا ہے کیوں کہ قرآن نے کہا ہے کہ رسول کے علاوہ کسی کو ہم علم نہیں دیتے۔ اور رسالت میں سے بھی دعویٰ وحی کا کرتا ہے کیوں کہ اس نے کہا ہے کہ رسول کو بھی وحی کے ذریعے علم دیتے ہیں۔ وہ رسالت کا دعویٰ وحی کا دعویٰ۔ اور اگر وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا تو پھر (معاذ اللہ) وہ کہتا ہے کہ خدا نے یہ غلط کہا ہے کہ غیرِ رسول کو ہم غیب کا علم نہیں دیتے' میں رسول نہیں ہوں غیب کا علم مجھے خدا دے رہا ہے۔ سوچو تو سہی قرآن کے ماننے والے جو ہیں' وہ ایک سیکنڈ کے لیے یہ خیال بھی ذہن میں لا سکتے ہیں کہ یہ واقعی پیشین گوئی کا علم خدا ان کو دیتا ہے؟ دعویٰ رسالت کیجیے کھلے بندوں آیے میدان میں۔ لیکن عجیب قوم ہے وہ پیشین گوئیوں کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ قوم کھڑے ہو کے یہ نہیں کہتی ہے کہ صاحب! یہ قرآن کی مخالفت ہے' خدا کی مخالفت ہے' یہ دعویٰ رسالت ہے۔ اس کے بعد بحث اس پہ ہوتی ہے کہ پیشین گوئی پوری ہوئی تھی یا نہیں ہوئی تھی۔ یعنی اس کے امکان کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اسے جھوٹا کہتے ہیں یہ کہہ کے کہ تیری پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی۔ او بابا! دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے' پیشین گوئی کا دعویٰ ہی خلافِ قرآن ہے اس کے متعلق میں کہتا ہوں مناظرہ کرنا جو ہے پرکھنے کے لیے کھڑے ہو جانا جو ہے' یہ قرآن کے خلاف ہے۔ بعینہ جس طرح سے نبی اکرم ﷺ کے بعد دعویٰ نبوت کرنے والے کے متعلق کھڑے ہو کے مناظرہ کرنا پرکھنا کہ تیرا دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا' قرآن کے خلاف ہے۔ ایک سانس میں بات کہہ دینی چاہیے۔ قرآن ختم نبوت ﷺ کرتا ہے اس واسطے قرآن کے بعد نبوت کے متعلق کچھ کہنا' قرآن کے خلاف ہے۔ یا قرآن کا انکار کرو اور باہر چلو' وہاں تم سے انسانوں کے لیول کے اوپر ہم گفتگو کریں گے۔ قرآن کو ماننے کے بعد کہتے ہو تو قرآن کا انکار ہے' ہم تم سے گفتگو ہی نہیں کر سکتے۔ عزیزانِ من! اسی طرح پیشین گوئیوں کے دعوے کرنے والے جو ہیں اگر وہ مسلمان کی حیثیت سے آپ کے سامنے وہ آتا ہے تو اس کے متعلق یہ بات کرنا کہ آؤ ہم پرکھتے ہیں تمہاری پیشین گوئی پوری ہوئی ہے یا نہیں' دونوں ہی قرآن کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ قرآن اٹھا اٹھا کر کہتا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے یہ علم حاصل ہوا ہے۔ اس سے کہو کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ رسول کو وحی کے ذریعے علم دیا جاتا ہے۔ کرو

دعویٰ اس کا سیدھی سی بات کرو۔ کہ جی نہیں من نیستم رسول۔ اوجب رسول نہیں ہوتو یہ غیب کا علم کیسے حاصل ہو رہا ہے؟

انسانوں کے تمام نظریوں کو قرآنِ حکیم کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا

لیکن اسے کیا کہیے یہ قوم ہزار برس سے یہ مانتی چلی آ رہی ہے کہ یہ جتنے بڑے بڑے مقربین ہیں ''سائیں گھوڑے شاہ تے لسوڑی شاہ سب نوں پیشین گوئیاں ہوندیاں نیں' جاندے ای اوہناں دے کول ایس واسطے نیں کہ بابا اے کم ہوئے گا یا نہیں ہوئے گا' مقدمہ جتیا جائے گا یا نہیں جتیا جائے گا'' یعنی مستقبل میں ہونے والی باتوں کے متعلق پوچھنے جاتے ہو۔ ہزار برس سے یہ قوم جارہی ہے اوران کو مقربینِ بارگاہِ خداوندی کہتے ہیں۔ نہ ان مقربین کو یہ پتہ ہے کہ یہ قرآن کیا کہتا ہے' وہ بھی کہتے چلے جارہے ہیں' نہ پوچھنے والوں کو یہ علم ہے کہ ہم کیا کہتے ہیں اور دونوں روز قرآن کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔ اللہ اکبر۔ اور پھر انکوائری کمیٹیاں بٹھاتے ہیں کہ ہماری یہ حالت کیوں ہوگئی ہوئی ہے۔ اب یہ بات کہیے تو اس کے بعد پھر وہی شخصیت پرستی کہ صاحب یہ اتنے اتنے بڑے اولیائے کرام غوث اور قطب اور ابدال اور پتہ نہیں کیا کیا نام۔ اَسۡمَآءٌ سَمَّيۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ (53:23) چند نام ہیں جو تم نے رکھ لیے ہیں۔ عزیزانِ من! کچھ بھی کیوں نہ نام رکھ لیں اور آپ کوئی بھی مرتبہ اس کو کیوں نہ دے دیں' قرآن کے خلاف اگر کوئی شخص یہ جاتا ہے اس کا مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں ہے چہ جائیکہ آپ اس کو مقربِ بارگاہِ خداوندی قرار دے دیں۔ ایک ہی کسوٹی ہے اس آسمان کے نیچے۔ باطل ہے اس کا دعویٰ۔ جرأت کرکے یا اپنے آپ کو رسول کہے' یہ نہیں کہتا۔ خدا کہتا ہے کہ غیرِ رسول کو کسی کو ہم غیب کا علم نہیں دیتے۔ اب رہے وہ کہ جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں' عام طور پہ صاحب وہ ہر سال وہ جاری ہوتی ہیں' وہ فلاں نے پیشین گوئی ہے' فلاں پیشین گوئیاں کرتا ہے یہ سارا کچھ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ علم کے درجے پہ یہ بات غلط ہے۔

غیب کے علم کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا فیصلہ

قرآن کہتا ہے کہ کسی کو غیب کا علم نہیں دیا جاتا کوئی فرد جان نہیں سکتا کہ کل کیا کرے گا' کس زمین پہ اس کی موت ہوگی۔ قیاسات ہیں کچھ' علم کا درجہ نہیں اس کو حاصل ہوسکتا۔ قرآن یہ کہتا ہے اس بنا پہ ہم یہ چیز کہیں گے۔ کہ جی وہ ٹھیک ہوجاتی ہیں؟ یہ چیزیں ٹھیک ہوجانے والی آپ روزمرہ دیکھتے ہیں کہ کس قدر یہ CHANCES ہوتے ہیں اس کے اندر۔ وہ جو ٹھیک ہوجاتی ہیں نا اس کو تو لے دوڑتے ہیں اور جو وہ غلط ہوجاتی ہیں اس کو ابھارتے ہی کوئی نہیں۔ بہرحال میں اس وقت اس موضوع پہ علمی طور پہ

گفتگو نہیں کر رہا کہ ان کے متعلق میں یہ بتاؤں کہ یہ کیسے ہو جاتا ہے اور کیسے کی جاتی ہیں۔ قرآن ماننے والے کی حیثیت سے یہ بات پیش کر رہا ہوں کہ یہ درسِ قرآن کہ خدا نے یہ کہا ہے کوئی شخص جان نہیں سکتا کہ کل کیا کرے گا' کوئی جان نہیں سکتا کہاں مرے گا۔ غیب کا علم سوائے رسولوں کے کسی کو نہیں دیا جاتا تھا رسالت ختم ہوگئی' غیب کا علم کسی کو نہیں مل سکتا۔ اگر کسی کی کتنی ہی پیشین گوئیاں کیوں نہ پوری ہوتی جائیں اگر ہم یہ کہیں کہ یہ غیب کا علم تھا جو اس کو حاصل ہوا تھا' قرآن کے خلاف ہے۔

علمِ غیب کی تعریف

قیاسات کی باتیں اور ہیں۔ اس قسم کی چیز تو ایک ڈاکٹر بھی اپنے ہاں کہہ سکتا ہے دوائی دینے کے بعد اگر حتمی طور پہ اس نے تشخیص کر لی ہے اور دوائی صحیح پہنچی ہوئی ہے' وہ کہے گا کہ گھنٹے بھر میں اس کا بخار دو ڈگری کم ہو جائے گا۔ یہ غیب کا علم نہیں ہے یہ اس کے ہاں کا مشاہدے کا علم ہے۔ یہ چیزیں SCIENTIFICALLY قانون کی رو سے اس نے یہ سیکھی ہیں۔ ایسے ہی جیسے یہ موسمیات کے متعلق یہ باتیں صحیح ہو جاتی ہیں۔ آنے والے طوفانوں کے متعلق یہ سائنٹفک علم ہے۔ یہ سمع اور بصر کے ذریعے سے یہ علم حاصل ہوتا ہے۔ یاد رکھیے اس بات کو کہ جس علم میں آپ علم کے جو انسانی ذرائع ہیں ان کو استعمال کر کے کسی نتیجے پہ پہنچتے ہیں' وہ غیب نہیں ہوتا۔ غیب کہتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کے جو انسانی ذرائع ہیں' وہ استعمال میں نہ لائے جائیں اور کہا جائے کہ خدا براہِ راست ہمیں بتا دیتا ہے' اسے غیب کا علم کہتے ہیں۔ یہ جو قیاسات کی رو سے پیشین گوئیاں کرنے والے دنیا میں موجود ہیں' انہیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ خدا ہمیں یہ بتا دیتا ہے۔ ایک فن ہے اس کی حیثیت سے کچھ قیاسات ہیں' یہ چیزیں وہ کرتے ہیں۔ باقی یہ چیز اور یہ جو دعویٰ کرنے والے ہیں خدا کے مقرب ہونے کی بنا پر کہ خدا ہمیں یہ علم دے دیتا ہے' اس کے متعلق پھر دہرا دوں کہ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ چیز خدا صرف رسولوں کو دیتا تھا وہ بھی وحی کے ذریعے دیتا تھا غیر از رسول کسی کو خدا کی طرف سے یہ علم حاصل نہیں ہوتا۔ جو دعویٰ کرتا ہے یا تو رسالت کا دعویٰ کرتا ہے اور یا جھوٹ بولتا ہے اگر وہ رسالت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اور وہ اتنا بڑا گستاخ ہے کہ قرآنِ کریم کی کھلی ہوئی مخالفت کرتا ہے اور پھر دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے یہ علم مل رہا ہے۔ **فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ج** (3:179) غیب کی باتیں ہم کسی کو نہیں بتاتے تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ کہاں لایا ہے قرآن؟ میں کہتا ہوں یہ پیشین گوئیوں پہ ایمان رکھنے والے' مقربین کی طرف منسوب کرنے والے' مامورین کا اپنا دعویٰ کر کے پیشین گوئیوں کی بنا پہ دعوے منوانے والے **اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ج** (3:179) کے اندر آتے ہیں؟ ایمان رکھنے والے کا ایمان یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ خدا اپنے غیب کو کسی فرد پہ ظاہر نہیں کرتا۔ **وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ** (3:179)

قرآنِ حکیم کے مطابق پیشین گوئیاں کرنے والوں کے لیے عذاب ہے

ایمان لاؤ گے ان قوانین کی نگہ داشت کرو گے تو پھر تمہارا عظیم بدلا ہوگا۔ اور اگر یہ ایمان نہ لاؤ گے یہ مانتے چلے جاؤ گے کہ ہاں صاحب! پیشین گوئیاں ہوتی ہیں، غیب کا علم جانتے ہیں، حضرت صاحب، بتا دیتے ہیں۔ جا کے دیکھ لیجیے۔ روز چلے جاتے ہیں پھر اس کے لیے تو قرآن کہتا ہے فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (3:179) تو نہیں ہوتا، عَذَابٌ اَلِيْمٌ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ خدا کا دردناک عذاب ہوتا ہے اس قوم کے اوپر جس میں وہ جکڑی ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! سب سے بڑا عذاب حیوان اور انسان میں ما بہ الامتیاز چیز عقل و فکر تھی، اس انداز سے پوچھنے والا جو ہے، عقل اور فکر کی بنا کے اوپر بات نہیں کرتا۔ پہلی چیز تو ہم پرستی ہے جکڑے رہتی ہے یہ قوم تو ہم پرستی کی جہالتوں میں تاریکیوں کے اندر۔ دنیا علم اور فکر اور سائنٹفک انکشافات قانون کی کارفرمائیوں کی بنا پہ چاند پہ چلی جاتی ہے۔ یہ اپنے ان معاملات کے لیے بھی جن کی رو سے علم کے ذریعے سے معلوم ہوسکتا تھا کہ کیا ہوگا، ان کے لیے بھی ان کے پاس جاتے ہیں جنہیں اپنی ذات کا بھی علم نہیں ہوتا۔ ''اوہناں دیاں وضع تے شکلاں دیکھو جا کے تسی، سِینڈ وگن ڈے ہوئے ہیگے نیں سوہری دیاں دے''۔ ''اللہ دے مقرب بندے، بندہ اوہناں نوں کول بٹھان نوں راضی نئیں ہوندا ہیگا''۔ عزیزانِ من! اندازہ لگا یے۔ اس چیز کے متعلق کہ ''سائیں جی! بڑا بیمار ہوگیا اپنے چر دا ارمان نئیں اوندا ہیگا، تسی دسو پئی ارمان آئے گا یا نئیں آئے گا''۔ آپ کے ہاں ایک علم موجود ہے فن موجود ہے سائنس موجود ہے ڈاکٹری کی یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ تشخیص کرے گا اس کے مطابق آگے بڑھے گا پھر وہ بتائے گا کہ دوائی کیا ہوگی پھر وہ بتائے گا کب آرام آئے گا، اس سے جا کے پوچھو۔ اس سے نہیں جا کے پوچھیں گے، اِن کے پاس جائیں گے۔ تو جو قوم اس طرح سے جہالت کے اندر ڈوبی رہے جو قرآن نے کہا ہے کہ پھر اس قوم کے اوپر المناک عذاب ہوتا ہے، جہالت سے بڑا عذاب دنیا میں اور کیا ہوتا ہے؟ یہ قوم SUPERSTITIONS کے اندر جیتی ہے SUPERSTITIONS کے اندر مر جاتی ہے۔ سب سے بڑا عذاب تو یہی ہوتا ہے۔ اور پھر شخصیت پرستی کا عذاب وہ جس سے جا کے یہ اتنی سی بات پوچھتے ہیں اس کے متعلق دل کے اندر جو اس کے وہ ڈر اور خوف ہوتا ہے کہ حضرت جی کے متعلق یہ کمرے کی تنہائیوں میں بھی کوئی بات ان کی شان کے خلاف نہ نکل جائے۔ کیوں؟ سب جانتے ہیں چودہ طبق روشن ہوتے ہیں ''اکھیوں اولا ہوندا ہیگا''۔ سوچتے ہیں آپ؟ خود اپنی ہی ایک جہالت کے عقیدے کی بنا کے اوپر ایک شخص کے متعلق اتنا بڑا اپنے دل میں خوف طاری کر لینا صاحب، کوئی بات ان کی شان کے خلاف نہ ہو۔ اور وہ پیشین گوئی غلط نکلتی ہے ''کوئی ساہڈی سمجھن دا فرق ہوگیا ہیگا جی اوتے حضرت صاحب تے دیکھی ہوئی گل کر دے ہیگے نیں''۔ یہ کیوں ہے؟ جرأت نہیں ہوسکتی یہ کہنے کی کہ صحیح بات

نہیں اس نے کہی۔ یہ کہا تو اس کے بعد دین و دنیا میں راندۂ درگاہ۔ اور پھر اس کے بعد کہتے ہیں کہ صاحب! واقعی کچھ ہو جاتا ہے اس کے بعد۔ یہ تو سائیکولوجی کا مسئلہ ہے۔ وہ تو حضرت صاحب ہیں رات کے اندھیرے میں رسی کو سانپ سمجھیے، غش آ جاتا ہے آدمی کو۔

جہالت اپنے پہلو میں کئی قسم کی نفسیاتی بیماریاں اپنے دامن میں لیے ہوتی ہے

عزیزانِ من! جہالت کی تاریکیوں میں اپنے ہی بنائے ہوئے سانپ ہوتے ہیں جو آپ کو ڈس جاتے ہیں۔ حضرت صاحب کے اندر تو کوئی بھی قوت نہیں ہوتی۔ وہی چیز ہے جسے وہ ایک جامع محاورہ ہمارا زبان کا جو کہہ گیا ہے کہ ''پیر مندیاں نوں کھاندا اے''۔ پہلے اس کا ماننا شرط ہو جاتا ہے اور اس کا ماننا ہے کہ اس کی ہر بیہودہ حرکت کے اندر بھی آپ کو ایک نورِ یزدانی نظر آتا ہے اس کی بات جھوٹی بھی ہو جاتی ہے تو اپنے آپ کو جھٹلاتے ہو، اسے جھٹلانے کی آپ کوشش نہیں کرتے۔ کبھی دل کی گہرائیوں میں اس کے خلاف ایک بات ہو جاتی ہے، دو گھنٹے کے بعد بخار آ جاتا ہے آپ کو۔ جو میں نے عرض کیا ہے اپنی ہی بنائی ہوئی رسیوں کے سانپوں سے آپ ڈسے جاتے ہو۔ جہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے یہ آیا تھا۔ قرآن نے یہ کہا تھا **يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ** (2:257) یہ کتابِ عظیم آئی تا کہ تمہیں جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی کے اندر لے جائے۔ تم روشنی داخل ہونے کے لیے ہر دروازہ، دروازے کی ہر درز تک بند کر کے اندر بیٹھ جاتے ہو کہ تاریکیوں کے اندر جیو تاریکیوں کے اندر مرو۔ عزیزانِ من! یہ ساری تاریکیاں ہیں۔ قرآن نے جب یہ کہا ہے کہ غیب کا علم کسی شخص کو نہیں دیتے، آپ دیکھیے کہ کتنی بڑی تاریکی سے نکال کے ہم کو لے گیا ہے اب کوئی حضرت صاحب ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو میرے مستقبل کے متعلق مجھے کچھ بتا دے۔ کہتا ہے اپنا مستقبل اپنے ہاتھوں سے تیار کرو، یوں تمہیں اس کا علم ہو جائے گا، دوسرا اس کے متعلق کیا علم دے گا۔ عزیزانِ من! سورۃ الِ عمران کی ایک ہی آیت ہم نے 917 اور اگر میں اس کا مفہوم کچھ وضاحت سے کر چکا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیزیں بڑی اہم تھیں۔ دو چیزیں آج میں نے عرض کی ہیں پہلی بات یہ کہ وہ صحابہؓ کے متعلق جو ہمارے ہاں عقیدہ ہے، قرآن یہ کہتا ہے۔ دوسری چیز یہ آپ کے ہاں پیشین گوئیاں کرنے والے کے دعوے خدا اور قرآن کے ماننے والوں کی طرف سے آپ کے ہاں آتی ہیں یہ ان کی حیثیت ہے قرآن نے جو کہی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

اکتیسواں باب: سورۃ آلِ عمران (آیات 180 تا 186)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی نظامِ معیشت انفاق کے ایک لفظ کے گرد گھومتا ہے

عزیزانِ من! آج مئی 1970ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی آیت 180 سے ہوتا ہے: (3:180)۔

دنیا بھر میں ملتِ اسلامیہ کے مابین باہمی سر پھٹول کی بنیادی وجہ قرآنی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرنا ہے

اور آیت ہے وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ هُوَ خَیۡرًا لَّهُمۡ ؕ بَلۡ هُوَ شَرٌّ لَّهُمۡ ؕ سَیُطَوَّقُوۡنَ مَا بَخِلُوۡا بِهٖ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِیۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ (3:180) آج

کل ہمارے ہاں معاشی مسئلے نے خاص اہمیت اختیار کررکھی ہے۔ اسلام کا معاشی نظام۔ اور آپ دیکھ رہے ہوں گے کہ دو متضاد کیمپ ہیں، دونوں اپنے اپنے نظریے کو اسلامی کہہ رہے ہیں۔ تاریخ میں شاید ہی کبھی کوئی ایسا دور آیا ہو کہ ایک ہی منتہا ایک نصب العین ایک آئیڈیل ایک آئیڈیا اس کے مدعی، ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہی نہیں بلکہ اس سے آگے تک نوبت پہنچ رہی ہو۔ آپ نے فٹ بال کی ٹیم کے ادھر کے الیون کو کبھی آپس میں جھگڑتے لڑتے نہیں دیکھا ہوگا۔ جو فریقِ مقابل ہے اس کے ساتھ تو سخت مقابلہ ہے۔ کیوں مقابلہ ہے؟ اس کا نصب العین ان کے OPPOSITE ہے ان کا گول دوسرا ہے، ان کا گول دوسرا ہے۔ لیکن اگر یہ کیفیت ہو کہ یہ گیارہ ادھر کے جو اس ایک گول کے مدعی ہیں جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا گول وہ ہے، کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ اس گول کے متعلق آپس میں ان کا کوئی اختلاف کوئی افتراق کوئی سر پھٹول کسی قسم کی چپقلش؟ ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ گول متعین ہے۔ اور اگر ان گیارہ میں آپس میں اس بات کے اوپر ہی سر پھٹول ہو رہی ہو کہ گول کون سا ہے وہ ہے یا یہ ہے پھر اس ٹیم کا خدا حافظ۔ ہر شخص اسلام کے نام پہ دعوت دے رہا ہے اور بالکل ایک دوسرے سے متضاد نظریات پیش کر رہا ہے۔ اور اس حد تک اختلاف ہے کہ وہ دوسرے کو گناہ گار ہی نہیں، کافر قرار دے رہا ہے۔ ہماری ٹیم کا ممبر ہی نہیں یہ ہوسکتا یہ DISQUALIFY ہے، یہ کبھی کرکٹ یا کبھی فٹ بال کھیل ہی نہیں سکتا۔ کافر تو یہ ہو جاتا ہے نا پھر۔ اور دونوں دعویٰ کرتے ہیں کہ صاحب ہمارا گول وہ ہے۔ اتنی بڑی ستم ظریفی وہی قوم کرسکتی ہے کہ جو ٹمٹماتے چراغ کی طرح بجھنے والی ہو۔

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے

کوئی ٹیم جس کے الیون ممبرز کے اندر گول کے تعین کے متعلق یہ اختلاف موجود ہے، آپ سوچ سکتے ہیں کہ وہ کبھی میدان جیت سکتی ہے؟ اور یہ اس لیے کہ فٹ بال کے میدان کا گول تو محسوس متعین سامنے ہوتا ہے۔ لیکن ان کے ہاں قرآنِ حکیم کے صرف الفاظ مشترک ہیں، مفہوم آج تک متعین کسی نے نہیں بتایا اور شاید ان کے اپنے ذہن میں بھی نہ ہو۔

قرآنِ حکیم کے بیان کردہ معاشی نظام کی اہمیت اور لفظ انفاق کی وضاحت کے باوجود ہماری حالتِ زار

جہاں تک معاشی مسئلہ ہے تو حیرت ہے کہ اس مسئلے کے متعلق بھی قرآن کو ماننے والوں کی دو آرا ہو رہی ہیں۔ شروع سے آخر تک آپ قرآن میں دیکھ جایئے انفاق انفاق انفاق۔ ابتدا ہی ہوتی ہے وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (2:3) یہاں سے ابتدا ہوتی ہے قرآن کی۔ ''دیے جاتے ہیں، دیے جاتے ہیں، کھلا رکھتے ہیں'' سارے قرآن میں یہ تو حکم ہیں اور قرآن میں کہیں ایک جگہ بھی یہ نہیں ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مال کو جمع رکھتے ہیں۔ اتنی CLEAR اتنی واضح تعلیم کا دین اور اس میں اس مسئلے کے اوپر سر پھٹول

سر بہ گریباں ایک دوسرے کے ساتھ کہ جمع کرنا اور جمع کر کے رکھنا یہ ہے دین۔ ارے انفاق کو سکھانے والا دین یہ تعلیم دینے والا حکم دینے والا اور اس کے متعلق یہ چیز۔ آپ سوچ لیجیے ایک قرآن کو چھوڑنے سے قوم کہاں جا پہنچتی ہے؟ انفاق کی آیات' میں نے عرض کیا ہے کہ اس کے لیے تو آپ دیکھیں گے کہ کم ازکم چوتھائی قرآن کی تو آپ کی اس پہ آ جائے گی۔ اس لفظ میں یا اس مفہوم کے اعتبار سے ''دیے جاؤ' کمائے جاؤ' دیے جاؤ''۔ میں نے عرض کیا ہے کہ انفاق کا تو لفظ قرآن نے اخراج کے معنوں میں استعمال نہیں کیا یعنی خرچ کرنا نہیں ہے' وہ خرج ہے۔ یہ تو لفظ قرآن نے انفاق کا استعمال کیا جس کے معنی یہ ہیں نفق۔ میں نے کہا تھا نفق یہ وہ میانی ہوتی ہے کہ جس کے دونوں سرے کھلے ہوتے ہیں ادھر سے کوئی چیز ڈالی جائے اور اُدھر سے وہ چیز نکلتی جائے۔ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) قرآن کہتا ہے اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (107:1) کیا لفظ ہیں قرآن کے؟ تم نے ان کی حالت پہ بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ انکار نہیں کرتے دعویٰ تو کرتے ہیں دین کا' عملاً تکذیب کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں کس چیز کا روک لینا جرم ہے' بخل ہے شر ہے

کون لوگ ہیں؟ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) کہ رزق کے جن چشموں کو بہتے رہنا چاہیے تھا' ان میں بند لگا کے روک لیتے ہیں۔ یہاں تو سوال ہی روک لینے کا اور کھلا چھوڑ دینے کا ہے۔ یہ نظام اس قسم کا ہے کہ جس میں آپ کیپٹل کو سرمایے کو روپے کو روک ہی نہیں سکتے۔ یہ جو روکنا ہے اس کا' قرآنِ کریم نے اس کو اتنا بڑا جرم قرار دیا ہے۔ ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تکذیبِ دین ہے۔ وہی لفظ ہے یہاں جسے بخل کہتے ہیں۔ کہا کہ وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ ط (3:180) خیر اور شر دو بڑی بنیادی اصطلاحیں ہیں GOOD & EVIL اسی کی ساری کشمکش ہے۔ یہ خیر ہے یہ شر ہے' دو اصطلاحیں ہیں بالکل ایک دوسرے کی ضد۔ یہ کفر ہے وہ ایمان ہے' یہ جہنم ہے وہ جنت ہے' یہ خیر ہے وہ شر ہے' یہ GOOD ہے یہ EVIL ہے۔ کہتا ہے یہ لوگ کہ جو روک رکھتے ہیں بند رکھتے ہیں اس چیز کو جو کچھ کہ خدا نے دیا ہے' وہ یہ خیال بھی نہ کریں کہ یہ چیز کسی طرح سے بھی خیر ہے۔ الفاظ ملاحظہ فرمایے ''خیر نہیں ہے'' یہاں تک ہی نہیں کہا متعین طور پہ کہا بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ ط (3:180) یہ ان کے لیے شر ہے۔ یہ خیر اور شر ہی کا تو سارا مسئلہ تھا۔ قرآن نے تو دونوں متضاد اصطلاحیں ایک ہی جگہ استعمال کر کے بتا دیا کہ یہ جس کو انفاق کی طرح سے کھلا رہنا چاہیے تھا' یہ اس کو روک رکھنے والے جو ہیں' یہ گمان تک نہ کریں یَحْسَبَنَّ (3:180) گمان بھی نہ کریں کہ کسی طرح سے اس میں بھی کوئی خیر کا پہلو ہو سکتا ہے شَرٌّ لَّھُمْ ط (3:180) شر ہے ان کے لیے۔ انجام اس کا کیا ہوگا؟ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ط (3:180) یہی چیز یہی مال جسے وہ اس طرح سے

روک رکھتے تھے، جمع کر کے رکھ لیتے تھے، تو عام الفاظ کے اعتبار سے قیامت کے دن یہ ان کے گلے کا ہار ہوگا، طوق گلے کا ہوگا۔ جیسے ہتھکڑیاں ہوتی ہیں اس زمانے میں مجرم کے گلے میں طوق بھی ڈالا جاتا تھا۔ گلے کا طوق بن جائے گا یہ سارا مال جسے انہوں نے روک کے رکھا ہوا ہے۔

مذہب کی دنیا میں احبار و رہبان کی کیفیت اور پھر مال جمع کرنے کا نتیجہ

یہ وہ چیز ہے جسے قرآن نے متعدد مقامات پر مختلف الفاظ میں کہا۔ بات شروع کی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ط (9:34) اے ایمان والو! متنبہ رہنا اس بات سے یہ جو مذہب کے نام کے اوپر اٹھتے ہیں، خواہ وہ علما کی جماعت ہو یا مشائخ کی جماعت ہو احبار و رہبان، ان کی کیفیت یہ ہے کہ خود تو وہ کچھ کرتے نہیں ہیں۔ دوسروں کی کمائی پر وہ گذارا ہی نہیں کرتے، عیش پرستیاں کرتے ہیں، کھا جاتے ہیں۔ اور وہ یہ کچھ کر کے چلیے NEGATIVE ASPECT ہی سہی نہ کمایا، دوسروں کا ہی کھا گئے۔ وہ کہتے ہیں وہ اس مال پہ جو دوسرے کماتے ہیں اس پہ خود بھی عیاشیاں کرتے ہیں اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ لوگ خدا کے راستے پہ آنے نہ پائیں۔ انسانیت کے راستے میں سنگِ گراں بن کے حائل ہو جاتے ہیں کہ کوئی خدا کی طرف جانے ہی نہ پائے۔ بڑا غور طلب ہے صاحب یہ جو مقام ہے۔ آیت ختم نہیں ہوئی ابھی۔ اور اس کے بعد ہے وَ الَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ط فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (9:34) جو لوگ چاندی اور سونے کو (یہی دولت کے SYMBOLS ہیں) جمع کر رکھتے ہیں، خزانے بنا لیتے ہیں اور انہیں بہبودیتِ عامہ کے راستے میں کھلا نہیں رکھتے، روک رکھتے ہیں، اے رسول ان لوگوں کو عذابِ الیم کی بشارت دیدے، دردناک عذاب کی۔ یَّوْمَ یُحْمٰى عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ط (9:35) جس دن ان سکوں کو تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں اور پھر ان سے ان کی پیشانیوں کو، ان کے پہلوؤں کو، ان کی پشت کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (9:35) یہ ہے وہ مال کہ جسے تم نے انسانیت کی بہبود کی خاطر عام رکھنے کی بجائے اپنی ذات کے لیے روک کر رکھا ہوا تھا فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (9:35) کوئی خارج سے عذاب نہیں آ رہا، وہی جو کچھ تم نے اس طرح سے روک رکھا تھا، وہی عذاب بن کر تمہارے گلے کا ہار ہو گیا آج۔ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ط (3:180) کے متعلق ٹھیک ہے ہمارا ایمان ہے مرنے کے بعد وہ قیامت ہے لیکن قیامتِ امروز بھی ہے وہ قرآن سے ثابت ہے یہیں ایک انقلاب آتا ہے جس وقت یہ سارا روکا ہوا مال جو ہے وہ تپایا جاتا ہے، داغے جاتے ہیں، گلے کا ہار ہو جاتا ہے،

عذاب بن جاتا ہے۔اس نے کہا یہ کیفیت ہوگی اس مال کی۔ یہاں ایک غورطلب چیز ہے کہ قرآن نے پہلے یہ اربابِ مذہب جو ہیں ان کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی پھران کا ذکر کیا ہے یہ جو اس طرح سے روپے کو سرمایہ دار روک کر رکھنے والے۔اوران کے متعلق کہا ہے کہ وہ راستے میں کھڑے ہوجاتے ہیں کہ خدا کے راستے کی طرف انسانیت جانے نہ پائے اور یہ اس مال کو جمع کرتے رہیں۔ گویا یہ کھڑے ہوجاتے ہیں دروازے پر کہ وہ حفاظت کرتے رہیں ان سب کی کہ جو اس طرح سے اس مال کو اپنے ہاں جمع کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، روکے ہوئے رکھتے ہیں۔ان لوگوں کو آگے نہیں آنے دیتے۔یعنی آپ دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں گروہ جو ہیں کس طرح ان کا گٹھ جوڑ قرآن بتا رہا ہے۔ایک ہی آیت کے اندر ان دونوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ خود نہیں کچھ کرتے، ان کے مال کے اوپر پلتے ہیں کام یہ کرتے ہیں، یہ راستے میں کھڑے ہوجاتے ہیں کہ خدا کی راہ کی طرف آنے نہ پائیں اور یہ اطمینان سے جمع کرتے چلے جائیں۔

محروم لوگوں کے سلسلہ میں اربابِ مذہب کا طرزِ عمل اور غلط سوچ کی آبیاری کے خطوط

عزیزانِ من! انسانیت کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوا ہے۔کوئی شخص بھی جس کے دماغ میں تھوڑا سا بھی ہوش ہے، وہ کبھی بھی برضامندی اس چیز کے اوپر تیار نہیں ہوگا کہ وہ محنتِ شاقہ وہ کچھ کرے اوراس کی محنت کی کمائی کوئی دوسرا ایسا لے جائے جو کچھ نہیں کر رہا۔"جو کچھ نہیں کر رہا" کے اندر آپ کے اربابِ شریعت و مذہب بھی آجاتے ہیں اور یہ طبقہ جو روپے کی INVESTMENT سے دوسرے کی کمائی کو لے آتا ہے، یہ بھی اس میں آجاتے ہیں۔کوئی شخص بھی اپنی مرضی سے یہ کبھی بھی پسند نہیں کرتا کہ صاحب! سارا دن وہ جان مار کے پسینے کی کمائی وہ لائے اور دوسرا اس میں سے چھین کے لے جائے اور یہ کچھ نہ کہے۔یہ جو حصہ ہے نا کہ یہ کچھ نہ کہے یہ وہ چیز ہے جو اربابِ مذہب نے اپنے ذمے لے رکھی ہوتی ہے کہ اس کا ہم انتظام کردیں گے کہ یہ کچھ نہ کہیں۔ان سے کہا یہ جاتا ہے کہ رزق کی تقسیم خدا کرتا ہے آسمان پہ۔وہاں تو یہ بھی کہا ہوا ہے کہ عرش کے نیچے جو پہلا آسمان ہے نا اس کے اندر چھید ہیں ہر فرد کے رزق کے لیے ایک ایک چھید ہے اللہ میاں نے کیا ہوا۔ہر فرد کو اس چھلنی میں سے چھن کے اس چھید کے مطابق ملتا ہے۔ تم میں اگر ہمت ہے تو وہاں جا کر ان کا چھید تنگ کرآ ؤ اپنا چھید کھلا کرآ ؤ جاکے۔اوراگر یہ نہیں کرتے تو شکایت جو کرنی ہے یہ خدا کے فیصلے کے خلاف شکایت ہے۔ڈرو اللہ کے غضب سے، کیا کررہے ہو تم، اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے"جنوں چاہے او لکھوں ککھ کر دااے، جنوں چاہے ککھوں لکھ کردے، تقدیرتے شاکر رہنا چاہیدا ہیگا"۔اور باقی بات یہ ہے عزیزو! کہ غریبوں

کے لیے یہ دنیا ہے نہیں ہے یہ جتنی بھی مادے کی کثافتیں ہیں وہ ساری ان کے لیے ہیں اور غربا کے لیے جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

مست رکھو ذکر و فکر و صبح گاہی میں انہیں
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں انہیں

یہ یہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔

مذہب کی طرف سے دورِ حاضر میں پھیلائی جانے والی گمراہیوں کی نوعیت اور اس کا نتیجہ

پہلے دور کا میں نہیں کہہ سکتا آج کے دور کی کشمکش میں بھی۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ مجھے تو نہ کسی سیاسی پارٹی سے کوئی واسطہ ہے نہ مذہبی فرقوں سے۔ میں تو ان دونوں کو' قرآن کی رو سے ملت میں تفرقہ جس سے پیدا ہوتا ہے' شرک سمجھتا ہوں۔ اس لیے یہ سوال نہیں ہے۔ لیکن میں کہہ رہا ہوں کہ تاریخ میں جانے کی ضرورت نہیں' آج کی کشمکش میں بھی آپ دیکھیے بہر حال ایک نظریہ پیش کیا جا رہا ہے نا اسلام کا کہ وہ اگر اس میں سے اتنا سا نکال کے دے دیا جائے' انہیں تو باقی سارا مال حلال وطیب ہو جاتا ہے۔ سارا جمع شدہ مال۔ اس نظریے کو پیش کیا جا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس کو پیش کرنے والا کوئی جاگیردار کوئی زمیندار کوئی کارخانہ دار نہیں ہے۔ کسی نے آج تک یہ اس قسم کا بیان نہیں دیا۔ یہ ساری چیزیں اربابِ مذہب کی طرف سے آرہی ہیں۔ آ کیسے رہی ہیں؟ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ کھانے کو مل رہا ہے۔ یعنی انہیں چاہیے تھا محافظت کرتے اور اگر اسلام کی چیز ہے تو وہ بھی بہر حال مسلمان ہیں' یہاں وہ طبقہ یہودیوں کا تو ہے نہیں کہ جو آپ کے اسلام کا نام نہیں لے سکتا' مسلمان ہیں وہ کیوں نہیں اسلام کا نام لے کے یہ کچھ کہتے؟ کوئی نہیں ان میں سے کہہ رہا۔ یہ دیکھیے قرآن کا انداز کہ احبار و رہبان اور یہ جو ہیں ان کو ایک کیٹگری کے اندر قرآن لایا ہے ایک آیت کے اندر لایا ہے۔ کیسے یہ لایا جاتا ہے؟ قرآن کی یہ آیت ہمارے سامنے ہے۔

بخاری شریف اور مشکوٰۃ شریف کی ایک روایت

آج بھی یہ چیز کہی جاتی ہے کہ صاحب مال جمع نہیں ہوگا تو زکوٰۃ کیسے دی جائے گی۔ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں کہ صاحب! پھر یہ صدقہ اور خیرات اور یہ غریبوں کو کیسے دیا جائے گا؟ یعنی آپ کے ثواب کمانے کے لیے ان گروہوں کا موجود رکھنا نہایت ضروری ہے کیوں کہ اگر محتاج نہ رہے' فقیر نہ رہے تو یہ جتنے بھی زیادہ دولت والے ہیں' یہ جنت میں کیسے جا سکیں گے؟ تو ان

کوسواری کے لیے جیسے یہاں گھوڑے کی ضرورت ہے'ان کو جنت میں پہنچانے کے لیے غریبوں کی ضرورت ہے' فقیروں کی ضرورت ہے' مستقل کلاس ایک رکھنی چاہیے۔ یہ ہے اعتراض پڑ جاتا زکوٰۃ کیسے دیں گے؟ اس کے لیے یعنی قرآن کے تمام احکام شروع سے آخر تک جمع کرنے کے اتنا قرآن خلاف ہے۔ آپ نے دو آیتیں دیکھی ہیں ابھی اور دیکھیے گا سارے قرآن میں۔ کہاں سے یہ بات آئی صاحب؟ ایک روایت ہے باب الزکوٰۃ مشکوٰۃ شریف کی آپ دیکھیے۔ ویسے روایت تو بخاری شریف میں بھی ہے مشکوٰۃ کے حوالے سے آپ دیکھیے۔ اس میں لکھا یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ جو لوگ مال کو جمع کر کے رکھتے ہیں' وہ جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور داغ دیے جائیں گے یہ۔ تو اس میں یہ لکھا یہ ہے یہ آیت جب نازل ہوئی تو صحابۂ کرامؓ جمع ہوئے ان میں کہرام مچ گیا۔ یعنی وہ سارے ہی آدم جی اور اصفہانی اکٹھے ہوئے ہوئے تھے "پئی آ کی لگا ہون؟"۔ اندازہ لگایے۔ کہ صاحب! یہ تو مال جمع کرنا یہاں قرآن نے اس طرح سے اس کو حرام قرار دے دیا ہے' وہ جہنم کی آگ بن جائے گا کیا کریں؟ صحابۂ کبارؓ انہیں معلوم ہے خدا کی طرف سے ایک آیت نازل ہوئی ہے اور اس پہ یہ اضطراب' کیا بات ہے کس قالب میں ہم انہیں ڈھالتے ہیں؟

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

حضرت عمرؓ جیسی عظیم شخصیت کے متعلق خودساختہ کہانی

کیا وہ ہمارے ہی جیسے مسلمان تھے کہ خدا کی طرف سے ایک آیت آئے اور اس کے اوپر اضطراب واقع ہو جائے۔ مشورہ ہوا اپنے میں سے ایک REPRESENTATIVE چنا۔ سیدھی بات ہے کہ اس کلاس کا REPRESENTATIVE تو وہ سب سے بڑا کوئی CAPITALIST ہونا چاہیے نا۔ کون سا چنا؟ حضرتِ عمرؓ۔ خود ہمیں بتاتے ہیں کہ اس دور میں بھی نہیں' جب وہ خلیفہ ہوئے تھے خطبہ دے رہے تھے تو ان کے تہ بند کے اوپر نو پیوند لگے ہوئے تھے۔ انہیں چنا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں اور وہاں جا کے ہمارا کیس پلیڈ کریں کہ حضرت قرآن کی اس آیت نے تو بڑا اضطراب پیدا کر دیا ہے آپ ﷺ کے صحابہؓ کے دلوں میں' حضرت عمرؓ جا کے یہ پلیڈ کریں رسول اللہ ﷺ سے۔ خدا بھیجنے والا اور رسول ﷺ اس حکم کو عام کرنے والا' صحابہؓ کی جماعت یہ مشورہ ہو رہا ہے REPRESENTATIVE حضور ﷺ کی خدمت میں جا رہا ہے کہ کسی طرح سے اللہ میاں سے جا کے بدلوا لاؤ یہ۔ یہ پوری حدیث آپ کے ہاں کی موجود ہے۔ تو حضرت عمرؓ بھی گئے (وہ بھی چلے گئے) جا کے یہ پیش کیا قصہ۔ آپ ﷺ نے کہا کہ خوامخوہ کے لیے ان کے دل میں اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ یہ چیز جو حکم نازل ہوا ہے اس کے

ساتھ انہیں یہ پتہ نہیں ہے وہ زکوٰۃ کا حکم بھی تو ساتھ ہے۔ اچھا جی۔ کہا کہ اس میں سے اگر اڑھائی پرسنٹ دے دیا جائے گا تو باقی سارا مال حلال وطیب ہو جائے گا۔ حدیث میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب آ کر یہ ان کو سنایا تو نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ ''میں سمجھناں دیگاں دتیاں ہونیاں اوہناں نے''۔ سوچیے تو سہی۔ اب اس کے لیے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر یہ حکم رہے تو پھر وہ زکوٰۃ کیسے دی جائے؟ اس کو دینے کے لیے یہ سارے احکام جو ہیں۔ اور آگے ہم چلے تو اس کے بعد تو سیدھی سی بات کہ یہ احکام منسوخ ہو گئے ہیں، رہے ہی نہیں ہیں۔

کیا نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی اس اڑھائی فیصد کے تصور کی شہادت فراہم کرتی ہے؟

عزیزانِ من! بات یہ نہیں ہے۔ بات تو ان سے ایک ہی پوچھنے کی ہے کہ کیا نبی اکرم ﷺ نے ساری عمر زکوٰۃ دی تھی؟ زکوٰۃ تو اس مال پہ ہوتی ہے کہ جو سال بھر تک جمع رہے اور وہاں تو یہ کیفیت ہے کہ رات کو سونے سے پیشتر پوچھ لیا جاتا تھا کہ گھر میں کوئی پیسہ فالتو تو نہیں رکھا ہوا۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی کے آخری سانس میں پوچھا بیوی سے کوئی فالتو روپیہ تو نہیں گھر میں رکھا؟ انہوں نے کہا کہ سات درہم صبح آئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں بیت المال میں جلدی سے بھیج دو (یہ بھی روایت موجود ہے) انہیں بھیج دو تا کہ یہ نہ ہو کہ محمد ﷺ جب خدا کے حضور جائے تو وہاں یہ دکھایا جائے کہ تم نے یہ چیز فالتو گھر میں رکھی تھی اور محتاجوں کے لیے بیت المال میں نہیں بھیجی تھی اس حالت میں دنیا سے آ رہے ہو؟ اللہ اکبر۔ اس سے پوچھو کہ جب قرآن کہتا ہے کہ **وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ** ؕ (2:219) یہ پوچھتے ہیں وہی ینفقون کہ انفاق کس حد تک کریں؟ ان سے کہو کہ جتنا تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ میں کہتا ہوں کہ ضرورت سے زائد اگر سو روپیہ ہے اور دس میں ضرورت پوری ہوئی جو نوے دے دیتا ہے اسے کہا جاتا ہے کہ نہ نہ روک کے رکھو تا کہ سال کے بعد اس میں اڑھائی فیصد دے دو نگا جبکہ وہاں تو یہ کہا جا رہا ہے کہ میں تو نوے دے رہا ہوں خدا کا یہی حکم ہے اگر نوے دے دو گے تو پھر وہ اڑھائی دینے کے لیے کہاں سے لاؤ گے؟ وہ زکوٰۃ کا حکم کیسے ہو گا پورا؟ ''اوڈھائی دین لئی نوے روک رکھے''۔ عزیزانِ من! میرے سامنے قرآن ہے میں تو قرآن کا طالب علم ہوں، قرآن یہ کچھ کہہ رہا ہے۔

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام پہلے ہر متنفس کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ کا معاش کا جو غلط نظام ہے یہ اس کے اندر کے احکامات ہیں وہ تو اس نظام کے احکامات

ہیں کہ جس کے متعلق سب سے پہلے نظام یہ کہتا ہے کہ کوئی متنفس ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری ہمارے اوپر نہیں۔ نظام ہر ایک کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری لیتا ہے اور اس کے بعد پھر یہ صورت ہے کہ جو کچھ بھی وہ کما کے لاتا ہے اس کو ضرورت کیا ہے یہ دردِ سر اپنے لیے مول لے' وہ جا کے ان کے حوالے کرتا ہے کہ جایے صاحب پورا کیجیے۔ وہ ضرورت کے مطابق خرچ کرتے ہیں' یہ اس نظام کی بات کر رہے ہیں۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ اسلامی نظام پہ یہاں گفتگو کرتے ہیں یہ لوگ' یہ نہیں کہ آج کے حالات میں کیا کیا جائے؟ وہ تو جب بھی آپ نظام سامنے رکھیں گے تو وہ آئیڈیل ہوگا آپ کے سامنے ایک' GOAL ہوگا جس میں اس موجودہ حالت سے بتدریج وہاں پہنچا جائے گا۔ لیکن اس GOAL کے صحیح ہونے میں تو دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ اسلام کے معاشی نظام کا گول یہ ہے کہ مملکت ذمہ دار ہوتی ہے ہر متنفس کے سامانِ زیست بہم پہنچانے کا' وہ اعلان کرتی ہے اپنے ایوان کے باہر لکھتی ہے کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ ج (6:151) ہم تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہیں۔ اور پھر یہ نظام آتا ہے تو جمع کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی صاحب' دردِ سر کا ہے کے لیے مول لیا جائے۔ وہ کہتا ہے یہ اس نظام کی باتیں ہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ گفتگو آج یہ ہو رہی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ اس میں دو رائے ہی نہیں ہیں صاحب۔ قرآن کی آیات کھلی کھلی ہیں یہ اس نظام کا اس مملکت کا فریضہ اور یہ اس کے بعد یہ نظام' جمع کرنے کا سوال ہی نہیں۔ یہاں سے وہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کیوں حضور ﷺ نے ایک پائی بھی گھر میں نہیں رکھی؟ کیوں زکوٰۃ بھی نہیں دی ساری عمر؟

قرآنِ حکیم کے نظام کے بغیر وراثت یا دیگر قرآنی احکام پر کیسے عمل ہوگا؟

اب سوال یہ ہے کہ صاحب! اگر یہ جمع نہ کیا جائے گا تو وراثت کے احکام پہ عمل کیسے کیا جائے گا؟ یہ پوچھو اس غریب سے کہ جس کے پاس کفن کے لیے اس دن پیسہ نہیں ہوتا جس دن مرتا ہے۔ تو گویا وہ تو یہ سارے احکامِ خداوندی جتنے ہیں ان کے اوپر تو وہ عمل ہی نہیں کر سکتا' زکوٰۃ کیسے دے گا؟ یہ غریب کیسے دیتا زکوٰۃ۔ تو خدا کا اتنا بڑا فریضہ اس سے بھی یہ قاصر' وراثت کے احکام اس سے بھی یہ قاصر' صدقہ و زکوٰۃ یہ دے ہی نہیں سکتا' اس کے پاس ہے ہی نہیں بے چارے کے پاس اس سے بھی قاصر' مسجد نہیں بنوا سکتا کہ جنت میں موتیوں کا گھر الاٹ ہو جائے' اس سے بھی قاصر' حج نہیں کر سکتا پیسہ کوئی نہیں ہے کہ زم زم کے پانی سے سارے جتنے بھی بلیک مارکیٹنگ کے داغ ہیں وہاں دھو آئے اس سے بھی قاصر ''جامہ نہ دامن دامن از کجا؟؟؟''۔

ملوکیت کے سایے میں نظامِ سرمایہ داری کا نتیجہ دلوں کو لپیٹ لینے والی آگ کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا

عزیزانِ من! یہ آپ کے ہاں کا دین نہیں یہ تو اس دور کا مذہب بن گیا ہوا ہے جب آپ کے ہاں ملوکیت اور یہ سارا نظام جو تھا سرمایہ داری کا آپ کے مسلمانوں میں آ گیا تھا۔عزیزانِ من! قرآن سے پوچھیے وہ کہتا ہے کہ جو لوگ اسے روک رکھتے ہیں وہ یہ خیال بھی نہ کریں کہ یہ خیر ہے' یہ شر ہے۔ یہاں کہا کہ گلے کا ہار بن جائے گا یہاں کہا کہ وہ تپائے جائیں گے یہ سارے جتنے بھی ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔ دو چار آیتیں میں اس وقت پیش کر دیتا ہوں حوالے کے لیے ورنہ قرآنِ کریم تو سارا بھرا پڑا ہے ان سے۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ نِ. الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (104:1-2) اعلان کر دو تباہی کا ان لوگوں کے لیے جو مال جمع کرتے رہتے ہیں' اکاونٹ کھول لیتے ہیں پھر وہ چیک کرتے ہیں' بیلنس کتنا ہوا۔ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (104:2) پھر اس کو گنتا رہتا ہے' ننانوے کے پھیر میں جا پڑتا ہے نا یہ۔ یہاں بھی وہ ہے يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ (104:3) یہ سوچ رہا ہے یہ خیال کر رہا ہے کہ یہ مال جو جمع کر رہا ہے اس سے حیاتِ جاویداں مل جائے گی؟ كَلَّا (104:4) آپ کو معلوم ہے یہ کہاں آیا کرتا ہے؟ WARN کر دو ان کو قطعاً ایسا نہیں ہوگا ہرگز ایسا نہیں ہوگا لَيُنْبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ (104:4) یہ مال اور یہ صاحبِ مال یہ جو ہے' اس جہنم کے اندر اس کو ڈال دیا جائے گا کہ ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی ہوتی ہے۔ وَمَاۤ اَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةُ (104:5) تمہیں معلوم ہے بھی وہ کیا ہے الْحُطَمَةُ؟ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ . الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (104:6-7) یہ نہ سمجھ لینا کہ کہیں تندور گاڑ رکھا ہے' اس میں سے شعلے نکل رہے ہیں سوال نہیں' اللہ کی جلائی ہوئی آگ۔عزیزانِ من! سوچیے اللہ کی جلائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔افوہو۔ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ . فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (104:8-9) یہ بڑے بڑے ستون بن کے جو کھڑے ہوئے ہوئے ہیں یہ ستون جو ہیں اس وقت اس نظام کے انہیں یہ پیکرِ انسانی نہ سمجھو یہ وہ ستون ہیں جن کے اندر سر سے پاؤں تک آگ بھری ہوئی ہے۔صرف ان کے یہ اوپر کے پیکر پھٹ جائیں گے اندر کی اپنی آگ ان کو جلا دے گی۔

عزیزانِ من! قرآن ہے۔اور جو قوم یہ روش اختیار کر لیتی ہے هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ج (47:38) کیا تم وہ قوم ہو کہ جن سے یہ کہا جاتا ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے اس مال کو کھلا رکھو تو تمہاری کیفیت یہ ہے فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ج (47:38) وہی بخل یہاں آیا ہے کہ تم میں سے وہ لوگ ہیں کہ جو اس کو روک رکھتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں عربی کے الفاظ کا ترجمہ اردو زبان میں پورا اترہی نہیں سکتا

آپ کو معلوم ہے ہمارے ہاں پھر ترجموں میں جو لفظ عربی کا آتا ہے جو اردو میں اس کا مفہوم ہوتا ہے' اس سے بات بگڑتی ہے۔ بخل یا بخیل جسے ہم کہتے ہیں نا وہ ایک ذاتی انفرادی سی چیز سمجھی جاتی ہے کہ ایک شخص جو اپنے سٹیٹس کے مطابق اپنی پوزیشن کے مطابق خرچ نہ کرے اپنی ذات پہ ''بڑا بخیل ہے'' اپنی ذات پہ بھی اتنا خرچ نہیں کرتا اسے کہتے ہیں۔ یہ عربی زبان کا لفظ اس کے لیے نہیں ہے یہ انفاق کے بالکل مقابلے میں ضد ہے' اس کے معنی ہوتا ہے اس کو بہتے پانی کی طرح کھلا نہ رکھنا نیز اس کے معنی ہوتے ہیں بند لگا کے اپنی ذات کے لیے روک رکھنا۔ کہا یہ ہے کہ یہ جب کہا جاتا ہے کہ اس کو یوں کھلا رکھو تو یہ وہ لوگ ہیں جو روک رکھتے ہیں وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ ط (47:38) اسے روک کے اپنے ذہن میں سمجھتا یہ ہے کہ میں نے دوسروں کو اس سے محروم کر دیا' اسے پتہ نہیں کہ اس شخص نے اس کو روک کر اپنی ذات کو اس سے محروم کر دیا۔ وَاللّٰہُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ ج (47:38) یہ بھی نہ سمجھو کہ ہم جو بار بار کہتے ہیں کہ اسے ہمارے راستے میں دیے جاؤ' ہمارے راستے میں دیے جاؤ' تو ہم بھی ایک فقیرِ بے نوا ہیں' جھولی پھیلا کے بیٹھے ہیں ''دے جا بابا اللہ دے واسطے''۔ یعنی خدا کہتا ہے یہ نہ سمجھو کہ ہم فقیر ہیں تم بہت بڑے غنی ہو دولت مند ہو۔ سوال ہمارا نہیں ہے فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ ط(47:38) اس سے تم اپنی تباہی لا رہے ہو۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام سے منحرف ہونے کی شکل میں کسی دوسری قوم کے تسلط کی وارننگ

عزیزانِ من! سنیے پوری قوم میں جب یہ معاشی نظام رائج ہو جائے' اس قوم کا حشر کیا ہوتا ہے؟ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ لا (47:38) اگر تم نے اس صحیح روش سے اعراض برتا تو وہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا۔ بہت بڑے انقلاب کی یہ علامت ہے۔ کون سی قوم وہ ہو گی؟ قرآن تفصیل میں نہیں جاتا اصول بیان کرتا ہے اصول یہ ہے ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ (47:38) وہ تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ بات ختم ہو گئی۔ استبدالِ قومی ہو جاتا ہے اس میں' وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ تمہارے جیسی نہ ہو گی کے معنی کیا ہو گا؟ وہ ان کا نظام جو ہے معاشی وہ یہ ہو گا کہ وہ ان کو روکے ہوئے نہیں رکھیں گے انسانیت کی بہبود کے لیے اس کو آگے پھیلائیں گے۔ فی سبیل اللہ والی بات یاد رکھیے اس میں' یہ بھی نہ سوچیے کہ یہ نظام جو دعویٰ اس چیز کا کرتے ہیں کہ ہم اس چیز کو پھیلاتے ہیں اس دولت کو' اگر وہ خدا کی وحی کی بنیادوں کے اوپر وہ نظام قائم نہیں ہے تو یاد رکھیے وہ اسلام کا نظام نہیں ہو سکتا۔ جس طرح سے اس دولت کو روک رکھنا' اسلامی نظام نہیں ہے۔ اسی طرح

سے اس کے بند کو اٹھا دینا لیکن وحی کے ساحلوں کے اندر اس کو نہ جانے دینا' یہ بھی اسلامی نظام نہیں ہے۔

قرآنی نظامِ معیشت تو ہر جگہ سلسبیل کی صورت لیے ہوئے ہوتا ہے

اسلامی نظام یہی ہے کہ روکے نہیں' چلتا جائے لیکن سیلاب نہ بننے پائے۔ نہر کی حیثیت ہو' وحی کی مستقل اقدار کے ساحلوں کے اندر یہ پانی بہتا ہوا چلا جائے۔ اور بہتا چلا جائے جسے قرآن نے سلسبیل کہا ہے۔ ہم نے تو کہا ہے نا جنت کے اندر ایک چشمہ ہے اس کا نام ہے اور یہ تو بڑا عجیب لفظ ہے مرکب ہے یہ سلسبیل: بہتا ہوا چلا جائے آواز لگاتا ہوا پوچھتا ہوا کہ کتنی ضرورت ہے بھئی تمہاری' تمہاری کتنی ضرورت ہے پکارتا ہوا آگے بڑھتا جائے اور کہتا جائے جس کی جتنی ضرورت ہے ڈول بھر لو اپنا۔ یہ ہیں جنت کے چشمے۔ ثُمَّ لاَ یَکُوْنُوْا اَمْثَالَکُمْ (47:38) تمہارے جیسی پھر وہ قوم نہیں ہوگی یاد رکھو۔ پوری قوم کے متعلق قرآن نے یہاں یہ کہہ دیا۔ ایک اور ریفرنس لے لیجیے۔ کہتا ہے جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں' قرآن نے جہاں یہ دیا ہے بڑا محاکاتی انداز ہے' نقشہ کھینچ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں تَدْعُوْا (70:17) وہ آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے جہنم۔ کسے بلا رہی ہے؟ مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی (70:17) اسے کہ جس نے اس صحیح نظام سے یا تو بالکل منہ موڑ لیا ادھر پشت کر کے چلا گیا وَتَوَلّٰی (70:17) یا کم از کم اعراض برت کے یوں نکل گیا۔ واہ واہ واہ۔ یہ جو کہتے ہیں نا کہ صاحب! ٹھیک ہے یہ سرمایہ داری کے بھی خلاف ہے یہ اس کے بھی خلاف ہے فَاَعْرِضْ (53:29) درمیان میں سے یوں کترانے کی راہیں ہیں جو نکالی جاتی ہیں۔ اَدْبَرَ (70:17) جو بالکل اعلان کرتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ غلط ہے نظام وہی صحیح ہے وہ بھی یہ کہتے ہیں۔ آوازیں دے دے کر جہنم بلا رہا ہے ان کو جو اس صحیح معاشی نظام جو قرآن دیتا ہے اس سے منہ موڑ کے چل دیتے ہیں' اعراض برت کے پہلو تہی کر کے چل دیتے ہیں۔ کون ہیں یہ لوگ؟ قرآن تو کسی بات کو وضاحت کیے بغیر چھوڑتا نہیں ہے۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (70:18) یہ وہ ہیں کہ جو جمع کرتے ہیں ایک اس قسم کی تھیلی میں کہ نیچے کا منہ تو پہلے ہی بند تھا جمع کر کے اوپر کا منہ کس کے باندھ دیتے ہیں فَاَوْعٰی (70:18) یہ ہوتا ہے۔

قرآنی نظامِ معیشت میں رزق کے تمام کے تمام سرچشمے مملکت کی تحویل میں ہوتے ہیں

عزیزانِ من! یہ ایک نظام ہے جو قرآن پیش کرتا ہے وحی کی بنیادوں کے اوپر مستقل اقدار کے مطابق انسانیت کی بہبود کے لیے سرمایے کو' محنت کے محاصل کو' زمینوں کی پیداوار کو' جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے۔ اور دیے میں تو دونوں چیزیں آتی ہیں وسائلِ رزق

جتنے بھی ہیں، وہ سارے خدا کے دیے ہوئے ہیں یہ زمین اور زمین کے اندر ساری صلاحیتیں یہ تو نہ ہم نے کہیں سے خریدی ہیں، نہ ہم نے کہیں سے پیدا کی ہیں یہ تو جس نے خالق نے جو تخلیق کیا وہ ساتھ ہی اس نے ربوبیت کا بھی انتظام کیا۔ زمین میں یہ خزانے بھر کے دے دیے۔ دوسری چیزیں انسان کے اندر کے کمانے کی صلاحیتیں ہیں اب دیکھیے تو سہی یہ کہاں سے لیتا ہے یہ؟ یہ فطرت کی طرف سے اسے ملی ہوئی ہیں۔ یہ تو صرف اپنی طرف سے محنت کرتا ہے اور اسی لیے کہتا ہے قرآن کہ **لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى** (53:39) محنت جو ہے یہ ہے صرف اس کی، اس کا حق دار ہے یہ، باقی جو کچھ ہے یہ تو خدا کی طرف سے ملتا ہے انسانیت کی بہبود کے لیے۔ اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ جو ان چیزوں کو روک لیتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ خیر ہے بلکہ ان کے لیے یہ شر ہے۔

قرآنی نظامِ حیات میں کسی قسم کی پیوندکاری ثواب نہیں بلکہ یہ شرک ہے

میں پھر عرض کر دوں کہ یہ اسلامی مملکت کے معاشی نظام کا ذکر ہو رہا ہے۔ اور اسلام کا معاشی نظام یا کوئی بھی نظام جو ہے وہ پیوندکاری نہیں ہے کہ آپ باطل کا نظام قائم رکھیں اس کے اندر اس کے کچھ چھوٹے چھوٹے پیوند لگا دیں اور اس کے بعد خوش ہو جائیں کہ ثواب کا کام یہ ہو رہا ہے۔ پیوند سے کام نہیں چلتا، وہ شرک ہے۔ توحیدِ خالص یہ ہے یا کفر اختیار کرو یا ایمان اختیار کرو۔ اور یہ میں عرض کر دوں کہ جب بھی آپ کسی معاشرے کو اس انقلابی نصب العین تک لے جانا چاہیں گے تو بتدریج وہاں تک پہنچا جائے گا GRADUALLY وہاں تک پہنچا جائے گا۔ بات نصب العین کے تعین کی ہے اسے ایمان کہتے ہیں، وہاں تک پہنچنا اسے اعمالِ صالحہ کہتے ہیں۔ ان دونوں کے مجموعے سے یہ نظام قائم ہوگا۔ **سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط**(3:180) گلے کا ہار بنا دیا جائے گا تم اسے اپنی ملکیت سمجھتے ہو اسی لیے روک رکھتے ہو نا۔ **وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط** (3:180) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ ملکیت خدا کی ہے، تمہاری ملکیت نہیں ہے۔

کرۂ ارض پر ذاتی ملکیت کا تقدس ملوکیت کو جنم دیتا ہے جو تذلیلِ انسانیت ہے

سوال پیدا ہو رہا ہے جی ذاتی ملکیت کے اندر، جو اس کو نفی کرتا ہے وہ صاحب کفر کا نظام لا رہا ہے۔ یعنی اس کو ذاتی ملکیت کو ایک تقدس حاصل ہو رہا ہے گویا یہ فرمانِ خداوندی ہے یہ یوں پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے **لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** ذاتی ملکیت تم میں سے کس کی ہو سکتی ہے؟ خدا بن رہے ہو۔ ہم مالک ہیں جو کچھ بھی ہے اس کے اندر۔ **وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ** (3:180) اور ہم جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو، دھوکہ دیتے ہو، اس کا نام نیکی خیر خیرات یہ رکھتے ہو ہم جانتے ہیں۔ ملکیت کا

تصور جو ہے وہ اَنۡدَادًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ کہا ہے قرآن نے' خدا کے مقابلے میں دوسرے خدا بنا دینے والی بات ہے۔ وہ کہتا ہے لِلّٰهِ مِیۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ (3:180)۔ عزیزانِ من! کسی کا مکان ہو وہ اس کا مالک ہو۔ آپ اس کی ملکیت کا دعویٰ کیجیے دیکھیے تو سہی پھر آگے جا کے جو جھگڑا ہوتا ہے۔ لِلّٰهِ مِیۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیۡرٌ وَّ نَحۡنُ اَغۡنِیَآءُ (3:180-81) اس نظام کے لیے جب یہ کچھ کہا جاتا ہے تمہارا نہیں خدا کا ہے۔ خدا کے لیے جسے ہم کہتے ہیں دے دو' اللہ واسطے جنوں اسی ہن کہنے ہونے آں دے دو' وہ اللہ واسطے کی صدائیں تو وہ محتاج بھکاری بے کس بے نوا سا بڑی دردانگیز صدا وہ لگاتا ہے''دے جا اللہ دے واسطے'' اس دردناک صدا میں محسوس ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کچھ خدا ہی ہے جس کے لیے یہ مانگ رہا ہے بے چارہ۔ وہ کہتا ہے یہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا محتاج ہے اور یہ غنی ہیں بات یہ نہیں ہے وَ اللّٰهُ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ خدا تو ساری کائنات سے مستغنی ہے اس نے اپنے لیے کیا مانگنا ہے' وہ تمہارے ہی لیے ایک نظام ایسا چاہتا ہے جس میں یہ مانگنے والے رہیں ہی نہیں۔ یہ وجۂ تذلیلِ انسانیت ہے ایک انسان دوسرے انسان سے کہے کہ مجھے خدا کے لیے روٹی دے دو۔ وجۂ تذلیلِ انسانیت۔ عزیزانِ من! آپ گھر میں مویشی پالتے ہیں تو خود اس کا خیال رکھتے ہیں کہ وقت پہ ملے لیکن انسان آپ کے معاشرے کے اندر دردناک اور سوزانگیز آواز سے آپ کو کہتا ہے کہ میرے بچے تین دن سے بھوکے ہیں مجھے خدا کے لیے روٹی دے دو' اس سے زیادہ انسانیت کی ذلت کیا ہو سکتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے مطابق نظامِ خداوندی کا انکار کرنے والا ہی تو کافر ہے' مشرک ہے' ظالم ہے

کہا یہ جو ہم تمہیں نظام دے رہے ہیں تو ہم محتاج نہیں ہیں' تمہارے ہی لیے ہم یہ کہہ رہے ہیں۔ البتہ جواب اس کا ہے وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ (36:47) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کا رزق جو ہے اسے کھلا رکھو ہر ایک کی ضرورت کے لیے۔ قَالَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا (36:47) یہ لوگ جو اس نظام سے انکار کرتے ہیں۔ یاد رکھیے كَفَرُوۡا (36:47) کے معنی یہی نہیں ہوتے وہ ہندو یہودی غیر مسلم جسے آپ کہتے ہیں' ہر وہ جو صحیح نظامِ قرآنی سے انکار کرنے والا وہ کفر ہے اور یہ کافر ہے وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ (5:44) جو بھی ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا اسے کافر کہا جاتا ہے۔ اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں نا کہ کافر یہ کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ اچھا وہ وہاں ہندو تھے وہ تو وہاں رہ گئے نا وہ وہاں کہتے ہوں گے اب بھی کہتے ہوں گے''کہن دیو وساہڈا کی لیندے ہیگے نیں''۔

خداتعالیٰ کے ہاں رزق کی تقسیم وانتظامی امور کا طریق انسانوں کی کٹ حجتیوں کا ذکر

یہ جو اس صحیح نظام سے انکار کرتے ہیں وہ کہتے کیا ہیں؟ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ان لوگوں سے کہتے ہیں جو کہہ رہے ہیں کہ انسانیت کی بہبود کے لیے جسے فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے ان کو تم دو' وہ کہتے کیا ہیں؟ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ (36:47) تقدیر کا سارا مسئلہ' رزق کا سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ کہتے وہ یہ ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا کہ یہ لوگ جو ہیں یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ ان کو رزق خود کیوں نہ دیتا۔ یہ جو محتاج ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا چاہتا ہی نہیں ہے کہ یہ محتاج نہ رہیں تو تم ہمیں یہ کہتے ہو کہ خدا سے لڑائی کریں۔ وہ ان کو محتاج رکھنا چاہتا ہے تم کہتے ہو ان کو روٹی دو' نہ بابا! اللہ بڑا ڈاہڈا اوہدے نال تے لڑائی نئیں لڑی جاسکدی ہیگی''۔ اندازہ لگایے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے خدا یہ کہہ رہا ہے کہ یہ ان کفار کا قول ہے کہ اگر وہ چاہتا تو انہیں خود روٹی آ کے کیوں نہ دیتا۔ اس نے کہا کہ ہم خود آپ آ کے بھوکے کے منہ میں لقمہ نہیں ڈالا کرتے۔ اور میں یہ چیز کئی بار آپ سے واضح کر چکا ہوں قرآن کی آیات میں کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ ہمارا پروگرام جو انسانوں کی دنیا کے اندر چلتا ہے' وہ انسانوں کے ہاتھوں سے چلتا ہے ہمیشہ۔ اور وہ مشہور آیت جو ہے سورۃ نسآء کی وہ تو میں دہرایا کرتا ہوں کہ مدینے کے اندر تو یہ مملکت بن گئی۔ مکے کے اندر ابھی وہ لوگ موجود تھے جن پہ ظلم وستم ہو رہا تھا' وہاں وہ وہاں پکار رہے تھے۔ قرآن نے یوں کہا ہے اے مدینے کے مسلمانو! جو تم محفوظ ہو گئے ہو کیا تم سن نہیں رہے کہ مکے کے مظلوم ہمیں پکار رہے ہیں مدد کے لیے۔ خدا یہ کہہ رہا ہے وہ مظلوم ہمیں پکار رہے ہیں مدد کے لیے' کیا تم ان کی آواز و فریاد سن نہیں رہے؟ اٹھ کے ان کی مدد کے لیے جاتے کیوں نہیں ہو؟ (4:75) بات تو سیدھی کہنے کی تھی صاحب! پکار رہے ہیں آپ کو آپ قادرِ مطلق ہیں' آپ کیوں نہیں ان کی مدد کرتے؟ ایک تو وہ پکار ہی آپ کو رہے ہیں پھر آپ کی قدرتوں کا اندازہ نہیں لامحدود ہے' تو آپ یہ آپ کیوں نہیں کرتے؟ وہ کہتا ہے یہ بات نہیں ہے وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (2:251;22:40) ہمارا پروگرام یہاں یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں جنہیں ہم کہتے ہیں کہ ہمیں یہ کرنا ہے۔ ہمیں وہ پکارتے ہیں' ان کی حفاظت ہم نے کرنی ہے۔ خدا انسانوں کی جماعتوں کے ہاتھوں سے انسانوں کی جماعتوں کا مقابلہ کرایا کرتا ہے۔ یہاں جو کہا گیا کہ ان سے جب کہا جاتا ہے کہ آؤ انتظام کرو ان بھوکوں کی روٹی کا تو یہ کہتے ہیں کہ صاحب! اگر خدا نے ان کو واقعی معاش کی طرف سے بے فکر کرنا ہوتا تو وہ خود کیوں نہ ان کو رزق دے دیتا؟ کہا ان سے کہو کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (36:47) کتنی کھلی ہوئی گمراہی کے اندر تم جا رہے ہو۔ یہ انتظام یہ نظام تم نے ہی قائم کرنا ہے۔ روکا بھی تو تم نے ہی ہے رزق کو' بند بھی تم نے ہی کھولنے ہیں۔ یہی چیز یہاں دہرائی لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ

وَّ نَـحۡـنُ اَغۡـنِـیَـآءُ (3:181) بات ہم نے سن لی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پھریوں تو معنی یہ ہوئے کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں جو ہم سے وہ مانگتا ہے وہ کہتا ہے۔ یہ کٹ حجتیاں ہیں حقیقت میں۔ بات یہ بھی جانتے ہیں سمجھتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے سَـنَـکۡتُبُ مَا قَـالُوۡا (3:181) جو کچھ یہ کہتے ہیں لکھتے چلے جاتے ہیں درج کرتے چلے جاتے ہیں' ان کے اعمال نامے میں۔ وَ قَـتۡـلَـهُـمُ الۡاَنۡبِیَـآءَ بِـغَیۡرِ حَقٍّ ۙ (3:181) اور ان سے پوچھو کہ اگر یہی چیز ہے جو یہ کہتے ہیں تو اس سے پیشتر بھی جو ان کی طرف سے انبیا آئے تھے ان لوگوں نے اٹھ کے ان کے اوپر کیوں حملے کر دیے تھے اور ان کو کیوں قتل کر دیا تھا؟ وَّ نَـقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ (3:181) اور ان سے یہ کہا جائے گا کہ یہ کٹ حجتیاں جو تم بیچ میں کرتے ہو اس کے بدلے میں ایک جلا دینے والا عذاب آئے گا' اس قسم کا انقلاب آئے گا۔

غلط معاشرے میں آنے والی تباہی نیک و بد دونوں کو پھر برباد کر دیتی ہے

عزیزانِ من! اس کے لیے قرآن نے دوسری طرف کہا ہے کہ محتاط رہو اس فتنے سے کہ جب وہ آیا کرتا ہے تو پھر ظالمین تک ہی محدود نہیں رہا کرتا (8:25)۔ سیلاب نہ پرسد کہ درِ خانہ کدام است۔ وہ پھر تفریق نہیں کیا کرتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس سے آنے سے پہلے پہلے بند لگا کے اس کے روکنے کی فکر کرو۔ ذٰلِکَ بِـمَـا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ (3:182) یہ جو اس قسم کا پھر وہ عذاب آتا ہے' تباہی آتی ہے معاشرے کے اندر' یہ فساد برپا ہوتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کس طرح فساد برپا ہوتے ہیں معاشرے کے اندر؟ وہ کہتا ہے کہیں باہر سے آیا ہوا نہیں ہوتا بِـمَـا قَـدَّمَـتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ (3:182) تمہارے ہاتھوں کا لایا ہوا ہوتا ہے۔ لفظ ہے قرآن کا قَـدَّمَتۡ : بعض سفر تو ایسا ہوتا ہے کہ ساتھ ہی توشہ باندھ دیا جاتا ہے بعض اس قسم کا بھی ہوتا ہے عام طور پہ فوج کے اندر ایک ہراول دستہ ہوتا ہے' اسے پہلے بھیج دیا جاتا ہے منزل پہ' وہ ریگولر فوج کے وہاں پہنچنے سے پہلے وہاں سارا سامان جتنا بھی ہے' پورا کر دیتا ہے۔ پہلے سے سامان پورا کر دینا تاکہ پہنچنے کے بعد وہ سامنے آجائے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ ہر عمل جو انسان کرتا ہے وہ پہلے وہ عمل کرتا ہے' بھیج دیتا ہے گویا اپنے لیے وہ پہلے ہی وہ نتیجہ' بعد میں وہاں پہنچتا ہے عمل کے سرزد ہونے کے بعد نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

انسانوں کے تخریبی اعمال ہوں یا تعمیری ان کا نتیجہ بتدریج ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے

یہ جو انقلاب آتا ہے' فساد برپا ہوتے ہیں' آفتیں آتی ہیں' فتنے آتے ہیں' یہ ایک دن کی بات نہیں ہوتی۔ اس قوم نے بہت پہلے سے تخریبی چیزیں اپنی جتنی بھی ہیں' بھیجنی شروع کی ہوئی ہوتی ہیں۔ عجیب لفظ ہے قرآن کا۔ تم بھیجتے چلے جا رہے تھے ہم تو

صرف ان کو یہاں جمع کرتے چلے جا رہے تھے بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ (3:182) تم نے یہ پہلے سے بھیجنی شروع کی ہوئی تھیں۔ بائیس برس سے یہ بھیجنی شروع کی ہوئی تھیں، ایک دن کی بات نہیں ہوتی۔ عزیزانِ من! اسی طرح سے جب اس کی جگہ آپ ایک صالح انقلاب لاتے ہیں، وہ بھی شاباش نہیں آیا کرتا اس کے لیے بھی بہت پہلے سے ہاتھوں کو کچھ بھیجنا پڑتا ہے، بڑا ابتدریج آتا ہے۔ وہ تو اس عذاب کے متعلق کہا ہے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (7:182) GRADUALLY, STAGE BY STAGE درجہ بہ درجہ ہم ان کو لیے چلے جا رہے ہیں اور جب وہ سامنے آئے گا تو وہ نظر ایسے آئے گا کہ ان کو اس کا شعور تک بھی نہ ہوگا کہ آ کہاں سے گیا۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ (3:182) تمہارے ہاتھوں ہی تو پہلے بھیجا تھا، بھول گئے۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (3:182) اللہ کسی پہ ظلم نہیں کیا کرتا۔ قومیں اپنے ہاتھوں کے لائے ہوئے نظام کی وجہ سے تباہ ہوا کرتی ہیں، خدا کسی پر ظلم نہیں کیا کرتا۔ اس لیے ان چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کر دینا یہ قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ اَلَّذِيْنَ (3:183) وہ کہتا ہے حجتیں ان کی ملاحظہ فرماؤ۔ باتیں ہم ان سے کر رہے ہیں یہ جو نظام ہے اس کی اور ان کی کیفیت یہ ہے وہ جو حضرتِ موسیٰ کا وہ قصے میں آتا ہے فرعون کے پاس گئے اس سے جا کے کہتے ہیں کہ یہ بنی اسرائیل کے اوپر اتنا ظلم کر رہے ہو ان کو چھوڑو اجازت دو میں ان کو یہاں سے لے جاؤں۔ دربار میں بیٹھے ہوئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے بات یہ ہو رہی ہے۔ لیکن فرعون یہ کہہ رہا ہے کہ موسیٰ! یہ بتاؤ کہ یہ جو ہمارے بڑے بڑے یہ درباری وزیر امیر ہیں ان کے جو بزرگ اس سے پہلے مر چکے ہیں، وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں ہیں؟

لائل پور میں ایک محفل استفسارات کے دوران پرویز صاحبؒ سے لیے گئے سوالات کی نوعیت

لائل پور میں میں بھی تقریر کر رہا تھا، بات آج کل کے یہی مسائل، یہی تو سامنے آ سکتے تھے۔ یہی چیزیں سامنے آ رہی تھیں قرآن کی رو سے یہ پیش کیا جا رہا تھا۔ اس کے بعد عام طور پہ میرا انداز ہے وہ میں نے یہ کہا کہ بھئی! سوالات کے ضمن میں میں ہمیشہ یہ کہہ دیا کرتا ہوں کہ سوالات جو ہیں ان کو پیش کیجیے تو وہ پرچی وہاں سے آ گئی لکھا ہوا تھا کہ ذرا تفصیل سے بتایے کہ رسول اللہ ﷺ نور تھے یا بشر تھے؟ اور یہ مجھے معلوم تھا کہ میرے جانے کے تین ہی دن پہلے پبلک جلسہ میں نہیں، فتنہ وہاں تک پہنچ چکا تھا ایک گھر کے اندر آپس میں کزنز تھے نوجوان وہ وہاں گھر میں بات چل پڑی اور وہاں لائل پور میں یا ان جگہوں میں جو مذہب پرست زیادہ ہیں، وہاں تو یہ مسئلہ بڑا اہم چلا ہوا ہے۔ گھر کے اندر وہ آپس میں گفتگو کر رہے تھے نور و بشر کی اور یہاں سے جو وہ آگے بڑھے ہیں، اشتعال اتنا دلایا گیا کہ دوسرے نے اٹھ کے اس کو چاقو مار کے وہیں مار دیا، گھر میں بھائی کو ڈھیر کر دیا۔ تو بات یہ ہو رہی ہے اور

وہ چٹ آ رہی ہے کہ وہ نور تھے یا بشر تھے؟ بعینہ وہی بات جو اس نے کہی تھی کہ الجھاؤ اس میں کہ بتایے صاحب یہ اسلاف جو ان کے تھے وہ جنتی تھے یا جہنمی تھے۔ وہ سیدھی بات ہے کہ کسی مولوی صاحب کے سامنے اگر یہ بات آتی تو ساری رات اس بحث میں وہ صرف کر دیتا۔ اسے پتہ نہیں تھا سامنے ہے کون؟ یہ خدا کا پیغمبر تھا۔ اس نے کہا وہ جو تم ان کے متعلق کہتے ہو عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ كِتٰبٍ ج (20:52) ان کا معاملہ خدا کی کتاب میں درج ہے جہاں ان کے اعمال نامے ہوتے ہیں تم بتاؤ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں۔

عقلِ انسانی کی توہم پرستیوں کی نوعیت

یہاں بھی جو ان سے بات ہو رہی تھی وہ اس نظام کی تھی۔ اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡكُلُهُ النَّارُ ط (3:183) کہ یہ بات تو بعد میں کر لی جائے گی یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ صاحب! کیوں ہم اس کو گرہ دے کے بیٹھے ہوئے ہیں کیوں نہیں وہ نظام قائم کرتے؟ جبکہ ان کا کہنا تھا کہ تم یہ بتاؤ کہ وہ سوختنی قربانی یہودیوں کے ہاں وہ قربانی دیتے تھے پھر وہ گوشت کو جلاتے تھے اور وہ یہ کہتے تھے اس میں سے ”گل بڑی ٹھیک کہندے سن آ کباباں دا دھواں جیہڑا اوندا اے نا“ (دراصل وہ کباب کا اشتہار ہی ہوتا ہے وہ جو دھواں اس سے اٹھا کرتا ہے کھینچ کے لے آتا ہے)۔ وہ کہتے تھے کہ یہ جو گوشت کو جلاتے ہیں نا یہ دیوتا جو ہیں نا ان تک یہ دھونی پہنچتی ہے، بہت خوش ہوتے ہیں پھر وہ۔ اسے سوختنی قربانی کہتے تھے۔ عام طور پہ قریباً قریباً ہر مذہب میں یہ چیز رائج تھی۔ تو وہ کہنے لگے کہ صاحب! یہ بات تو بعد کی ہے پہلے یہ بات بتاؤ کہ ہمیں کہا یہ گیا تھا کہ تم کسی رسول کی بات نہ ماننا تاوقتیکہ وہ یہ سوختنی قربانی والی بات نہ لے آئے ”اے گل پہلاں کر“۔

عقلِ انسانی کی مکاری اور قرآنِ حکیم کا ارشاد

آپ دیکھیں گے کہ جب بھی کہیں کوئی اہم معاملے جو ہیں، زندگی سے متعلق معاملات، ان کے متعلق آپ گفتگو کریں گے، عقائد کی بحث چھڑ جائے گی صاحب۔ ’کس نہ کشود نہ کشائد بہ حکمت ایں معمہ را‘ حل ہی نہیں ہوتے یہ مسائل جو ہیں۔ کبھی ادھر نہیں آنے دیتے۔ انہوں نے فوراً یہ کہا کہ یہ بتاؤ۔ جواب دینے والا ابھی تو خدا تھا قُلۡ قَدۡ جَآءَكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَبِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡهُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (3:183) کہا ان سے پوچھو کہ تم خود کہہ رہے ہو کہ اس سے پہلے ہماری طرف رسول آئے تھے، انہوں نے اس قسم کا حکم دیا تھا ہمیں، وہ یہ چیز کہتے تھے تم یہ کہہ رہے ہو تو بتاؤ کہ وہ جو یہ چیز بھی تمہاری پوری کر

رہے تھے پھران کو قتل کیوں کر دیتے تھے ان کے در پے تخریب تم کیوں ہو جاتے تھے؟ کہ اگر یہی حجت کی بات ہے تو یہ پہلے بتاؤ کہ یہ تم کیوں کرتے تھے؟ کہا بات اور ہے ''من حرامی حجتاں ڈھیر'' بات وہی ہے جو ہم یہ کہہ رہے ہیں۔ اب وہ یہ کہتے تھے کہ نہیں صاحب! آپ چونکہ یہ نہیں کرتے اس لیے ہم تمہاری معاشی نظام کی بات جو ہے اس کو غلط سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔

نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر سب سے زیادہ اذیت پہنچانے والا الزام

عزیزانِ من! سب سے بڑی اذیت یہ ہوتی ہے کسی صداقت شعار دیانت دار سچے آدمی کے متعلق یہ کہنا کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ بڑی اذیت رساں چیز یہ ہوتی ہے یہ الزام لگا دینے والی۔ قرآنِ کریم میں بار بار یہ کہا گیا ہے حضور ﷺ سے کہ بڑے بڑے الزامات لگاتے ہیں۔ لیکن یہاں بڑے ہی حسین انداز سے ایک بات کہی ہے فَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقَدۡ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ جَآءُوۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الۡكِتٰبِ الۡمُنِيۡرِ (3:184) کہا کہ یہ اگر تیری تکذیب کرتے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں ہے تم سے پہلے بھی جتنے لوگ خدا کے پیغامات لے کر آئے تھے، انہوں نے اسی طرح سے ان کو بھی جھٹلایا تھا۔ واضح دلائل بہترین ضابطے قانون، ایسی کتابیں کہ جو دوسروں کو روشنی دینے والی کتابیں تھیں، تاریکیوں سے ان کو روشنی کی طرف لے جانے والی چیزیں تھیں، وہ لے کے آئے تھے۔ انہوں نے ان کی بھی تکذیب کی تھی۔ لیکن اس معاملے میں ایک چیز جو میں نے کہا تھا قرآن نے بڑی ہی لطیف چیز کہی ہے اور بڑی عظیم چیز ہے۔ میں تو جب اس کو دیکھتا ہوں وجد آ جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی، وہیں کے آپ ﷺ رہنے والے، ان ہی میں سے ایک فرد اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ (18:110) وحی آتی ہے اس کے علاوہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ اب وہ جو یہ چیز کہے خدا کی طرف سے وحی آتی ہے، وہ کہیں کہ یہ جھوٹی بات ہے تو گویا یہ ہوا نا کہ وہ اس شخص کو جھوٹا کہتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ یہ تھی، قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ انہوں نے جب یہ کہا کہ اس تمہارے دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا ہے کہ تم کہتے ہو کہ میں خدا کی طرف سے رسول ہوں، وہاں سے وحی مجھے ملتی ہے، اس کا ثبوت تمہارے پاس کیا ہے؟ بہت بڑی چیز تھی کہ اس دعوئ نبوت کا ثبوت کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے اس کا ثبوت کیا بہم پہنچایا گیا تھا؟ ہمارے ہاں تو یہ کہتے ہیں نا کہ صاحب! معجزات نبوت کی صداقت کا ثبوت ہوتے ہیں، معجزہ دکھا دیا جائے۔ قرآن نے بار بار اس کی نفی کی ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ اُدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ قف عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىۡ ط (12:108) میں تو جو خدا کی طرف تمہیں دعوت دیتا ہوں علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں، عقل و فکر کی بنا پر، علم و بصیرت کی بنا پر، اور تم مجھ سے وہ باتیں مانگتے ہو جس میں تمہاری عقل و فکر ماؤف ہو جائے ارے کیا کرتے ہو تم؟ پھر انہوں نے کہا کہ تمہارے پاس ثبوت کیا ہے اس کا؟ آپ ﷺ نے فرمایا ثبوت یہ ہے فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ

قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (10:16) میں کہیں باہر سے نہیں آیا' میں نے ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے تم بتاؤ کہ اس قسم کی زندگی جو تمہارے سامنے ہے میری' سچے کی زندگی ہوتی ہے یا جھوٹے کی زندگی ہوتی ہے؟ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ رکھو انگلی کوئی ہے مائی کا لعل' کہو ایسی زندگی ایسی سیرت کس کی ہوتی ہے؟ عزیزانِ من! ایک داعی اپنے دعوے کی صداقت میں اپنی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ اور وہی داعی سچائی کے اوپر ہے جو دشمنوں کے نرغے میں کھڑا ہو کے یہ بات کہہ دے۔ آج کہا جاتا ہے ووٹ اس کو دو جس کا ماضی بڑا صاف ہے اور ہر شخص اس کوشش میں ہے کہ کسی کا ماضی بھی بے داغ نہ رہنے پائے۔ یہ ہے ماضی بے داغ کہ اس قدر مخالفت جو ان لوگوں کی مخالفت ہوتی تھی اس کا تو اندازہ نہیں آپ لگا سکتے'

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابو سفیان کی حق گوئی

ہرقل کے دربار میں ابو سفیان گیا تھا' مدد لینے کے لیے حضور ﷺ کے خلاف' اس جماعت کے خلاف۔ وہاں ہرقل نے یہ پوچھا تھا کہ یہ شخص جس نے یہ دعویٰ کیا ہے تم میں سے ہی ہے یا کہیں باہر سے آیا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا ہم میں سے ہے' ہمارا عزیز ہے' ہمارا بھتیجا ہے' کسی نے کہا بھائی ہے' اپنے میں سے ہے۔ کہا کہ اس کی زندگی تم میں گذری ہے؟ انہوں نے کہا ہم میں گذری ہے۔ اس نے پوچھا کہ پھر زندگی یہ کیسی تھی؟ عزیزانِ من! سچائی اس کو کہتے ہیں' کریکٹر اس کو کہتے ہیں۔ اس مشن پہ وہ گیا ہوا ہے وہ شخص' وہاں امکان ہے اس چیز کا کہ جو جی میں آئے وہاں کہہ دے اور پھر یہ زندگی کی اہم ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا تو کہتے ہیں' واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ واجب از روئے (خود ساختہ) شریعت تو مسلمانوں پہ ہوتا ہے کافر ابو سفیان پہ تو نہیں واجب ہو سکتا تھا'' او تے مسلمان ہوندا نا تے فیر بولدا نا جھوٹ' لے جی کافر ہو کے جھوٹ بول سکدا اے؟''۔ وہ وجوبِ شرعی سے واقف ہی نہیں تھا بے چارہ۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں معاف کر دے گا اللہ میاں اسے کہ تو نے جھوٹ نہیں بولا'' او کہے گا جی مینوں پتہ ای نئیں سی میں مسلمان ای نئیں ساں''۔ اس کے دربار میں اتنی بڑی مہم پہ گیا ہوا شخص اور وہاں یہ وہ پوچھتا ہے۔ اس جواب کے اوپر دارومدار تھا اس کے مشن کی کامیابی اور ناکامی کا۔ سیرت یہ ہوتی ہے' سر پہ چڑھ کے بلاتی ہے۔ ابو سفیان نے کہا اس نے زندگی ہم میں گذاری ہے اس نے کبھی آج تک نہ جھوٹ بولا ہے' نہ کسی کو فریب دیا ہے۔ اس نے کہا کہ جس کی پوری سیرت یہ ہو وہ کبھی راتوں رات اتنا بڑا جھوٹا نہیں ہو سکتا جیسا تم کہتے ہو' میں اس کو سچا ہی مانوں گا۔ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (10:16)۔ آئے نا کوئی مائی کا لعل' بڑے دعوے کرنے والے' اٹھ کے کہے نا کہ میں نے تم میں زندگی بسر کی ہے دیکھو تو سہی یہ زندگی کس کی ہوتی ہے۔ میں بات یہ کہہ رہا تھا کتنے حسین پیرائے میں اللہ نے یہ بات کہی ہے کہ تمہیں یہ باتیں اذیت ضرور دیتی ہیں کہ یہ تمہیں

کہتے ہیں کہ یہ بات جو تم کہہ رہے ہو وحی کی یہ جھوٹی ہے۔ تکذیب کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! سنیے لفظ۔ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ (6:33) ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں تمہارے دل کو اس سے بڑی اذیت پہنچتی ہے لیکن ذرا فرق کر دو ایک بات میں فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ (6:33) یہ تجھے جھوٹا نہیں کہتے وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ (6:33) یہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اے رسول! تمہیں تو جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ ہماری باتوں کو جھوٹا کہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ظالم کی جڑ کٹ جائے گی' یہ کہتے ہیں جھوٹ ہے۔ کہا تمہیں جھوٹا نہیں کہتے۔ کتنا فرق ہے تمہیں جھوٹا نہیں کہتے' ہماری بات کو جھٹلاتے ہیں ''غصہ ساہنوں آنا چاہیدا اے''۔ یہ ہے شہادت۔ کتنا لطیف فرق ہے صاحب دو باتوں کے اندر۔

قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ ظہورِ نتائج کا نکلنا صرف حشر پر ہی موقوف نہیں

قرآن کہتا ہے فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰی مَا كُذِّبُوْا (6:33-34) اور یہ آج کی نئی بات نہیں ہے جہاں بھی کوئی انقلابی آواز آئی ہے جن جن کے WESTED INTEREST کے اوپر اس کی زد پڑتی ہے' وہ ہمیشہ اس کو جھٹلاتے ہیں۔ کہتے ہیں نہیں یہ نظام یہ صحیح ہے ہی نہیں ہے' نظام صحیح وہ ہے جو ہم کہتے ہیں۔ یہ چیزیں وہ کہتے ہیں۔ تمہیں گھبرانا نہیں چاہیے تجھے تو جھوٹا نہیں کہتے۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ (3:184) لیکن ان سے کہو یہ معاملات یہیں طے ہو جانے والے نہیں ہیں۔ یہ بات نہیں کہ یہاں تم نے جھوٹ فریب جس طرح سے جی چاہا اپنے مقاصد کو حاصل کر لیا' منافع کو سمیٹ لیا' اس کے بعد مر گئے' معاملہ ختم ہو گیا۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ (3:185) موت آنے والی ہے۔ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ (3:185) یوم الحساب آنے والا ہے۔

قیامت کے محدود تصور کے علاوہ نجات کا غلط تصور جو دنیا بھر کے مذاہب میں مشترک پایا جاتا ہے

عزیزانِ من! میں پھر یہ عرض کر دوں قیامت کے متعلق یہ وہی نہیں ہے جو مرنے کے بعد کی ہے' یہاں بھی جب صحیح انقلاب آتا ہے جیسا انقلاب یہ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے ہاتھوں آیا' یہیں ترازو قائم کر دیے جاتے ہیں' یہیں خیر اور شر کی پرچیاں تلنے لگ جاتی ہیں۔ وہ تو بڑا سریع الحساب واقع ہوا ہے۔ یہیں سامنے اعمال نامے آ جاتے ہیں' یہیں وہ گلے کا طوق بن جاتے ہیں' یہیں وہ تپائے جاتے ہیں سکے' یہاں بھی وہ انقلاب آ جاتا ہے۔ کہا کہ پورا پورا بدلا ہر ایک کا اس میں دیا جائے گا۔ اور آگے ہے

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ط (3:185) اب وہاں کی بات یہ ہے۔اب یہاں یہ ایک چیز کہی گئی اگرچہ اس سے پہلے بھی میں کئی بار کہہ چکا ہوں لیکن انداز اب درس کا یہی ہے کہ جب بات آئے کچھ اس کی وضاحت ساتھ کے ساتھ کردیں۔نجات کا مسئلہ: جتنے دنیا کے مذاہب ہیں'ان میں نجات کا تصور مشترک ہے'نام کچھ رکھ لیا جائے۔وہ مکتی ہو ہندوؤں کی'وہ نروان ہو بدھ مذہب والوں کا'وہ SALVATION ہو'وہ نجات ہو آپ کے ہاں بھی جو تصور آپ نے لے لیا ہے'یہ قدرِ مشترک ہے۔یہ تصور ہے کیا؟ بات پیچھے سے چلتی ہے۔یونانیوں نے زندگی کا ایک تصور دیا تھا انہوں نے دیکھا تھا کہ یہ PLANETS جتنے ہیں ان کو گول نظر آتے تھے دائرے میں۔انہوں نے کہا کہ زندگی کا فلسفہ دائرہ ہے۔اسی طرح انہوں نے کہا کہ انسانی زندگی بھی ایک CYCLIC ORDER میں چلتی ہے دائرے میں چلتی ہے۔دائرے میں چلنے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ ایک مقام سے آدمی چلے اس دائرے میں' چلتا رہے' چلتا رہے۔سفر کی تکمیل کا نام ہوگا کہ جہاں سے چلا تھا' وہیں پہنچ جائے یہ ہے نا دائرہ۔جسے کوہلو کا بیل کہتے ہیں وہ بیل دن بھر میں شاید چالیس پچاس میل کر لیتا ہوگا شام کو دیکھیے ''اوسے کھونٹے تے بدھا ہونداا ے''۔دائرے میں جب زندگی چلتی ہے تو زندگی کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جہاں سے چلے تھے'وہاں پہنچ جائے۔انہوں نے تو یہ فلسفہ دیا تھا مذہب والوں نے اس کو ایک عقیدہ بنالیا'نجات کا تصور۔

فیثا غورث' آواگون' اشوک اور نروان والوں کا تصور

یونان میں اسی فلسفے کے ماتحت فیثا غورث نے اس کو مذہب کی شکل دی TRANSMIGRATION OF SOUL تناسخ کا مسئلہ یا آواگون کا مسئلہ۔یہ وہاں یونان کا مسئلہ ہے'ہندوؤں کا نہیں ہے۔ایک روح آتی ہے یہاں کسی پیکر میں وہ یہاں کچھ برے کام کرتا ہے'مرجاتا ہے۔پھر وہ روح چکر کاٹتے دوسرے پیکر میں آجاتی ہے پھر وہ یہ کچھ کرتا ہے'پھر آجاتی ہے' چکر چکر گھن چکر' دونا چکر' جیون چکر' مہا چکر حتیٰ کہ اشوک کا چکر۔ان کے ہاں آج کل وہ علم ان کا جو نشان ہے وہ بھی چکر۔زندگی چکر میں چلتی ہے۔کروڑوں سالوں کے چکر کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کہ جیسی روح پہلے دن آئی تھی پھر وہ ویسی کی ویسی ہو جاتی ہے۔''لے کم کِتا جے'' AS YOU WERE ہو جاتی ہے۔اور پھر شادیانے بجتے ہیں کہ صاحب شکر ہے'نجات ہے۔یعنی ایک انداز کی روح اللہ تعالیٰ نے'خدا نے'ایشور'پرماتما نے وہ بھیجی اور پھر اس کے بعد اس چکروں میں ڈال دیا اس کو۔کروڑوں سال چکروں میں ڈالنے کے بعد وہ کیا کیا اس نے؟ کہ آخر الامر جیسی تھی ویسی ہوگئی۔مکتی ہوگئی مکت ہوگیا قصہ ''مک گیا سیاپا''۔نروان والوں نے کہا

کہ یہ جو یہاں ہوش آ گیا ہے آدمی کو اس کا بیڑہ غرق، یہ ساری مصیبت اسی چیز کی ہے، نہ ہوش میں رہے، نہ یہ پتا ہو، نہ آرزوئیں پیدا ہوں، نہ تکالیف آئیں۔ اس کے لیے ریاضتیں مشقتیں وہی چکران کے ہاں کا۔ سارے چکر کاٹنے کے بعد پھر کیا ہو؟ نروان کہ جس میں پھر ہوش ہی باقی نہ رہے۔ چل بھئی۔ ''سوہری دے پہلے ای دن دھتورا پی معاملہ ختم ہو جائے''۔ نروانا' جیسا پہلے آیا تھا نا کہ ہوش نہیں تھی، ویسے ہی پھر وہ ہو جائے نروان ہے۔

عیسائیوں کے عقائد

یہودی عیسائی جتنے دوسرے باقی مذاہب ان کے ہاں کیا صورت ہے؟ عیسائیت نے کہا انسان تو پیدا ہونے سے پہلے بالکل پاک وصاف تھا، دنیا میں آیا پہلا جوان کا ماں باپ تھا آدم وحوا، اس نے ایک گناہ کیا۔ گناہ اتنا بڑا تھا ہر بچہ پیدائشی اپنے اولیں ماں باپ کا بوجھ لیے ہوئے چلا آتا ہے۔ اور بوجھ وہ ہوتا ہے ایسا پیٹھ کے ساتھ سیا ہوا کہ وہ جتنے جی چاہے یہاں عمل کرلے، وہ بوجھ اترتا ہی ہے نہیں۔ وہ ایک بابا چھلاوا ہوتا ہے نا وہ جو یہاں بیٹھ جایا کرتا ہے۔ وہ ٹانگیں یوں پھنسا دیتا ہے، وہ اترتا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں وہ بوجھ اتر نہیں سکتا۔ اللہ میاں نے بھیجا، ہر بچے کو بھیجتا ہے وہ بوجھ لدا ہوا وہ اتر سکتا نہیں ''اللہ میاں نے کہیا کہ اے کی بن گیا'' یعنی وہ تو ہر انسان جو ہے اس پہ وہ بوجھ ہے، ہر انسان دوزخ والا ہے۔ اب اس نے کہا کہ وہ جنت تو بے کار رہ جائے گی ''یعنی کرائے تے چڑھانا چاہیدا ہیگا اے''۔ اس کے لیے پھر تدبیر سوچی۔ باپ بیٹا بیٹھے ایک دن ''ایووں کر کے بیٹھے ہون گے پئی ہن کریے کی'' معاذ اللہ معاذ اللہ فیصلہ یہ کیا بیٹے نے کہا کہ عزیز ترین محبوب ترین تیری چیز میں ہی ہوں نا۔ مجھے پھانسی چڑھا دے اور میرے خون کے بدلے میں ان گناہ گاروں کو بخش دے۔ کفارے اور صلیب کا مسئلہ۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد کیا ہوا؟ کہ وہ بوجھ پیٹھ پہ لدنے سے پہلے جیسا تھا نا بچہ ویسا ہی بن کے جنت میں چلا گیا ''آ کم ہو یا جی''۔

یہودیوں کا تصور

یہودیوں کے ہاں نجات کا مسئلہ: کہ بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا ہونے سے تو جنتی ہو جاتا تھا وہ جو سبت کے دنوں میں کچھ غلطیاں ہو گئیں ان کی وجہ سے جہنم میں رکھا جائے گا۔ اس کے بعد ہمارے بخشانے والے جو ہیں وہ آ جائیں گے۔ ان کو ذرا لگ جائے گی دیر ''او تنور تے روٹی کھان بیٹھے ہوئے سن'' لیکن جب وہ آئیں گے تو آن کے کہیں گے کہ صاحب! یہ ان کو تم نے کیسے یہاں پکڑ لیا؟ انہوں نے کہا کہ اچھی بات کہ لے جاؤ۔ تو وہ پھر ان کو ویسا ہی کر دیں گے جیسا وہ اسرائیل کے گھر میں پیدا ہونے کے

وقت تھے۔ وہی چیز۔ چکرا تنے کاٹ کے ویسا ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔ یہ ہے نجات کا تصور۔

قرآنِ حکیم نجات کے اس تصور کو غلط قرار دیتے ہوئے صراطِ مستقیم کے تحت ارتقائی منازل کی آ گہی بخشتا ہے

می نہ سزدخدائے۔ عظیم سلسلۂ کائنات اس میں انسان کی پیدائش' سلسلۂ رشد و ہدایت یہ تمام کچھ اس لیے کہ جیسا پہلے انسان تھا' اسی قسم کا ویسا ہی بنا دیا جائے۔ ویسا ہی بنانا تھا تو اس چکر میں ڈالنے کی ضرورت کیا تھی۔ قرآن کہتا ہے نجات کا تصور غلط ہے۔ زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اس نے قرآن کی جو بھی INTRODUCTION ہے اس کے اندر یہ سارا نظریہ جو تھا اس چکر کا نظریہ ایک لفظ سے باطل کر دیا **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (1:6) چکر میں نہیں سیدھا راستہ۔ ایک لفظ میں۔ برادرانِ عزیز! قرآن یوں سمجھ میں آتا ہے۔ وہ یوں ہی بات نہیں کرجاتا وہ تو ایک ایک لفظ میں باطل کے سارے نظریے خواہ وہ فلسفے کے ہوں یا مذاہبِ باطلہ کے ہوں' کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ زندگی صراطِ مستقیم کا نام ہے توازن بدوش سیدھا راستہ' ایک قدم بھی آگے اٹھے گا تو منزل کی طرف جائے گا۔ اور جب شام کو منزل پہ پہنچے گا تو وہ کوہلو کے بیل کی طرح شام کو وہاں نہیں ہوگا' جہاں سے سٹارٹ کیا تھا' آگے بڑھا ہوا ہوگا۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے آگے بڑھ جاؤ۔ **لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ** (84:19) اور کہا کہ یوں ہی اسی لیول کے اوپر نہیں بڑھنا آگے بڑھنا بلند ہونا۔ ہم تمہیں **طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ** (84:19) بلند کرتے ہوئے چلے جائیں گے۔ یہ سوال ہی نہیں کہ جیسے پہلے انسان تھا اسی قسم کا یہ رہ جائے۔ اسی لیے اس نے نجات نہیں **اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ** (37:60) کہا ہے' فوز کا لفظ ہے اس کے معنی ACHEIVEMENT ہوتے ہیں کچھ حاصل کی ہوئی بات۔ AS YOU WERE نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ تصور نہیں ہے کہ یہاں سے لے جا کے پھر ان گناہوں کے بدلے میں پہلے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر وہاں وہ سزا بھگت لیں گے۔ پھر یہاں سے نکال کے جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اب اس کے لیے تصور سارا وہاں سے لیا یونان کا فلسفہ' مذاہبِ عالم کا نجات کا تصور اور اس کے بعد پھر اپنے ہاں کی دلائل دینے لگ گئے کہ کپڑا میلا ہو جاتا ہے نا تو پھر وہ (جنت کے متعلق بہت بڑے متکلم ہیں ہمارے ہاں کے' چھوڑیے کون ہیں' فوت ہو گئے سینکڑوں صفحے دلائل کے اوپر ہیں) دھوبی کی بھٹی پہ چڑھا دیا جاتا ہے' وہاں سے میل کچیل کٹ جاتی ہے پھر ہو جاتا ہے صاف۔ یعنی جیسے پہلے تھا پھر ویسے ہو گیا نا۔ اب دیکھیے ویسا ہی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ صاحب! وہ جہنم جو ہے اصل میں SANITORIUM ہے' مریض کو وہاں رکھا جاتا ہے اور

وہاں کے جو علاج ہیں، وہاں کی احتیاطیں ہیں، ان سے پھر وہ اچھا ہو جاتا ہے یعنی مرض سے پہلے جیسا تھا پھر ویسے ہو گیا وہی AS YOU WERE۔ آپ کے ہاں بھی یہ چیز نجات کا تصور اسی قسم کا آ گیا۔ عزیزانِ من! قرآن کا تصور یہ نہیں ہے۔ قرآن میں یہ ہے ہی نہیں کہ پہلے جہنم میں بھیجا جائے گا، بھٹی چڑھایا جائے گا، سزا بھگتائی جائے گی، پھر وہاں لے جایا جائے گا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک جہانِ فردا کی زندگی کا معیار

اس نے تو کہا یہ ہے کہ وہاں فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِیْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (101:6-7-8-9) وہاں تو ایک ہی معیار ہے کہ اگر آگے بڑھنے کی صلاحیتوں کا پلڑا جھک جائے گا، اگلی کلاس میں چڑھا دیا جائے گا۔ وہ پلڑا اگر جھکا ہوا نہیں ہے، دوسری طرف کا پلڑا ہے وہاں اس کی ترقی روک دی جائے گی، سوال ہی نہیں ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں بھی آپ دیکھیں گے وہ لایا ہے، وہ کہا ہے کہ جو اس عذاب سے محفوظ رکھا جائے گا جو دور رکھا جائے گا (21:101)۔ اہلِ جنت کے متعلق ہے کہ ان کے کانوں میں جہنم کے شعلوں کی سنسناہٹ کی بھی آواز نہیں آئے گی (21:102)، سوال ہی نہیں کہ اس میں ڈال کے پھر آگے لے جایا جائے۔ اسی لیے یہاں وہ لفظ آ گیا کہ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ (3:185) جو تباہ کر دینے والے انجام سے محفوظ رکھا گیا زُحْزِحَ (3:185) بلکہ دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا۔ آگے ہے وہ لفظ فَقَدْ فَازَ ط (3:185) اس نے کچھ ACHEIVE کیا۔ مجھے کبھی اس کا صحیح مرادف اردو میں لفظ نہیں ملتا، ملا ہی نہیں۔ یہ جو ACHEIVEMENT جسے کہتے ہیں کچھ حاصل کرنا یہ ہے وہ لفظ جو قرآن نے کہا ہے فَقَدْ فَازَ ط۔ باقی رہا یہ کہ اسی دنیاوی زندگی کو اگر آپ منتہٰی اور مآلِ آخری نصب العین قرار دے لیں، کہا غلط چیز ہے۔ یہ تو اس بلندیوں تک پہنچنے کے لیے ذریعہ ہے اسی کو نصب العین جس نے سمجھ لیا، فریب کھا گیا۔ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (3:185) اگر اسی کو تم اپنا مقصود بالذات سمجھتے ہو اور آگے بڑھنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے پھر تو یہ سارا نرا دھوکہ اور فریب ہے۔

مومن کی معراج تو سنگلاخ پتھروں پر سفر کرنے کا تقاضا کرتی ہے

اب اس جماعت کے متعلق کہا یہ سب کچھ کہنے کے بعد اے جماعتِ مؤمنین! لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ قف (3:186) یہ جس منزل میں تم نے آگے بڑھنا ہے، یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے، کانٹوں بھری منزل ہے۔ تصادم ہوگا، ٹکراؤ ہوگا، مزاحمتیں ہوں گی، مخالفتیں ہوں گی، بڑے بڑے ابتلا ہوں گے، آزمائشیں ہوں گی، باطل کا مقابلہ ہوگا، جان اور مال کی

آزمائشیں ہوں گی۔آزمائش کے معنی ہیں اپنے آپ کو آزمانا ہوگا تمہیں کہ ہمارے اندر کتنی قوت پیدا ہوگئی ہے کتنا جوہر بیدار ہوگیا ہے۔''وہ اللہ میاں آزماتا ہے'' یہ نہیں بلکہ تم اپنے آپ کو قدم قدم پہ آزماؤ گے کہ ہم میں کتنی طاقت ہوگئی' ہم میں کتنی قوت ہوگئی۔ اور زندگی میں یہ ہے کہ ہر قدم کے اوپر آپ کے اندر کی طاقت جو ہے پہلے سے بڑھنی چاہیے۔ورنہ وہ بات نہیں ہونی چاہیے کہ وہ بڑھاپے میں اس نے کہا کہ پہلوان جی جو بات جوانی میں تھی اب نہیں وہ رہی۔کہنے لگا نہیں! اب بھی وہی بات ہے' ہم میں کوئی کمی نہیں آئی' ہم تمہیں ابھی دکھا دیتے ہیں' چلیے اکھاڑے میں۔چلے گئے اکھاڑے میں اتار دیے کپڑے کس لیا لنگوٹ۔کنارے کے اوپر ایک پتھر پڑا ہوا بہت بڑا' وہاں چلے گئے اس پتھر کو زور لگایا ادھر سے' وہ ویسے کا ویسے ہی رہا' پھر زور لگایا اُدھر سے وہ ویسے کا ہی رہا۔اس نے کہا کیوں جی؟ کہنے لگا میں نے جو تمہیں کہا تھا کہ کچھ فرق نہیں آیا۔کہنے لگا جی فرق کیوں نہیں آیا؟ ''کہن لگا جوانی اچ وی نئیں سی ہلدا ہوندا ہن وی نئیں ہلدا''۔عزیزانِ من! یہ جنت ہے جس کے ہم مستحق نظر آتے ہیں' نہ جوانی میں ہلتا تھا' نہ بڑھاپے میں آ کے ہلا۔یہ جو چیز ہے یہ فاز فوز عظیم نہیں ہے۔

قرآنی اعمال تو ہر آن نت نئے اضافے کی نوید دیتے ہیں

قرآنی اعمال کو اسی لیے اس نے اعمالِ صالحہ کہا ہے' صلاحیتیں اس میں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔تو آزمائش یہ ہے کہ یہ دیکھے کہ اس سے پہلے نہیں ہلتا تھا' آج یہ دیکھیے کس طرح سے ہل رہا ہے۔مومن کا ہر قدم آگے کو بڑھتا ہے اس کے لیے تو جنت بھی آخری مقام نہیں ہے راستے کا ایک ستانے کا مقام ہے آگے بڑھنے کے لیے ایک اور STEPING STONE ہے۔اس نے تو اور آگے بڑھنا ہے۔ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا (79:44) یہ بات پھر کبھی کریں گے کہ وہ کیا ہے۔کہا یہ کہ بڑے تصادمات ہوں گے' بڑی مخالفتیں ہوں گی' قدم قدم کے اوپر تمہیں اپنے آپ کو آزمانا ہوگا کہ وہی بات تو نہیں ہے کہ نہ جوانی میں ہلتا تھا' نہ بڑھاپے میں ہلتا ہے۔دیکھو کہ کتنی زیادہ ترقی تم نے کی ہے۔اور اگلی بات اور ہے اور یہ ہے وہ اذیت رساں بات۔وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا ط (3:186) اور یہی بات نہیں کہ کھلے ہوئے میدان میں یہ آئیں گے ٹکراؤ ہوگا' کہا یہ تو کچھ بات نہیں۔بہت سی ایسی ایسی باتیں سنیں گے جو بڑی اذیت رساں ہوں گی۔آہاہا۔

کسی بااصول اور باوقار فرد کو اذیت ناک کیفیت میں مبتلا کرنے کی ایک گہری سازش کا طریق

برادرانِ عزیز! مخالف جب کمینگی کے اوپر اتر آتا ہے' وہ کھل کر میدان میں مخالفت نہیں کرتا' وہ الزام تراشیاں کرتا ہے پھر۔

اور یہ بڑی اذیت رساں چیز ہوتی ہے۔ایک حق اور صداقت کے مطابق زندگی بسر کرنے والا نہایت دیانت دار شخص جس نے اپنے کردار کو اتنا سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ رکھا ہو' یہ کرتے ہوئے اس کے متعلق جب یہ چیز آ جائے کہ بڑا بددیانت ہے اور اس نے یہ کیا۔ وہ بھی اس لسٹ کے اندر جب آ جاتا ہے تو بڑی اذیت رساں چیز ہوتی ہے۔عزیزانِ من! جس نے یہ کچھ کیا ہوا ہوتا ہے' اس کو اس سے تکلیف ہی نہیں ہوتی۔ نہ کرنے والے کے دل سے پوچھیے وہ الزام نہ لگائیں ویسے اس سے یہ کہہ دیں کہ ہاں یہ چیز جو ہے مثلاً ملازمت میں کہہ دیں کہ صاحب! ضرورت نہیں ہے چلے جایئے' کچھ نہیں محسوس ہو گا اس کو' کچھ فنانشل سی چیز ہے کوئی بات نہیں' یہاں نہیں وہاں کما لے گا۔لیکن جب اس سے یہ چیز کہی جاتی ہے کہ تم بے ایمان ہو پھر تو یہ نہیں برداشت ہوتا۔

ایک پاکباز شخصیت پر کیا گزری

اس طرح سے زندگی بسر کرنے والا جو ہے پاک باز' اس کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے۔اس دوست کی بات یاد آ گئی جو اس درس کے اندر نمایاں حیثیت سے بیٹھا ہوا ہوتا تھا کہ جب کسی نے آ کے اس کی موٹر کے ساتھ ٹکر ماری۔ٹیکسی کا وہ ڈرائیور تھا۔روزے کا دن تھا۔انہوں نے کبھی روزہ بھی نہ چھوڑا تھا' بڑی پاک باز زندگی تھی۔اس ڈرائیور نے یہ کہا کہ شراب پیتے ہو اور اس طرح سے گاڑی چلاتے ہو' تمہیں شرم نہیں آتی۔اور آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا مر گئے۔وہ تو اتنی بات سن نہیں سکتا۔یہاں پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے یہ کیا کہا کہ تصادمات کی زندگی کے متعلق یہ نہیں کہا' کہا سنو گے ایسا کچھ کہ جس سے تمہیں بڑی تکلیف پہنچے گی۔ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ(3:186) ان مقامات کے اوپر ضبط کو ہاتھ سے نہ دو اور توازن اپنا اگر قائم رکھو یہ ہے عزم الامور' یوں رہنا پڑے گا تمہیں۔عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔سورۂ الِ عمران کی آیت 186 تک ہم آ گئے 187 سے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ(2:127)

❀......❀......❀

بتیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 187 تا 192)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1970ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ الِ عمران کی 187 ویں آیت سے ہوتا ہے: (3:187)۔

قرآنِ حکیم کی آیات اور اس کی پیش کردہ تعلیم دوسروں سے چھپانا اور کمائی کا ذریعہ بنانا' جرمِ عظیم ہے

اس سے پہلے یہ آیات آ چکی ہیں کہ یہ یہودی یہ کہتے تھے کہ ہم سے یہ عہد کیا گیا تھا' ہم سے وہ عہد کیا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا کہ تم سے تو ایک ہی عہد کیا گیا تھا اور ذرا سوچو تو سہی کہ اس عہد کو تم نے کس طرح سے نباہا؟ اور وہ عہد تو اتنا ہی تھا کہ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ (3:187) کہا یہ گیا تھا کہ خدا کی طرف سے یہ جو کتاب مل رہی ہے' وحی مل رہی ہے' اسے چھپانا نہیں' کھول کھول کر لوگوں کے سامنے اس کو رکھ دینا' واضح طور پر اسے پیش کرنا۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ خدا کی اس کتاب کو اس تعلیم کو کھلے بندوں لوگوں کے سامنے پیش کرو اور اسے چھپاؤ نہیں۔ یہ تھا جو تم سے عہد لیا گیا تھا اور تم نے

اس عہد کو پورا اس طرح سے کیا کہ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (3:187) تم نے اس کتاب کو اپنے پسِ پشت ڈال دیا اور مذہب کچھ کا کچھ بنا کے بیٹھ گئے۔ کاہے کے لیے یہ کیا؟ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط (3:187) اسے تم نے پروفیشن بنالیا' کمائی کا ذریعہ بنالیا۔ اور جب دین کمائی کا ذریعہ بن جائے تو پھر کتاب اللہ تو سامنے پیش نہیں کی جاسکتی۔ وہ تو سب سے پہلی زد اس کی مذہبی پیشوائیت یا پریسٹ کرافٹ پر پڑتی ہے۔ دین آتا ہی اس لیے ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان یہ جو حاجب اور دربان بن کے بیٹھ جاتے ہیں' ان کو درمیان سے ہٹا دیا جائے۔

دینِ خداوندی کو مذہب کے اندر بدلنے کے لیے مذہبی پیشوائیت کا ہاتھ ہمیشہ قابلِ ذکر رہا ہے

خدا کی کتاب کا براہِ راست تعلق خدا کے بندوں کے ساتھ ہو' اس لیے یہ INSTITUTION ہی خلاف ہے دین کے۔ اور جوں ہی یہ درمیان میں آئی' مذہبی پیشوائیت جسے آپ کہتے ہیں' دین دین نہ رہا' مذہب ہوا اور یہ اس بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ یہ اسے پروفیشن بناتی ہے۔ کوئی اور ذریعۂ معاش ان کا نہیں ہوتا' مذہب ذریعۂ معاش ہوتا ہے۔ اور جب کوئی چیز ذریعۂ معاش ہو جائے گی تو سیدھی سی بات ہے کہ اس میں بلیک مارکیٹنگ ہوگی۔ اصل دین جو ہے اس کو چھپایا جائے گا' اس کی جگہ سے یہ وضعی مصنوعی اس قسم کی چیزیں پیش کی جائیں گی۔ اس قسم کی تجارت تو چلتی اسی طرح سے ہے کہ اصلی شے مارکیٹ میں آنے نہ دی جائے' ہر چیز بناوٹی جو ہے اسے اصلی کہہ کر پیش کیا جائے۔ خوب چلتی ہے تجارت۔ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ (3:187) کتنی بری تجارت ہے جو یہ کچھ کرتے ہیں۔ کہا یہ گیا ہے یہاں کہ تم نے خدا کی کتاب کو چھپایا۔ دیگر مقامات میں تو یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس میں تحریف کی الفاظ ہی بدلے' آیتوں کی آیتیں تبدیل کر دیں' کتاب کی جگہ کوئی اور ہی کتاب لائے۔ یہ تو ایک حصہ ہے۔ لیکن یہ جو چیز ہے کہ انہوں نے اس کو چھپایا اس کے لیے انہوں نے کیا کیا طریقے اختیار کیے تھے؟ وہ ہم سامنے لائیں گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ہاں پھر مذہبی پیشوائیت نے کیا کیا۔

یہودیوں کے ہاں وحی کی دو قسموں کے عقیدے کی وضاحت اور ان کے نتائج کا تفصیلی ذکر

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا قرآنِ کریم یہ جو امِم سابقہ کی داستانیں بیان کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے' اس نے ان کی کہانیاں سنانی ہیں۔ وہ تو ان کی داستانیں بیان کرتا ہے تاکہ ہم اس سے سبق لیں کہ ان قوموں نے یہ کچھ کیا تو اس کا یہ نتیجہ مرتب ہوا۔ اگر ہم بھی یہ کچھ کریں گے یہی نتیجہ ہمارے ہاں مرتب ہوگا۔ تو آپ ذرا غور کیجیے کہ انہوں نے کیا کیا تھا؟ سب

سے پہلی چیز تو یہ کہ خدا کی وحی اس کی کتاب میں آتی ہے' اس میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ایک عقیدہ وضع کیا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تو وحی مکتوب ہوتی ہے' وحی متلو ہوتی ہے' وہ وحی جو کتاب میں ہوتی ہے' اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس جیسی ایک اور وحی ہوتی ہے خدا کی طرف سے وہ اس کی کتاب میں نہیں ہوتی' اس سے الگ ہوتی ہے اور وہ روایات کے ذریعے سے آگے آتی ہے۔ یہودیوں کے ہاں مستقل طور پر یہ دو وحی تھیں۔ ایک تورات کے اندر اور دوسری جسے وہ کہتے تھے کہ حضرتِ ہارونؑ کی اولاد میں روایات کے ذریعے سے مسلسل آگے چلتی آ رہی ہے۔ اُس کی تلاوت ہوتی ہے' اس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ یہ کتاب میں لکھی جاتی ہے' وہ زبانی روایات ہوتی ہیں۔ غور فرمایا آپ نے۔ یہ جو دوسری قسم کی وحی تھی یہ اتنا بڑا طومار تھا ان کے ہاں کہ وہ تورات والی وحی وہ اس کے نیچے دب کے رہ گئی تھی۔ ان کی ساری شریعت کا مدار اس دوسری قسم کی وحی پر تھا۔ یہ مشنا ان کی روایات کی جو کتابیں تھیں' ان پر مبنی تھی' ان کی فقہ جو تالمود میں تھی۔ ان کا سارا مذہب ہی ان ہی کے اوپر چلتا تھا۔ اور اس سے آگے بڑھے تو ان کے ہاں یہ عقیدہ وضع ہوا کہ خدا کی وحی کے معنی ان الفاظ میں نہیں ہوتے جن الفاظ میں وہ آتی ہے اس کے باطنی معنی ہوتے ہیں۔ اور وہ باطنی معنی جو ہیں وہ یہ بڑے بڑے ان کے ہاں کے SAINTS یا بزرگ تھے' یہ خدا سے براہِ راست وہ معنی لیتے ہیں اور ان کو سینہ بہ سینہ اپنے ہاں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ یہ راز کی باتیں ہیں وہ لکھتے بھی نہیں ہیں' وہ جو ان کے ہاں کے عقیدت مند' ان کے خلفا ان کے مرید' یہ بس ان تک رہتی ہے بات۔ اور اصل کتاب یا اصل وحی تو ان معنی کی رو سے ہوتی ہے جو باطنی طور پر آگے چلتے ہیں۔

خودساختہ روایات کی پیدا کردہ وحی' اسکی بنیاد پر تصوف اور پھر اس کے اندر باطنی معنی کے پھیلاؤ کا سلسلۂ دراز

یہ تھے وہ طریقے جن طریقوں سے انہوں نے خدا کی وحی کو چھپایا اور اس کی جگہ غیرِ وحی جو تھی اس کو دین بنا دیا' مذہب بنا دیا۔ اب بڑی گنجائش عام ہوگئی کاروبار پھیلانے کی۔ وہ اصلی اور جینون (Gonuine) چیز تو جتنی ہوتی ہے' اتنی ہی ہوتی ہے لیکن جب اس کے بعد آپ مسور کی دال کے چھلکوں کی چائے بنانی شروع کر دیں تو پھر تو آپ روزانہ بوریاں بھرتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ یہ جتنا مذہب کا پھیلاؤ تھا ان کے ہاں' وہ یہ اس قسم کی جتنی وضعی روایات تھیں ان کی بنا پر' اور پھر اس کے اوپر جو فقہ مرتب ہوئی اس کی بنا پر اور ان کے ہاں کے تصوف کے اندر باطنی معنی اس کی بنا پر۔ اور اس کے بعد تو یہ لفظوں کے اعداد سے بھی

عدد جسے آپ کہتے ہیں' گنتی سے ان سے معنی متعین کیا کرتے تھے۔ یہ جمل سے' رمل سے نقشے بنا کر یہ اسمِ اعظم وظائف تعویذ یہ ساری چیزیں تھیں جو ان کے ہاں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ باطنی معنی تھے جن کی رو سے وہ کہتے تھے کہ یہ ہم اصلِ حقیقت کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو تو پسِ پشت ڈالا اور یہ ساری چیزیں جتنی تھیں ان کو دین بنا کے پیش کیا اور اس طرح سے اپنی دوکان داری چمکائی۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو کے علاوہ مثلہ معہ اور ناسخ و منسوخ جیسے عقائد کی حقیقت' فقہ کی تائید اور پھر قرآنِ حکیم کے باطنی معنوں کے افسانوں کے جال میں الجھی ہوئی ملتِ اسلامیہ کی حالتِ زار

عزیزانِ من! آپ سوچیے ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ یہ سارے عقائد آپ کے ہاں موجود ہیں یا نہیں؟ آپ کے ہاں کا بنیادی عقیدہ ہے آپ کے اہلِ مذہب کا مذہبی پیشوائیت کا کہ وحی دو قسم کی ہیں: وحی متلو اور وحی غیر متلو۔ یہ خالص یہودیوں سے عقیدہ لیا گیا ہے۔ قرآن تو ایک طرف رہا آپ کے ہاں کا جو صدرِ اول کا لٹریچر ہے اس میں بھی یہ دو قسمیں نہیں ملتیں یہ تصور بہت بعد کی پیداوار ہے۔ اور پھر یہ دوسری قسم کی جو وحی ہے جنہیں روایات کہا جاتا ہے' اس کے لیے وہی عقیدہ مثلہ معہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔ پہلا عقیدہ تو یہ ہوا کہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ پھر آگے عقیدہ ہوا وضع کہ یہ جو ہیں احادیث یا روایات جنہیں کہا جاتا ہے' یہ قرآن کے ساتھ جب ٹکرائے ان کا کوئی حکم' تو یہ ناسخ ہیں۔ قرآن کے حکم کو منسوخ کر دیتی ہیں۔ آگے عقیدہ یہ ہوا کہ قرآن کی آیات کی تفسیر ان کے ذریعے سے ہوگی۔ جس آیت کا جو مفہوم یہ بیان کرے وہی مفہوم لینا ہوگا آپ کو۔ اور یہ وحی کی دوسری قسم ہے۔ پورا جتنا بھی ضخیم ذخیرہ آپ کے ہاں روایات کا پایا جاتا ہے اس کے متعلق آپ کے ہاں یہ عقیدہ ہے' قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل اسی قسم کی وحی۔ فرق اتنا ہے کہ اس کی تلاوت کی جاتی ہے اور تلاوت کی جاتی ہے محض ثواب کے لیے' عمل اس کے اوپر ہوتا ہے۔ آپ کی ساری فقہ' اس کا مدار ان کے اوپر ہے۔ اور پھر آگے آپ کا تصوف آتا ہے۔ اس کے اندر یہ عقیدہ موجود ہے کہ قرآن کے معنی باطنی معنی ہیں' الفاظ کے ذریعے سے یہ معنی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ یہ معنی جتنے یہ اللہ والے ہیں' وہ خدا سے براہِ راست ان کے معنی معلوم کرتے ہیں اور پھر عجیب عجیب معنی ہوتے ہیں ان کے۔ رہتا ہے وہ صیغۂ راز میں' سینہ بہ سینہ علم اسے کہتے ہیں۔ جو ان کے ہاں کا جو مقتدا ہے' اس کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ تو علمِ لدنی اس کو بتا دیتے ہیں خدا کی طرف سے براہِ راست پایا ہوا اور پھر یہ آگے چلتا ہے' سینہ بہ سینہ راز ہائے سربستہ۔ اور ان کے نزدیک اصل معنی اصل مفہوم جو ہے وحی کا وہ انہیں ہی معلوم ہے۔ وہ جو مولانا روم فرما

گئے' بار بار دہرا گئے کہ

ما ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیشِ سگاں انداختم

قرآن کا اصلی مغز تو ہم نے لے لیا ہے۔ یہ جو الفاظ کے ذریعے سے قرآن ان لوگوں کے پاس ہے' یہ تو ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں' نچوڑتے چلے جایے اس کو۔ آپ نے غور فرمایا کہ بات تو کہی گئی تھی یہودیوں سے کہ تم نے یہ کیا اور آپ کے ہاں بعینہ وہی اعتقادات آپ کے ہاں اب اسلام بن چکے ہوئے ہیں اصلِ اسلام عینِ اسلام۔ ایک لفظ آپ ان روایات کے خلاف نہیں کہہ سکتے' ان کے اوپر مرتب شدہ فقہ کے خلاف نہیں کہہ سکتے۔

قرآنِ حکیم کو حق ثابت کرنے والوں کے خلاف کفر کے فتوے اور نبی اکرم ﷺ کی حدیث

قرآن کے متعلق اگر آپ ایک چیز لاتے ہیں یہ کہنا کہ خدا کی طرف سے صرف خدا کی یہ کتاب ملی تھی' آپ کو معلوم ہے کہ یہ کہنا اتنا جو ہے' اس سے کفر کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ کہ دینِ خالص قرآن کے اندر ہے دین کی سند اور حجت خدا کی یہ کتاب ہے۔ یہ عقیدہ جو ہے آپ کے ہاں اس مذہبی پیشوائیت کے نزدیک کفر کا عقیدہ ہے' الحاد کا عقیدہ ہے' اس پہ فتوے لگ جاتے ہیں۔ ابھی اگلے دنوں آپ نے دیکھا ہوگا اس کو طلوعِ اسلام نے بھی نقل کیا تھا۔ ایک روایت ایک حدیث ایسی بھی مل جاتی ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی بات میری طرف منسوب کرے اس کو ہمیشہ قرآن کے سامنے لاؤ اگر وہ اس کے مطابق ہو تو سمجھو کہ میری ہے اگر وہ اس کے خلاف ہے تو سمجھو کہ وہ میری نہیں ہے۔ کتنی صاف چیز ہے کتنی واضح چیز تھی یہ۔ اس حدیث کے متعلق یہ کسی نے لکھ دیا اس کے متعلق' ہمارے ہاں کے اہلِ حدیث کے ترجمان نے یہ بات لکھی کہ یہ اتنی بڑی غلط حدیث کو رسول اللہ ﷺ کی طرف لوگ منسوب کرتے ہیں۔ یعنی یہ حدیث سب سے بڑی غلط ہے۔ کہا اس کے مقابلے میں صحیح حدیث یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ ایک شخص بیٹھا ہوا یہ کہے گا کہ لوگو! قرآن ہی خالص ہے اسی کی طرف آ ؤ۔ یہ غلط ہے کہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل اور وحی بھی ہے' اس کو ماننا پڑے گا۔ کہا یہ ہے صحیح' وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ جتنی بھی آپ مختلف فرقوں میں مختلف افراد میں کشمکش دیکھ رہے ہیں' یہ تفرقے یہ فرقہ بندیاں' یہ ساری کی ساری اس ضخیم لٹریچر کی بنا پہ ہے جسے ان کے ہاں کا عقیدہ ہے کہ وہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ' قرآن سے الگ روایات اور فقہ کے ذریعے آپ کو ملی ہے۔

کیا فقہ کے قوانین قرآنِ حکیم کے قوانین سے مقدم ہیں؟

وہ تو پھر بھی روایات ہیں جو منسوب الی الرسول ہوتی ہیں۔ جو فقہ آپ کے ہاں مرتب کی ہے' وہ انسانوں کی مرتب کی ہوئی فقہ۔ فقہ کے معنی ہیں کسی خاص دور میں جو کسی نے قانون مرتب کیا۔ اس قانون کی کیفیت بھی یہ ہوگئی ہے یہ عقیدہ ہے آپ کے ہاں۔ ایک امام ہیں حسن' فقہ کے امام ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ ہمارے کسی فقیہہ امام کا کوئی قول اگر قرآن کے خلاف جاتا ہے تو پہلے تو یہ کوشش کرو کہ قرآن کی آیت کی تاویل ایسی ہوجائے جو اس قول کے مطابق ہو۔ اور اگر آپ دیکھیں کہ وہ ایسی سخت آیت ہے کہ وہ ''لف لفا کے ہوندی نئیں ہیگی ڈاہڈا اوکھا کم آ پئے'' اگر ایسی صورت ہو کہ اس کی ایسی تاویل نہیں ہوسکتی تو پھر یہ سمجھو کہ قرآن کی آیت منسوخ ہے۔ یہ ہے وہ مقام جس پہ آپ کھڑے ہیں۔

کسی قانون کے اسلامی ہونے یا نہ ہونے کے لیے کسی معیار اور اتھارٹی کا ہونا تو ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہوتا ہے

یہ جو روز دہائی مچتی ہے صاحب! اسلامی نظام' اسلامی قوانین' یہ ضابطہ اور وہ۔ یہ اسلامی کہا جاتا ہے' قرآنی کبھی نہیں کہتا کوئی ان میں سے۔ اسلامی کہنے میں یہ ساری گنجائشیں نکل آتی ہیں کہ جس کا جی چاہے اور قول نقل کر دیجیے اسلامی ہے اور اسلامی میں یہ سارا کچھ شامل ہے۔ ہر راوی کی روایت' ہر فقیہہ کی فقہ' ہر مفسر کی تفسیر' ہر محدث کی حدیث۔ اور اس کے بعد یہ اہلِ باطنی تشریف لے آتے ہیں ان کے ہاں کی اپنی تفسیریں ہیں۔ یہ جتنا کچھ ہے یہ سارا ملا دیجیے اور ان میں سے کوئی کسی کا قول ہوجائے وہ اسلامی ہوجائے گا آپ کے ہاں۔ حتیٰ کہ یہاں تک بات آئے گی آپ کہیے وہ کہتے ہیں کہ ''صاحب! حضرت وارث شاہ فرما گئے ہیگے نیں تسی کی گلاں کردے پئے ہیگے ہو''۔ یعنی جب ایک دین کی حجت یا سند اتھارٹی نہ رہے تو پھر اس کے بعد تو پھر یہ سارا کچھ اتھارٹی بنتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے وہ دشواری جس کی بنا پہ آپ کے ہاں نہ اسلامی نظام متعین ہوتا ہے' نہ اسلامی آئین متعین ہوتا ہے' نہ اسلامی قانون متعین ہوتا ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا ہر ایک کے ہاں اپنی اپنی سندیں ہیں' اپنی اپنی حجتیں ہیں۔ خدا نے اپنی کتاب کو کہا تھا کہ یہ ہے ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (2:2) یہ ہے دین میں سند اور حجت' جو اس کے مطابق ہے' اسے صحیح سمجھو' جو اس کے خلاف ہے' اسے غلط کہو۔ حجت اور سند یہ ہے۔ جب تک یہ چیز رہی مسلمان کے اندر ان میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا' ان میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے

۔لہٰذا اس قسم کی کتاب کو جب آپ سند اور حجت قرار دے لیں گے' اختلاف پیدا ہی نہیں ہو سکے گا۔ جوں ہی آپ نے اس کو چھوڑا اور یہ تمام چیزیں آپ کے ہاں سند اور حجت ہو گئیں۔اس کے بعد جو جی میں آئے آپ کہہ دیجیے۔آپ کے کسی بزرگ کا قول اس کے لیے سند اور حجت ہو جائے گا۔ یہ ہیں وہ طریقے جس سے کتاب اللہ کو چھپایا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ اور حروف کی ادائیگی کے سلسلہ میں ہماری احتیاط کی کیفیت

آپ کے ہاں کی کتاب اللہ یعنی قرآنِ کریم جو ہمارا ہے' اس میں الفاظ اور حروف کے اندر تو کسی قسم کی تبدیلی اور تحریف یہ کر نہیں سکتے۔اس لیے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ تو خدا نے خود لیا تھا' اس میں تو تبدیلی نہیں۔تو انہوں نے کہا' نہ ہوا کرے' پڑھتے رہو۔ اور بڑا زور دیا جاتا ہے اس کے الفاظ کی صحت کے اوپر ہی نہیں بلکہ وہ لہجہ اور تلفظ جو ہے' اس کی صحت کے اوپر بھی جو زور دیا جاتا ہے۔ ع یہاں سے نکلے ق وہاں سے آئے' ث یوں کہیے' ص یوں کہیے۔آپ کو معلوم ہے صواد یے اور ضواد یے دو فرقے ہیں ہمارے ہاں۔یہ جو قرآن میں وَلَا الضَّآلِّيْنَ (1:7) آتا ہے وہ بعض اس کو وَلَا الضَّآلِّيْنَ (1:7) پڑھتے ہیں اور بعض اس کو ولد آلین پڑھتے ہیں۔تو یہ دو فرقے ہیں ''صوادیا تے ضوادیا''۔یعنی یہاں تک اس کے متعلق تو اتنی بڑی احتیاط تجوید کا علم الگ ہے۔یہ جو بڑے بڑے قاری آپ کے ہاں آتے ہیں' فن ان کے ہاں کا ہے یعنی اس کے الفاظ کے متعلق اتنی احتیاط ہے۔کہیں کوئی غلطی چھاپے میں نہ رہنے پائے۔

عمل سے بالا تلاوت کا مقصد صرف ثواب کی حد تک یا قبر پر مُردوں کو سنانے کی خاطر پروفیشن کے لیے رہ گیا ہے

تراویح میں وہ قرآن سنایا جائے تو پیچھے سامع ہوتا ہے۔ٹھیک ہے قرآن کے الفاظ کی صحت کے متعلق یہ کیفیت۔لیکن یہ سارا قصہ جو ہے تلاوت کے لیے' ثواب حاصل کرنے کے لیے' عملاً قرآن جو ہے ان کے ہاں بالکل بےکار ہے۔سند اور حجت غیرِ قرآن کی ہے اور اس کے متعلق یہ عقیدہ یہ ہے کہ مثلہ معہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔اس قرآن کے متعلق یہ عقیدہ جس نے کہا ہے اپنے متعلق کہ ان سے کہو کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ خدا کی طرف سے نہیں ہے تو اس کی دس سورتوں کی مثل سورتوں لا کے بتاؤ۔ یہ مثلہ معہ پورے کا پورا اور پھر یہ جو قرآن جو ہے' اس کی ضخامت کے اعتبار سے پاسنگ بھی نہیں رہتا بے چارہ۔ چھ چھ لاکھ حدیثوں میں سے تو ایک بخاری بنی' چالیس چالیس لاکھ میں سے ایک مُسند امام احمد بن حنبل کی بنی۔کوئی قریباً چودہ لاکھ تو حدیثیں مروج ہیں۔میں صرف

روایات لے رہا ہوں' آگے چلیے فقہ تو پوچھیے نہیں۔ یہ تمام چیزیں جتنی ہیں اسلام آپ کا یہ ہیں۔ تلاوت صرف اس کی ہوتی ہے ثواب کی خاطر اور یا یہ کہ جب وہ آخر میں جان نہ نکلتی ہو تو از یاسینِ او آ ساں بمیری "کہ اینوں یاسین سناؤ سیا یا مکاؤ"۔ عزیزانِ من! اس مصرف کے لیے آپ کی کتاب رہ گئی۔ کیا یہ نہیں ہے کہ جو کہا گیا تھا کہ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ (3:187) پسِ پشت ڈالا اس کو' پروفیشن بنایا دین کو کتنی بری کمائی ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن نے کہا تو یہ ہے کہ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (3:187) جنہیں کتاب دی گئی تھی' ہم ان آیتوں کو پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ صاحب یہ یہودیوں کے متعلق ہیں اصل میں۔ یعنی قرآن کا حصہ بیشتر تو کفارِ عرب کے متعلق' مشرکین کے متعلق' وہاں کے منافقین کے متعلق' کچھ عیسائیوں کے متعلق' کچھ یہودیوں کے متعلق اور آپ کے متعلق اس میں کیا ہے؟ بہشتے فی سبیل اللہ ہم است "اللہ واسطے دی جنت"۔ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (3:187) پسِ پشت ڈال دیا اس کتاب کو انہوں نے۔ اس لیے کہ دین کو پروفیشن بنالیا۔

فکرِ قرآنی سے دور انسانی سوچ ہمیشہ خود نمائی کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ج وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (3:188) کہا کہ تم گمان بھی نہ کرو کہ یہ لوگ جن کی کیفیت یہ ہے کہ جو کچھ یہ کرتے ہیں یہ اس کے اوپر مگن ہو کے خوش ہو جاتے ہیں کہ صاحب! ہم بہت بڑے دین دار ہیں اور دین کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اور اس کے بعد ہے ٹکڑا' بڑا جامع ٹکڑا ہے۔ وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:188) چاہتے یہ ہیں کہ جو کچھ یہ کرتے نہیں' اس کی بنا پر ان کی تعریف کی جائے۔ اب آپ غور کیجیے اس کے اندر' آپ کے ہاں تمام سارے کے سارے اربابِ مذہب اور اصحابِ اقتدار لیڈر سب آ جاتے ہیں اس میں۔ ہر ایک آپ کے ہاں' ان کی روش کیا ہے؟ ان باتوں کی بنا پر قصیدے ان کی شان میں پڑھے جائیں جو یہ کرتے نہیں صرف کہتے ہیں۔ قرآن نے کیٹگری شروع میں ہی بتائی ہے آپ کو معلوم ہے وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) کہ وہ کہتے ہیں یہ بات کہ ہم ایمان لائے ہیں خدا پر اور آخرت پر وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) مومن نہیں ہیں۔ عزیزانِ من! یہ کون لوگ ہیں؟ یہ ہم ہی تو ہیں۔ ہر ایک ہم میں سے کہتا ہے الحمدللہ مسلمان اور اس کے بعد ہر ایک ہم میں سے کہتا ہے کہ صاحب! اصل یہ ہے کہ وہ جو بتایا ہے مسلمانوں کی شان وہ تو ہم میں ہے نہیں۔ روز آپ دیکھتے ہیں دہائی مچی ہوئی او مسلمان بن جاؤ' اسلام کے قالب میں اپنے آپ کو ڈھال لو۔ کہنے والا یہ کہتا ہے

تم ڈھال لو میں نہیں' نہ۔تم یہ نہیں کرتے' تم وہ نہیں کرتے یعنی یہ آپ خود تو سب کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ایسے بن جاؤ' ایسا تمہیں ہونا چاہیے' صحیح مسلمان بنو' سچے مسلمان بنو۔اور اس کا اعتراف ہے وَ مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ (2:8) کہ ہم مومن نہیں ہیں۔

کیا ہم مسلمان بھی ہیں؟ اگر ہیں تو پھر یہ ہر سو مرثیہ گوئی کی چیخ و پکار کیسی؟

اس آیت کے متعلق بھی یہ اپنے آپ کو فریب دے کے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ وہاں کے منافقوں کے متعلق تھی۔ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اودھوکہ دیتے ہو خدا اور مؤمنوں کو۔ وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ (2:9) ان کو کیا دھوکہ دو گے' اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہو۔عزیزانِ من! اس سے بڑا دھوکہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے کہ مسلمان اور اس کے بعد اعتراف کرتا ہے کہ نہیں ہوں میں۔مومن ہم نہیں ہیں صاحب وہ تو وہ تھے نا وَ مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ (2:8)۔

کوئی فرد ہو یا کوئی قوم وہ تب ڈوبتی ہے جب وہ کہے کچھ لیکن کرے کچھ

ہم میں سے یہ تمام جتنے بھی یہ مذہبی رہنما ہوں' یہ سیاسی لیڈر ہوں' جو بھی آپ کے ہاں ذرا مقتدر ہو جاتا ہے ہر ایک کی کیفیت وَّ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا (3:188) چاہتا یہ ہے کہ ان کاموں کی وجہ سے اس کی تعریف کی جائے جسے وہ کہتا ہے' کرتا نہیں ہے۔کہتا ہے۔قومیں یہاں ڈوبتی ہیں۔ فَلَا تَحۡسَبَنَّهُمۡ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الۡعَذَابِ ۚ (3:188) قطعاً گمان بھی نہ کرو کہ اس روش سے یہ قوم کسی طرح عذاب سے چھوٹ جائے گی۔نہیں چھوٹ سکتی۔عزیزانِ من! اس سے اور بڑا عذاب کیا ہے۔ جہاں دو مسلمان ملتے ہیں وہ مرثیہ پڑھتے ہیں' ساری دنیا کے مسلمان اپنی حالت پہ مرثیہ پڑھتے ہیں۔کہا کہ یہ عذاب سے چھوٹ نہیں سکتے۔وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (3:188) عذاب دردانگیز عذاب ہے' چیخیں نکل جائیں گی اس عذاب سے۔جسے میں نے کہا ہے کہ ہم رونا روتے ہیں مرثیہ پڑھتے ہیں۔چیخیں نکلتی ہیں جب بھی کہیں مسلمان دو ملتے ہیں۔اتنے بڑے عذاب کے اندر ماخوذ ہے یہ قوم۔اس لیے کہ کتاب اللہ جو دین میں سند اور حجت تھی اسے پسِ پشت ڈالا' چھپایا اسے' اس کی جگہ اور چیزوں کو دین کی سند بنایا۔ زبانی باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔چاہتے یہ ہیں کہ ان باتوں کی بنا پر ان کی تعریف کی جائے۔کہا کہ جس قوم کی یہ روش ہو وہ تو عذابِ الیم سے چھوٹ نہیں سکتی۔

کیا قوموں کے اعمال نامے کو کسی ترازو میں بھی نہیں تولا جاتا؟

بظاہر نظر آتا ہے کہ قوم کی قوم یہ کرنے لگ جائے تو اس کے اوپر کس کی گرفت ہوسکتی ہے۔ایک فرد خلافِ قانون کچھ کرے تو

سپاہی پکڑ لے اور اگر سارا معاشرہ ہی خلافِ قانون کرنے لگ جائے تو پھر کیا ہو؟ ذہن میں یہ آتا ہے کہ پھر تو کوئی اوپر قوت ہی نہیں ہے جو پکڑ لے۔ کہا ہے نہیں! تم نہیں جانتے' جانتے بھی ہو تو اس حقیقت کو سامنے لانا نہیں چاہتے کہ اس سے اوپر ایک قوت ہے۔ تم تو شے کیا ہو وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:189) آپ دیکھتے ہیں عزیزانِ من! ربط کیا ہے قرآن کے اندر۔ تم سمجھتے ہو کہ ہمارے اوپر کسی کا اقتدار نہیں ہے۔ پورا معاشرہ بگڑ جائے تو اقتدار پھر کسی کا رہتا ہی نہیں ہے۔ کہتا ہے' ہے اقتدار' کس کا اقتدار ہے؟ اس کا اقتدار ہے کہ جس کا اقتدار ساری کائنات کے اوپر چھایا ہوا ہے۔ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:189) ہر شے کے لیے اس نے قانون بنا دیا' پیمانے بنا دیے ہیں' ان پیمانوں کے مطابق یہاں ہر چیز کا فیصلہ ہوتا رہتا ہے۔ سارے کا سارا معاشرہ بگڑ جائے تو اسے مطمئن نہیں ہونا چاہیے کہ اب ہم پر کسی کی گرفت نہیں ہے' ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا یہاں قرآن نے جو کہا ہے یعنی پیچھے سے بات آ رہی ہے وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ کی اور اس کے ساتھ ہے وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ (3:189)۔ ظاہر بیں نگاہوں کو اس میں ربط نہیں نظر آتا کہ انہیں عذابِ الیم ہوگا' ارض و سما میں جو کچھ ہے اس کے اوپر ملکوت اور اقتدار خدا کا ہے وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:189) یہ بات کیا ہوئی؟

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق اور کائناتی قوانین کو بروئے کار لانے کا مقصد

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کو سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک بات جہاں وہ کہتا ہے' دوسرے مقام پہ دیکھیے کہ اس کی تفسیر کن الفاظ میں کرتا ہے؟ یہاں یہ کہا اور (53:31) میں یہی الفاظ ہیں وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ (3:189) وہاں ہے وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۙ (53:31) کاہے کے لیے؟ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (53:31) یہ سارا سلسلۂ کائنات اس لیے سرگرمِ عمل ہے' خدا نے اسے قوانین کی زنجیروں میں اس لیے جکڑ رکھا ہے کہ کسی کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ حسن کارانہ عمل کے صحیح نتائج' غلط اعمال کے تخریبی نتائج نقصان دہ نتائج مرتب ہو کر رہیں۔ لہٰذا کوئی قوم یہ نہ سمجھ لے کہ اگر ہم سب نے مل کر ایک غلط روش اختیار کر لی ہے تو اب ہم پر کسی کا مواخذہ ہی نہیں ہو سکتا۔ کہا مواخذہ ہے یہ تو ساری کائنات ہماری اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ کسی کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ عزیزانِ من! آپ غور کیجیے جس غلط روش میں ہم چلے آ رہے ہیں ماخوذ صدیوں سے' باہر کی قوتیں نہ بھی ہمارے اوپر آ کے گرفت کریں تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے ہم ایک مسلسل عذاب کے اندر مبتلا چلے آ رہے ہیں۔ ہر شخص اس کا احساس رکھتا ہے کہ ہم ذلیل ہیں'

خوار ہیں محتاج ہیں، روٹی تک کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں، کچھ اپنے لیے کر نہیں سکتے۔ بظاہر آزاد مملکتیں ہیں کوئی مملکت آزاد اپنے آپ کو نہیں کہہ سکتی۔ ہر ایک محسوس کر رہا ہے، نکلنے نہیں پار ہا اس عذاب میں سے۔ یہ عذاب کس کی طرف سے ہے ہمارے اوپر؟ یہ خدا کی کائناتی قوتیں جو اس طرح سے مسلط ہیں، اقوام کے اعمال کے نتائج اس طرح سے مرتب ہوتے ہیں اس لیے اس نے کہا کہ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:189) اقوام کے اعمال کے نتائج اس طرح سے مرتب ہوتے ہیں کہ تم اس کے اندر سے نکل نہیں سکتے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اس نے یہ کہا۔ کیا بات ہے قرآن کی؟

کائنات کا ذرّہ ذرّہ صاحبِ عقل وبصیرت والباب کے لیے اپنی حد تک ایک معجزہ ہے

عزیزانِ من! آگے وہ دو آیتیں آتی ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس کے لیے دو چار درس تو کیا کتنے مہینے اس پہ چلے جائیں گے تو شاید یہ سلسلہ ختم نہ ہو۔ عجیب وغریب چیز ہے وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ (3:189) کا ربط آپ نے پچھلی آیات سے دیکھا کہ اقوام کے اعمال کے نتائج کے سلسلے میں یہ کائناتی قوتیں کیا کچھ کرتی ہیں۔ بات یہاں اتنی سی کہی تو کیا اس کو ہم محض ایک عقیدے کے طور پہ مان لیں؟ کہ صاحب ایسا ہوتا ہے۔ اس نے کہا ہم تو کوئی بات بھی ایسے نہیں منوانا چاہتے۔ اگلی آیت ہے کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (3:190) یاد رکھو! ارض و سما کی تخلیق میں رات اور دن کی گردش میں ان تمام چیزوں کے اندر ہمارے اس قانون کی کھلی کھلی نشانیاں ہیں جو پہلے ہم نے بیان کیا ہے۔ کن کے لیے؟ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ صاحبانِ عقل وبصیرت کے لیے۔ بلکہ عقل سے بھی اگلا درجہ ہے الباب جسے کہتے ہیں، لُبِ لباب آپ کہتے ہیں نا یہ وہی لفظ ہے۔ وہ جسے کہتے ہیں پنجابی میں ''تت کڈیا ہویا کسے چیز دا'' وہ لفظ ہے یہ الباب۔ ان کے لیے۔

یذکرون کے الفاظ کا مفہوم تسبیح پھیرنا نہیں بلکہ قوانینِ خداوندی کے سامنے سرنگوں ہونا ہے

یہ کون لوگ ہیں؟ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ (3:191) وہ لوگ (عام الفاظ میں ترجمہ تو یہی آئے گا) کہ جو کھڑے بیٹھے لیٹے یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ (3:190) اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ چلیے۔ انہوں نے فوراً یہ کہا کہ صاحب! کھڑے بیٹھے لیٹے تو خدا کا ذکر ایسے ہی ہے کہ یا تو چلتے پھرتے تسبیح پھرے اور اگر یہ نہیں ہے تو قلب چلے۔ تو یہ چیز جو ہے وہ یا اللہ یا اللہ کی، یہ ہوتا رہے صاحب یذکرون اللہ۔ لیکن یہ تو قرآن ہے وہ تو اس قسم کے فریب میں رہنے نہیں دیتا۔ یہ کیا ہے یذکرون اللہ؟ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ج (3:191) وہ اس سلسلۂ کائنات کی تخلیق میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں یہ ہے ذکر

اللہ۔ اور یہ وہ چیز ہے جو کھڑے بیٹھے لیٹے ہر وقت یہ چیز ہوتی ہے۔ اربابِ فکر سے پوچھیے کوئی لمحہ ان کا ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت وہ فکر سے خالی ہوتے ہوں۔ سوچتے ہیں غور و فکر کرتے ہیں‘ انہیں کہا ہے یذکرون اللہ والے اور انہیں ہی کہا ہے اولی الالباب سب سے زیادہ عقل و ہوش کے علم و بصیرت کے فہم و فراست کے مالک‘ عقل کی اصل کے مالک یہ ہیں وہ لوگ۔ یذکرون اللہ کیا ہوا؟ ہر وقت خدا کے قوانین کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ اور وہ غور و فکر کرتے رہتے ہیں فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:190)۔ اور اس کے بعد غور و فکر دیکھیے یہ خالی ذہنی چیز نہیں کہ بیٹھے سوچتے رہتے ہیں اور سوچنے کے بعد فلسفیانہ طور پہ کسی نتیجے پہ پہنچتے ہیں وہ کہتا ہے یہ نہیں۔ فکر کا عملی پروسیس یہ ہے کہ کائنات کی ایک ایک چیز کا تجزیہ کر کے ANALYSIS کر کے‘ ریسرچ کر کے لیبارٹریز میں ان کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔ عزیزانِ من! سنیے کس نتیجے پہ پہنچتے ہیں؟ کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًاج (3:191) اے ہمارے نشو و نما دینے والے تو نے کائنات کی کسی چیز کو باطل پیدا نہیں کیا‘ نہ رائیگاں پیدا کیا ہے‘ نہ تخریبی نتائج کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ہیں اللہ کا ذکر کرنے والے۔

کائنات کا کوئی ذرّہ بھی ایسا نہیں جو بے مقصد یا تخریبی نتائج کے لیے پیدا کیا گیا ہو

کہا یہ ہیں وہ لوگ جو اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ کائنات کا سلسلہ اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ کسی کا کوئی کام بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس نتیجے کے اوپر پہنچے ہوں گے۔ یہ ہے وہ ذکر اللہ جس کے بعد عملاً وہ یہ ثابت کر دیں گے دنیا پہ کہ یہاں کی کوئی شے نہ بے کار‘ رائیگاں‘ بے معنی‘ بے مقصد‘ بے سود پیدا کی ہے نہ تخریبی نتائج کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ باطل کے دونوں معنی ہیں۔ کوئی شے اس کائنات کی۔

علامہ پرویزؒ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ

ہمیں تو اتنا ہی پتہ ہے نا کہ سانپ ڈستا ہے اور آدمی مر جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے اس سے بڑا تخریبی نتیجہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ ڈستا ہے اور مر جاتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ جنہوں نے اس طرح سے یہ ذکر اللہ کیا‘ تفکر کیا وہ کس نتیجے پہ پہنچے؟ مجھے یہ سانپ کی بات اس لیے یاد آ جاتی ہے کہ اپنا وہ ذاتی واقعہ اس میں ہے۔ کچھ برس پیشتر میرا آپریشن ہوا تھا۔ اس آپریشن کے بعد ایک دن ایسی کیفیت بگڑی کہ خون رواں ہوا‘ بند نہیں ہو رہا تھا۔ اور آخری مرحلے آ چکے کہ معالج نے بھی یہ کہہ دیا کہ اب تو دعا کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے‘ کوئی شکل باقی نہیں رہ گئی۔ اور اس آخری لمحوں میں ایک چیز تھی جو سامنے آئی معالج کے۔ اس نے اس کا انجکشن دیا‘ خون

بند ہو گیا دوبارہ زندگی مل گئی۔ یہ جو آپ کے سامنے اتنے عرصے سے یوں بیٹھا ہوا ہوں بتوفیق ایزدی یہ اس ایک انجیکشن سے یہ کیفیت مڑ گئی تھی، دوبارہ آ گئی تھی۔ تو اس کے بعد جب بات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب وہ کیا تھا؟ اس نے کہا سانپ کا زہر تھا جس کا انجیکشن دیا گیا تھا۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج (3:191) بے ساختہ میری زبان پہ آ گیا تھا کہ ہم آج تک یہی سمجھے ہوئے تھے کہ یہ ہلاکت ہے، موت ہے اس کے اندر۔ انہوں نے یہ بتا دیا کہ جب کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو موت سے تمہیں بچا سکتی وہ چیز کہ جسے تم جاہل یہ سمجھے ہوئے تھے کہ موت لانے والی چیز ہے، حیات آور ثابت ہو گئی۔ اور جو اس نتیجے پہ نہیں پہنچے ان کے متعلق قرآن نے کہا دعا ان کی یہ ہوتی ہے سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) تو تو بہت پاک ہے بلند ہے ان چیزوں سے کہ کسی چیز کو تخریبی نتیجے کے لیے پیدا کرے، ہماری جہالت ہے جو ہم جانتے نہیں ہیں۔ اے پروردگار! ہمیں اس حالت میں نہ رکھو کہ اس طرح سے ہماری کھیتیاں جھلس جائیں۔ سانپ کو ہم ڈسنے والا ہی سمجھیں، حیات بخش نہ سمجھیں اس کی زہر کو۔ ''اے گرمیاں آ گیاں نیں ناجتھے ویکھو گے اے او تھے اے بھونڈ اندی کھکھر تے آ بتھاڑ سُجا دیندی ہیگی اے'' کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ صاحب! یہ کاہے کے لیے پیدا کر دی؟

قرآنِ حکیم کے حقائق کو سمجھنے والوں کی علیٰ وجہِ البصیرت ایمان لانے کی سعی و کاوش

کوئی چھ سات برس اُدھر کا واقعہ ہے جنوبی امریکہ سے آپ کے ہاں ایک خاص DELEGATION آیا تھا ''اے بھونڈ کٹھے کرن واسطے'' یہ بھڑیں وہ یہاں سے ایکسپورٹ کر کے لے گئے تھے۔ وہاں کسی فصل کو اس قسم کا کوئی کیڑا مار رہا تھا، ستا رہا تھا، تلف کر رہا تھا جس کا علاج سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ انہوں نے وہاں آ کے اسی فصل کے اوپر ریسرچ کی کہ یہاں اس کیڑے کو کون تلف کرتا ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ بھڑیں اس کیڑے کو تلف کرتی ہیں۔ وہ یہاں سے ایکسپورٹ کر کے لے گئے۔ وہاں اس کی پرورش کی انہوں نے جا کے، فصل بچ گئی ان کی۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج (3:191)۔

کائنات پر ریسرچ کا ملکہ مذاہبِ عالم کے شعور میں کہیں نہیں ہوتا

عزیزانِ من! مقام وہ آ گیا ہے کہ جہاں میں نے کہا تھا کہ موضوع وہ آ گیا ہے کہ جس کو پھیلاتے جایے تو معلوم نہیں کتنے درس نکلیں۔ بڑی اہم چیز ہے جو سامنے آئی۔ ساری دنیا کے مذاہب کے اوپر آپ نگاہ ڈالیے تو کیا ان میں کہیں بھی آپ کو اس کائنات پر غور و فکر کرنا ریسرچ کرنا سائنٹفک ریسرچز جسے آپ کہتے ہیں، یہ کہیں بھی آپ کو یہ چیز ملے گی؟ باقی دنیا کے مذاہب کو

چھوڑ دیجیے اپنے ہاں کا جو مذہب ہے آپ کے ہاں (قرآن نہیں مذہب) اس میں آپ غور کر لیجیے کہیں بھی آپ کو یہ چیز ملے گی؟ کہ ان چیزوں کے متعلق کچھ ریسرچ کرنی چاہیے۔یعنی انسان اور کائنات کا تعلق کیا ہے؟ مذہب کا یہ موضوع ہی نہیں ہے۔اس نے کہا کہ صاحب! ہمارا موضوع تو یہ ہے کہ انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ اور وہ تعلق خالص ایک ذہنی سی چیز ہے' اپنے دل میں ایک ایمان کی بات۔ایک خدا بنا لیجیے اپنے ذہن کے اندر۔اپنے ذہن میں اس کے ساتھ ایک تعلق قائم کر لیجیے صاحب۔نہ خدا کو کسی نے دیکھا نہ اس تعلق کو پہچانا۔یہ کہتے ہیں ہمارا تعلق ہے ہم ہر روز رات کو وہاں ہوتے ہیں۔ہوتے ہیں رات ہی کو وہاں''دن نوں نئیں کوئی ہونداا وتھے''۔وہاں ہوتے ہیں' واپس آ جاتے ہیں وہ ٹھیک ہے صاحب' نہ اس کے لیے کوئی شہادت' نہ اس کے لیے کوئی ثبوت کی بات۔سارے اہلِ مذاہب کے ہاں مذہب کی بنیاد اس پہ ہے کہ یہ تو بس صرف خدا اور بندے کے درمیان ایک تعلق ہے اللہ سے لو لگانے والی بات ہے۔ذہن میں بیٹھے ہوئے' اپنے حجرے میں' تکیے میں دائرے' میں مندر میں' خانقاہ میں' جنگل میں' غار میں' درختوں کے نیچے' دریا کے اندر اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں خدا کے ساتھ لو لگائے۔مذہب کا اتنا ہی تعلق ہے۔اور یہ سارا کچھ کاہے کے لیے کیا جاتا ہے؟ نجات حاصل ہو جائے کسی طرح۔مر رہے ہیں پھنسے ہوئے ہیں۔یہ ہے مذہب۔کسی مذہب میں یہ بات نہیں آپ کو ملے گی کہ وہ آپ کو یہ بتائے کہ انسان اور کائنات کا باہمی تعلق کیا ہے۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے تعلیمی کورس کا اہم ترین موضوع کائنات کے ذرّے ذرّے پر غور و فکر کرنا ہی ہے

یہ ہے وہ اہم موضوع۔اور قرآنِ کریم کو آپ دیکھیے شروع سے آخر تک' سب سے زیادہ زور اس نے یہ دیا ہے کہ انسان اور کائنات کا باہمی تعلق کیا ہے۔اور یہاں سے وہ بات آگے لے جاتا ہے کہ کائنات میں غور و فکر سے تم دیکھو گے کہ کسی ایک مقتدر ہستی کا قانون ہے۔اتنا زبردست قانون کہ جس میں اگر سیکنڈ کے کروڑویں حصے کا بھی تفاوت آ جائے تو کائنات کا سلسلہ درہم برہم ہو کر رہ جائے۔قرآن انسان پہ زور دیتا چلا جاتا ہے کہ وہ کائنات کے تعلق کے اوپر غور کریں۔آیئے ذرا تاریخ میں جائیں اس لیے کہ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ایک بیک گراونڈ جب تک آپ کے ہاں وہ نہ سامنے آ جائے کہ جس میں یہ مذہب' انسان الجھا ہوا تھا قرآن کی عظمت بے نقاب ہو کر سامنے نہیں ہوتی۔قرآن کہتا ہے کہ اقوامِ عالم کی موت اور حیات اس بنا پر ہے کہ انسان کا کائنات کے ساتھ کیا تعلق رہا ہے۔یہ بڑی بنیادی چیز ہے کہ جانا جائے کہ ابتدائی دور کا انسان کیسے تھا۔دوسرے ممالک اور اقوام

میں تو نہ جایۓ وہاں کی ہسٹری کا آپ کو مطالعہ کرنا پڑے گا۔ یہاں بھی جو لوگ ہندوستان میں تھے ہندوؤں کو کم از کم جانتے تھے انہیں یہ معلوم ہوگا۔

وحی کی روشنی کے بغیر کرۂ ارض پر ابتدائی دور کے انسان کی کیفیت

ابتدائی دور میں انسان کو زمین کے اوپر تو ہر قوت اس کے خلاف جانے والی نظر آتی تھی' یہ بالکل نہتا اس کے اندر۔ سیلاب آتے ہیں زلزلے آتے ہیں' آتش فشاں پہاڑ پھوٹتے ہیں' دریا امڈ جاتے ہیں' جنگل میں بڑے بڑے مہیب جانور ہیں' اتنے اتنے بڑے سانپ ہیں۔ یہ سارا کچھ اور اس کے پاس تو ایک ہی ہتھیار ایک ہی حربہ تھا نا جسے اس کا علم اور عقل کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے انسان ابھی عہدِ طفولیت میں بالکل بچہ۔ وہ آلہ وہ INSTRUMENT وہ اوزار ابھی اس کے پاس ہے نہیں اور اتنی بڑی مخالف مہیب قوتیں اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی۔ اس میں یہ ایک ہی چیز جانتا تھا خوشامد' ڈر۔ بجلی کڑکی اور یہ سجدے میں گرا' بادل گرجا اس نے ڈنڈوت بجالایا' سانپ آیا اس نے ہاتھ جوڑ دیۓ' بڑا سا مہیب دریا گنگا آ گیا اس نے ماتا کہہ دیا' اتنا بڑا درخت دیکھا پیپل کا سہم کے رہ گیا تو بھی دیوتا ہے۔ اِندر بھی دیوتا' اگنی بھی دیوی' گنگا بھی مائی' سانپ بھی دیوتا' پیپل بھی دیوتا' زلزلہ جو ہے اس کے لیے جو گائے ہے جس کے سینگوں کے اوپر زمین ہے' وہ بھی ایک دیوی۔ اس کے حضور بھینٹ چڑھاؤ قربانیاں دو' اس کو خوش رکھو کسی طرح سے وہ ناراض نہ ہونے پائے۔ وہ بے چارہ یہی جانتا تھا۔ ہر قوت کے سامنے سجدہ کرتا تھا' ہر کائناتی چیز اس کے نزدیک معبود تھی دیوی دیوتا تھا۔ انسانی عقل آگے بڑھی۔ آیۓ دیکھیں تنہا عقلِ انسانی وحی کی روشنی کے بغیر وہ کس نتیجے پہ پہنچی؟ عقل کا اولین گہوارہ یونان کی حکمت ہے' فلاسفی وہاں سے ہی نکلی ہے۔

عقلِ انسانی کا اولین گہوارہ یونان اور وہاں کے سقراط کے فلسفے کی اہمیت اور بیدل شاعر کی شاعری

کون ہے جو سقراط کا نام نہیں جانتا ابوالآباء ہے وہ فلاسفرز کا۔ سقراط کا فلسفہ یہ تھا کہ مطالعے کے قابل صرف انسان کی ذات ہے باہر کی کائنات نہیں' انسان خود ہی صرف۔ اسے باہر کی دنیا میں نہیں دیکھنا چاہیۓ' اپنے اندر جھانکنا چاہیے۔ آپ دیکھتے ہیں ان الفاظ سے بات کہاں آئے گی ہمارے ہاں۔ اپنے اندر جھانکو یہ سقراط کا فلسفہ تھا۔ اس نے کہا تھا کہ انساں بجائے خویش ہے ایک محشرِ خیال۔ یہ خود ایک کائنات ہے' اسے صرف اپنا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہی وہ چیز ہے جو آپ کے ہاں فلسفے میں آ گے آئی۔ میں آگے بتاؤں گا کیسے تصوف بنا۔ آپ کے ہاں آئی تو بڑے حسین انداز میں بات یاد آ گئی بیدل آپ کے ہاں کا جو شاعر ہے وہ یہ پرانا جو

فلسفہ تھا اس نے اپنایا اور بڑے حسین انداز میں اس کو وہ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا یہ شعر ہے بڑا خوبصورت۔ یہی چیز کہ انسان خود اپنا مطالعہ کرے اپنے اندر جھانکے وہ کہتا ہے کہ

ستم است گر ہوسد کشد کہ بہ سیرِ سرو سمن را

زبان کی اہمیت سے دوری قوموں کو گونگا بنا دیتی ہے

اب تو فارسی کے شعروں کے بھی ترجمے کرنے پڑتے ہیں۔ نئی نسل کے بچوں کو تو اردو کا ترجمہ بھی کر کے بتانا پڑتا ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کس زبان میں کریں ’’پنجابی اچ ترجمہ کر دین تے ہٹ ہٹ تکن لگ جاندیاں بچیاں فیر اوپچھدیاں نیں بابا او ہٹ ہٹ کی ہوندا ہیگا اے‘ پتہ نئیں ہن کس زبان اچ ایہناں نوں سمجھایا جائے‘‘ ایک انگریزی کسی زمانے میں تھی اس کے پیچھے لٹھ لے کے پھرتے ہیں ’’بناؤ اس قوم نے گونگے بالکل‘‘۔

ستم است گر ہوسد کشد کہ بہ سیرِ سرو سمن را

ترجمہ اور پھر شعر کا ترجمہ پھول کی پتی سے خوشبو کی تلاش میں اسے مسل دینے والی بات ہوتی ہے۔ کہتا ہے ستم ہے ظلم ہے کہ اگر تیرے اندر کا ذوق تجھے یہ کہتا ہے کہ جاؤ جناح گارڈن میں جاؤ اور وہاں جا کے پھولوں کی سیر کرو۔

تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ای

تو نے اپنی طرف غور ہی نہیں کیا تو خود بھی ایک غنچے سے پھول سے کم کھلا ہوا نہیں ہے

درے دل کشا بہ چمن درا

دل کے دروازے کھول اندر تیرے چمن کھلا ہوا ہے خوامخوہ باہر جا رہا ہے۔

من دا گھونگھٹ کھول نی دلہن من دا گھونگھٹ کھول

یہ سب وہی ہے چکر آپ دیکھیں گے۔ یہ جسے آپ اپنے ہاں کا تصوف لیے پھرتے ہیں‘ فلسفہ لیے پھرتے ہیں‘ سارا وہاں کا یہ چلا ہوا ہے۔

تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ای درِ دل کشا بہ چمن درا

MAN IS THE OBJECT ۔

سقراط کے بعد تصوف کی وادیوں میں افلاطون کی پرواز کی بلندی کے اثرات اور ایشور کا خواب

سقراط کہتا ہے انسان' باہر کچھ نہیں۔ بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ ان کے شاگرد تھے دنیائے فلسفہ کے سب سے بڑے پلیٹو' افلاطون جسے کہتے ہیں نام ہی افلاطون کا آپ دیکھتے ہیں۔ اس کا فلسفہ ہے بڑا پھیلا ہوا کہ یہ جو کچھ تمہیں باہر نظر آتا ہے سب فریبِ نگاہ ہے' یہ فی الحقیقت موجود ہی نہیں ہے۔ اوپر ایک دنیا ہے عالمِ امثال THE WORLD OF IDEAS اس کی پرچھائیں ہیں جو یہاں پڑ رہی ہیں' یہ ہے ہی نہیں۔ اتنا بڑا افلاسفر تھا کہ وہ اس چیز کو اس انداز میں بیان کر گیا ہے' اڑھائی ہزار سال ہو گیا ساری دنیا کا ذہن اس سے متاثر چلا آ رہا ہے' اس وقت تک اس سے نہیں نکل سکی دنیا۔ ہندوؤں کے اندر آیا تو ان کے ہاں کا ویدانت سارا یہی ہے۔ یہ کائنات یہ دھرتی ساری' مایا کا جال ہے' سراب ہے۔ مایا فریب کو کہتے ہیں' سارا فریب ہے۔ اس نے کہا تھا کہ WORLD OF IDEAS ہے انہوں نے کہا ایشور کی لیلا ہے۔ خدا نے یوں ہی ایک تھیٹر کا تماشہ کر رکھا ہے۔ جب یہ لیلا انہوں نے کہا تو آپ کو معلوم ہے' ان کے ہاں خدا کے لیے ایک لفظ نٹ راجن ہے۔ نٹ کہتے ہیں نا یہ کھیل کھیلنے والے' یہ نٹ آیا کرتے تھے نا۔ نٹ راجن نٹوں کا راجہ (CHIEF ACTOR)۔ ایشور کی لیلا ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ نہیں ایشور خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ سب ایشور کا خواب ہے۔ جب وہ جاگ اٹھے گا' جاگ اٹھنے کے بعد تو خواب ختم ہو جاتا ہے نا جی تو یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہے۔

ایران کے آتش کدوں سے تصوف کی تپش نے مسلمانوں پر آخر کیا کیا اثرات مرتب کیے

جب ایران کے آتش کدوں میں یہ پہنچا تو وہاں سے یہ تصوف کی شکل بن کے نکلا۔ یہی تصوف آپ کے ہاں مسلمانوں میں آیا اور آپ کے ہاں کے تصوف کی ہر کتاب ہر فقرہ اس کے اوپر ہے' یہ دنیا کچھ نہیں بے کار ہے' اس میں من مت لگاؤ' مادہ کثافت ہی کثافت ہے۔ یہ ہے ہی نہیں جو کچھ بھی ہے۔ سارا تصوف وہی پلیٹو کا ایک جو ٹیڑھی گردن تھی اس بڑے سر والے کی' چلا آ رہا ہے صاحب آپ کے ہاں۔ یعنی سب سے بڑی سچائی آپ کے ہاں یہ ہے جب یہ کہا جائے کہ صاحب! یہ دنیا کچھ نہیں ہے' فانی ہے مادہ کثیف ہے' غلاظت ہے' اس کے قریب نہ جانا' اس سے دامن بچانا۔ جتنا آلودہ کوئی دنیا کے اندر ہوتا ہے اتنا ہی خدا سے دور ہو جاتا ہے۔ خدا کے مقرب بندوں کی نشانیاں یہ ہیں' دنیا سے دور الگ تھلگ رہتے ہیں۔ کوئی تعلق کوئی رشتہ اس دنیا سے نہیں رکھتے' اس لیے کہ یہ ہے ہی نہیں ہے۔ بیدل نے تو وہ چیز کہی تھی وہ سقراط کی صدائے بازگشت تھی۔ ہمارے ہاں کے اگلے شاعر غالب

آ ئے' وہ پلیٹو کی فلاسفی والا ہے وہ کہتا ہے کہ

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ کائناتی تصور کے برعکس دنیا بھر کی پژمردہ سوچ کی کیفیت

عزیزانِ من! ساری دنیا اسی فریب کے اندر مبتلا چلی آ رہی ہے۔ آدھی سے زیادہ آبادی دریاؤں کو سجدے کرنے والی' سانپوں کے سامنے ہاتھ جوڑنے والی' زلزلوں کو قربانیوں سے خوش کرنے والی' اِندر کو دیوتا' آندھی اور جھکڑ کو دیویاں بنانے والی' اگنی کو دیویاں بنانے والی' فطرت کی ہر کائناتی قوت کو اپنا معبود اپنا مسجود بنانے والی۔ اور ان حالات میں چھٹی صدی عیسوی کے اندر قرآن آیا اور اس نے آ کے پہلے پارے کی پہلی آدم کی تمثیلی داستان میں کہا کہ سارے ملائکہ آدم کے سامنے جھک گئے۔ ایک فقرے میں اس نے ساجد کو مسجود اور مسجود کو ساجد بنا دیا۔ ملائکہ کائنات کی ساری قوتیں ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن کی عظمت کا یوں پتہ چلتا ہے جب یہ پہلے پتہ ہو ''لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی''۔ یہ کثافت سامنے آئے تو پھر پتہ چلتا ہے قرآن کہہ کیا گیا ہے۔ یہ سارے ملائکہ ہیں جنہیں ذہنِ انسانی نے معبود بنا رکھا تھا' اپنا جنہیں مسجود بنا رکھا تھا۔ انسان عابد و ساجد تھا ان کے لیے۔ ایک بات وہ آ کے کہہ گیا۔ تمام ملائکہ جو تھے فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (15:30) جھک گئے اس کے سامنے۔ وہ اگلی بات ہے وہ کہ نہ جھکا تو اس کے اپنے اندر کا ایک شریر نفس تھا وہ اس کے سامنے نہ جھکا اس کو جھکانا اس کا مقصد ہو گیا۔ وہ تو جھک گئیں قوتیں اس کے سامنے' کائنات کی ساری قوتیں اس کے سامنے جھک گئیں۔ عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں دنیائے فکر میں' دنیائے مذہب میں اور پھر دنیائے تصوف میں کتنا انقلابِ عظیم کا یہ اعلان تھا کہ کائنات کی ہر قوت اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اور پھر یہ بات کہنے کے بعد آگے آیا وہ قرآن کے اندر' قدم قدم کے اوپر وہ اس قسم کی آیات آپ کو ملیں گی۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ج (14:33) یہ زمین کے اوپر رینگنے والے کیڑے اور سانپ ہی نہیں' وہ کہتا ہے یہ چاند اور سورج جو تمہیں اتنے اتنے بڑے نظر آتے ہیں' ہمیشہ چلتے رہنے والے' مسلسل چلتے رہنے والے' وہ بھی ہم نے تمہارے لیے قانون کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیے ہیں' مسخر کر کے تمہارے لیے رکھ دیے ہیں۔

مقامِ آدم کے سامنے تمام کائناتی قوتیں سرنگوں ہیں لیکن اس کے باوجود حضرتِ انسان کی یہ حالتِ زار۔ آخر کیوں؟

عزیزانِ من! مقامِ آدم دیکھیے کیا ہے۔ **وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ** (14:33) دن اور رات کی گردشیں ساری تمہارے تابع تسخیر ہیں۔ مقامِ آدم چلا آ رہا ہے۔ **وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ** (14:33) یہ بڑے بڑے دریا جن کو معبود بنائے ہوئے ہو (14:32)۔ دیکھا آپ نے انہار کیوں کہا قرآن نے؟ یہ ساری دیوی دیوتا تھے ان قدیم اقوام کے نزدیک۔ یہ دریا بھی تمہارے لیے ہم نے مسخر کر دیا۔ بڑی تفصیلیں ہیں قرآن میں اور ان تمام تفاصیل کو اجمالی طور پر یہ کہہ دیا کہ **وَسَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ** ط (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب کا سب تمہارے لیے مسخر ہم نے کر دیا ہے **جَمِیْعًا** (45:13)۔ عزیزم! غور فرما رہے ہیں کہاں لے جا رہا ہے قرآن؟ انسان اور کائنات کا جو تعلق ہے باہمی۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ یہ پیدا کیا ہے' یہ فریبِ نگاہ ہے' یہ باطل ہے' یہ سراب ہے' یہ مایا ہے' یہ لوگ یہ کہہ رہے ہیں۔ اور میں نے ابھی عرض کیا ہے نا کہ خود آپ کے ہاں بھی تو یہ عقیدے ہیں کہ یہ ساری دنیا اور دنیا کے اندر کی کائنات کی چیزیں ساری باطل ہیں' ساری فریب ہیں۔ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ جی لگایا جائے لہٰذا ان سے دور بھاگا جائے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی پستی کی وجۂ جواز اور اس کا علاج

یہ سلسلہ کس لیے پیدا کیا ہے سنیے قرآن کیا کہتا ہے **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا** ط(38:27) ہم نے کائنات کے اس سلسلے کو باطل پیدا نہیں کیا۔ اگلا ٹکڑا ہے سننے کا **ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا** (38:27) یہ ان لوگوں کا ظن ہے۔ پہلے تو دیکھیے ظن کا لفظ یہ کہا کہ علم پہ مبنی نہیں ہے۔ یہ بات جو لوگ یہ کہتے ہیں' قیاس ہے' محض قیاسی بات کرتے ہیں۔ اور کن کی یہ بات ہے؟ جو قیاس سے بھی ایسا کہتے ہیں کہ یہ فریب ہے۔ یہ حقیقت نہیں۔ یہ سراب ہے کون ہیں؟ یہ کفر کا قول ہے کافروں کا قول ہے یہ۔ ذرا کفر اور ایمان کے امتیاز کی لائن آپ نے یہاں دیکھی ہے' کیا قرآن کہہ رہا ہے۔ کائنات کے متعلق یہ تصور کہ یہ یوں ہی باطل ہے' سراب ہے' فریب ہے' مایا ہے' یہ اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس میں جی لگایا جائے' اس سے کوئی تعلق پیدا کیا جائے۔ پہلا تو یہ ہے کہ یہ علم پہ مبنی نہیں ہے۔ بڑا دعویٰ ہے قرآن کا یہ جو کہہ دیا ہے کہ یہ علم کی بات نہیں ہے' قیاس آرائیاں ہیں۔ اور یہ ان

لوگوں کا عقیدہ اور قول ہے الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا۔ کہا اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ ط (38:27) تباہی ہے اس قسم کی قوم کی جو یہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ سب کچھ ان کا جھلس کر رہ جاتا ہے۔ کائنات کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ یہ اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس پہ غور و فکر کیا جائے یہ ہے ہی نہیں۔

علامہ اقبالؒ کی آ گہی کے مطابق اس قدر گھمبیر صورت حال کے کچھ ذمہ دار شعبوں کی نشاندہی

اب آپ نے سوچ لیا کہ یہ آپ کی قوم ہزار برس سے ان تباہیوں کے اندر کیوں ہے؟ یہ ایک عقیدہ کائنات کے متعلق۔ اور پھر دل کی اتنی گہرائیوں میں یہ گیا ہوا ہے کہ جتنا زیادہ اس دنیا پہ لعنت کوئی بھیجے' اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے۔ دنیا دار آپ کے ہاں ایک اصطلاح ایسی آ گئی ہے جو قابلِ نفرت ہے۔ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ ط (45:27)۔ سوچ لیجیے کہ آپ کے ہاں کی حکمت' فلسفہ' کلام' مذہبی روایات' تصوف کے یہ تمام کے تمام عقیدے پھر ان کے اوپر مبنی آپ کی ساری شاعری کہ جس نے کائنات کے متعلق یہ عقیدہ بنا دیا کہ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے؟ کہ ایسے عقیدے اور ایسے نظریۂ حیات رکھنے والی قوموں کی تو کھیتیاں جھلس کے رہ جاتی ہیں۔ کیا کہا تھا اقبالؒ نے کہ

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و شاعر و صوفی کی نا خوش اندیشی

کتنے سفینے ڈبو دیے اس نے ہمارے ایک غلط عقیدے نے۔ اور آپ دیکھیے گا کسی سے بات کیجیے تو وہ کہے گا' اس عقیدے کا مذہب سے کیا تعلق ہے۔ یعنی وہ یہ ان چیزوں کو مذہب سے تعلق ہی نہیں بتاتے۔ کہتے ہیں مذہب سے تو یہ بتایے کہ آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیے یا ہلکی آواز سے کہنی چاہیے۔ یہ تو ہوا نا مذہب کا عقیدہ۔ اس پہ تو ٹھیک ہے کوٹھے بھرے ہوئے ہیں کتابوں کے ان مسئلوں کے اوپر' روز سر پھٹول ہوتا ہے اس پہ۔ وہ تو مذہب کے متعلق ہے یہ کون سی بات مذہب کے متعلق ہے۔ وہ کہتا ہے فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ ط (45:27)۔ یہاں تو یہ کہا تھا NEGATIVE ASPECT ہے کہ ہم نے باطل نہیں پیدا کیا۔ NEGATIVE ASPECT ہی نہیں' آیے قرآن تو اس کے ساتھ فوراً POSITIVE ASPECT جو ہے مثبت ASPECT لاتا ہے۔

یہ کائنات تو تو بالحق ہے جو پیدا کی گئی ہے

خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ (29:44) یہ کائنات ایک REALITY ہے اور یہ ترجمہ ہے حق کا: ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اور پھر یہ لفظ باطل کے مقابل میں آئے گا تو یہ ایک تعمیری مقصد ہے جس کے لیے یہ پیدا کی گئی۔ یہ سارے معنی حق کے آتے ہیں عربی زبان میں۔ IT DOES EXIST INFACT , IT IS A REALYT یہ ساری CONSTRUCTIVE PROGRAM کے لیے یہ سب کچھ ہے یہ FANTASY نہیں ہے۔ یہ ذہن کے نقشے نہیں ہیں، یہ خواب نہیں ہے، ایشور کی لیلا نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ میں مومن کی تعریف لیکن ہمارے ہاں کی پنجابی شاعری

خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (29:44) اب دیکھیے مومن کون ہیں؟ اس حقیقت میں کہ کائنات ساری بالحق پیدا کی گئی ہے، مؤمنین کے لیے اس میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ دیکھا کہ ایمان کہاں آتا ہے اور مومن کس طرح سے بنتا ہے؟ جو یہ ثابت کرے کہ یہ کائنات کا سلسلہ سارا بالحق پیدا کیا گیا ہے۔ وہ عقیدہ آپ کے سامنے آ گیا تھا، نانٹ راجن والا کہ خدا نے ایک لیلا رچا رکھی ہے، ایک کھیل ہے، ایک تماشا ہے۔ وہ خود نٹ راجن ہے۔ آپ بھی اس کے اندر آتا ہے وہ بہت بڑا ایک چیف ایکٹر بن کے۔ ہمارے ہاں تو وہ کہتے ہیں کہ اوندا اے آپ ناں رکھدا اے تاپ۔ ''جی ہاں! جدوں تسی انجیکشن دیندے ہوتے ٹھُدا کیوں ہے''۔ کیا پوچھتے ہو کہ کہاں پھر رہے ہیں۔

آپے دھیاں تے آپے ای پتر آپے ای بن دا اے ماں پے
آپے مارے آپ جوائے تے آپے کرے سیاپے

یہ ہے آپ کے ہاں۔ خود بھی ایک ایکٹر ہے اس کے اندر۔ اور پھر جب شاعری میں بات آتی ہے تو پھر تو عجیب چیز ہوتی ہے

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ خود رند و سبو کش
خود برسرِ آں کوزہ خریدار برآمد بشکست و رواں شد

اس پہ پھر وجد آ جاتا ہے حضرت صاحب کو۔ یہی تھا کہ نٹ راجن ہے، کھیل ہے تماشہ ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

سنیے عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ قرآن سمجھنا ہو تو یہ تمام جتنے اس سے پیشتر یہ عقائد چلے آ رہے تھے، وہ سامنے ہونے

بڑے ضروری ہیں COMPARATIVE STUDY بڑی ضروری ہے۔قرآن کہتا ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (45:38) ہم نے سلسلۂ کائنات کو ایک کھیل کے طور پہ پیدا نہیں کیا ہے۔ہم کھیل نہیں کھیل رہے می نہ سزد خدائے را۔آپ دیکھ رہے ہیں کن کن چیزوں کی تردید کرتا ہے قرآن۔ہم سمجھتے ہیں کہ یوں ہی یہاں بالحق کہا کہیں لٰعِبِيْنَ کہہ دیا' شاعری ہورہی ہے۔عزیزانِ من! شاعری نہیں ہورہی جتنے باطل عقائد اس سے پیشتر چلے آرہے تھے' ایک ایک عقیدے کی جڑ کاٹتا چلا جاتا ہے قرآن۔لٰعِبِيْنَ ایک مستقل مذہب ہے آپ کے ہاں کا کہ یہ لیلا ہے یہ کھیل ہے تماشا ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (45:30) مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (44:38-39) ہم نے یہ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثریت انسانوں کی ایسی ہے جو علم سے کام نہیں لیتی تو ہم پرستیوں کے اوپر چلی جارہی ہے۔جو کچھ آباء نے مانا جو کچھ پیچھے سے چلا آرہا ہے' چلے جارہے ہیں اس کے اوپر کبھی علم سے کام ہی نہیں لیتے۔ورنہ اسے تو ہم نے کھیل کے بنا پہ تماشے کے طور پہ پیدا نہیں کیا' بالحق پیدا کیا ہے اسے۔

پلیٹو کا فلسفۂ حیات

پلیٹو کا فلسفہ بھی یہ تھا کہ یہ جب باہر کی چیز EXIST ہی نہیں کرتی۔یہ ہے ہی نہیں۔یہ ہے ہی فریب تو جو علم ان چیزوں کے اوپر مبنی ہوگا' کائنات کے متعلق معلومات جو آپ کو حاصل ہوتی ہیں وہ حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں نا آپ ایک بات ایک چیز سنتے ہیں' معلوم ہوتا ہے۔کہیں گولی چلی آواز آئی کان میں آپ نے کہا گولی چلی' چیخ کی آواز آئی آپ نے سمجھا کہ کسی شخص کو لگی جا کر۔اس کے بعد جا کے آپ نے آنکھوں سے دیکھا تو آپ کا ایک عزیز ہے سینے میں ایک ٹیس پیدا ہوئی۔علم کے ذرائع یہ ہیں SENSES کے THROUGH اسے PERCEPTUAL KNOWLEDGE کہتے ہیں کائنات کا علم حاصل اس طرح سے ہوتا ہے۔سمع اور بصر قرآن نے جسے کہا ہے۔جب یہ عقیدہ ہو جائے کہ یہ باہر کی چیزیں ساری کی ساری ہے ہی چھلاوا تو ان کے متعلق جو معلومات آپ کو حاصل ہوں گی' وہ قابلِ اعتماد ہی نہیں ہوں گی۔یہ فلسفہ ہے آپ کے ہاں پلیٹو کا دیا ہوا کہ PERCEPTUAL KNOWLEDGE جو حواس کے ذریعے جو حاصل ہوتا ہے مشاہدۂ فطرت کے اوپر' مطالعہ کے بعد' تجربے کے بعد یہ سارے کا سارا باطل ہے' ناقابلِ اعتماد ہے۔کسی چیز کو اس میں سے اعتماد کے قابل نہ سمجھو۔آپ نے دیکھا کہ SCIENTIFI OUTLOOK جو ہے' کس طرح اس کی نفی کی گئی ہے یہاں کہ یہ قابلِ اعتماد چیز ہے ہی نہیں' یہ طریقہ نہ اختیار کرنا۔آپ کے ہاں بھی یہی چیز آ گئی۔میں ابھی بتاتا ہوں کیسے آئی۔

پلیٹو کے فلسفے کے بالمقابل قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اصولوں کی اہمیت اور علمِ انسانی کے حدود

پہلے یہ دیکھیے کہ قرآن نے کیا کہا؟ عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے علم کی ایک DEFINITION دی ہے کہ علم کہتے کسے ہیں۔ابھی میں نے کہا کہ ان کے نزدیک حواس کے ذریعے SENSES کے ذریعے PERCEPTION کے ذریعے جو KNOWLEDGE حاصل ہوتا ہے وہ علم نہیں ہے فریب ہے۔قرآن کہتا ہے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (17:36) کہتا ہے جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگا کرو۔خود ہی بتا دیا کہ علم کسے کہتے ہیں۔کہتا ہے کہ یاد رکھو! ہم سمع (سننے کی قوت) بصر (دیکھنے کی قوت) SENSES تمہاری حواس تمہارے اور ان کے ذریعے جو معلومات اکٹھی ہوتی ہیں پھر اندر MIND کے پاس جاتی ہیں وہ کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے۔آپ دھواں دیکھتے ہیں دور سے تو دل آپ کا کہتا ہے کہ آگ لگ گئی۔چیخ کی آواز سنتے ہیں وہ پہچانی ہوئی آواز ہے تو آپ کا دل اندر سے کہتا ہے کہ یہ تو فلاں عزیز ہے میرا جس کی یہ آواز ہے۔سمع اور بصر سے حواس سے معلومات اکٹھی ہوتی ہیں پھر وہ مائنڈ کے سامنے جاتی ہیں، وہ کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے۔قرآن نے یہ تینوں چیزیں یہاں کہی ہیں کہ یاد رکھو! تمہارے حواس اور تمہارا مائنڈ یا INTELLECT کی قوتِ فکر جو ہے ان سب سے ہم پوچھیں گے کہ تم جس چیز کے پیچھے لگے تھے۔انہوں نے اس کی صداقت اور گواہی دی تھی یا نہیں۔اس کے نزدیک علم کی DEFINITION یہ ہے کہ SENSES ڈیٹا اکٹھا کریں، معلومات اکٹھی کریں، انسان کا دل اس کے متعلق کسی نتیجے پہ پہنچے، وہ کہتا ہے یہ ہے علم۔دیکھا آپ نے پلیٹو کے زمانے سے لے کے اس وقت تک جتنے یہ باطل تصورات علم کے متعلق آ رہے تھے، ایک فقرے میں سب کو کاٹ کے رکھ دیا۔

اہلِ طریقت کے نزدیک علم کے ذریعے کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کے ذاتی تجربے کے علاوہ ایک مشکل عمل کا ذکر

آپ کے ہاں پھر جو سب سے یقینی علم ہے وہ اہلِ طریقت کا ہے بلکہ وہ اہلِ حقیقت اپنے آپ کو کہتے ہیں معرفت والے۔یہ علم تو خیر دونوں کے نزدیک اہلِ شریعت اور اہلِ طریق کے نزدیک، یہ علم تو دنیا داروں کا، مادہ پرست (یہ ایک لفظ نکلا ہوا ہے آپ کے ہاں) اور وہ الحاد اور بے دینی ہے۔جوں ہی یورپ کے سائنٹسٹ کے متعلق بات آئی، آپ دیکھیں گے ان کے ماتھے پہ جھر کے نقشے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔اتنی نفرت سے ان کے متعلق بات کی جائے گی صاحب! مادہ پرستی ہے صاحب۔تو یہ تو دونوں کے

نزدیک یہ ہے لیکن اہلِ طریقت آپ کے ہاں' آگے پہنچتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ اہلِ شریعت بھی یہ جو علم لیے پھرتے ہیں' نا بہر حال پڑھتے ہیں' آنکھوں سے تو کام لیتے ہیں نا۔ یہ سنتے ہیں قرآن کی آیتیں یا حدیثیں یا فقہ تو کانوں سے تو کام لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ علم نہیں ہے لب بہ بند و چشم بند و گوش بندان سب کو بند کر''او ہدے بعد لگھو ہو کے بیہ جا' ہوئے گا کی؟''۔عزیزانِ من! یہاں تک تو مرحلہ آسان ہے وہ تو ہم نے بھی بڑی آسانی سے یہ کر لیا تھا بڑا عرصہ لگھو بنا رہا۔ پہلا ہوتا ہے مت دیکھ' مت سن' مت چھو' مت چکھ۔ یہ جو حواس ہوتے ہیں ان پہ کنٹرول ہوسکتا ہے۔ یہاں قرآن نے وَالْفُؤَادَ کہا تھا۔ اگلا ان کے ہاں مرحلہ ہوتا ہے مت سوچ''اوئے میرے اللہ اے بڑا اوکھا کم ہونداا ے''۔لیکن کہتے ہیں جب تک یہ مرحلہ طے نہیں ہوگا اس وقت تک حقیقی علم نہیں آئے گا۔ مت سوچ۔ توبہ توبہ توبہ۔ کرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں یہ تو تھا علم کا ذریعہ شریعت میں اسے علم کہتے ہیں۔ کہتے ہیں مقصد علم نہیں ہے مقصد عرفان یا معرفت ہے پہچانا جائے' کیسے؟ خدا خود تمہارے سامنے کھڑا ہو جائے گا اگر یہ تم نے کر دیا تو۔ پہچان والے لوگ' اسی لیے ان کو اہلِ معرفت کہتے ہیں۔ اسی کو وہ کہتے ہیں حقیقت' حقیقت اس وقت تمہارے سامنے آتی ہے جب یہ سارے جتنے خارج کے ذرائع علم ہیں' ان تمام کے سوئچ آف کر دو' سوچو بھی نہیں۔ غور فرمائیے کہ یہ لوگ انسان کو کہاں لے جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک جہنم میں جانے والوں کے جرم کی نوعیت کے بالمقابل شریعت کے نزدیک جرم کی شکل وصورت

عزیزانِ من! قرآن سے علم کی DEFINITION یہ ہے کہ سمع اور بصر اور فواد سے جس چیز کی صداقت کی شہادت نہ ملتی ہو وہ علم نہیں ہے' جہالت ہے۔ اور جو ان سے کام نہیں لیتے ان سب کے اوپر بند لگا دیجیے۔ جو ان سے کام نہیں لیتے وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (7:179) یہ شہری آبادیاں ہوں یا یہ صحرائی آبادیاں' یہ کوئی بھی ہوں ان کے اطوار' ان کی روشیں' ان کے مسلک' بتا رہے ہیں کہ یہ جہنم میں جانے والے ہیں۔ اف! سوال یہ ہے کہ کیوں یہ جہنم میں جانے والے ہیں؟ کیا کیا انہوں نے جو جہنم میں جائیں گے؟ یہاں تو یہ کہا جائے گا کہ چونکہ اس کی شلوار ٹخنے سے نیچے آ گئی ہے' تہمد اس کا جو ہے یہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہو گیا ہے' جہنم میں جائے گا لیکن قرآن کی طرف آیے اور سوچیے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ یہ جہنم میں جانے والے ہیں کیوں؟ یہ وہ تھے لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ز (7:179) سینے میں دل رکھتے تھے سوچنے کا کام نہیں لیتے تھے اس سے۔ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ز (7:179) آنکھیں رکھتے تھے دیکھنے کا کام نہیں لیتے تھے وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط (7:179) کان رکھتے تھے ان سے سننے کا کام نہیں لیتے تھے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ (7:179) انسان سمجھتے ہو ان کو تم؟ بالکل ڈھور ڈنگر ہیں

حیوان ہیں یہاں تک تو کہا حیوان ہیں' کہا نہیں! بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط (7:179) حیوان پھر بھی اپنی INSTINCT اور جبلت کے سہارے تو ایک راستے پہ چلا جاتا ہے یہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں کم بخت۔ کیوں؟ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179) باہر کی کائنات سے بے خبر رہنے والے ہیں۔ برادرانِ گرامی قدر! غور فرمایا آپ نے۔ ایک کیٹگری یہ بتائی قرآن نے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ز وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ز (7:179) ان کی کیفیت یہ ہے کہ اس کائنات کی کسی چیز پہ غور وفکر نہیں کرتے ان کے لیے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں ان کی روش بتا رہی ہے کہ جہنم میں جائیں گے۔ کیا بات کہہ گیا ہے قرآن؟ بلکہ یوں اگر لفظوں میں سمجھنا ہو تو وہ یوں ہے کہ یوں کہو کہ یہ پیدا ہی جہنم کے لیے کیے گئے تھے یعنی اس انداز سے حتمی طور پر یہ کہہ رہا ہے' اس میں گنجائش ہی نہیں ہے کسی اور چیز کی۔ یہ ہیں وہ لوگ۔

قرآنِ حکیم کی بارگاہ میں عقل وبصیرت سے کام لینے والوں کو خراجِ تحسین

ان کے برعکس ایک اور گروہ ہے اور وہ وہ گروہ ہے جہاں سے آج ہم نے اس درس کی ابتدا کی۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ. الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً ج (3:190-191) یہ وہ ہیں صاحبانِ عقل و بصیرت جو سمع اور بصر سے کام لیتے ہیں حواس کے ذریعے خارجی کائنات کی معلومات اکٹھی کرتے ہیں' اسے دل کی دنیا کے سامنے لاتے ہیں INTELLECT یا فکر کی دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ وہاں سے پھر کسی نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔ نتیجے پہ ACADEMICALLY (نظری طور پہ) محض نہیں پہنچتے اس کے بعد عملاً یہ لیبارٹریز میں ان کو لے جاتے ہیں۔ سچ مچ چاند کے اوپر جا کر چاند کے اوپر معلومات اکٹھی کرتے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ ہم آپ کیا سمجھیں۔

کائنات کی ساخت اور اس کے نشیب وفراز پر غور وفکر کرنے والوں کی ذہنی کیفیت

عزیزانِ من! کسی ریسرچ سکالر سے کسی سائنٹسٹ سے پوچھیے کہ جب ایک نقطہ' کوئی ایک فارمولا' کوئی ایک قانون خدا کا' ان کے ذہن میں آتا ہے تو اس کے پیچھے جب وہ چلتے ہیں تو ہر وقت وہ اٹھتے بیٹھتے لیٹتے کھاتے پیتے ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہی ایک چیز گھوم رہی ہے الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ج (3:191) سوچ رہے ہیں غور وفکر کر رہے ہیں تخلیقِ ارض وسما کے اندر' یہ ہیں ذاکر یہ ہیں خدا کا ذکر کرنے والے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ پھر ان کی سوچ کا ان کے تجربے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کہہ اٹھتے ہیں ایک ایک شے کے متعلق رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ

ھٰذَا بَاطِلاً ج (3:191) اے ہمارے نشوونما دینے والے تونے کائنات کی کسی شے کو باطل پیدا نہیں کیا۔ سُبۡحٰنَکَ (3:191) تو اس سے بہت دور ہے کہ کوئی شے باطل پیدا کردے' تیرے شایانِ شان نہیں ہے یہ۔ یہاں کوئی ایک کاریگر کوئی ایسی چیز پیدا کرے جو آپ پوچھو کا ہے کے لیے پیدا کی ہے؟ وہ بتائے نہیں کہ یہ کیوں پیدا کی ہے' اس کا مصرف کیا ہے' اس کا کام کیا ہے' اس کا مذاق اڑایا جائے گا۔ اتنا بڑا خلاقِ عظیم کائنات کا اور اس کی تخلیق میں یہ چیزیں جو ہیں وہ باطل ہوں می نہ سزد خدائے را۔ سُبۡحٰنَکَ (3:191) تو اس سے بڑا بلند ہے کہ تو باطل کی چیزیں پیدا کرتا رہے' تو کھیل کھیلتا رہے۔ یہ بچوں کے گھروندے نہیں ہیں وہ جو ریت سے اور مٹی سے بناتے ہیں' بنانے کے بعد جی اکتا تا ہے تو پھر پاؤں مار کے چلے جاتے ہیں۔ یہ کیفیت نہیں ہے تیری سُبۡحٰنَکَ ہماری آرزو یہ ہے کہ کہیں اس قسم کا تصور تیرے متعلق ہمارے ذہن میں نہ آجائے کہ تو نے یوں ہی یہ کھیل کے طور پہ پیدا کردیا۔ فریبِ نگاہ ہے یہ' یہ سراب ہے' یہ مایا ہے' ایسا نہ ہوجائے۔ ایسا اگر تصور پیدا ہوگیا تو ہماری تو تمام امیدوں کی کھیتیاں جھلس جائیں گی فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) بچا ہمیں عذابِ نار سے۔ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ (3:192) سنیے عزیزانِ من! یہ جو ہم نے کہا کہ ہمیں بچا عذابِ نار تو فوراً ذہن میں آگیا کہ وہ جہنم ہے نا وہ وہاں وہاں کے متعلق بات کی ہے۔ ٹھیک ہے وہاں کا جہنم اس پہ تو ایمان ہے۔ سوچیے یہاں کہتا کیا ہے قرآن؟ کہ ہمیں اس عذاب سے بچا جس میں قوموں کے اعمال سارے جھلس جاتے ہیں' ان کی کھیتیاں بارآور نہیں ہوتیں۔ عذابِ نار کی خود ہی قرآن نے یہاں تشریح کی ہے یہ کہہ کے مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ (3:192) اس لیے کہ جسے تو اپنے اس عذاب میں داخل کردیتا ہے کیفیت اس قوم کی کیا ہوتی ہے؟ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ط (3:192) دنیا میں ذلیل ہوجاتی ہے وہ قوم۔ یہ ہے عذابِ نار۔ جس قوم نے بھی SCIENTIFIC OUT LOOK نہیں رکھی اپنی' وہ قوم ذلیل ہوتی ہے دنیا کے اندر۔ ہماری ذلت اور خواری کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس طرح سے NEGLECT کیا ہے' ہم نے اس طرح قابلِ نفرت اس کو قرار دیا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ ہم نیوٹرل رہے ہیں اس سے' POSITIVELY ATTITUDE یہ ہے کہ قابلِ نفرت ہے یہ چیز۔ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ط (3:192) تو اسے ذلیل کردیتا ہے۔

بھکاری کے نامہ اعمال میں عزت ووقار کے نام کی کوئی شے نہیں ہوتی

عزیزانِ من! اس سے بڑی ذلت اور کیا ہوتی ہے؟ اتنا بڑا ملک اور اس میں اتنی POTENTIALITIES اور ہم روٹی تک کے لیے دوسروں کے آگے بھیک مانگتے ہیں دنیا میں۔ گداگر سے زیادہ اور کون ذلیل دنیا میں ہوتا ہے اور گداگر بھی وہ جو روٹی کا ٹکڑا مانگنے کے لیے جھولی پھیلائے دوسروں کے سامنے۔ اور اس جھولی پھیلانے کے متعلق فریب اپنے آپ کو یہ دے لے کہ

یہ ممالک ہمارے دوست ہیں۔قرآن کہتا ہے **وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ** (3:192) فریب میں نہ رہنا جو بھکاری کو روٹی دیتا ہے وہ اس کا دوست نہیں ہوتا' وہ اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ان کا دوست کون ہوسکتا ہے۔اللہ اکبر۔بات ابھی آدھی ہوئی ہے میں نے کہا تھا کہ اس کے لیے وقت اور چاہیے باقی حصے کو ہم آئندہ لیں گے۔وقت ہو گیا۔سورۂ الِ عمران کی آیت 192 تک ہم آئے ہیں اسی موضوع کا باقی حصہ جو ہے' ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ(2:127)

❀......❀......❀

تینتسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 192 تا 194)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وحی کی روشنی کے بغیر عقلِ انسانی کی زبوں حالی کا تذکرہ

عزیزانِ من! آج مئی 1970ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی آیت 192 سے ہو رہا ہے: (3:192)۔

اس آیت سے آغاز نہیں بلکہ یوں کہیے کہ سابقہ درس میں جس موضوع پر بات ہو رہی تھی، وہ تشنہ رہا تھا اور میں نے عرض کیا تھا کہ اس درس کو ہم اسی کے تسلسل میں آگے چلائیں گے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسان کا کائنات کے ساتھ باہمی رشتے کی اہمیت وافادیت کو سمجھنا نہایت ضروری ہے

موضوع ہمارے سامنے یہ تھا کہ انسان اور کائنات کا باہمی تعلق کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اور تجدیدِ یادداشت کے لیے ضروری ہے کہ اسے چند لفظوں میں پھر دہرا دوں کہ مذہب کی دنیا میں تو یہ چیز بڑی حیرت انگیز سی نظر آئے گی کہ مذہب کو اس سے کیا تعلق کہ انسان کا کائنات کے ساتھ تعلق کیا ہے۔ مذہب تو یہ بتاتا ہے کہ انسان کا خدا کے ساتھ رشتہ کیا ہے؟ اور وہ رشتہ ایک بالکل پرائیویٹ سا رشتہ ہے ذاتی سا، نجی سا، ذہنی سا، SUBJECTIVE سا۔ اور آگے بڑھے تو مذہب نے یہ کہہ دیا کہ یہ

کائنات اس قابل ہے ہی نہیں کہ اس کے متعلق کچھ غور وخوض کیا جائے۔اسے SERIOUSLY لیا جائے۔کچھ سوچا بھی جائے اس کے متعلق۔

فکرِ قرآنی کے برعکس پلیٹو کی فکر نے ہزاروں سال سے نوعِ انسانی کو الجھا رکھا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ اڑھائی ہزار سال سے پلیٹو نے جو ایک تصور دیا تھا وہ فکری طور پہ بہت بلند درجے کا فلاسفر تھا لیکن گردن ذرا ٹیڑھی تھی اس لیے ایک ایسی غلط بات میں، وہ عالمِ انسانیت کو الجھا گیا کہ اڑھائی ہزار سال سے مسلسل اس نظریے کے ماتحت انسانیت تباہ ہوتی چلی جارہی ہے لیکن گرفت اس کی اتنی سخت ہے کہ اس سے ابھی تک نکل نہیں پائی۔بات تو اس نے فلسفے کی زمین میں کی تھی لیکن مذہب نے اس کو اپنا لیا اور اس سے آگے بڑھے تو تصوف نے تو پوچھو ہی نہیں کیا گل کاریاں کیں پھر اس زمین میں۔اور قرآنِ کریم ہے کہ جس نے آ کے طلسمِ افلاطون کی دھجیاں بکھیر دیں اور اس نے بنیادی موضوع یہ بنایا کہ دین سب سے پہلے تمہیں یہ بتاتا ہے کہ انسان اور کائنات کا باہمی تعلق کیا ہے۔پلیٹو نے کہا تھا کہ یہ کائنات EXIST ہی نہیں کرتی اس کا وجود ہی کچھ نہیں ہے، واہمہ ہے، تخیل ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اَسَد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

پلیٹو کا تصورِ حیات ''یہ کائنات سراب ہے، وہم ہے، تخیل ہے''

یہ پلیٹو ہے جو بول رہا ہے۔ویدانت کہتی ہے کہ یہ مایا ہے، سراب ہے، یہ پلیٹو ہے جو بول رہا ہے۔مادے کے متعلق MATTER کے متعلق (کائنات کے معنی MATTER ہوتا ہے) یہ MATERIAL WORLD جو ہے، حواس کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے، پلیٹو نے کہا کہ اس پہ اعتماد ہی نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ باہر کی چیزیں تو EXIST ہی نہیں کرتیں ایک وہم ہے ایک تخیل ہے۔تخیل کی بنا پہ جو معلومات آپ حاصل کریں گے وہ کب قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں۔نا قابلِ اعتماد ہے یہ علم جسے آپ PERCEPTUAL KNOWLEDGE کہتے ہیں علم وہی ہے جو اندر کا باطن کا علم ہوتا ہے۔بات اس نے فلسفے کی دنیا کی کی۔

تصوف کے نزدیک اصل علم صرف باطنی علم ہی ہے جبکہ حواس کا علم نا قابلِ یقین ہے

آپ نے دیکھا کہ آپ کے ہاں جسے مغزِ دین کہا ہے وہ تصوف کے اندر آپ کے ہاں اس کی بنیاد ہے کہ اصل علم یہ نہیں ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے' اصل علم باطن کا علم ہے۔ اندر کی دنیا میں ایک علم ملتا ہے۔ وحی کے متعلق تو ایک استثنا تھی کہ خدا براہِ راست وہ علم دیتا ہے اور علم وہ کائنات کے متعلق علم تھا۔ یہاں یہ آیا کہ نہیں صاحب! علم اصل تو یہ ہے کہ جو اندر کی دنیا سے انسان کو ملتا ہے۔ باطنی علم ایک ہوتا ہے' براہِ راست ملتا ہے خدا کی طرف سے۔ پلیٹو بول رہا ہے۔ اڑھائی ہزار سال سے وہ تمام اقوامِ عالم کی فکر کے اوپر چھایا ہوا ہے' اعصاب کے اوپر سوار چلا آ رہا تھا۔ قرآن نے آ کے اس طلسم کی دھجیاں بکھیریں۔ اور کس قدر جائے افسوس ہے کہ قرآن کو بغل میں لے کے رکھنے والی قوم اس قوم کی بھی یہی کیفیت ہوگئی جو باقی تمام اہلِ مذاہب کی کیفیت ہے۔ ان کے نزدیک بھی جب دنیا کا نام لیا جائے' نفرت سے ماتھے پہ شکن پڑ جاتے ہیں ''دنیا قابلِ نفرت چیز ہے صاحب''۔ اس کے متعلق بھی انہوں نے یہ کہا کہ یہ جو حواس کے ذریعے علم حاصل ہوتا ہے' یہ کچھ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ علم وہی ہے اندر کی دنیا سے جو براہِ راست ملتا ہے۔ انہوں نے بھی یہ چیز کہہ دی کہ یہ اس کی ہستی کچھ شے نہیں' کچھ نہیں فریب ہے۔ ہندو نے یہ کہا تھا کہ یہ ایشور کی لیلا رچائی ہوئی ہے' پرمیشور کا خواب ہے آنکھ کھل جائے گی تو جب آنکھ کھل گئی تو نہ زیاں تھا نہ سود تھا۔ یہ آپ کے ہاں کی شاعری ہے شاعری نہیں ہے' پلیٹو بول رہا ہے۔ پلیٹو نہیں ہے آپ کے ہاں کا تصوف ہے یہ جو دین کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے دین کے مغز کا۔

پلیٹو کے خلاف' تصوف کے خلاف' قرآنِ حکیم کا فلسفۂ حیات' کائنات کا تصور اور ملائکہ کا مقام

قرآن نے آ کے اس طلسم کو توڑا اور اس نے یہ کہا کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ کہا کہ یہ جو تم نے فطرت کی قوتوں کو اپنا مسجود بنا رکھا ہے۔ اس کے سامنے سجدے کرتے ہو۔ اس کو خدا بنایا ہوا ہے۔ اس کو دیوی دیوتا بنایا ہوا ہے۔ ڈرتے ہو کانپتے ہو ان قوتوں سے۔ یہ قوتیں اس قابل نہیں ہیں کہ تم ان کے سامنے جھکو۔ تمہارا مقام یہ ہے کہ ساری قوتیں تمہارے سامنے جھکیں۔ ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ کرتے ہیں آدم ملائکہ کے سامنے سجدہ نہیں کرتا۔ کتنا بڑا انقلاب تھا جو قرآن لایا۔ اس کے بعد کہا کہ یہ قول کہ کائنات باطل ہے' یہ ان لوگوں کا قول ہے جو ظن و قیاس پہ چلتے ہیں اور یہ کفر ہے ایسا کہنا۔ دیکھا آپ نے قرآن نے کس طرح سے آ کے اس طلسم کو توڑا اور آپ دوبارہ پھر کس طرح اسی مقام کے اوپر پہنچ گئے جہاں قرآن سے پیشتر پلیٹو کے ماتحت ساری دنیا پہنچی ہوئی تھی۔ قرآن نے یہ چیز کہی کہ علم کی DEFINITION یہ ہے اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ

کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡئُوۡلًا علم کی DEFINITION اب یہ ہے ختمِ نبوت ﷺ کے بعد کہ وہ سمع اور بصر اور فؤاد کے ذریعے سے حاصل ہوگا ۔ اگر اس کے علاوہ کوئی شخص باطن کا علم کہتا ہے۔ براہِ راست وہ علم حاصل کرتا ہے اس کے علاوہ جو جی میں آئے اس کا نام رکھ لے' پلیٹو بول رہا ہے' اس کے اعصاب PERCEPTUAL KNOWLEDGE پہ پلیٹو سوار ہے۔عزیزانِ من! یہ تھی وہ چیز جسے میں نے پچھلے درس کے اندر قرآنِ کریم کی آیات کی روشنی میں پیش کیا تھا اور میں تو قرآن ہی کا درس دیتا ہوں۔

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں پر غور و فکر کر کے انہیں قرآنی احکام کے تابع صرف کرنے کا ذکر ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ایک ایک آیت اس کی تائید میں آپ کے سامنے پیش کی۔اور ہم یہاں تک آ گئے تھے کہ جس میں یہ کہا ہوا تھا پھر اس آیت کو دہرا دوں کہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ الَّذِیۡنَ (3:190-91) یاد رکھو! ارض و سما کی تخلیق میں لیل و نہار کے اختلاف میں اربابِ بصیرت اور عقل و فہم کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ (3:191) یہ وہ لوگ ہیں کھڑے بیٹھے لیٹے اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔اور میں نے کہا تھا کہ دیکھیے قرآن ذکر کس چیز کا نام رکھتا ہے؟ آپ کے ہاں تو معلوم ہے نا ذکر کسے کہتے ہیں؟ قرآن نے ذکر کہا اور وہیں اسی مقام پہ تفسیر اس کی کر دی یعنی وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ (3:191) کائنات کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں یہ ہے اللہ کا ذکر۔ اور یہ چیز محض ACADEMIC DISCUSSION نہیں' محض نظری اعتقادی ذہنی چیز نہیں ہے بلکہ وہ کائنات کی تخلیق پر غور کرنے کے بعد ایک ایک شے کا تجزیہ کرتے ہیں' ٹیسٹ کرتے ہیں' لیبارٹریز میں لے جاتے ہیں اور پھر وہ اعلان کرتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ (3:191) اے ہمارے نشوونما دینے والے (ربنا آپ نے دیکھا رب یہاں کیسا آیا ہے عجیب' نشوونما دینے والے) تیری ربوبیت کا تقاضا یہ تھا کہ ہمیں پیدا کیا تھا تو سامانِ نشوونما بھی ساتھ دیتا اور اس انداز سے تو نے دیا کہ کوئی شے یہاں باطل ہے ہی نہیں۔جبکہ پلیٹو کے مطابق کہ یہ EXIST ہی نہیں کرتی۔

حق اور باطل کی تعریف اور اسکا ماحصل

عزیزانِ من! حق تو ایک ٹھوس حقیقت کا نام ہوتا ہے تعمیری نتائج پیدا کرنے والی چیز کا نام ہوتا ہے۔ باطل واہمہ ہوتا ہے۔ تخریبی نتائج پیدا کرتا ہے۔ مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَكَ (3:191) یہ تیری شایانِ شان ہی نہیں تھا کہ تو یہی کھیل رچا تا رہتا ہے' سپنے میں ہوتا' باطل چیزیں پیدا کرتا' یہ تیری شایانِ شان ہی نہیں تھا' تو اس سے بہت دور ہے کہ تو اس قسم کے کھیل کھیلے۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ ہم بھی اسی غلط فہمی کے اندر مبتلا ہو جائیں جس میں باقی دنیا کی قومیں مبتلا ہوئیں اور ان کی امیدوں کی کھیتیاں جھلس کے رہ گئیں۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ (3:192) یہیں بتا دیا کہ یہ کیا کہا ہے نار میں داخل ہونا؟ مذہب نے تو فوراً ہمیں کہہ دیا نا کہ ہاں وہ جہنم میں جاؤ گے وہاں مرنے کے بعد۔ اس نے کہا وہ ٹھیک ہے مرنے کے بعد۔ اس نے کہا جو قوم کائنات کے متعلق یہ نظریہ رکھتی ہے کہ یہ باطل ہے' یہ فریب ہے' یہ سراب ہے' اس کا علم قابلِ اعتماد نہیں ہے' وہ نار میں جہنم کی زندگی بسر کرتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ط (3:192) [1] وہ قوم دنیا میں ذلیل وخوار ہو جاتی ہے۔ SCIENTIFIC OUT LOOK اگر قوموں کا نہیں ہے' وہ قومیں دنیا میں ذلیل ہو جاتی ہیں' دوسروں کی محتاج ہو جاتی ہیں۔ اور اس محتاجی کے عالم میں لوگ بھیک کا ٹکڑا ان کی جھولی میں پھینکتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے جارہے ہیں۔ وہ کہتا ہے وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (3:192) جو جس مقام پہ جس شے کو ہونا چاہیے وہاں نہیں رکھتا' وہ ظالم جو ہے دنیا میں کوئی اس کا دوست نہیں ہوا کرتا۔ یاد رکھو خیرات دینے والے وہ ہوا کرتے ہیں' ذلت کی نگاہوں سے تمہیں دیکھیں گے' دوستی نہیں ان کی ہوا کرتی۔ SCIENTIFIC OUT LOOK ۔ آپ دیکھتے ہیں مذہب کی سٹیج سے قرآن کیا بول رہا ہے۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں سائنس تو انسان اور کائنات کے باہمی رشتے کو مستحکم کرتی ہے

مذہب کی دنیا میں تو ہم نے سنا ہی تھا کہ CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE کتنی مشہور کتاب ہے آپ کو معلوم ہے یہ۔ یہ CONFLICT تھا ہمیشہ مذہب اور سائنس کا۔ یہ آ کے کہتا یہ ہے کہ یہ جسے تم سائنس کہہ رہے ہو' اس پہ تو بنیاد ہے انسان کے تعلقات کی اور کائنات سے اپنا صحیح رشتہ وابستہ کرنے سے خدا کے ساتھ صحیح رشتہ وابستہ ہوتا ہے۔ یہ آگے بات آئے گی۔ عزیزانِ من! یہاں تک ہم پہنچے تھے اب آگے چلیے۔ وہی DUALITY وہی

ثنویت' وہی تفریق مذہب اور کائنات کی: مومن کو اس سے کیا تعلق؟ اللہ والوں کو اس سے کیا واسطہ اس دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ ہم نے سائنٹسٹ گروہ ہی الگ سمجھ رکھا ہوا ہے جن کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہب والے وہ ہیں جن کے سائنس کے ساتھ کوئی مس ہی نہیں۔ وہ جتنا ان معاملات سے زیادہ بدھو ہوتا ہے' اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے۔ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے وہ اتنے بھولے بھالے تھے ان کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ گھڑی میں وقت کیسے دیکھا جاتا ہے۔

سائنس سے دور لوگوں کی کیفیت اور اس کے برعکس مومن کی عظمت تو ہر قدم پر کائنات پر غور و فکر کرنے سے وابستہ ہے

آپ ان کے جتنے بھی بڑے بڑے ہیں ان کی کرامات پڑھیے تو وہ آپ کو یہ چیزیں ملیں گی۔ جتنا ان دنیاوی معاملات سے بے خبر ہوتا ہے' اتنا ہی زیادہ وہ اندر کی دنیا کے اندر ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اندر کی دنیا کا علم تو اسے حاصل ہوتا ہے کہ لب بہ بند و چشم بند و گوش بند' کان بند کر آنکھیں بند کر منہ بند کرتا کہ اندر روشن ہو جائے۔ دروازے کھڑکیاں روشن دان سارے کے سارے بند کر لے تا کہ اندر جگمگا اٹھے تمہارا صاحب۔ اب اندھیرے کا نام نور رکھ لے کوئی تو کیا کرے گا کوئی۔ سنیے کہ قرآن کس کو مومن کہتا ہے؟ یہاں تو اتنا ہی کہا تھا لاولی الالباب' صاحبانِ عقل و بصیرت کہ جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے (یذکرون کے معنی سمجھ لیا نا آپ نے) قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ج (3:191) اور یوں تخلیقِ ارض و سما میں ہر وقت غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ یہاں صرف ذکر کرنے والا تھا اور آگے بڑھیے قرآنِ کریم کہتا ہے۔ بڑی اہم آیات ہیں قرآن کی بڑی انقلاب انگیز چیز ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے پلیٹو آج بھی اڑھائی ہزار سال سے اعصاب پہ سوار چلا آ رہا ہے' چلا ہوا ہے۔ صرف قرآن ہے جس نے آ کے اس کی دھجیاں بکھیری ہیں۔ سنیے مومن کسے کہتے ہیں؟ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (45:3) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اندر لَاٰیٰتٍ حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ کن کے لیے؟ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (45:3) مومن کی DEFINITION یہ ہو رہی ہے۔ کائنات کے اندر غور و فکر کے بعد وہ ان چیزوں پہ پہنچتا ہے۔ کائنات میں اس کو SIGNS نظر آتے ہیں۔ دیکھا آپ نے خدا تک پہنچنے کے لیے راستہ کونسا بتا رہا ہے قرآن؟ اندر کی دنیا میں گم ہو جانے والی بات نہیں۔ میں نے عرض کیا تھا' سقراط نے یہ تصور دیا تھا کہ انسان صرف اپنی ذات پہ غور کرے' باہر پہ غور ہی نہ کرے۔ ہمارے ہاں یہی تصور ہے نا اپنے اندر غور کرو میاں۔ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (45:3) باہر کی دنیا میں نشانیاں ہیں مؤمنین کے لیے۔ یہاں مؤمنین کہا۔ ایک ایک کیٹگری دیکھتے چلے جایے۔ مومن: ایمان

لانے والے یقین کرنے والے۔اگلا STEP یہ ہوا کرتا ہے ہمارے ہاں وَفِیۡ خَلۡقِکُمۡ وَمَا یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ (45:4) تمہاری اپنی تخلیق میں اور جس قدر جاندار مخلوق پھیلا دی ہوئی ہے ہم نے اس کائنات کے اندر ان سب میں کیا ہے؟ اٰیٰتٌ (45:4) نشانیاں ہیں بہت بڑی بڑی کس کے لیے؟ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ (45:4) جو ایمان کو یقین کے درجے تک پہنچانا چاہتی ہے اس قوم کے لیے یہ راستہ ہے ان کے اندر بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔اس راستے سے ایمان آتا ہے اس راستے سے ایمان کو یقین نصیب ہوتا ہے۔اور یہی لوگ ہیں جنہیں قرآن نے اربابِ عقل وبصیرت کہا ہے۔اگلی آیت وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّھَارِ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِھَا (45:5) ایک ایک گوشہ کائنات کا سامنے لا رہا ہے۔پہلے کہا تھا تمہاری تخلیق میں جتنی جاندار مخلوق پھیلا دی ہے اس میں اختلافِ لیل ونہار میں آسمان سے جو بارش برستی ہے اور اس سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ نصیب ہو جاتی ہے اس میں وَتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ (45:5) اور یہ جو ہواؤں کے رخ بدلتے ہیں ان کے اندر اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (45:5) بڑی بڑی نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو عقل وفکر سے کام لینے والی قوم ہے۔

خود ساختہ شریعت میں دو چیزوں کی ممانعت

یہاں آپ کے ہاں مسلمہ یہ ہے کہ شرع میں عقل کا کیا کام۔''دو چیزاں دا شریعت اچ کم نئیں ہوندا (ایہ ادھی گل اے جیہڑی میں کہی) اک تے ہوندا اے شرع اچ شرم دا کی کم' دوجا ہوندا اے شرع اچ عقل دا کی کم''۔اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (45:5)۔سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ایمان کس طرح سے لایا جائے؟ تبلیغ دین کیسے کی جائے؟ آپ نے وہ جماعت تو دیکھی ہوگی نا یہ جو مبلغوں کی جماعت ہوتی ہے' تبلیغی جماعت جسے کہا جاتا ہے۔جو اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں' لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ایمان لائیں۔ دیکھا تو ہوگا آپ نے ان کو۔میں نے عرض کیا ہے نا کہ میں کسی جماعت کسی پارٹی کسی فرقے پہ تنقیص نہیں کیا کرتا' قرآن کے خلاف جو مسلک ہوتا ہے' اس مسلک کے متعلق عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ مسلک کیا ہے۔یہ احباب یہاں تو انہوں نے تبلیغ کے کام اپنے پورے کر لیے

تو کارِ دنیا نکو ساختی
کہ بر آسماں نیز پرداختی

دنیا کے سارے کام ٹھیک ہو گئے تو پھر آسمان کی طرف چلے۔یہ جماعتیں یورپ اور امریکہ میں بھی پہنچیں اس ہیت کذائی کے ساتھ کہ وہ جوان کے ہاں کا بہر حال لباس ہے اس پہ تو میں نہیں تنقید کرتا جتنا زیادہ میلا ہو' اتنا ہی اللہ والا ہوتا ہے' گندگی میں لتھڑا ہوا'

مجذوب ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے ''او بالکل ای پہنچیا ہویا ہوندا ہیگا'' اس کی تو DEFINITION یہ ہے نا کہ

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نہ آید

جسے اس کی خبر ہو جاتی ہے پھر اس کی ہی خبر نہیں نکلتی صاحب ''گڑم''۔ لباس اس قسم کا چیکٹ ہوا ہوا' ہاتھ میں ایک عصا' عصا کے اوپر ڈوری کے ساتھ ایک لٹیا بندھی ہوئی۔ لمبی لمبی جیبوں والی وہ عبا۔ ایک طرف یہ سوکھی ہوئی نین سکھ کی مسواک' روز اسی سے جو کرتے ہیں۔ دوسری طرف استنجے کے لیے ڈھیلے' کمر کے اوپر اتنا سا بستر لپٹا ہوا۔ کوئی انگریزی نہیں جانتا' ولایت جا رہے ہیں تبلیغ کرنے کے لیے۔ ایک INTERPETER ساتھ رکھا ہوا ہے کہ وہ کچھ بات کرے گا۔ تبلیغِ دین ہے۔

خدا تعالیٰ پر یا قرآن پر ایمان لانے کا وہ طریق جو اس نے ازخود آخری حجت کے طور پر پیش کیا ہے

آپ کو پتہ ہے کہ قرآن پھر کیا کہتا ہے کہ ایمان لانے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے؟ دعوت دو تو کس راستے سے دعوت دو؟ بڑی غور طلب چیزیں ہیں بڑی اہم آیت ہے۔ عزیزانِ من! میں تو جب دیکھتا ہوں ان آیات کو تو میں تو پوچھیے نہیں' روح پہ کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ یا اللہ! تیرے دین نے کیا دیا تھا اور ہم کس مقام پہ کھڑے پھر آ کے اس قرآن کی موجودگی میں روز پڑھتے ہیں اس قرآن کو۔ اور چھلاوا وہ ہے کہ جو پلیٹو نے دیا تھا اور مختلف رنگ ہمارے ہاں اس میں شریعت بھی' طریقت بھی' معرفت بھی' تصوف بھی' سارا اس کے اندر آیا ہوا ہے صاحب۔ سنیے قرآن کیا طریق بتاتا ہے ایمان لانے کا' ایمان کی دعوت دینے کا۔ وہ اوپر سے گنا تا چلا آ رہا ہے نا تخلیقِ ارض وسما' جتنی زندہ چیزیں کائنات میں پھر رہی ہیں وہ' اختلافِ لیل ونہار' آسمان سے برسنے والا بادل' تصریفِ ریاح یہ تمام چیزیں تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (45:6) یہ ہیں آیات اللہ جنہیں تیرے سامنے اے رسول حق کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے' تمہیں یہ دیا جا رہا ہے۔ اور آگے ہے وہ ٹکڑا کہ ان سے پوچھو فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (45:6) ان سے کہو کہ اگر ان چیزوں کے باوجود تم ایمان نہیں لاتے تو پھر کون سی بات باقی ہے جس کے اوپر تم پھر ایمان لاؤ گے۔ یعنی اس کے بعد کوئی اور چیز ہے ہی نہیں۔ جو اس طریق سے ایمان نہیں لاتا' اسے کہا گیا ہے کہ پھر کون سی چیز باقی ہے جو تمہارے سامنے پیش کی جائے تو تم ایمان لے آؤ۔ یہ ہیں وہ آیات اللہ جنہیں پیش کرنے کے بعد ان سے کہا جائے گا' دعوتِ غور وفکر دی جائے گی' ایمان کی دعوت دی جائے گی یہ چیزیں پیش کرنے کے بعد۔ اور اس نے کہا کہ جو ان کے پیش کرنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتا خدا کی خالقیت اور رزاقیت اور ربوبیت کے اوپر' قانونِ مکافاتِ عمل کے اوپر تو سمجھ لو کہ وہ پھر کسی چیز سے بھی ایمان نہیں لا سکتا۔ آخری حجت ہے آخری دلیل ہے۔ قرآن کے حقائق پہ تو اس طرح سے ایمان لانے کی بات تھی۔

کائنات کے متعلق چھٹی صدی عیسوی میں قرآنِ حکیم کے انکشافات کے باوجود انیسویں صدی تک عقلِ انسانی کی علمی سطح

سنیے اس کی تفسیر میں وہ کیا کہتا ہے؟ آپ کفار کو اسلام کی ایمان کی دعوت دے رہے ہیں۔ ایک دعوت آپ دیتے ہیں ایک دعوت قرآن دیتا ہے۔ سنیے وہ دعوت کیا دیتا ہے؟ اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (21:30) یہ جو صداقتوں سے انکار کرنے والے (عام ترجمے میں جسے ہم کافر کہتے ہیں) یہ کافر جو ہیں کیا کبھی انہوں نے اس چیز پہ بھی غور کیا ہے بلکہ یَرَ (21:30) دیکھا ہے مشاہدہ کیا ہے؟ یہاں یَرَ ہے' خالی ذہنی طور پہ ایک THEORETICAL یا ACADEMIC یا SUBJECTIVE DISCUSSION نہیں' دیکھنا ہے۔ کیا انہوں نے اس چیز کا بھی مشاہدہ کیا ہے' غور کیا ہے۔ کس چیز پر؟ پھر سن لیجیے کفار کو دعوت دی جا رہی ہے۔ کس چیز پہ کبھی انہوں نے غور کیا ہے دیکھا ہے؟ کس چیز پہ؟ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ (21:30) اللہ اکبر! برادرانِ عزیز! آپ کے ہاں کی بلند تریں سائنس جس چیز پہ بیسویں تو نہیں خیر انیسویں صدی میں جا کے پہنچی تھی قرآن چھٹی صدی عیسوی میں یہ بات کہہ رہا ہے۔ کفار سے کہہ رہا ہے تم اور باتوں کو چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ اس چیز پہ تم نے غور کیا ہے کہ یہ سارا سلسلۂ کائنات ابتدا میں ایک ہی ہیولا تھا NEBULA تھا GASES کی شکل کے اندر۔ یہ الگ الگ زمین اور چاند اور ستارے اور سورج اور یہ چیزیں یوں نہیں تھیں۔ یہ سارے کا سارا کَانَتَا رَتۡقًا (21:30) یعنی کفار کو دعوت دی جا رہی ہے ایمان لانے کی کہ کبھی تم نے اس پہ بھی غور کیا ہے کہ ابتداً یہ سارا کائنات کا ہیولا ایک جگہ تھا۔ پھر اس کے بعد فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ (21:30) پھر ہم نے ان کو چھینٹے کی طرح یوں الگ الگ کیا وہ سورج وہ چاند وہ ستارے یہ زمین چھڑک دیا ان کو ہم نے ان فضا کی پہنائیوں کے اندر۔ اللہ اکبر۔ عزیزانِ من! انیسویں صدی عیسوی میں ابتدا ہوئی تھی اس DISCOVERY کی کہ یہ ساری کائنات کا ابتدائی ہیولا جسے NEBULA کہا جاتا ہے وہ ایک چیز تھی۔ قرآن نے دوسری جگہ دخان کہا ہے اس کو GASES کی شکل کے اندر تھی۔ قرآن کہتا ہے یہ چھٹی صدی عیسوی میں کہتا ہے یہ NEBULA کی FORM پہ تھی گیس کی شکل کے اندر تھی یہ الگ الگ چیزیں نہیں تھیں۔ وہاں دوسری جگہ ہے دَحٰهَا (79:30) یوں یہ اس ہیولے سے تیزی سے چھٹ کے یوں گئے جیسے گوپیے میں سے پتھر کو پھینکا جاتا ہے۔ پوچھیے کسی سائنٹسٹ سے اس کو وجد آ جائے گا صاحب اس تشبیہ کے اوپر وجد آ جائے گا۔ وہ گوپیئے کو تیزی سے گھمایا جاتا ہے تیزی سے گردش۔ ہیولا ساکن نہیں تھا وہ خود گردش کر رہا تھا۔ اس گردش کے

اندر سے وہ گو پیئے کی ایک ذرا سی STRING جو ہوتی ہے اس کو ذرا سا ڈھیلا کیا جاتا ہے تو اس کے اندر کا پتھر جو ہے اس کو باہر سے کوئی اور چیز نہیں ہوتی جو اس کو مومنٹم دیتی ہے' وہ جو گردش ہوتی ہے اس میں سے جو وہ نکلتا ہے تو اپنے مومنٹم سے آپ چلا جاتا ہے دور اور اسی طرح سے گھومنا شروع کر دیتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے حقائق پر ایمان لانے کی دعوت کا طریقِ کار

عزیزانِ من! قرآن یہ کہتا ہے او کفار! آؤ تمہیں ہم ایمان کی دعوت دیتے ہیں کبھی اس پہ بھی تم نے غور کیا ہے اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ (21:30) کبھی اس پہ تم نے غور کیا ہے۔ اور اس کے بعد کہا کہ ٹھیک ہے یہ تو کرے بن گئے' زمین بھی تمہاری بن گئی۔ کوئی ذی حیات تو یہاں تھا نہیں' زندگی کی تو ابھی نمود نہیں ہوئی تھی۔ پھر زندگی کی نمود کس طرح سے ہوئی؟ کون سی چیز ہے جس سے زندگی کی نمود ہوئی؟ کہا تم نے کبھی اس پہ بھی غور کیا کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ (21:30) پھر اس میں ہم نے کچھ تھوڑی سی ٹھنڈک پیدا کی تو اس کی یہ جو GASES کے VAPOURS جو تھے وہ پانی کی شکل انہوں نے اختیار کی اور پانی بنا تو اس سے پھر جاندار جتنی مخلوق تھی' اس کی ابتدا ہو گئی۔ کفار سے کہا کبھی تم نے اس پہ غور کیا ہے؟ اور اس کے بعد ہے ایمان کی دعوت ہے نا۔ کہا اس پہ تم نے غور کیا اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (21:30) اب بھی ایمان لاتے ہو یا نہیں۔ آہاہا۔ عزیزانِ من! دین کی تبلیغ یوں ہوتی ہے۔ سنتے ہیں آپ اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا (21:30) غور کس چیز پہ کرایا جا رہا ہے؟ اپنے ہاں کے مباحثے اور مناظرے اور یہ چیزیں جو ہیں' ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے۔ اور چلا ہوا مسئلہ کہ صاحب! مسح یوں کرنا چاہیے' وضو یوں کرنا چاہیے' اترے گا نہیں آئے گا۔ قرآن کہتا ہے کفار کو ان چیزوں کی طرف دعوت دو اور اس کے بعد ان سے کہو اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (21:30) کہو اس کے بعد بھی ایمان لاتے ہو یا نہیں؟ اور جو نہیں لانے والے۔ ابھی ابھی وہ پہلے آیت ہم نے دیکھ لی ہے نا کہ ان آیات کے بعد فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (45:6) اس کے بعد بھی اگر ایمان نہیں لاتے ہو سلام علیکم۔ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (25:63) تم نہیں ایمان لا سکتے۔ یہی راستہ ہے ایمان لانے کا۔ چھٹی صدی عیسوی کے اندر یہ کہہ رہا ہے تخلیقِ کائنات کے متعلق جسے اٹھاروی اور انیسویں صدی عیسوی میں آ کے جب ان لوگوں نے اس کا اعلان کیا تو وہاں کا مذہب جو تھا اس نے کہا پھانسی پہ چڑھا دو' ان کو کھال اتار دو' ان کی گیلیلیو کو پھینک دو پیسا کے ٹاور سے کہتا ہے زمین گول ہے' کہتا ہے زمین چکر کھا رہی ہے۔ یورپ نے سترہویں اٹھارویں صدی کے اندر یہ کچھ کہا یہ چھٹی صدی کے اندر یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ اور سائنس کی کتاب نہیں ہے کتاب تو انسانیت سکھانے والی ہے۔ اس نے

کہا ایمان لانے کا طریقہ اور ذریعہ یہ ہے کہواں سے اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (45:6) کیا اس کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے۔ مومن ہو گئے میں نے ابھی عرض کیا تھا' یقین کا درجہ حاصل ہو گیا۔

قرآنِ حکیم کے ہاں لفظ متقی کا مفہوم اور ہمارے ہاں کی گئی سازشوں کا نتیجہ

آپ کے ہاں متقی کا درجہ بہت آگے بتایا جاتا ہے' متقی پرہیزگار بڑا متقی واقع ہوا ہے۔ یہ تو الگ بات ہے کہ ہمارے ہاں جب تصورات اور ان کی DEFINITIONS بدلی ہیں تو پھر ان تمام چیزوں کے معنی بدل گئے ہیں۔ لیکن اگلا درجہ متقی کا ہے۔ قرآن دیکھیے متقی کسے کہتا ہے؟ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (10:6) یقیناً دن اور رات کی گردشوں میں' خدا نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ پیدا کیا ہے' لَاٰیٰتٍ (10:6) اس میں نشانیاں ہیں حقیقت تک پہنچنے کی۔ کس کے لیے؟ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (10:6) متقیوں کے لیے۔ مومن یہ' یقین رکھنے والے یہ' ایمان لانے والے یہ' متقی یہ۔ برادرانِ عزیز! آپ نے دیکھا کتنی بڑی سازش تھی جس سے آپ کی یہ گاڑی دوسری پٹڑی پہ ڈال دی گئی۔ جن جن تاریکیوں سے قرآن نے آپ کو نکالا تھا اور نور میں وہ لایا تھا' آپ کو پھر سے ان تاریکیوں کے اندر دھکیل دیا گیا آپ کے دین کو پھر مذہب بنا دیا گیا۔

خود کو علماء کہلانے کا حق کن کو ہے؟ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس سوال کے جواب کا متمنی ہے

آپ کے ہاں کی ساری بحثیں ہی مذہبی ہو گئیں' مناظرے ہی وہی ہو گئے' مباحثے ہی وہ ہو گئے' دین کی سب سے بڑی خدمت ہی یہ ہو گئی۔ اور یہ جتنے مسائل ہیں انہیں بیان کرنے والے جو ہیں ان کا نام علمائے کرام رکھ دیا گیا۔ ٹھیک ہے یہ کسی کا لائسنس تو ہے نہیں کہ اپنے آپ کو کوئی کیا کہتا ہے۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خدا کہا' وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو نبی کہا یعنی یہ تو کوئی آپ روک نہیں سکتے۔ اب وہ بھی ایک گروہ ہے جو اپنے آپ کو علمائے کرام کہتا ہے۔ ہم کون ہیں اعتراض کرنے والے۔ ہم کہتے صرف یہ ہیں کہ آؤ ذرا دیکھیں کہ جس خدا پہ تم ایمان لاتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم اس کی شریعت کے عالم ہیں' کچھ اس نے بھی کہا ہے' عالم کسے کہتے ہیں؟ کہا ہے اس نے' وہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا ''اوگھر تیکر پہنچدا اے''۔ علما: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ج (35:27) تم لوگوں نے کبھی اس کا بھی مشاہدہ کیا۔ اور دیکھیے SCIENTIFIC OUT LOOK یہ نہیں ہے کہ کمرے کے اندر بیٹھ کے کتابیں پڑھتے رہے۔ یَرَ کہتا ہے قرآن ہر جگہ خود جا کے دیکھو' مشاہدہ کرو' خود اس

کے بعد یہ تجربہ تمہارا جو ہے' اس سے تم یقین پہ پہنچو گے' دوسروں کی بتائی ہوئی بات کے اوپر کیوں تم یقین کر لیتے ہو؟ خود کرو۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ج (35:27) تم نے اس کا بھی مشاہدہ کبھی کیا کہ خدا نے بادلوں سے پانی برسایا یا پانی برساتا ہے فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا ط (35:27) پھر اس میں سے وہ تمہارے لیے پھل کھیتیاں کھانے پینے کی چیزیں اگاتا ہے قسم قسم کی۔ اول تو یہیں غور وفکر کی بات ہے۔ ایک جیسا پانی ایک جیسی زمین' زمین میں سب کچھ وہی' وہی ہوا' وہی سورج کی روشنی' ان ہی سے چیزیں اگتی ہیں نا۔ ادھر آپ نے ایک بیج جو ببول کا بودیا' ساتھ ہی اس کے آپ نے ایک لنگڑے کی گٹھلی لگادی۔ وہی زمین' وہی پانی' وہی ہوا' وہی روشنی' یہ سارا کچھ وہی' کچھ اسی قسم کا ایک پودا نکلتا ہے۔ چلتے چلتے چلتے جب اوپر پہنچتے ہیں تو اس میں وہی کانٹے ہوتے ہیں اور اس میں ثمرِ بہشت لگ جاتا ہے۔ کہتا ہے کبھی غور بھی کیا یہ کیا مشینری ہے' کیسے کام کر رہی ہے؟ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا ط (35:27) رنگا رنگ کے قسم قسم کے پھل اور کھیتیاں اگتی ہیں۔ یہیں تک نہیں۔ یہ ہمارے ہاں جو جیالوجی کا علم ہے' علمِ طبقات الارض پہاڑوں کی چٹانوں کا مطالعہ مشاہدہ کرنے کے بعد سائنٹفک حقیقتوں کے اوپر پہنچنا۔ زمین کے طبقات کو جس میں کوئی زندگی نہیں ہوتی' کبھی کسی نے اس سے پیشتر غور ہی نہیں کیا تھا کہ یہ چیز بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ عزیزانِ من! بالکل RECENT ہیں سائنس کی یہ شاخیں ''پہاڑوں کی چٹانوں کا مطالعہ''۔ ہم نے آپ نے بھی تو پہاڑ دیکھے ہیں بہرحال بیسیوں مرتبہ سینکڑوں مرتبہ' وہ سوائے اس کے کہ وہ بڑا ہی اونچا ہے بس اللہ اللہ خیر سلا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہاں سے واپسی پہ آئے تو وہ فرمائش پوری کردی'' اک وٹا لئی آنا سِل واسطے لوہڑ ہیگی اے''۔

زوآلوجی ہو یا بائیوآلوجی یا باٹنی' کیڑے مکوڑے ہوں یا مویشی' کائنات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جس کو قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں پیش نہ کیا ہو

پہاڑ کو ایک سائنس کا شعبہ بنانے کے لیے دو چیزیں آپ نے دیکھیں۔ تخلیقِ ارض وسما' بارش برسائی جاتی ہے' کھیتیاں اگائی جاتی ہیں' بائیالوجی پہلے آ گئی' زوالوجی یوں آ گئی' باٹنی یوں آ گئی اب جیالوجی تھی۔ چھٹی صدی عیسوی میں جیالوجی کے متعلق وَ مِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ وَّ حُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَ غَرَابِيۡبُ سُوۡدٌ (35:27) کبھی جا کے تم نے دیکھا ہے کہ یہ چٹان اتنی سیاہ کیوں ہو گئی' یہ سرخ کیوں ہے' ان دونوں کے درمیان اس قسم کی دھاری کیسے پڑ گئی' کیا کیا تطورات اور تغیرات ہیں جن کی وجہ سے یہ کچھ ہو گیا۔ یہ ایک جیسے پتھر کیوں نہیں رہے ان میں کیوں یہ مختلف قسم کے تغیرات رونما ہوئے۔ چھٹی صدی عیسوی

میں کہا جا رہا ہے کہ کبھی ان چیزوں کے اوپر تم نے غور کیا ہے۔ عزیزانِ من! کوئی جیالوجی کا سٹوڈنٹ یا پروفیسر ہو اس سے پوچھیے کہ یہ کیا چیزیں ہیں جو قرآن کہہ گیا ہے۔ وَ مِنَ النَّاسِ (35:28) سوشیالوجی کی طرف آؤ۔ عزیزانِ من! دیکھیے سائنس کا کوئی شعبہ ہے جو چھوڑ دیا ہے یہاں؟ صرف انسانوں کی دنیا طرف نہیں وَ الدَّوَآبِّ (35:28) یہ رینگنے والے کیڑے مکوڑے ان کے اوپر تم غور کرو وَ الْاَنْعَامِ (35:28) مویشیوں کو دیکھو مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ (35:28) ان کی کتنی قسمیں ہیں۔ کوئی شعبہ ہے سائنس کی دنیا کا جو ان چار آیتوں میں نہیں آ گیا؟ کہا کہ یہ چیزیں تم نے تو شاید غور نہ کیا ہو ایک ہے جماعت ایسی جو ان پہ غور کرتی ہے اور غور کرنے کے بعد ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کارگاہِ کائنات کی عظمت کو دیکھ کر کپکپی طاری ہو جاتی ہے ان کے اوپر کہ اللہ اکبر!

آنکھ والا تیرے جوبن کا نظارہ دیکھے ورنہ دیدۂ کور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے

اس قدر عظیم الخلقت چیزوں کو بنانے والا خدا اور وہ خدا جو اتنے بڑے قوانین کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔ کہا کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ایک گروہ ہے ایسا۔ کون سا گروہ ہے؟ برادرانِ عزیز! سنیے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ (35:28) کپکپی طاری ہو جاتی ہے اس کے بندوں میں سے ان لوگوں پر اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ (35:28) علما کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ یہ ہے علما کی DEFINITION قرآن کی رو سے۔ وہ کہیں گے جی یہ تو علما ہے ہم تو علمائے کرام ہیں جی۔ ''ٹھیک ہے جی تسی کرام ہو جی گل ٹھیک ہے جی''۔ برادرانِ عزیز! بڑی لرزہ انگیز چیزیں ہیں بڑی فکر انگیز انقلاب آفریں چیزیں ہیں۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ (35:28)۔ غور کرتے ہیں تو اس کی عظمت کو دیکھ کے ان پہ کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ کیا دیکھ کے؟ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (35:28) وہ دیکھتے ہیں کہ ایک تو یہ کہ اس نے اس کائنات کو ان تمام ادوار میں سے گذارا کیسے اس کی حفاظت کی کہ یہ تباہ نہیں ہو گئی۔ اتنے اتنے تباہ کن عناصر موجود ہیں کائنات کے اندر کتنا بڑا وہ حفاظت کرنے والا ہے کہ تباہ نہیں ہوئی یہ کائنات۔ کیوں؟ عَزِيْزٌ (35:28) اس لیے کہ بڑی زبردست گرفت ہے اس کی اس کا قانون ایسا ہے۔ جکڑے ہوئے ہیں اس کے قانون کے شکنجے کے اوپر کائنات ارض و سما تمام کی تمام۔ لیکن یہ تو وہ چیز ہے علما جو ہیں وہ کہتا ہے ان کی سمجھ میں بات آتی ہے وہ جب اس کے اوپر غور و فکر کرتے ہیں تو پھر کانپ اٹھتے ہیں۔ وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ (3:191) یہ ہیں علما قرآن کی رو سے۔ یہ تھی وہ علم کی DEFINITION پہلے اس نے دی تھی سمع اور بصر اور فؤاد یہ

ہیں وہ لوگ جو اس طرح سے علم حاصل کرتے ہیں اور پھر علم کی بنا پر وہ اس مقام پہ پہنچتے ہیں کہ فی الواقعی خدا کے متعلق صحیح اندازہ ان کا ہوتا ہے کہ خدا کیا ہے۔ یہ جو اس قسم کے آپ کے ہاں کے مناظرانہ مسائل کے اندر الجھے ہوئے ہوتے ہیں' اقبالؒ کے الفاظ میں یہ الٰہیات کے تر شے ہوئے لات و منات' ان میں جو الجھے ہوئے ہوتے ہیں' ان کو ان چیزوں کا کیا پتہ کہ یہ کیا چیزیں ہیں۔ان کے متعلق قرآن کہتا ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (6:91) انہوں نے خدا کی قدر ہی نہیں پہچانی کہ وہ ہے کیا۔ یہ پہچانتے ہیں اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (35:28) یہ ہیں وہ جو اسے پہچانتے ہیں۔ ایک اور آیت سامنے آئی اسی ضمن میں جو آج کل بڑی اہمیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ پہلے بھی آ چکی پھر اسے دہرا دوں۔ آیت کو دیکھیے چھٹی صدی عیسوی کو سامنے رکھیے اس کے بعد اپنے ہاں کی تفاسیر کو بھی اپنے سامنے رکھیے: [1] یہ زمین ایک چپٹی سی بیل کے سینگوں پہ' بیل مچھلی پہ' مچھلی پھر پانی پہ' اوپر آسمان شیشے کے ڈلے شیشے کے ڈلے کے اندر یہ ٹمٹماتے ہوئے جواہرات جڑے ہوئے سات آسمان کے معنی یہ ڈلے جو ہیں اتنے اتنے موٹے کہ اس میں سے گذرو تو پانچ سو سال کی مسافت۔ پھر ایک آسمان سے درمیان میں خلا دوسرے تک پہنچنے کے لیے پھر پانچ سو سال پھر اس قسم کا ڈلا پھر اس میں سے گذرو پھر پانچ سو سال۔ چلتے گئے' چلتے گئے' چلا چل مسافر کبوتر کی چال' چلا گیا اوپر پہنچ گیا آخری ساتواں آسمان آ گیا اس کے اوپر پھر ایک سمندر۔ یہ تفسیری روایت نہیں اسے یہ لوگ حدیث شریف کہہ کے منسوب کرتے ہیں اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے اوپر جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ تو علم کی بلندیوں کی انتہا کے اوپر پہنچا ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس کے اوپر ایک سمندر' سمندر اتنا گہرا کہ اس میں سات پہاڑی بکرے' وہ سمندر کا پانی پانچ سو میل کی مسافت کا لیکن پہاڑی بکروں کے وہ گھٹنوں تک آتا ہے۔ ''کہیا اوہناں نوں بکرے ای کہیا جے کتھے اونٹ ہوندے تے خورے کی ہوندا اوہدے بعد' جے بکرا ایہو جیا اے''۔ گھٹنوں تک پانی صرف آیا ہوا تھا ان سات بکروں کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ہے۔ عرش کے اوپر اللہ بیٹھا ہوا ہے سبحان اللہ صاحب' سبحان اللہ صاحب کیا فرمایا ہے مولوی صاحب نے۔

اجرامِ فلکی میں ہمارے اس سورج کے نظام کی ماہیت پوری کائنات کے صحرا میں ایک ذرّے کی مانند ہے

عزیزانِ من! اس مقام پہ آج ہیں ہم۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اب انہیں کیا بتایا جائے قرآن چھٹی صدی عیسوی میں کیا کہہ گیا۔ وہ کہہ گیا کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (42:29) اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے یہ ارض تمہاری اور یہ جو اجرامِ فلکی تمہیں نظر آ رہے ہیں۔ فضا کی پہنائیوں میں بکھرے ہوئے' یہ سارے SPACE کے اندر اتنے اتنے بڑے جو اجرام

آ رہے ہیں یہ سارے۔ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ط (42:29) اس زمین میں بھی اور ان میں سے بھی ایسے جن کے اندر جاندار مخلوق بستی ہے۔ آج اس چیز پہ یہ پہنچے ہیں علم الافلاک والے کہ امکان ہے کہ جو ہمیں یہ اجرامِ فلکی یا کرے باہر نظر آ رہے ہیں ان کے اندر بھی زندگی کے آثار ہیں۔ ہوسکتا ہے ان میں زندگی ملے۔ تلاش کیے چلے جارہے ہیں۔ اور یہ اجرامِ فلکی یہ پانچ سات ہی تو ہیں نہیں جو ہمارے نظام کے ہیں۔ یہ سورج اور اس کا یہ نظام وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات کے اندر اس سورج اور اس کے پورے نظام کی کیفیت یہ ہے جیسے ریت کے بہت بڑے صحرا میں ایک ذرہ ہو۔ ابھی تو سماوات کے امکانات کے پوچھیے نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دآبہ زندہ مخلوق' اعجاز ہے قرآن کا مخلوق کا تعین نہیں کیا کہ کس شکل کی' زندہ مخلوق فِيهِمَا (42:29) ان دونوں کے اندر ہے۔ ارض میں بھی ہے اور یہ جو اوپر ہیں' ان میں بھی تمہیں نظر آئیں گے۔ ضروری نہیں کہ ہر ایک کے اندر اس میں ہو۔ ارض میں خود ارض میں وہ خطے ایسے ہیں صحراؤں کے کہ جن کے اندر زندگی نہیں ملتی۔ لیکن ان میں وہ بھی ہیں جن کے اندر زندگی ہے۔

فضائی کرّوں میں بسنے والی مخلوق کو آپس میں ملا دیا جائے گا

اگلی چیز جس کے متعلق چھٹی صدی عیسوی میں یہ کہا جا رہا ہے کہ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (42:29) اور وہ اس پہ بھی قادر ہے کہ جب اس کی مشیت کا تقاضا ہو تو ان آبادیوں کو آپس میں ملا دے۔ آہاہا۔ زمین کے اوپر رہنے والا انسان چاند کے اوپر جاکے اور ان دونوں کو ملا دے گا اس طرح سے کہ وہاں ان کے دل کی دھڑکن یہاں ریکارڈ ہوتی ہے زمین کے ان کے ہاں کے ریکارڈ روم میں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جب نیچے بتاتے تھے کہ وہ سو رہا ہے اوپر والا یا جاگ رہا ہے تو یہ کیسے بتاتے تھے؟ وہ حضرت صاحب آنکھ بند کر کے تو بتاتے نہیں تھے' یہ تو آنکھیں کھول کے بتاتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے یہاں سے وہاں تک کوئی سلسلہ نظر آنے والا نہیں ہے چاند سے یہاں تک سلسلہ کیا ہو۔ بتاتے کس طرح سے تھے؟ ان کے ہارٹ کی دل کی جو BEATING ہے نا وہ ریکارڈ ہوتی چلی جاتی تھی خود بخود اور یہ ان کے ہاں کا یہ اصول ہے کہ جاگنے والے کی اور سونے والے کی BEATING میں فرق ہوتا ہے۔ جہاں ان کے اندر وہ فرق آتا' وہ کہتے تھے سو گیا۔ یہ جب آخری اپالو کو حادثہ ہوا ہے' اس حادثے میں ایک تو تھا وہ جاگنے والا جو انجن کے اوپر تھا' دو سونے والے تھے۔ یہ اتنا بڑا حادثہ رونما ہوا۔ اس نے جب آواز دی تو انہوں نے یہ کہا وہ دو سو رہے تھے نا اسے نہیں کہا کہ ان کو جگا دو کہ اس کی توجہ دوسری طرف ہو جائے گی۔ اتنا نازک مرحلہ آ گیا تھا کہ ان کی توجہ کو یہ نیچے والے دوسری طرف منتقل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ یہ زمین کے کنٹرول والوں نے ان کو جگایا۔ ''اٹھے سویر نوں کا کائیں جاگدا سکول جان واسطے' سارا ٹبر اوہدے دوالے ہویا ہوندا اے' پیؤ تھپڑ ماردا اے' ماں دہی دیندی ہیگی اے' بھین

اوہدی اکھیاں دھون ڈئی ہیگی اے' اوہدے بعد تھک تھکا کے اچھا او جان دیوسَون دیؤتاں کی ہوگیا اک دن نہ سکولے گیا تے''۔

وَّهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (42:29) قدیر: قادر نہیں قدیر' مسلسل چیز ہے یہ اس کی' ایک ہی دفعہ کی بات یہ نہیں ہوگی یہ ایک سلسلہ ہے۔ جب اس کی مشیت کے اندر قانونِ فطرت کے اندر کا تقاضا جب یہ ہوگا وہ اس پہ بھی قادر ہے کہ وہ ان کو جمع کردے' اکٹھا کردے۔کون ہیں یہ سمجھ سکتے ہیں؟ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (35:28) تم کیا سمجھتے ہو جاؤ' ان سے پوچھو جنہوں نے علم حاصل کیا ہے وہ تمہیں بتائیں گے اس کے بعد وہ کہیں گے کہ سُبْحٰنَكَ (3:191) تو بڑا عظیم ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ۔

دین اور دنیا میں ثنویت پیدا کرنے والوں کا حال اور قرآنِ حکیم کا ارشاد

یہ کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے کائنات کا علم ہے یہ تو یہ حاصل کر سکتے ہیں' اصل میں جو دین کا علم ہے' وہ ہماری اجارہ داری ہے۔ دین کے علم میں بنیادی طور پہ تو قرآن آتا ہے۔

غور وفکر کرنے والوں پر خارجی کائنات میں پوشیدہ حقائق بتدریج خود واضح ہوتے چلے جائیں گے

قرآن کے متعلق سنیئے کہ اس نے کیا کہا کہ یہ کیسے سمجھ میں آئے گا؟ ''پادتا وخت' کوئی اک مصیبت ہووے تے آدمی ٹالے وی جی''۔قرآن کیسے سمجھ میں آسکتا ہے؟ کہا سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (41:53) ہم آہستہ آہستہ بتدریج اپنی نشانیاں تمہیں خود تمہارے اپنی دنیا کے اندر' یہ خارجی دنیا کے اندر دکھاتے چلے جائیں گے' دکھاتے چلے جائیں گے۔ یہ جو ان نشانیوں کو دیکھنے والے ہوں گے وہ کس نتیجے پہ پہنچیں گے حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (41:53) تا آنکہ یہ حقیقت ان کے سامنے واضح ہو جائے گی کہ قرآن واقعی حقیقت ہے۔قرآن سمجھنے کا طریقہ: انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیوں کو غور سے دیکھو اس سے تمہیں یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ قرآن حق ہے۔اور اس کی دلیل کیسی خوبصورت دلیل ہے؟ کہا یہ چیز کہ قرآن میں انفس و آفاق کے اندر پھیلی ہوئی چیزیں ان کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو کہ جب تم سمجھو گے تو يَتَبَيَّنَ لَهُمْ (41:53) یہ بات کھل کے سامنے آجائے گی کہ واقعی یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ REALITIES (حقائق) اگر تم FACTS دیکھنا چاہو تو قرآن کو سمجھو وہاں سے بات سمجھ میں آئے گی۔کہا ذہن میں تمہارے خیال پیدا ہوگا کہ صاحب! قرآن میں یہ چیز؟ کہا جی ہاں قرآن میں یہ چیز' کیوں بھونچکے رہ رہے ہو اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ (41:53) کیا تمہارا رب جس کی کیفیت یہ ہے کہ

اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (41:53) کہ جو ہر شے کے اوپر پوری پوری نگرانی کر رہا ہے کیا اس کے لیے یہ بات کفایت نہیں کرتی کہ ہر شے کے متعلق جو کچھ کہے حق کہے' غلط نہ کہے۔ کوئی شے اس سے غائب نے' پوشیدہ نہیں' مشہود ہے۔ شہید آپ دیکھیے کیا کہا ہے؟ حالانکہ وہ عالم الغیب بھی ہے لیکن وہ کہا ہے کہ اس کی تو یوں کہو جیسے آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہے۔ جو آنکھوں دیکھی بات کہے کیا وہ بھی اصل اور حقیقت نہیں کہہ سکے گا تو اور پھر کون کہہ سکے گا۔ قرآن میں جو درج ہے اس کے حقیقت ہونے کی دلیل یہ کہ یہ اس خدا نے کہا ہے جو خدا اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

رموزِ فطرت کے سلسلہ میں کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اُن تک پہنچنے کے لیے سائنسی علوم کے کردار کے سلسلہ میں ایک قابلِ قدر کتاب کا تعارف

قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ کہ آفاق اور انفس کے اندر جو آیاتِ خداوندی جتنی جتنی کھلتی چلی جائیں' غور کرتے چلے جاؤ' قرآن اتنا ہی زیادہ سمجھ میں آتا چلا جائے گا۔ یہ دیکھ رہے ہیں آپ یہ انفس و آفاق کی آیات کھل کیسے رہی ہیں؟ سائنس کی تاریخ کو پڑھو۔ اتنی اتنی موٹی چار والیم پر ایک کتاب ہے۔ آپ کہتے ہوں گے کہ وہ سائنس کے متعلق اس میں بڑی تفصیلات ہوں گی' کتاب اتنی موٹی جو ہوگئی۔ جی نہیں! کتاب کا نام ہے INTRODUCTION TO THE STUDY OF SCIENCE سائنس کا مطالعہ کرنے کے لیے تمہید۔ یہ ہے یہ علوم جس طرف آپ کہتے ہیں۔ وہ علوم کے اندر اس نے ہسٹری کیسے دی ہے' بڑی عجیب کتاب ہے وہ۔ دنیا کے ہر شعبۂ علم کے متعلق پہلے دور کے انسان سے لے کے اس وقت تک جو DISCOVERIES ہوئی ہیں اس کے متعلق وہ عنوانات دیتا چلا جاتا ہے' عنوانات دینے میں چار والیم بن گئی ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟ GRADUALLY آہستہ آہستہ یہ رموزِ فطرت پر پڑے ہوئے پردے تھے' وہ لپٹی ہوئی فطرت کے حقائق اس کائنات کے اندر تیر رہے تھے' علمِ انسانی آہستہ آہستہ اونچا ہوتا چلا گیا جس تک اس کی رسائی ہوئی اس نے اس کا پردہ اٹھایا۔ حقیقت مسکراتی ہوئی سامنے آئی قرآن کا ایک دعویٰ اس کی شہادت مل گئی۔ پھر آگے بڑھا علمِ انسانی پھر اور آگے بڑھا۔ کھولتا چلا گیا' کھولتا چلا گیا۔ سائنس کی دنیا نے کہا نئی DISCOVERIES ہوئیں قرآن سے میری حقیقت کے لیے ایک اور دلیل مل گئی۔ اور ابھی تو نیوٹن کے الفاظ میں علم کے سمندر کے کنارے وہ کہتا ہے ہم تو یہ کوڑیاں چن رہے ہیں۔ نیوٹن جیسا عالم یہ کہتا ہے یہ بحرِ ناپیدا کنار۔ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (41:53)۔ میں جانتا ہوں آپ احباب کے بھی دل میں اور جہاں بھی یہ باتیں کی جائیں گی' ان کے دلوں میں کیا خیال پیدا ہوں گے؟ خیال یہ پیدا ہوں گے کہ صاحب! بتایا یہ کہ

SCIENTIFIC DISCOVERIES کرنے والے کائنات کے علوم کی تحصیل کرنے والے' مشاہدہ کرنے والے' مطالعہ تجربہ کرنے والے قرآن کہتا ہے' مومن بھی ہیں متقی بھی ہیں' یقین کرنے والے بھی ہیں۔ تو پھر یہ تو آپ کہیے کہ یہ تو سارا کچھ وہ کر رہے ہیں وہ خدا کو ہی نہیں مان رہے آپ ان کو یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے یہ بات نہیں ہے بات ابھی آدھی تمہارے سامنے آئی ہے۔ آدھی بات اور ہے ابھی اور وہ یہ کہ ایک تو کائنات یہ ہے تمہارے سامنے کھلی ہوئی' یہ اس کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ اس کائنات کے اندر انسان بستا ہے۔ انسانوں کے باہمی معاملات ہوتے ہیں۔ یہ حیوانوں درختوں پتھروں ستاروں کی دنیا نہیں ہے' جیتے جاگتے انسانوں کی دنیا ہے جس میں سے ہر انسان کے سینے کے اندر ایک دھڑکتا ہوا قلب ہے' اپنے اپنے جذبات رکھتا ہے' اپنے اپنے مفاد رکھتا ہے۔ اور اس قدر مختلف مفادات اور جذبات کے مالک انسان ایک جگہ رہتے ہیں' ٹکراؤ ہوگا ان کے اندر۔ یہ ٹکراؤ ایسا نہیں ہے کہ جو تم لیبارٹریز میں ان کا حل دریافت کرسکو۔ اس کے لیے آپ کو مستقل اقدار چاہئیں VALUES چاہئیں جن کے مطابق تم زندگی بسر کرو تو یہ ٹکراؤ نہ ہو تمہارا۔ یہ VALUES اور اقدار جو ہیں یہ نباتات وحیوانات اور افلاک اور پتھروں کی دنیا سے نہیں مل سکتی SCIENTIFIC DISCOVERY کے بس کی بات نہیں کیوں کہ یہ اقدار کائنات میں پھیلی ہوئی نہیں ہے۔ یہ جو چیز ہے یہ آپ کو وحی کے ذریعے ملے گی۔ لہٰذا آدھا حصہ جو ہے اس پہ ہی اکتفا کر کے مومن اور متقی نہ کہو۔ پہلا حصہ جو ہے یہ تو نہایت ضروری ہوا۔

دنیا میں وہی نظامِ حیات قائم رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو

عزیزم! جیسے ایمان لانے کے لیے' مسلمان ہونے کے لیے' پہلے جیتا جاگتا انسان ہونا ضروری ہے۔ اور یہ جیتا جاگتا انسان تو خالص مادی چیز ہے یہ تو بالکل MATERIAL, PHYSICAL شے ہے نا لیکن اس کا ہونا تو ضروری ہے۔ یعنی اگر یہ ہو ہی نا یا مر گیا ہو تو ایمان کے معنی کیا ہیں۔ اسی طرح سے جسے قرآن نے جن کو مومن متقی کہا ہے پہلے ان کے لیے ضروری ہے کہ اس کائنات کا یہ علم انہیں معلوم ہو۔ اور اس کے بعد اسے آپ کہیے فطرت کی قوتوں کا حصول۔ باہر کی دنیا کے متعلق جو علم بھی حاصل ہوتا ہے اس علم سے انسان کو ایک نئی قوت ملتی ہے FORCES OF NATURE جسے آپ کہتے ہیں۔ کہتا ہے قوتیں تو اس سے حاصل ہوں گی ان قوتوں کو خرچ کیسے کیا جائے گا' استعمال کیسے کیا جائے گا۔ اس کے لیے وحی کی راہنمائی کی ضرورت ہوگی۔ ان دونوں چیزوں کو جو اکٹھا کرے گا' اسے مومن کہا جائے گا۔ اس نے کہا کہ یہ جو تم آج کی دنیا میں دیکھ رہے ہو کہ بڑی بڑی ترقیاں ہوئی ہیں کچھ نئی بات نہیں' انسانی علم EVOLUTION کے طریقے سے ترقی کرتا چلا آ رہا ہے۔ پہلے بھی اقوام ایسی ہوئی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دور میں باقی اقوام کے مقابل میں بہر حال زیادہ ترقی کی ہوئی تھی' ان کے پاس مادی قوتیں زیادہ

تھیں۔قرآن ان اقوامِ سابقہ کو بالکل بدھو نہیں قرار دیتا۔اور آج جو نئی تحقیق ہو رہی ہے اور وہ تحقیق ہو رہی ہے آرکیالوجی کے ڈیپارٹمنٹس میں۔

قدیم آثاروں کی کھدائی کا عمل اپنے اندر سبق آموز داستانوں کی عکاسی کرتا ہے

اور میں آگے آؤں گا تو آپ کو بتاؤں گا قرآنِ کریم نے یہ ARCHAEOLOGICAL DEPARTMENT یا اس کی جو DISCOVERIES ہیں ان کے اوپر کتنا زور دیا ہے۔آج ایک نئی DISCOVERIES ہو رہی ہیں پرانی ہسٹری کے متعلق آرکیالوجی سے۔یہ پرانی پرانی چیزیں کھود کے اس میں سے جو نکالتے ہیں' ہمیں تو اتنا ہی پتہ ہے نا کہ وہ ٹیکسلا میں جا یے اور ان کے شوروم میں دیکھیے ''تے اوہدے اچ لکھو گھوڑے رکھے ہوئے ہوندے ہیگے نیں' اسی او ہوای ویکھ کے ترے اونے آں''۔علما جو ہیں وہ جو لکھو گھوڑے ہیں یا وہاں سے جو چیزیں نکلتی ہیں ان سے ہسٹری مرتب کر رہے ہیں۔وہ ہسٹری جو مرتب ہو رہی ہے' بتا رہی ہے کہ پہلی قومیں بھی ایسی تھی ان کے اندر ایسی اقوام گذری ہیں کہ جنہوں نے سمع اور بصر سے علم حاصل کیا تھا۔لیکن انہوں نے بھی خدا کی عطا کردہ راہنمائی جو تھی' اس سے انہوں نے آنکھیں بند کیں تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ وَلَقَدۡ مَكَّنّٰهُمۡ فِيۡمَاۤ اِنۡ مَّكَّنّٰكُمۡ فِيۡهِ (46:26) وہ قومیں ایسی تھیں کہ بعض امور میں انہیں اتنا زیادہ تمکن حاصل تھا' کنٹرول حاصل تھا' اقتدار حاصل تھا کہ ان امور میں تمہیں بھی ابھی اتنا اقتدار حاصل نہیں ہوا۔یہ مخاطب تھے اس دور کے عرب۔اس اقتدار اور تمکن میں وہ تم سے بھی بڑھی ہوئی قومیں تھیں۔اچھا پھر؟ وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ سَمۡعًا وَّاَبۡصَارًا وَّاَفۡـِٕدَةً (46:26) وہ ان حواس سے SENSES سے کام لیتے تھے۔سماعت سے' بصارت سے' مائنڈ سے' INTELLECT سے ان چیزوں سے کام لیتے تھے یہ ساری چیزیں انہیں حاصل تھیں۔تو اس کے بعد تو آپ فوراً کہہ دیں گے کہ اچھا اچھا مومن تھے' متقی تھے؟ کہتا ہے نہیں۔یہ ساری چیزیں انہیں حاصل تھیں فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُهُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ (46:26) یہ ساری جتنی SCIENTIFIC DISCOVERIES اور ان کے بنا پہ معلومات اور فطرت کی قوتیں جتنی حاصل کی ہوئی تھیں اِذۡ كَانُوۡا يَجۡحَدُوۡنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (46:26) جب انہوں نے خدا کے ان قوانین سے' جن کا نام ہم نے مستقل اقدار رکھا ہے' ان سے انکار کرنا شروع کیا تو اس کے بعد وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (46:26) تو جو ان سے کہا جاتا تھا کہ فطرت کی قوتوں کے غلط استعمال سے تمہارے ہاں اس قدر فساد برپا ہوگا تو یہ جن بوتل سے نکلا ہوا' بوتل میں پھر تم اس کو داخل نہیں کر سکو گے۔تباہی آ جائے گی' مذاق اڑاتے تھے۔کیا باتیں کرتے ہو تم پرانے زمانے کی صاحب! تباہی کیسے آ جائے گی اتنی اتنی بڑی قوتیں ہمارے پاس ہیں' تباہی

کیسے آ جائے گی۔ کہا کہ جب انہوں نے خدا کے ان قوانین سے انکار کیا جو انسانوں کے باہمی معاملات کے لیے ہم نے بطور راہنمائی کے دیے تھے‘ ان سے جب انکار کیا تو جن چیزوں کا وہ مذاق کیا کرتے تھے ان چیزوں نے انہیں گھیر لیا فَمَآ اَغۡنٰی عَنۡھُمۡ سَمۡعُھُمۡ وَلَآ اَبۡصَارُھُمۡ وَلَآ اَفۡـِٕدَتُھُمۡ (46:26) اور پھر یہ SCIENTIFIC KNOWLEDGE جو تھا ان کو اس تباہی سے بچا نہ سکا۔

فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے والی مغربی اقوام کا اقدارِ خداوندی سے لاتعلقی کا نتیجہ! عالم گیر سطح پر جہنم

دیکھا آپ نے قرآن کہاں لے جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت آج ہمارے ہاں ہوگئی ہے۔ اقوامِ مغرب فطرت کی قوتوں کی تحصیل میں ان بلندیوں پر پہنچ رہی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ان شعبوں میں جو کچھ انہوں نے حاصل کیا ہے‘ اس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن اس کے ساتھ وحی کی راہنمائی جس بری طرح انہوں نے اس سے اعراض برتا ہے‘ پہلو تہی کی ہے‘ پسِ پشت ڈالا ہے‘ اس کی بھی شاید ہی کہیں مثال ملے۔ پہلے یہ چیزیں انفرادی ہوتی تھیں‘ ان کے ہاں یہ فلسفۂ زندگی بن گیا ہوا ہے۔ دونوں چیزیں ہیں۔ اس کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں‘ ہر نئی DISCOVERY جو ہوتی ہے‘ انسانیت کو چاہیے کہ اس کے اوپر چراغاں کرے۔ چاند پہ پہنچے حیرت کے مارے لوگوں نے اس کے اوپر یقیناً چراغاں کیا‘ خوشیاں منائیں۔ آپ کو معلوم دوسرے ہی دن پھر کیا چیزیں آنی شروع ہوئیں؟ کہ صاحب! اب تو اس زمین پہ ہم بچ جاتے ہیں امریکہ کوئی گولا چلائے گا روس کی طرف‘ وہاں آ جائے گا وہاں سے ان کی طرف چلے گا اور اگر انہوں نے چاند پر جا کے اپنا محاذ قائم کیا اور وہاں سے انہوں نے تباہی کے گولے برسائے تو وہ تو ایک دن میں ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔ دوسرے دن یہ فکر عام ہوگئی‘ انسانیت کانپنے لگ گئی۔ ساری دنیا ایک جہنم کے اندر مبتلا ہے۔ ہمارا تو چھوڑیے ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ ہم کس مقام پہ ہیں۔ یہ جو برابر کی قوتیں ان کے ہاں کی ہیں‘ جو بلاکس بنے ہوئے ہیں‘ ریس چل رہی ہے اس وقت اٹامک انرجی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ۔ چلے جا رہے ہیں اندھا دھند اور سب کی کیفیت یہ ہے کہ رو رہے ہیں‘ ڈر رہے ہیں‘ کانپ رہے ہیں خوف سے۔ عزیزانِ من! کسی کو سکون میسر نہیں ہے کسی کو اطمینان میسر نہیں ہے۔ کس شعبے میں؟ انسانوں کے باہمی معاملات کے شعبے میں‘ اقوام کے باہمی معاملات کے شعبے میں یہاں کسی کو اطمینان میسر نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ چاند تک پہنچنے والا بھی۔ میرے الفاظ میں نہ سنیے اس کے الفاظ میں سنیے جسے بات کہنے کا سلیقہ آتا تھا۔ اس نے کہا کیفیت آج یہ ہوگئی ہے مغرب کے ان سائنٹسٹ کی‘ اقوامِ مغرب کی کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

قندیلِ آسمانی کے بغیر عقلِ انسانی کو صراطِ مستقیم تک پہنچنے کے لیے صدیوں کا وقت درکار ہوتا ہے

عزیزانِ من! زندگی کی شبِ تاریک اسی مشعل کی نورانی کرنوں سے سحر ہوا کرتی ہے جو آسمان سے وحی کے ذریعے ملتی ہے۔ انسانی عقل اپنا اپنا مفاد سوچتی ہے۔کوئی عقل دوسرے کا مفادنہیں سوچتی' کبھی نہیں سوچتی۔اس کی عقل دوسرے کی گرہ کاٹنے کی تدبیریں سمجھاتی ہے جس کی جیب خالی ہے'اس کی جیب میں کچھ ڈالنے کے لیے عقل نہیں سمجھاتی۔یہ اس کی ربوبیت سمجھاتی ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اب ہمارے ہاں کیا کیفیت ہے؟ ان کی ان چیزوں کو سامنے لا کر بڑے فخر سے پھر یہ چیز کہتے ہیں دیکھانا ہم نہیں کہتے تھے نہ کرو یہ ایجادیں' تباہی آجائے گی تمہیں برباد ہوجاؤ گے' دیکھا ہوگئے۔یعنی دو دفعہ اگر اپالو کامیاب ہوا ہے تو اس کے متعلق تو یہ کہ صاحب جھوٹ بولتے ہیں' گئے ہی نہیں''راہ اچوں ای مڑ آئے ہیگے نیں۔لے! کسے کھوہ دی بنے اتے روٹی کھان بیٹھے ہیگے سن تے فیر مڑ کے چل آئے ہیگے نیں''۔ان کے متعلق تو شک وشبہ ہے اور تیسرا جب ٹوٹا ہے تو کہا دیکھا صاحب ہم نہیں کہتے تھے' تباہ ہوجاؤ گے' برباد ہوجاؤ گے' غرق ہوجاؤ گے۔روز ہوائی جہاز ہزاروں میل لاکھوں میل کا سفر کر کے اپنی منزلوں پہ پہنچتے ہیں' ان کی زبان سے کبھی کلمہ تحسین کا نہیں نکلتا۔ جوں ہی اخبار آئی کہ فلاں جگہ ٹکرا گیا ہوائی جہاز' دیکھا صاحب! ہم نے کہا تھا نا کہ''گڈیاں اچ تریا کرو''۔اور آپ ان کی کیفیت یہ ہے کہ اب جو وہ چکر شروع ہوا ہے اس وقت جھگڑ کا تو یہ ہوائی جہاز بھی اکتفا نہیں کر رہے ان کے دورے کے لیے۔جی چاہتا ہے اس سے بھی تیز رفتار ہوں دس بجے ڈھاکے میں تقریر ختم ہو' سوا دس بجے لاہور میں پہنچ جائیں۔ان سے کام تو یہ لے رہے ہیں۔

لاوڈ سپیکر کے سلسلہ میں مولانا مفتی محمد شفیع کا فتویٰ نیز قرآنِ حکیم کے ہاں قصۂ آدم کو بیان کرنے کا محاکاتی انداز

وہ لاوڈ سپیکر جب یہ نیا نیا چلا ہے تو آپ کو تو معلوم ہے' طلوعِ اسلام میں آپ نے دیکھا ہوگا' یہی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا فتویٰ تھا کہ حرام ہے۔ آج نماز میں بھی اپنے سامنے لاوڈ سپیکر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ خوش ہوتے ہیں ان چیزوں پہ دیکھ کے۔ عزیزانِ من! خوش ہونے کی بات نہیں ہے بات صرف یہ کہنے کی ہے کہ انہوں نے فطرت کی قوتوں کے اوپر قابو پایا۔ آیے وہی جو قرآن نے تمثیلی انداز میں قصۂ آدم بیان کیا ہے۔ اس نے کہا کہ آدم کا مقام یہ تھا کہ فطرت کی قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئیں۔ لیکن یہ جو عقلِ بے باک اس کے اندر دی گئی تھی' یہ سرکش جذبات جو اپنے ہی مفاد سوچتے ہیں دوسرے کا مفاد نہیں سوچتے' یہ شیطان یہ سجدہ ریز نہ ہوا۔ ابھر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آدم نے اس کی بات مان لی۔ عزیزانِ من! بڑا حسین انداز ہے قرآن کا محاکات کے طریق پہ قرآن باتیں سمجھاتا ہے۔ اس قسم کے جو ABSTRACT TRUTH ہوتے ہیں ان کو سمجھایا ہی تمثیلی انداز میں جاتا ہے۔ فطرت کی قوتوں کو اس نے مسخر کر لیا اپنے اندر کا جو ابلیس تھا' وہ نہ جھکا اس کے سامنے' آدم نے اس کی بات مان لی۔ ابھی آدم کے مقام پہ تھا' مومن نہیں ہوا ہے یہ۔ اس کی بات مان' لی جنت چھن گئی۔ کیا بات ہے قرآن کی؟ جنت چھن گئی' آدم مایوس ہو گیا۔ کیا ہوا یہ؟ دھتکارا ہوا کسی دروازے کا نہ رہا۔ کیا کوئی اور طریق ہے اس سے کہ چھنی ہوئی جنت مل جائے؟ کہا مایوس نہ ہو آدم! اس کا طریقہ ہے اور طریقہ اس کا یہ ہے کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) اس کے لیے ہماری طرف سے آسمان سے وحی آئے گی جو اس وحی کی روشنی میں ان قوتوں کا استعمال کرے گا' اس کے سامنے باہر کے ملائکہ بھی جھکیں گے اندر کا ابلیس بھی۔ یوں جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے اس جنت کو حاصل کر لے گا پہلے اسی دنیا میں اس کے بعد اگلی دنیا کے اندر۔ کس قدر حسین بلیغ انداز میں اس بات کو کہا ہے اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ نے جیسا میں نے کہا ہے کہ جو علمِ انسان کی بلندیوں کے اوپر تھی۔

انسان کے سرکش جذبات (شیطان) کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی حدیث

عزیزانِ من! حضور ﷺ کی حدیثیں جو قرآن کے مطابق ہوتی ہیں چمکتے ہوئے موتیوں کی طرح سامنے آجاتی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کا ایک ابلیس ہوتا ہے۔ SHOCKING تھی یہ بات ''ہر انسان کا''۔ رفقاء نے' صحابہؓ نے

پوچھا کہ کیا آپ ﷺ کا بھی ابلیس ہے ایک؟ بڑا نیچرل تھا QUESTION ۔کہا ہاں ہے میرا بھی ابلیس (اگلی بات ہے سننے کی) کہا لیکن میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا ہے۔ابلیس کو مارا نہیں جاسکتا' بڑی قوت ہے۔جذبات عقل فکر سے عاری انسان پتھر کی دنیا ہے' انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے' آدم نہیں بن سکتا وہ' اس کا رہنا نہایت ضروری ہے بس فرق صرف یہ ہے کہ اگر صرف فطرت کی قوتوں کو ہی مسخر کیا جائے اور اسے اسی طرح چھوڑ دیا جائے تو پھر اس کا نتیجہ تو جنت سے نکلنا' جہنم پیدا کرنا ہے اپنے لیے بھی دوسروں کے لیے بھی۔اور اگر فطرت کی قوتوں کو یوں مسخر کیا اور اس کے بعد اپنے ابلیس کو وحی کے سامنے جھکا دیا۔انہیں اپنے سامنے جھکایا اسے اس کے سامنے جھکایا۔اس کے بعد دیکھیے یہاں بھی جنت کی زندگی' وہاں بھی جنت کی زندگی۔عزیزانِ من! یہ ہے مقامِ مومن۔ ہمارے سامنے دو باتیں تو واضح طور پہ آگئیں ایک تو مقامِ آدم: مقامِ آدم فقط یہ ہے کہ فطرت کی قوتیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہوں۔اس سے فطرت کی قوتوں کے جتنے فائدے ہیں' وہ حاصل ہو جائیں گے۔ایٹم بم بھی بن جائیں گے' تلواریں بھی تمہیں مل جائیں گی' زمین سے رزق بھی بہت سا نکل آئے گا' بڑی بڑی قوتیں آپ کو مل جائیں گی' اس کے فائدے مل جاتے ہیں۔قرآن انہیں مفادِ عاجلہ کہتا ہے' پیش پا افتادہ مفاد' یہ حاصل ہو جائیں گے۔ٹھیک ہے یہ اپنے نتائج رکھتے ہیں فطرت کی قوتوں سے جو فائدے اٹھائے جاتے ہیں' اپنے نتائج رکھتے ہیں۔وہ نتائج تمہیں مل جائیں گے۔پیش پا افتادہ قریبی زندگی تمہاری جو ہے یہ واقعی تمتع کی ہو جائے گی' خوشگواریوں کی ہو جائے گی' سہولتوں کی ہو جائے گی' آسائشوں کی ہو جائے گی۔یہ مل جائے گا تمہیں لیکن مستقبل تاریک ہو جائے گا۔وَمَا لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ(2:200) وہ ہم نے سمجھا آخرت وہاں کے متعلق ہے' یہاں بھی یہ چیز ہے' مستقبل تمہارا تاریک ہو جائے گا۔

کائناتی قوتوں کو تابعِ فرمانِ نظر نہ کرنے کا نتیجہ مستقبل کو تاریک کرنے کے مترادف ہے

ہر اس قوم سے قرآن کہتا ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے' انہیں وحی کے تابع نہیں رکھتی' اسے کہتا یہ ہے کہ ٹھیک ہے تمہاری یہ ابتدائی زندگی چمک دمک کی ہو جائے گی لیکن مستقبل تمہارا روشن نہیں ہوگا' وہ تاریک رہے گا۔انیسویں صدی میں جب SCIENTIFIC DISCOVERIES کی ابتدا ہوئی ہے پوچھو نہیں کہ یورپ کی قومیں جو ہیں کس قدر اپنے ہاں تحسین و آفرین کے پھول ایک دوسرے پہ برساتی تھیں۔وہ کہہ رہی تھیں کہ جنت سے نکلا ہوا آدم کس طرح پھر سے جنت کے اندر چلا گیا۔ فطرت کی قوتوں کو انہوں نے مسخر کیا' اسے تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا قرآن نے یہ کہا ہے۔میں نے کہا یہ لفظ کیسے میرے ذہن میں آیا؟ پہلا شعر بھی تو یہ تھا

عشق نا پید و خرد می گزدش صورتِ مار

ایمان ہے نہیں، تنہا عقل کے زور پہ چل رہا ہے، سانپ کی طرح ڈستی چلی جارہی ہے اس کو۔کرنے کا کام یہ تھا ''عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کرنہ سکا'' اسے قرآن کی وحی کے تابع نہ لایا اس لیے یہ اس کی صورت ہوئی۔ایک کیٹگری ہمارے سامنے یہ آ گئی فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا، وحی کے تابع نہ رکھا اس کی یہ کیفیت۔

عقل کو تابع فرمانِ نظر کرنے والوں کی کیٹگری

دوسری کیٹگری فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا اور اس عقلِ بے باک کو، اس ابلیس کو، مومن مسلمان کیا، وحی کے تابع ان کا استعمال کیا۔یہ مقامِ مومن ہے۔پہلا مقامِ آدم یہ مقامِ مومن۔اور تیسری کیٹگری وہ کہ نہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا اور جب انہیں مسخر ہی نہ کیا تو انہیں وحی کے تابع استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔جس کی یہ کیفیت ہے نہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا، نہ وحی کے تابع لانے کا سوال پیدا ہوا، یہ کون سا گروہ ہے؟ صورت ببیں حالم مپرس۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔الحمدللہ مومن کہنے والے اور ساری دنیا پہ تیوریاں ڈالنے والے کہ کفار کی جماعتیں ہیں جی۔

تیسری کیٹگری کا ذکر وحی کی روشنی کے بغیر سفرِ حیات کو روشن کرنے کی سعیٔ لاحاصل کا ذکر

عزیزانِ من! اُن کے اس کفر نے اس دنیا کے کچھ مفاد تو ان کو دے دیے، آپ کے اس فریب انگیز ایمان نے تو آپ کی یہ دنیا بھی خراب کردی، آخرت بھی خراب کردی۔اس لیے کہ قرآن کہتا ہے کہ وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی(17:72) جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں کا بھی اندھا ہی ہوگا۔یہی تھا وہ مقام جس پہ اقبالؒ نے ایک مصرع میں بات کہی تھی۔خدا پرستو بہ، آدم نہ رسیدی خدا چہ مے جوئی۔مقامِ آدم پہ ہی تو نہیں آیا تو خدا کو کیا تلاش کر رہا ہے۔خدا تک پہنچنے کے لیے تو سیڑھی یہ ہے مقامِ آدم سے خدا تک پہنچنا ہے۔تمہیں بہ آدم نہ رسیدی خدا چہ مے جوئی۔اور اسی لیے یہ ہے وہ قوم اپنے آپ کو جتنا جی چاہے کوئی فریب میں رکھ لے، حقائق کے سامنے تو فریب میں نہیں رکھا جاسکتا۔آپ کے سامنے کتنی کوششیں ہورہی ہیں اس قوم کو اس قعرِ مذلت سے نکالنے کی، مرثیے پڑھے جا رہے ہیں، رونے روئے جا رہے ہیں، تبلیغیں ہورہی ہیں، انجمنیں ہورہی ہیں، کانفرنسیں ہورہی ہیں، مصلح بڑے بڑے آ رہے ہیں، ریفارمر بھی آ رہے ہیں، مامورین من اللہ بھی لے کے آ گئے ہیں، اس قوم کی حالت یہ کہ دن بہ دن نیچے ہی نیچے چلی جارہی ہے۔کیا ہوا ہے یہ؟ مقامِ آدم تک پہلے لانے کے لیے کوئی نہیں ان سے کہتا، اس کے

بعد مقامِ مومن حاصل ہونا ہے۔ اور جو اس طرح سے اس قوم کے لیے کچھ نہیں کرتا' یاد رکھیے اس قوم کو کبھی بھی اس قعرِ مذلت سے وہ نکال نہیں سکتا۔ معلوم ہونا چاہیے اس قوم کو کہ جس قوم کی یہ دنیا ذلیل ہے' ہو نہیں سکتا کہ اس کی عاقبت سنوری ہوئی ہو۔ جو مقامِ آدم کے اوپر پہلے نہیں پہنچتا' وہ مقامِ مومن پہ پہنچ نہیں سکتا۔ یہ دنیا جو ہے اس کے لیے دعا یہ ہے پہلی دعا ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً (2:201) اور پھر دعا ہے وَّ فِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔ اس لیے اسے سمجھ لیجیے اور اس دھوکے سے نکل جایے۔ یہ حقیقت ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰی فَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰی (17:72) یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا ہوگا۔ اور اسی کو اقبالؒ نے کہا ہے کہ

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

خدا کا قانون انسانوں کی دعاؤں کو عمل کے ترازو میں تولتا ہے

جس کا آج درخشندہ نہیں ہے' اس کا کل بھی تاریک ہوگا۔ یہ ہے جو قرآن ہمیں سمجھاتا ہے۔ اور یہ تھی وہ چیز کہ اس آیت کے آخر میں یہ جو چیز کہی گئی کہ جن سے کہا گیا' جنہوں نے کہا کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے کہیں ہم جہنم کے اندر نہ چلے جائیں ان سے کہا تم نہیں جا سکتے اس لیے کہ تمہاری تو روش یہ تھی کہ تم نے تو کہا تھا رَبَّنَآ (3:193) فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا ہے' اختلافِ لیل و نہار کے تفکر وغیرہ کی آیتوں کے ساتھ ہی آیت ہے اگلی آیت ہے یہ کہ اس کے بعد تم نے تو یہ کہا تھا رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ (3:193) ہم نے سنا ایک منادی دینے والا تھا تیرا رسول خاتم النبین ﷺ' وہ پکارتا جاتا تھا او آؤ لوگو خدا کی ان صداقتوں پہ ایمان لاؤ۔ اے لیل و نہار کے اختلاف میں' اے ارض و سما کی تخلیق کے اندر غور و فکر کرنے والو! اے ان قوتوں کو مسخر کرنے والو۔ کیا انداز کہنے کا ہے؟ ایک منادی کرنے والا منادی کر رہا تھا' پکار رہا تھا' چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا او انسانو! آؤ یہ کچھ تم نے کر لیا' آؤ وحی کی صداقت کے اوپر بھی ایمان لاؤ۔ تم نے یہ کہا کہ ہم نے اس منادی کرنے والے کی آواز کو سنا فَاٰمَنَّا (3:193) ہم نے اس کی بات مان لی۔ یہ ہے مومن۔ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ کَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا (3:193) تمہاری آرزوئیں یہی تھیں کہ یہ جتنی چیزیں اس سے پیشتر اس قسم کی ہو گذری ہیں جن سے تباہیاں آیا کرتی ہیں' ان سے حفاظت کا سامان بہم

پہنچادے، جتنی ناہمواریاں اور جتنی برائیاں ہوچکی ہوئی ہیں، ان کا ازالہ کردے۔ اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد انجام ہمارا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ (3:193) ان جیسا انجام ہمارا کر جن کو زندگی کی کشاد نصیب ہوئی تھی۔ ابرار کا لفظ یہاں دیکھیے بِرّ سے ہے، کشاد نصیب ہوئی تھی، وسعتِ کائنات کے اندر وہ پہنائیوں میں پھر رہے تھے۔ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ (3:194) ہاں ہمارے نشو ونما دینے والے ہم نے یہ کچھ کیا ہے، تیرا وعدہ ہے اس لیے، جو کچھ تو نے وعدہ کیا تھا اپنے رسولوں کی وساطت سے، ہمیں دے۔ یہ کیا وعدہ تھا؟ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (24:55) ہم نے وعدہ کیا تھا کہ جو ایمان لائے گا اور اعمالِ صالح ان کے ہوں گے، ہم اس زمین میں ان کو استخلاف تمکن فی الارض حکومت مملکت عطا کردیں گے جیسا کہ تاریخ میں پہلی قوموں کو ہم نے یہ کچھ عطا کیا۔ اے ہمارے نشو ونما دینے والے ہمیں وہ کچھ دے دے جس کا وعدہ تو نے اپنے رسولوں کی وساطت سے کیا تھا۔ وَ لَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ (3:194) پہلے یہ کہا تھا کہ جو یہ SCIENTIFIC OUT LOOK نہیں رکھتا وہ اس دنیا میں ذلیل ہوتا ہے۔ کہا کہ جب مکافاتِ عمل کا وقت آئے اعمال کے نتائج سامنے آئیں تو ہمیں اس وقت پھر ذلیل نہ کر۔ تو نے وعدہ کیا تھا کہ ایمان واعمالِ صالح کا نتیجہ اس زندگی میں تمکن ہوتا ہے، اپنا وعدہ پورا کر اس لیے کہ اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ (3:194) تو تو اپنے وعدے پورے کیا کرتا ہے، بڑا سچا ہے وعدوں کا۔ خدا کا وعدہ اور اس کی سچائی کیا ہے؟ اسی کو قانونِ خداوندی کہتے ہیں۔ انہوں نے دعائیں کیں جواب کیا ملا؟ فَاسۡتَجَابَ لَھُمۡ (3:195) وقت ہوگیا ہے اسے آئندہ پہ ہم اٹھا رکھتے ہیں۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت یوں کہیے 194 تک ہم پہنچے موضوع تو ہمارا جو تھا وہ آپ کے سامنے تھا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

چونتیسواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیت 195)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا کا بصیرت افروز' قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! آج مئی 1970 کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی 195 آیت سے ہوتا ہے:(3:195)۔

گزشتہ سے پیوستہ موضوع

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں بات یوں چلی آ رہی تھی کہ صحیح مومن وہ ہیں جو اس کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں' ایک ایک چیز کا تجزیہ کرتے ہیں' تحقیق کرتے ہیں اور اس کے بعد اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ رَبَّـنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تُو نے اس کائنات میں کوئی شے نہ تو بیکار پیدا کی ہے' نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لیے پیدا کی ہے۔ اس کے بعد یہ چیز ہے جسے ہم دعا کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اس طرح ان کے لب پہ یہ چیز آ جاتی ہے کہ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اسی طرح فطرت کی قوتوں کو مسخر کریں' (علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد' اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں) اور یوں دنیا میں تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں' ذلیل اور خوار نہ ہوں۔

اب اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان قوتوں کو مسخر کر کے ہم انہیں تیرے بتائے ہوئے قوانین و اقدار کے مطابق

صرف کریں اوراس طرح ہماری سعی وعمل کی کھیتیاں جھلسنے سے بچ جائیں۔اوراس کے بعد یہ طریقہ بتایا ہے کہ جو کچھ تُو نے ہم سے اپنے رسولوں کی معرفت وعدے کیے ہیں انہیں پورا فرما۔عزیزانِ من! وہ وعدے یہ ہیں کہ ایمان واعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ' اس دنیا میں استخلاف فی الارض ہے۔ یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ ایمان اوراعمالِ صالحہ سے اس دنیا کی حکومت' تمکن اور مملکت عطا ہوگی۔ کہا ہے کہ یہ چیزیں ہمیں عطا فرمائی جائیں۔

یہ چیزیں' یہ باتیں وہ ہیں جنہیں ہم اپنی عام اصطلاح میں دعا کہتے ہیں اور یہ دعاؤں کی شکل میں ان کے لب پر آ گئیں۔اس کے بعد یہ ہے کہ فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ (3:195)۔عام معنی کے اعتبار سے یہ ہے کہ ''ان کے رب نے ان کی دعائیں قبول کرلیں''۔لہٰذا آج کے درس کا موضوع نہایت ہی اہم ہے کہ دعا کسے کہتے ہیں؟ قبولیّتِ دعا کے معنی کیا ہیں؟ اگرچہ یہ چیز اس سے پہلے بھی ہمارے سامنے آچکی ہے لیکن اس دفعہ کے درسِ نو میں تو ہمارا انتظام یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی قرآنِ کریم میں وہ موضوع آئے' میں اس موضوع کو پھر اصرار وتکرار کے ساتھ اسی طرح سے دہراتا چلا جاؤں۔درحقیقت ''درس'' کے تو معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے مفہوم کو مختلف انداز میں بار بار گاہتے چلے جانا' گاہتے چلے جانا' تآنکہ چھلکوں میں سے دانے الگ ہوکر سامنے آجائیں۔اس لیے اس موضوع کو پھر سامنے لایا جائے گا۔اور بات بھی بڑی اہم ہے۔

ہمارے ہاں کا مروّجہ تصور' اس کے مضمرات اور الجھنیں

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو تصور یہی ہے کہ کوئی مشکل آپڑے' کوئی مصیبت آجائے' اس کے لیے خدا سے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کی جائے پھر خدا اس دعا کو قبول کرلیتا ہے' وہ مشکل آسان کردیتا ہے اور وہ مصیبت ٹل جاتی ہے۔ یہ ہے ہمارے ہاں دعا کا تصور۔اب اس تصور کے ماتحت ایک بڑی الجھن پیدا ہوتی ہے جس کا پھر جواب نہیں ملتا۔اسے ایک مثال سے سمجھیے کہ ایک بیوہ ماں کی زندگی کا ایک ہی سہارا اس کا ایک نوجوان بچہ ہے جسے اس نے ایک ایک دن گِن گِن کر' پروان چڑھایا' پرورش کیا اور وہ جوان ہوا' اس کی زندگی کا سہارا بنا۔وہ اچانک بیمار ہوا۔اب یہ ماں اس کے سرہانے بیٹھے' جس خلوص سے دعا کرتی ہے' اس خلوص میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔اس بچے کو اگر شفا ہوجائے تو یہ بھی نہیں ہے کہ اس سے کسی دوسرے کا حق مارا گیا ہے۔میں ابھی عرض کروں گا کہ دوسرے کے حق مارے جانے والی دعا کیا ہوتی ہے۔اِس دعا میں یہ بھی صورت نہیں ہے۔اس کی ہزار مخلص دعاؤں اور خلوص کے باوجود' آنسو بہہ جانے کے باوجود' صبح کے وقت وہ بچہ دم توڑ جاتا ہے' مرجاتا ہے۔یہاں وہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ اتنے خلوص سے مانگی ہوئی دعا بھی قبول نہیں ہوئی تو اس کا جواب ہمارے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ''

خدا کو منظور ہی ایسا تھا''۔عزیزانِ من! یہ صرف کہہ دینے کے لیے الفاظ ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ میں قرآن کی جو تعلیم پیش کرتا ہوں وہ اس لیے تو نہیں ہے کہ جو کچھ ہم الفاظ استعمال کرتے چلے آرہے ہیں' کرتے چلے جائیں' جو تصورات ذہن میں قائم ہیں' میں انہی کو محکم کرتا چلا جاؤں۔میرا منصب تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم جو کچھ کہتا ہے اسے آپ کے سامنے پیش کروں۔

میں نے کہا ہے کہ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ''خدا کو منظور ہی یہی تھا''۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہونا وہی تھا جو خدا کو منظور ہے تو یہ دعائیں بیچ میں کاہے کے لیے آ گئیں۔اور اگر دعاؤں سے وہ چیز بدل سکتی ہے جو خدا کو منظور تھی تو خدا کی یہ جو پہلی منظوری ہے وہ کس کام آئی۔یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔اور پھر جو میں نے کہا تھا کہ وہ دعائیں بھی ہیں جن سے دوسرے کا نقصان ہوتا ہے (مثلاً) دو فریقوں کے درمیان ہائیکورٹ میں مقدمہ ہوتا ہے۔صبح کو فیصلہ ہونا ہوتا ہے۔مدعی اپنے ہاں دعا کر رہا ہے' مدعا علیہ اپنے ہاں دعائیں کر رہا ہے۔دونوں ایک ہی خدا سے دعا کر رہے ہیں کہ میرے حق میں فیصلہ ہو۔دعا سے بھی ایک فریق آگے بڑھتا ہے۔وہ نیاز کے تصور کے تحت خدا سے کچھ منت مان لیتا ہے کہ میں اتنے کی نیاز دونگا۔دوسرا اس سے سوائے کی نیاز دینا شروع کر دیتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کس کی دعا قبول ہوگی؟ اگر یہ ہے کہ جس فریق نے زیادہ شدت سے' گڑگڑا کر دعا مانگی ہے' زیادہ منت مانگی ہے' اس کی قبول ہوگی تو اس کے معنی ہیں کہ خواہ وہ مقدمہ جھوٹا ہی ہو' کیا اس کے حق میں ہی فیصلہ ہو جائے گا؟ اور اگر یہ ہے کہ نہیں' جو سچا ہے اس مقدمے میں فیصلہ اس کے حق میں ہوگا تو پھر اسے دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے' خدا کو تو علم ہے کہ یہ سچا ہے یا جھوٹا ہے۔کہا تو اس سے جائے جسے علم اس کا نہ ہو۔وہ تو خبیر ہے' وہ تو علیم ہے' وہ تو جانتا ہے' وہ تو دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔اور اس کے بعد صبح ہم دیکھتے یہ ہیں اور عام طور پہ روز یہ ہوتا ہے کہ وہ جو سچا اور حق دار ہے' اس کے خلاف ڈگری ہو جاتی ہے' اس کے خلاف فیصلے ہو جاتے ہیں۔سچا بھی ہے' حق پر بھی ہے' دعائیں بھی مانگیں' پھر بھی اس کے خلاف فیصلہ ہوا۔میں کہہ یہ رہا ہوں کہ سوچنے سے یہ تمام سوالات پیدا ہونگے۔لہٰذا چیز یہ ہے کہ ہم ایک چیز کو تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں اور یہ بھی ہے کہ اسے چھیڑو بھی نہیں کہ صاحب! اسے چھیڑنے سے ایمان خراب ہوتا ہے۔

ایمان عقل وفکر کے بعد لانے کی چیز ہے' یہ کوئی جذباتی چیز نہیں ہے پھر نوجوان طبقہ موردِ الزام کیوں؟

عزیزانِ من! اسے چھیڑنے سے اگر ایمان ایسا ہی کوئی چھوئی موئی سی چیز ہے تو ایسا ایمان ہونے سے تو نہ ہونا اچھا ہے جو ذرا

سے چھیڑنے سے ختم ہو جائے۔ گرنے والے مکانوں کو تو میونسپل کارپوریشن خود آ کر انہیں پہلے گرا دیتی ہے کہ اگر یوں گر گئے تو لوگ نیچے آ جائیں گے۔ ایمان تو وہ ہے ایمانِ مُحکم کہ جتنا جی چاہے اسے چھیڑیئے' وہ پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے۔ ایمان کی پختگی کے معنی یہ ہیں۔ ایمان سوچنے سمجھنے کے بعد' Rationally 'عقل وفکر کے بعد' علم وبصیرت کے بعد لایا جاتا ہے' یہ ایک یقینِ محکم کا نام ہے۔ یہ Faith نہیں ہے' یہ Conviction ہے' ایک یقین ہے جو علم وبصیرت کی بنا پہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ جذباتی چیز نہیں ہے۔ وہ جذباتی اطمینان ہوتا ہے جس کی عمارت ذرا سے کریدنے سے نیچے آ گرتی ہے۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ صاحب! نوجوان طبقہ سرکش ہو گیا' سوشل ازم آ گئی' کمیونزم کا الحاد آ گیا' ایمان خراب ہو گیا۔ یہ کونسا ایمان تھا جو خراب ہو گیا؟ یہ وہی ''ایمان ہے'' جسے چھیڑنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

ایسے دلائل جن کی کوئی بنیاد ہی نہ ہو' ان پر اٹھنے والی عمارت کبھی قائم نہیں رہ سکتی

آپ اسے چھیڑنے کی اجازت نہ دیجئے' اسے کوئی آدمی نہیں چھیڑے گا لیکن یاد رکھیے! جھکڑ آئے گا تو اس میں عمارت گر جائے گی۔ جس کی بنیاد کمزور ہے آپ کب تک اسے اس قسم کی دعاؤں اور تعویذوں کے سہارے محفوظ رکھیں گے۔ یہ گرے گی۔ مُحکم عمارت وہ ہے کہ ہزار جھکڑ آئیں مگر وہ اپنے زورِ دروں کے بل پر قائم رہے۔ اس کی بنیاد مُحکم ہونی چاہیے۔ لہٰذا' عزیزانِ من! جسے آپ خدا پر ایمان کہتے ہیں' وہ اس یقینِ محکم کا نام ہونا چاہیے کہ ہزار جھکڑ اٹھتے چلے جائیں مگر وہ قائم ودائم رہے۔ جھکڑ کیا ہیں؟ یہی آپ کے ہاں کے دلائل ہی تو ہونگے یعنی کوئی فلسفے کے دلائل ہونگے' کوئی منطق سامنے آئے گا' کوئی فطرت کے شواہد آئیں گے' کوئی تجربات کے نتائج سامنے آئیں گے۔ یہ آتے چلے جائیں۔ یہ جتنے آتے چلے جائیں' وہ ایمان محکم سے محکم تر ثابت ہوتا چلا جائے۔ اُسے ایمان کہا جائے گا۔ لہٰذا ابھی آپ نے جو سوچا کہ ہم دعا کے متعلق جو کہہ رہے ہیں' جو ذہنوں میں ایک تصور چلا آ رہا ہے' اس کو ذرا سا بھی اگر آپ پرکھتے ہیں تو عمارت ہل جاتی ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ ٹھیک ہے' اس سے ایک اطمینان و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ اطمینان اور سکون خالی جذباتی چیز ہے۔ یہ تو جو بت کدے میں بت کے سامنے گڑگڑاتا ہے' اسے بھی حاصل ہو جاتا ہے' اسے بھی اطمینان مل جاتا ہے۔ یہ جو قبروں پہ جا کر اپنی مرادیں مانگ کر آ جاتے ہیں' ان کو بھی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ انہیں بھی سکون حاصل ہو رہا ہوتا ہے۔ پتھروں سے' چونے اور مٹی کی عمارتوں سے' پھر اپنے جیسے انسانوں سے جنہیں حضرت جی کہا جاتا ہے' اُن سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

انسان کا جذباتی طور پر اطمینان حاصل کر لینا علم و بصیرت کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا

اطمینان کی چیز تو یہ ہے کہ جہاں بھی جس کا دل کھُب جائے‘ وہ وہاں سے اطمینان لے کر آ جاتا ہے۔ اطمینان وہ چیز ہے۔ یہ خالی جذباتی چیز ہے۔ جب بھی وہ اطمینان علم و بصیرت کی کسوٹی پہ کسا جائے گا تو اُس کی عمارت کھڑ کھڑا کر گر جائے گی۔ اصل اور حقیقی اطمینان وہ اطمینان ہے جو یقین کے سہارے قائم ہو۔ لہٰذا دیکھنے کی یہ چیز ہے۔ ان چیزوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ شکوک ابھرتے ہیں تو ان کو ابھرنے دینا چاہیے کہ پھانس تو ایسی چیز ہے کہ وہ ہوتی اتنی خفیف سی ہے مگر انسان کو ساری رات سونے نہیں دیتی۔ اس کا نکال دینا ضروری ہے۔ اور قرآن کا تو دعویٰ یہ ہے کہ وہ اس قسم کی تمام شکوک و شبہات کی پھانسیں نکال کر یقین کے سہارے پہ ایک اطمینان پیدا کرتا ہے۔ عزیزانِ من! اسے ایمان کہتے ہیں۔

دعا کیا ہے اور یہ قبول کیسے ہوتی ہے؟ بات تو قرآن نے اسی آیت میں دو لفظوں میں واضح کر دی ہے۔ ہم ہی اس پہ غور نہیں کرتے‘ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ’’انہوں نے دعائیں مانگیں‘‘۔ یہ میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ یہ مانگنا کیا ہے اور دعا مانگنا کسے کہتے ہیں۔

دعا کا لغوی مفہوم ’’پکارنا‘‘ ہوتا ہے مانگنا نہیں‘ خدا کی طرف سے پکار کا جواب ’’انسانی عمل سے مشروط ہوتا ہے‘‘

عزیزانِ من! ان آیات میں یہ تھا کہ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا (3:193) (اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تُو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے‘ جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کیا ہے (24:55) اُن سے ہمیں بہرہ یاب کرنا)۔ دیکھتے ہیں آپ‘ یہ وہی چیز ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی دعا مانگی۔ اگلی آیت میں کہا کہ **فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ** (3:195)۔ ترجمہ ہم نے کیا کہ خدا نے ان کی دعا قبول کر لی۔ موج ہو گئی‘ بیٹھے گھر میں۔ عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے۔ وہاں سے یہ جواب ملا کہ **فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ** (3:195) اِنہوں نے اُس اپنے نشو و نما دینے والے کو پکارا۔ یاد رکھیے! عربی زبان میں ’’دعا‘‘ کے معنی مانگنا نہیں ہوتا‘ پکارنا ہوتا ہے۔ ابھی میں عرض کروں گا کہ یہ پکار بھی کیا ہوتی ہے۔ بہرحال انہوں نے پکارا اور اس کا جواب ملا۔ یوں کہیے کہ انہوں نے ایک بات کہی‘ اُدھر سے یہ جواب ملا۔ اور یہ جو جواب ہے‘ عزیزانِ من! اس میں دعا کا یہ سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہ تو قرآن ہے۔ کہتا ہے کہ **فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ** (3:195) کہیے یہی کہ خدا نے ان کی

دعاؤں کو قبول کیا اگر آپ کہنا چاہتے ہیں۔ اگلی بات بھی تو سنیئے کہ پھر کیا کیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہ کہیے کہ اُدھر سے جواب ملا۔ کیا جواب ملا؟ یہ ملا کہ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ (3:195) یاد رکھو! ہم تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کے اجر کو ضائع نہیں کیا کرتے۔ یہ جواب ملا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بات تو قرآن کے چار لفظوں میں حل ہو جاتی ہے۔ تم نے کہا کہ یہ ہو' اُس نے کہا کہ ٹھیک ہے تم چاہتے ہو کہ ایسا ہو۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ ہم کسی کام کرنے والے کے کام کے اجر کو ضائع نہیں کیا کرتے۔ اس کے مطابق کرو تو ایسا ہو جائے گا۔ ہمارا یہ وعدہ ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ (3:194) تو اپنی وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ کہا کہ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے' بڑا صحیح سمجھا ہے کہ ہم وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے' ہمارا وعدہ یہ ہے کہ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ(195) تم میں سے جو بھی کام کرے گا اس کے کام کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔

دعا کا جواب آپ نے سن لیا۔ جو چاہتے ہو کہ ایسا ہو تو اس کے لیے کام کرو۔ ہمارا وعدہ یہ ہے کہ ہم کام کرنے والے کے کام کے اجر کو ضائع نہیں کیا کرتے۔ اُس نے دونوں گروہوں کو کہہ دیا کہ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی (3:195) اس میں یاد رکھیے! عورت ہو' مرد ہو' کسے باشد۔ یہ تمیزیں تم نے ہی اپنے ہاں پیدا کی ہوئی ہیں۔ اگلے کیا الفاظ ہیں! بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ (3:195) ہمارے ہاں دونوں میں کوئی امتیاز نہیں' تم سب ایک ہی ہو۔ کوئی بھی آرزو دل کے اندر پیدا کرے' اس کے حصول کے لیے کام کرے مگر کام کرنے کا طریقہ صحیح ہو۔ قرآن نے یہ آگے بتایا ہے میں ابھی اس پہ آؤں گا۔ کہا ہے کہ غلط طریقے پہ کام نہ کرے بلکہ صحیح طریقے پر کام کرے۔ ''عامل'' کا لفظ ''کام کرنے والے'' کے معنوں میں آتا ہے۔ یہاں عورت اور مرد دونوں کے متعلق یہ کہہ دیا۔

کسی عظیم مقصد کے حصول کے لیے ہجرت تک کا عمل ناگزیر ہو جاتا ہے اور اس عمل کا بدلا بھی

اور یہ کام پھر کس قسم کے ہیں؟ سنیے! کن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں کہا کہ فَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا (3:195)۔ اللہ اکبر! ہم سے دعائیں قبول کرانا چاہتے ہو؟ سنو! ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ یہ عامل ان کو کہتے ہیں کہ جنہیں اپنے مقصد کے حصول کے لیے جو کچھ چھوڑنا پڑے چھوڑ دیں۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ اگر گھر بار چھوڑنے کی نوبت آئے' اسے بھی چھوڑ دیں۔ نصب العین کے حصول کا عشق اسے کہا جاتا ہے۔ عشق میں سب کچھ چھوڑنا ہوتا ہے۔ کیا بات آ گئی اس عشق کی! اسے قرآن کے الفاظ میں لیجیے۔ یہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے جو انتہائی

تڑپ ہے' اس کا نام عشق ہے۔اس کے لیے هَاجَرُوْا (3:195) سب کچھ چھوڑنا پڑے۔انداز تو غزل کا ہے مگر بات بڑی پتے کی کہی ہے:

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

باقی سب جو تمہارا ہو گیا تو پھر هَاجَرُوْا (3:195) کی بات تو صاف ہو گئی صاحب! جس مقصد کے لیے یہ چھوڑنا ہے' یہ بھی ہم نے چھوڑا' یہ چھوڑنا ہے' یہ بھی ہم نے چھوڑا۔وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِيْلِیْ (3:195) اس کے لیے خواہ گھر بار سے کیوں نہ ان کے نکال دیا جائے' سخت مصائب ان کے اوپر کیوں نہ آ جائیں حتیٰ کہ یہاں تک کیوں نہ نوبت آ جائے' وہی آخری منزل عمل کی جو میدانِ جنگ میں ہوتی ہے کہ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا (3:195) میدانِ جنگ میں بھی نکلے' وہاں لڑے' ٹھیک ہے فاتح منصور بھی لوٹے' جان بھی وہاں دیدی۔یہ ہیں وہ لوگ جن کے لیے کہا ہے کہ لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ج (3:195) یہ ہیں وہ لوگ ہیں کہ جن کی چھوٹی بڑی ناہمواریاں' اس حسنِ عمل کے زیادہ وزن سے' دور ہو جاتی ہیں۔جنت ان کا مقام ہو جاتا ہے: اس دنیا کے اندر بھی اور آخرت میں بھی۔ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط (3:195) (یہ خدا کی طرف سے اُن کے اعمال کا بدلا ہے)۔تم نے دعا مانگی' سنو! ہم تو بھائی' اجر دیا کرتے ہیں' معاوضہ دیا کرتے ہیں' بدلا دیا کرتے ہیں۔

لفظ ثواب کا لغوی مفہوم ''کچھ حاصل ہونا'' ہے نیز خدا کو پکارنے کی ایک عملی مثال

ثواب کے معنی ''عمل کے اجر'' کے ہیں کہ جتنا کچھ صرف کیا جائے' اتنا واپس مل جائے۔ہم کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دیا کرتے۔ثواب یہ ہے کہ تم صرف جتنا کرتے ہو وہ تمہیں واپس مل جائے گا۔کہا ہے کہ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (3:195) ہم ''عمل کا اجر و صلہ'' واپس دیتے ہیں اور بڑے حسن کارانہ انداز سے دیتے ہیں۔حسن وہ ہوتا ہے جس میں توازن نہ بگڑنے پائے۔جو چیز تم نے صرف کی ہے' اس سے کچھ توازن بگڑے گا لیکن ''حسن الثواب'' یہ ہے کہ ہم نہایت حسین انداز سے واپس دیتے ہیں کہ تمہارا توازن نہ بگڑنے پائے۔کہا یہ ہے کہ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ (3:195) جسے آپ کہتے ہیں کہ دعائیں قبول کیں۔کہا ہے کہ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ (3:195) (اُنھوں نے ان حسین آرزوؤں کے ساتھ' خدا کی دعوت پر لبیک کہا اور خدا کے قانون نے آگے بڑھ کر ان کی پکار کا جواب دیا۔اس کے لیے دیکھیے (2:186)۔یہ وہی ہے)۔یہ چار لفظ ہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ دعا' مانگنا نہیں' پکارنا ہے۔ زندگی کے دوراہے پر ہم کھڑے ہو گئے۔ وہاں یہ معلوم نہیں ہو رہا کہ کس راستے پہ چلیں گے تو وہ راستہ ہمیں صحیح منزل تک پہنچا دے گا۔

عزیزانِ من! وہاں اس دوراہے پر کھڑے ہوئے آپ کیا کرتے ہیں؟ کوئی جو جانے والا ہے' اُسے آواز دیتے ہیں: دیکھنا بھائی! ذرا ادھر آنا۔ مجھے یہاں سے شہر کی طرف جانا ہے' کس راستے پہ کس سڑک پہ جاؤں؟ وہ کہتا ہے: اِدھر چلے جائیے۔ یہ ہوتا ہے کسی کو پکارنا' آواز دینا کہ بھئی! ذرا مجھے بتا دیجیے۔ زندگی کے ہر دوراہے پہ خدا کی راہنمائی کو آواز دینا کہ مجھے بتا دو اس چوراہے پہ کہ کونسا راستہ اختیار کروں کہ منزلِ مقصود پہ جا پہنچوں۔ پھر معلوم ہو جانے کے بعد راستہ وہی اختیار کریں جو آپ پہلے چاہتے تھے' وہ نہیں جو صحیح معنی میں اُدھر جا رہا ہے۔ آپ کا سارا عمل رائیگاں چلا گیا۔ اور اگر آپ وہیں کھڑے ہی رہیں اور کہتے رہیں یا اللہ! انارکلی پہنچا دے مولا! انارکلی پہنچا دے۔ سوال یہ ہے کہ زندگی کے دوراہے پہ آپ کو معلوم ہو کونسا راستہ کدھر جاتا ہے' جدھر جانا ہے اُس راستے پر پھر چل نکلیے۔ اب یہ جو یوں جانے والا ہے' اس کا ہر قدم منزل کو کھینچ کر اس کے قریب لا رہا ہے۔ یہ ہے لَآ اُضِيۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡكُمۡ (3:195) تم میں سے جو بھی اس طرح کام کرنے والا ہے' ہم اس کے کام کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ قوانین کو عملی طور پر تسلیم کرنا' عبادت یا عبودیت کہلاتا ہے تو پکار کا جواب چہ معنی دارد

لہٰذا دعا کے معنی ہی پکارنا کے ہیں۔ یہ پکار ہے اور پکار کے ساتھ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ہمارے احکام کے مطابق کام کرنا' اس کو عبادت کہتے ہیں' اسے عبودیت کہتے ہیں۔ یہ خدا کے قوانین کی فرماں پذیری ہے' یہ اس کے احکام کے مطابق کام کرنا ہے۔ دیکھیے! قرآن کیا کہتا ہے۔ قرآن تو معنی خود متعین کرتا جاتا ہے۔ سورج تو خارج کی روشنی کا محتاج ہی نہیں ہوتا۔ کہا ہے کہ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادۡعُوۡنِىۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَـكُمۡ ؕ (40:60) تمہارے رب نے یہ کہا ہے کہ پکارو مجھے' میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ یہ ہے سب سے بڑی چیز۔ زندگی کے دوراہے پہ جہاں آپ کھڑے ہونگے' وہاں جب آپ پکاریں گے' پکار کا جواب ضرور ملے گا۔ کہاں سے ملے گا؟ آپ نے بھی تو خدا کو ہزاروں بار پکارا ہوگا' کیا کبھی کوئی آواز کان میں آئی؟ وہ کہتا ہے کہ جواب دوں گا۔ یہاں سے بات بڑی اہم آتی ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق کس طرح سے قائم ہوتا ہے۔ بڑے خلوص سے آدھی رات کو اٹھ کر

ہم آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ سجدے میں گرے ہوئے اسے پکارتے ہیں۔ آواز نہیں آتی حالانکہ وہ کہتا ہے: پکارو جواب دوں گا۔ بات کیا ہوئی؟

خدا تعالیٰ کا انسانوں کے ساتھ باہمی ربط کس سے قائم ہے اور جواب کہاں سے ملتا ہے؟ ایک اہم سوال

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق کس چیز سے ہے؟ سُنیئے! ہمارا اور خدا کا تعلق براہِ راست نہیں ہے۔ اس کا اور ہمارا تعلق اس کی کتاب (قرآنِ مجید) کے ذریعے ہے' اس کے کلام کے ذریعے ہے۔ غور سے سوچیں گے تو بات بڑی عجیب سمجھ میں آئے گی۔ وہ خدا کہ جو قیاس وخیال وگمان ووہم میں نہ آسکے' اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس کو دیکھنا سننا تو ایک طرف رہا۔ وہ خدا تو خیال وقیاس میں بھی نہیں آ سکتا۔ اس کے ساتھ ہمارا تعلق' اپنے ذہن میں' اپنے جی میں جو آئے آپ دھر لیجیے۔ وہ تو غیر محسوس' غیر مرئی خدا ہے' وہ تصور میں بھی نہ آ سکنے والا خدا ہے۔ اس نے ہمیں اپنے آپ کو ایک محسوس شکل میں دیا ہے اور وہ ہے اس کا کلام۔ قرآن کو کلام اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ ہمارے سامنے اس شکل میں آ گیا۔ ہم قرآن پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے باتیں کرتا ہے۔ ہم اس کو پکارتے ہیں تو ہمیں اس سے جواب ملتا ہے۔ اس سے جواب ملے گا۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن نے کہی ہے کہ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (2:186) اے رسول! میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھتے ہیں کہ خدا کہاں ہے۔ کیا کہیں عرشِ عظیم پہ بیٹھا ہوا ہے' کہیں ہم سے دور ہے؟ کہا کہ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ (2:186) ان سے کہو کہ دور نہیں ہے' میں تو تمہارے پاس ہوں اور اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ میں پھر عرض کردوں کہ یہ تو ہمارا اپنا بھی تجربہ ہے کہ ہماری پکار کا جواب آواز کی شکل میں ہمیں نہیں ملتا۔ اب وہ کہتا ہے کہ پکار کا جواب دیتا ہوں۔ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) ہر پکارنے والا جب بھی پکارتا ہے' اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ کہاں سے جواب ملتا ہے؟

خدا کی ذات پہلے انسان سے اپنی پکار کا جواب لینا چاہتی ہے پھر تمہاری پکار کا جواب دیتی ہے

عزیزانِ من! جس معنی میں ہم دعا لیتے ہیں' اس میں تو ہمیں جواب نہیں ملتا۔ وہ ہر پکارنے والے کو کہتا ہے کہ جب پکارتا ہے تو جواب دیتا ہوں۔ آگے یہ ہے کہ ان سے کہو کہ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ (2:186) ان سے کہو کہ وہ ہماری اس

چیز کے اوپر ایمان لائیں اور پہلے ہماری پکار کا جواب دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی پکار کا جواب دیں' ان سے کہو کہ پہلے تمہاری طرف سے ایک کام ہونا چاہیے۔ وہ یہ فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لِىۡ (2:186) ہے تم نے پکارا ہے مگر اس سے پہلے ہم نے تمہیں پکارا ہے۔ پہلے اُس بات کا جواب دو اپنی ہی نہ ہانکتے چلے جاؤ مگر تم ہو کہ ''جو میں کہنا آں اوہدا جواب دے آں' اپنی ماری ترے جاندے او''۔ کیا بات ہے! فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لِىۡ (2:186) میں نے تمہیں پکارا ہے' تم سے پہلے پکارا ہے' پہلے اس کا جواب دو۔ وَلۡيُؤۡمِنُوۡا بِىۡ (2:18) اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی صداقتوں پر ایمان لاؤ اور جواب دو جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے۔ تم سے کہا تھا کہ آتے ہو میدانِ جنگ میں یا نہیں؟ اس کا کیا جواب ہوگا؟ ٹھیک ہے' آتے ہیں۔ لَبَّيۡكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيۡكَ آتا ہوں' آ رہا ہے تیرا بندہ۔ کہا کہ یہ کہو' اس کے بعد پھر دیکھو میں تمہاری آرزوئیں کس طرح پوری نہیں کرتا۔ پہلے میری بات کا جواب دو۔ یہ ہے فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لِىۡ وَ لۡيُؤۡمِنُوۡا بِىۡ (2:186)۔ یہ کچھ کاہے کے لیے ہے؟ کہا کہ لَعَلَّهُمۡ يَرۡشُدُوۡنَ (2:186) تا کہ صحیح راستہ تمہارے سامنے آ جائے۔ میری بات کا جواب دو' صحیح راستہ سامنے آ جائے گا۔ بس صحیح راستہ سامنے آئے گا تم دیکھو گے کہ کس طرح سے میں تمہاری بات کا جواب دیئے چلا جاتا ہوں۔

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ یہ پکارنا کیا ہے؟ یہ زندگی کے دوراہے پر اس سے پوچھنا ہے کہ مجھے بتاؤ کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس قرآن سے آپ کی ہر دعا کا جواب ملے گا' ہر پکار کا جواب ملے گا' جو پوچھو گے یہ جواب دے گا' جہاں پوچھو گے' وہیں جواب دے گا۔ اس لیے کہا ہے کہ اُجِيۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) ہر بلانے والا جب مجھے بلاتا ہے میں اس کے بلانے کا جواب دیتا ہوں۔ بلا کر دیکھیے' پکار کر دیکھیے' خدا سے پوچھیے کہ مجھے ایسے میں کیا کرنا چاہیے۔ خدا اپنے اس کلام کے ذریعے جواب دیتا ہے۔ اور چونکہ اس نے کہا ہے کہ وَ تَمَّتۡ كَلِمَةُ رَبِّكَ(6:115) یہ بات مکمل ہوگئی اس لیے ہو نہیں سکتا کہ تمہارا کوئی سوال اس کی طرف جائے اور اس کا جواب تمہیں اس سے نہ ملے۔ جواب اس سے ملے گا' وہ تمہیں براہِ راست نہیں کہے گا۔ یہی تو بات تھی۔ اگر اس نے براہِ راست یہ کچھ کرنا ہوتا تو وہ اپنے رسولوں کو کیوں بھیجتا' کتابوں کو کیوں بھیجتا' تم بات کرتے' بات کا جواب ملتا۔ اب اس کتاب میں تمہاری ہر بات کا جواب اس نے دے رکھا ہے

خدا تعالیٰ کے احکام پر تکبر کا برتنا جہنم کو دعوت دیتا ہے

کہا ہے کہ فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لِىۡ وَ لۡيُؤۡمِنُوۡا بِىۡ لَعَلَّهُمۡ يَرۡشُدُوۡنَ (2:186) (میرا قانونِ ہدایت جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے' اس کی پُکار کا جواب دیتا ہے اور اُبھر کر اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ لہٰذا ان سے کہو کہ قربِ خداوندی کا طریقہ یہ ہے

کہ یہ لوگ میرے قانون کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے اس کی پوری پوری اطاعت کریں)۔ دیکھتے ہیں بات کیسے واضح ہوتی جارہی ہے۔ کہا ہے کہ پہلے میری بات کا جواب دو۔ یہ جواب کس طرح سے تھا؟ آ جایئے اُدھر (40:60) پر۔ کہا ہے کہ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِىٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط (40:60) تمہارا رب کہتا ہے کہ مجھے بلاؤ' میں تمہارے بلانے کا جواب دوں گا۔ اچھا جی لیکن سن رکھو کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِىْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (40:60) جو شخص بھی ہمارے احکام کی اطاعت سے کچھ تکبر محسوس کرے گا' وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ ذہن میں نہیں آتا کہ دعا اور اس کی قبولیت اور اس کے ساتھ عَنْ عِبَادَتِىْ (40:60) کے بعد یہ کیا بات ہوئی؟ بات ہی یہ ہے کہ وہ جو کہتا ہے کہ پہلے میری پکار کا جواب دو تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو کچھ میں کہتا ہوں' اس کے مطابق کام کرو۔ جو اس سے ذرا سا تکبر برتتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ کیا ہے' میں کروں گا وہی جو میرے ذہن میں آئے گا تو وہ کہتا ہے کہ پھر تو تمہاری کھیتیاں جھلس جائیں گی۔ ہم جواب اُسی صورت میں دیں گے جو کچھ ہم نے کہا ہے' اس کے مطابق کرتے چلے جاؤ۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے اس کام کا اجر ضائع نہیں ہوگا۔ ساتھ کے ساتھ تمہاری دعاؤں کا تمہارے ان کاموں کا جواب' ان نتائج کی شکل میں ملتا چلا جائے گا' تمہارے سامنے آتا چلا جائے گا۔

کس کی دعا قبول ہوتی ہے؟ خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی پکار کا نہایت واضح جواب' مگر ایمان اور اعمالِ صالحہ شرط ہے

کس کی دعا قبول ہوتی ہے؟ میں الفاظ وہی استعمال کرتا ہوں جو ہمارے ہاں رائج ہیں ورنہ ہونا یہ چاہیے کہ کس کی پکار کا جواب ملتا ہے۔ جواب کے' استجاب کے' الفاظ وہی ہیں جو میں نے کہا ہے کہا ہے کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ (2:186) ۔ وہی الفاظ چلے آ رہے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ (42:26) ان لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں' (عام الفاظ میں) ان لوگوں کی پکار کا جواب ملتا ہے' (قرآن کے الفاظ میں) الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) جو ان احکام کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور پھر صلاحیت بخش کام کرتے چلے جاتے ہیں' اس پروگرام کے مطابق چلتے جاتے ہیں۔ صحیح راستہ دریافت کر لیتے ہیں اور پھر اس پر گامزن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ (42:26)۔ اپنے الفاظ میں کہہ لیجیے کہ ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں' ان کی پکار کا جواب ملتا ہے۔ پہلے تو یہ یقین ہو جائے انہیں کہ یہ ہے وہ راستہ جو منزل تک پہنچائے گا۔ یہ ہے یہ ایمان' یہ Conviction' یہ یقین۔ اور پھر وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) (صلاحیت بخش کام کرتے چلے جاتے

ہیں)۔یہ وہ ہیں کہ جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ وَیَـزِیْدُھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ط (42:26) اورخدااپنے فضل وکرم سے انہیں بڑی فراوانیاں عطا کرتا ہے۔

دعا کی قبولیت کے لیے قوانینِ خداوندی پر یقینِ محکم اور استقامت کے ساتھ جمے رہنا شرطِ اول ہے

عزیزانِ من! (42:26) میں کہا ہے کہ ٹھیک ہے' جب تم یہ کچھ کرتے ہوتو پھرتم دیکھو گے کہ تمہارے اندازے سے بھی زیادہ اس کے بہتر نتائج نکلتے ہیں۔صحیح راستہ ہو' اس پہ انسان قدم زن ہوپھر دیکھے کہ کس طرح توقع سے بڑھ کرنتائج برآمد ہوتے ہیں۔ہم نے دیکھا کہ دعائیں ان کی قبول ہوتی ہیں جوراستے کے صحیح ہونے پر پہلے یقین کرتے ہیں' اطمینان کر لیتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے۔پھراس پرگامزن ہوتے چلے جاتے ہیں تو قدم قدم پران کی پکار کا جواب ملتا چلا جاتا ہے۔

اب اس کے بعد قرآنِ کریم تاریخی شواہد ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔حضرت موسیٰؑ اوران کے بھائی حضرت ہارونؑ کی مثال ہمارے سامنے لاتا ہے۔ان کے سامنے مہم اتنی سخت ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ کیونکہ اِنَّـہٗ طَغٰی (20:24) وہ بڑا سرکش ہوگیا ہے۔کتنی بڑی مہم ہے' کتنا بڑا ٹکراؤ ہے اس قوت کے ساتھ جو دنیا میں استبداد اور ظلم کے لیے ضرب المثل ہے اور وہ ہے فرعون استبداد کا مجسمہ۔جانے سے پہلے جسے ہم کہتے ہیں کہ دعائیں کیں: رَبَّـنَـآ اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَہٗ (10:88) اے ہمارے نشوونما دینے والے! فرعون اوراس کے سرداروں کو سامان اور متاعِ حیات فراوانی سے مل رہا ہے۔حضرت موسیٰؑ نے یہ چیزیں کہیں۔آگے کہا کہ رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ ج رَبَّـنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِھِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (10:88) اے ہمارے نشوونما دینے والے! اے ہمارے رب! (اُس کے بل بوتے پروہ لوگوں کوخدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں اس لیے اے نظامِ ربوبیت کے مالک! تُو ان کے مال و دولت کوتباہ کردے اورجس عقل وفہم سے یہ اس قسم کی انسانیت سوز تدابیر سوچتے ہیں اسے سلب کرلے۔یہ) بڑا ظالم ہے بڑا سخت گیر ہے' بڑا محکم گرفت کرنے والا ہے اس نے تباہ کردیا ہے' اسے تو تباہ کردے' اس کا بیڑہ غرق کردے' وہ اس قابل نہ رہے کہ کسی پرظلم کرے۔یہ ساری دعائیں چلی آرہی ہیں۔آگے کہا کہ قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا(10:89) جواب ملا (ہمارے الفاظ میں ترجمہ کیجیے) ہم نے تم دونوں کی دعا کوقبول کرلیا۔ٹھیک ہے' بیٹھ جائیے۔ہم نے کہا تھا کہ اس کا بیڑہ غرق ہوجائے' وہ تباہ ہوجائے برباد ہوجائے۔خدانے کہہ دیا کہ ہاں! ہم نے تمہاری دعا

قبول کر لی۔اس کے بعد سوائے اس کے کہ آدمی نیاز بانٹتا پھرے اور کچھ کام تو وہ کرتا ہی نہیں ہے۔کتنا Definite ہے کہ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (10:89) عربی والے جانتے ہیں۔ٹھیک ہے دعا قبول ہوگئی آپ کہیے۔ہم تمہاری پکار کا جواب دیتے ہیں۔ آگے کہا ہے کہ فَاسْتَقِيْمَا (10:89) جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے' نہایت استقامت اور ثبات سے اس پر جمے ہوئے رہو' پھر بات بنے گی۔''ہُن گھر نوں نہ ٹُر جانا''(اب گھر نہ چلے جانا): فَاسْتَقِيْمَا (10:89) ۔دیکھتے ہیں یہ دعا قبول کیسے ہو رہی ہے! کہا ہے کہ فَاسْتَقِيْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (10:89) اور راستے میں تمہیں کوئی بھی بہکانے والا ملے اُس کی بات نہ مان لینا کہ اِدھر کو ہی نکل جاؤ۔راستے کی نشان دہی ہوگئی' پروگرام مرتب ہوگیا۔ٹھیک ہے ہم جواب دیتے ہیں۔چلو اور فَاسْتَقِيْمَا (10:89) ثابت قدم رہو اب اس پروگرام پر۔

اور تو اور انبیائے کرام کی دعائیں بھی جہدِ مسلسل کے ساتھ مشروط تھیں

عزیزانِ من! دو اولوالعزم نبی دعا مانگتے ہیں۔پھر یہ بھی نہیں ہے کہ کوئی ظن و قیاس ہی ہو کہ شاید قبول ہوئی ہے یا نہیں ہوئی۔ یہ الفاظ ہیں کہ ہم نے تمہاری دعاؤں کو قبول کر لیا۔ان الفاظ میں اگر ترجمہ کرتے ہو تو۔اب کیا بات رہ گئی! کہا ہے کہ فَاسْتَقِيْمَا (10:89) جم کر کھڑے ہو جاؤ۔اور دیکھنا راستے میں کئی ایسے ملیں گے جو تمہیں یہ کہہ کر بہکائیں گے کہ یہ بات' یہ راستہ صحیح نہیں ہے' یوں نہیں' یوں چلو۔کسی کی بات نہ ماننا' سیدھے استقامت سے اس پر چلتے چلے جانا۔دیکھتے ہیں آپ دعا بھی ہے انبیا کی۔قبول ہونے کا پہلے اعلان کر دیا ہے کہ ہم نے قبول کی اور پھر اس کے بعد جو کچھ کہا گیا' اس سے معلوم ہوا کہ قبول کیسے ہوتی ہے۔اور یہ تو میں نے ابھی آپ کے سامنے آیت پڑھ دی تھی کہ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) صرف اس کی دعا قبول ہوتی ہے جو اس صداقت پہ یقین رکھے اور پھر اس کے مطابق کام کرتا چلا جائے۔حضرت نوحؑ نے خدا کو پکارا۔دو نبی تو ہم نے دیکھے۔یہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ ہیں۔حضرت نوحؑ نے خدا کو پکارا: قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ (23:26) خدا سے کہا کہ یا اللہ! میری مدد کر' یہ بڑی تکذیب کرتے ہیں' یہ لوگ بہت تنگ کرتے ہیں' بہت تکلیف دیتے ہیں' حق کی آواز کو بلند نہیں ہونے دیتے' راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔

عزیزانِ من! ایک عذاب آنے والا ہے' طغیانی آنے والی ہے' اس کے خلاف دعا کی جاتی ہے کہ رَبِّ انْصُرْنِیْ (23:26) میری مدد کر۔دعا قبول ہو رہی ہے۔اُدھر سے جواب آتا ہے کہ فَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ (23:27) ۔ہمیں اور آپ کو تو براہِ راست جواب نہیں ملتا' انبیائے کرامؑ کو تو براہِ راست جواب ملا کرتا تھا۔یہ براہِ راست جواب ہوتا تھا۔کہا ہے کہ ہم نے اس کی

طرف وحی کی کہ ٹھیک ہے' تمہاری دعا قبول ہوئی' ہم تمہیں اس طوفان سے اس طغیانی سے بچالیں گے مگر **اَنِ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ** (23:27) بس کشتی بنانی شروع کردو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انبیائے کرامؑ کی دعائیں کیسے قبول ہورہی ہیں۔ اب یہاں کہا ہے کہ طوفان (Deluge) سے بچنا چاہتے ہو! ٹھیک ہے تمہاری دعا قبول ہے مگر اب تم کشتی بنانی شروع کرو' دیکھو گے کہ تم بچ جاؤ گے۔ یہ صحیح طریقہ تھا طغیانی سے بچنے کا۔ بات اتنی ہی ملی۔ جو وہاں سے جواب ملا ہے وہ صرف یہ ملا ہے کہ یاد رکھو! یہ ایسی طغیانی جو ہے' اس طغیانی سے وہ بات نہیں ہوگی' جو تمہارا وہ بیٹا کہے گا کہ کوئی نہیں' میں ذرا اونچے سے ٹیلے پہ چڑھ جاؤں گا' وہاں بچ جاؤں گا۔ یہ ایسا طوفان آنے والا ہے کہ یہ پانی وہاں تک بھی چڑھ جائے گا۔ اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ کشتی بناؤ۔ عزیزانِ من! یہ کچھ حضرت نوحؑ کی دعا کے جواب میں کہا جا رہا ہے۔ اور جو آیت ہمارے سامنے ہے اس میں یہی چیز ہے جس سے آج کے درس کا آغاز ہوا۔ وہاں جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ **فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى** (3:195) ٹھیک ہے دعا قبول ہوئی' کسی کام کرنے والے کے کام کا اجر ہم ضائع نہیں کیا کرتے۔ یہ تو ہوا وہ طریقہ جو خدا کے جواب نے بتایا کہ یہ چاہتے ہو کہ ایسا ہو تو پھر انہیں یہ کچھ کرنا ہے۔ دعا کے معنی یہ کہیے۔

ہمارے ہاں کی دعاؤں کا انداز اور قرآنِ حکیم کا فرمان کہ یہ ضائع چلی جائیں گی

میں ابھی عرض کروں گا کہ دعا کیا ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ چاہتے ہو کہ یہ ایسا ہو تو اس کے لیے یہ ہے جو کچھ تم کرو۔ اور کہا کہ ایک انداز دعا کا تمہارا بھی ہوتا ہے' دعا کا ایک انداز اور بھی ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا آپ کا وہ دعا کا انداز کیا ہوتا ہے۔ سنیے! قرآن حکیم کے نزدیک ایک دعا کا انداز یہ ہوتا ہے۔ کہا کہ **وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ لَا یَسۡتَجِیۡبُوۡنَ لَهُمۡ بِشَیۡءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیۡهِ اِلَی الۡمَآءِ لِیَبۡلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الۡكٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ** (13:14) ایک دعائیں تمہاری ہوتی ہیں اور ان کا انداز ہوتا کہ پیاسا ندی کے کنارے پہ کھڑا دونوں ہاتھ آگے کیے ہوئے کہے جا رہا ہے کہ پانی آ جا' میری پیاس بجھا جا۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں۔ ہاتھ پھیلائے ہوئے کہہ رہا ہے' دونوں ہاتھوں سے کہہ رہا ہے: پانی آ جا' میری پیاس بجھا جا۔ کہا کہ اس سے کہہ دو کہ کبھی پانی منہ میں نہیں آئے گا' ہزار مرتبہ یہ کہتے رہو' بیکار جائے گا تمہارا یہ پکارنا۔ یہی مشکل ہے کہ ہم میں سننے کی تاب نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ **وَ مَا دُعَآءُ الۡكٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ** (13:14) یہ کفر کی دعائیں ہیں' یہ ضائع چلی جایا کرتی ہیں۔ وہ ایمان کی دعائیں تھیں اور یہ کفر کی دعائیں ہیں ان کے لیے کہا ہے کہ **اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ** (13:14) یہ ضائع چلی جائیں گی' رائیگاں چلی جائیں گی۔ جتنے جی چاہے ہاتھ پھیلاتے چلے جاؤ۔

انسان کی آرزو اور اس کی ہر چاہت انسانی قوتوں کو متحرک کرنے کے ساتھ ساتھ ایک پروگرام کی طالب ہوتی ہے

یہ دعا ہوتی کیا ہے؟ پہلی چیز یہ ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے دل کے اندر ایک آرزو کا پیدا ہونا ہوتا ہے۔کوئی کام ہو' آپ دیکھیے گا کہ اس سے پہلا قدم یہ ہے کہ آپ کے دل میں اس کے لیے ایک آرزو بیدار ہو۔آپ چاہیں کہ یہ ایسا ہو جائے۔پہلی چیز یہ اس کے لیے چاہنا ہے۔یہ جو چاہنے والی بات ہے' یہ محرک بنتی ہے۔اس کے بعد یہ ہے کہ اس کے لیے آپ پروگرام بنائیں' پھر اس کے لیے کوئی کام کریں۔یہ پہلا ذرّہ ہے جسے آپ First Crystal کہتے ہیں۔جو مقصد آپ چاہتے ہیں حاصل ہو' اس کے لیے آپ کے دل میں ایک آرزو بیدار ہو' ایک تڑپ پیدا ہو' اس کے لیے ایک خواہش پیدا ہو تو یہ چیز آپ کی قوتوں کو بیدار کرنے کا' کھینچ کے چلے آنے کا محرک بنتی ہے۔

لفظ دعا کا وہ مفہوم جو اہلِ عرب اپنے ہاں لیا کرتے تھے

کیا کہنے ہیں اس عربی زبان کے اور ان لوگوں کے جنہوں نے اس زبان کو پالش کیا تھا۔دعا کا لفظ سمجھنا ہے تو ان کے معنی آپ ان عربوں سے سمجھیے جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا۔جب وہ دودھ دوہ لیتے تھے تو کچھ جانور ہیں جو کچھ دودھ چڑھا لیتے ہیں۔یہ خود جتنا دودھ آرہا ہوتا تھا اس میں سے کچھ تھوڑا سا دودھ یہ خود چھوڑ دیتے تھے۔اب یہ جو چھوڑا ہوا دودھ ہے اس کی وجہ سے اس مویشی کے اندر کا تقاضا یہ ہے کہ یہ جو دودھ اس چشمے سے باہر آ گیا ہے اسے تو وہ ضرور نیچے ٹپکائیں۔اب وہ جو اس ٹپکانے کے لیے کچھ اندر سے حرکت کرتا تھا اس کے ساتھ جو پچھلا دودھ تھا' اس تحریک کے ساتھ وہ بھی چلا آتا تھا۔یہ جو دودھ تھوڑا سا چھوڑا جاتا تھا جو اُس دودھ کو ساتھ لانے کی تحریک پیدا کرتا تھا' اسے وہ ''اَلـدَّاعِیَۃُ'' کہا کرتے تھے۔عزیزانِ من! انسان وجد میں آ جاتا ہے۔کس زبان کا انتخاب کیا ہے اس کتاب لکھنے والے نے! حق یہی تھا کہ یہی زبان ہوتی جس میں یہ کتاب ہے۔اور کیا وہ لوگ تھے صاحب!

حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے جو بنی اسرائیل تھے ان کے لیے تو وہ حکومت دی' تمکن دیا' وہ یہ کچھ کرتے رہے۔بنی اسماعیلؑ کے متعلق سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دو تین ہزار سال کیا کرتے رہے؟ سنیے! وہ دو تین ہزار سال کے لیے یہ زبان تیار کرتے رہے جو قرآن کے حقائق اور رموز کی حامل ہوتی۔اور محسوس کے ذریعے سے بات سمجھ میں آتی ہے۔اب یہ دیکھیے! اس سے بات

کیسے سمجھ میں آ گئی۔ کیا بات تھی ان کی! وہ یہ دودھ جو چھوڑ تے تھے' جو اندر خفیہ صلاحیتیں' جو غیر محرک تھیں' ابھرتی نہیں تھیں' آتی نہیں تھیں' ان کو بلانے کے لیے' ان کو نیچے لانے کے لیے ایک محرک کی ضرورت تھی۔ وہ یہ دودھ جو چھوڑ دیتے تھے وہ اُس دودھ کو لے کر بھی نیچے آ جاتا تھا۔ اُسے ''اَلدَّاعِیَۃُ'' کہا کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے ہاں **الدواعی** ان تمام جذبات کو کہتے تھے جو کسی ایک آرزو کے بروئے کار لانے کا محرک بنتا تھا۔ قرآن نے کہا ہے کہ پہلی چیز یہ ہے کہ تمہارے اندر آرزو بیدار ہو لیکن آرزو تو ہر قسم کی بیدار ہو گی' غلط بھی بیدار ہو گی' صحیح بھی بیدار ہو گی۔ آپ کا نصب العین' مقصد غلط بھی ہو سکتا ہے صحیح بھی۔ تو غلط اور صحیح کی کسوٹی (Criterion) کیا ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

انسانی جذبات کی تربیت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی راہنمائی: تم اپنے چاہنے کو ہمارے چاہنے کے ساتھ منطبق کر دو

قرآن نے کہا ہے کہ **وَ یَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَہٗ بِالۡخَیۡرِ ؕ وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا** (17:11) انسان کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ اگر اس کو راہنمائی نہ ملے تو وہ بسا اوقات ایسی چیزوں کی آرزوئیں کرتا رہتا ہے جو اس کے لیے بڑی نقصان دہ ہوتی ہیں۔ یہ اصل میں بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔ کیا بات قرآن نے کہی ہے! یہ آپ دیکھتے ہیں کہ جتنے کاموں پہ ہمیں ندامت ہوتی ہے' اس کے بعد ہم یہی کہتے ہیں کہ صاحب! جلدی میں ایک فیصلہ کر بیٹھا' ذرا سوچا نہیں ہے میں نے۔ کہا کہ یہ جلد باز ہے۔ جلد بازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ان چیزوں کے لیے بھی آرزو کرنے لگ جاتا ہے' خواہش کرنے لگ جاتا ہے جو اس کے حق میں نقصان دہ ہوتی ہیں۔ اس لیے پہلی تربیت تو اس کی یہ کی گئی کہ **وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ** (81:29) بس اصولاً یہ سمجھو' دنیا میں کرو تم یہ کہ تم وہ کچھ چاہو جو ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ تم اپنے چاہنے کو ہمارے چاہنے کے ساتھ ملا دو۔

زندگی کے معاملات میں انسانی چاہت قوانینِ خداوندی سے ہی ہم آہنگ ہونی چاہیے

خدا نے انسان کے لیے کیا چاہا ہے کہ اس کے لیے کیا اچھا ہے؟ وہ اس قرآن کے اندر موجود ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ تمہارا چاہنا' تمہاری آرزو' تمہارا نصب العین' کوئی کام جو چاہتے ہو کہ ہو جائے' وہ وہ ہونا چاہیے جو خدا کے اس منشا کے مطابق ہو جو قرآن میں اس نے کہہ دیا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ آرزوئیں ہی تمہاری اس کے مطابق ہوں۔ پہلی چیز قرآن نے First Step (قدمِ اوّل) یہ بتایا ہے کہ تمہاری اپنی آرزو محض تمہارے اپنے جذبات و خواہشات پر مبنی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ آرزو اس کے

مطابق تمہاری ہونی چاہیے۔ تو پہلا کام تو اس دعا کا پہلا Step (قدم) یہ ہوتا ہے کہ آپ کی آرزو صحیح ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے خاص انداز کے اندر بات کہی ہے کہ

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

پہلا کام تو اس میں یہ ہوتا ہے کہ جو بھی خیال' آرزو' خواہش' پیدا ہو تو پہلے یہ دیکھ لو کہ وہ اس کے قانون کے مطابق ہے۔ نہیں ہے تو اُسے بدل لو۔ دعا کی قبولیت کا پہلا مرحلہ تو یوں طے ہوا کہ ''مری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے''۔ صحیح آرزو سامنے آئی۔ اب وہ شدت اختیار کیے چلی جا رہی ہے۔ آپ دیکھیں گے غیر شعوری طور پر جب آرزو شدید ہو جاتی ہے تو زبان پہ آپ کے وہ الفاظ خود آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ تنہائیوں میں' اکیلے بیٹھے ہوئے' شدتِ آرزو کا اظہار ہونے لگ جاتا ہے۔ یہ جو اس طرح سے' شدتِ آرزو کا اظہار الفاظ کے ذریعے سے ہے۔ اسے اصطلاح میں آپ دعا کہہ لیجیے۔ اقبالؒ نے ہی کہا تھا جو بچے گایا کرتے ہیں کہ

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری

انسان کی تمنا لب پہ آ جاتی ہے۔

تکمیلِ آرزو کی شدت انسان سے شدید محنت کا بھی تقاضا کرتی ہے

اب آپ دیکھیے جتنا زیادہ اس مقصد کے حصول کی آرزو میں آپ کے اندر شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی' آپ دیکھیں گے ایک عزم پیدا ہوگا' اس کے لیے Determination پیدا ہوگی' ارادے پختہ ہونے شروع ہو جائیں گے' پروگرام بننے شروع ہو جائیں گے۔ دیکھو گے کہ اس سے پہلے جو کچھ تم تھے اس کے بعد تمہارے اپنے اندر ایک تبدیلی آئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے کم ہمت ہو' سُستی بھی ہو' اٹھنے کو بھی جی نہ چاہتا ہو لیکن جب یہ چیز ہو کہ یہ کام کرنا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں کتنی توانائیاں آپ میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو اتنی توانائی پیدا ہوتی ہے کہ بعد میں آپ خود سوچتے ہیں کہ میں نے یہ کیسے کر لیا۔ وہاں دور سڑک کے پار آپ کا بچہ ہو اور آپ دیکھیں کہ وہاں سے موٹر آ رہی ہے۔ عام حالات میں آپ کی جو رفتار ہے' وہ بھاری بھاری قدموں سے بھی کیوں نہ ہو مگر اس وقت آپ دیکھیں گے کہ آپ برق رفتاری سے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کو خود پتا نہیں چلتا کہ

میرے اندر یہ کہاں سے اتنی بڑی طاقتیں آ گئیں۔ طاقتیں آپ کے اندر تھیں۔ یہ وہ دودھ تھا جو اوپر چڑھا ہوا تھا۔ یہ جو شدتِ آرزو ہوئی ہے اس نے ان تمام صلاحیتوں کو اتنی زور سے آواز دی اور اتنے زور سے صلاحیتوں کو کھینچا کہ آپ کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوگئی اور اگلا مرحلہ یہ ہوا کہ اس شدتِ آرزو سے جسے آپ دعا کہتے ہیں خود آپ کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

دراصل انسان کے اندر کی تبدیلی ہی وہ ملکہ ہے جو باہر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرتی ہے

چناں چہ علامہ اقبالؒ نے اس کیفیت کو دوسرے الفاظ میں (ضربِ کلیم میں) اسی غزل میں (جس کا ایک شعر پہلے پڑھا ہے) بیان کیا ہے کہ

تری دُعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی

خدا کا قانون' قانونِ مکافاتِ عمل کے نتائج' اٹل ہوتے ہیں۔

تری دُعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے

اس تیرے بدلنے سے ہی تو سب کچھ باہر کی دنیا بدل جاتی ہے۔ یہ تو انسان کے اندر تبدیلی ہے جس سے باہر کی ساری کائنات بدل جاتی ہے۔

مؤثر انداز میں صحیح نتائج کے ثمرات انفرادی تگ وتاز کی بجائے ہمیشہ اجتماعی نظام کے رہینِ منت ہوتے ہیں

اب بات کیا ہوئی؟ بات ہوئی آرزو کی بیداری کی۔ اس کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ ایسی آرزو ہونی چاہیے جو خدا کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق ہوتا کہ اس کا انجام میرے لیے شر نہ ہو' خیر ہو۔ اس کے حصول کے لیے شدتِ آرزو ہو' جس سے عظیم عزم ہو' پختہ ارادے ہوں اور ہمتیں بیدار ہوں' پھر اس کے مطابق اگلا قدم یہ ہے کہ آپ عملاً اس کے حصول کے لیے آگے بڑھیں اور جو کچھ اس راستے میں حائل ہو' جتنی تکلیفیں آئیں' جتنے مرحلے آئیں' جس قدر رکاوٹیں پیش آئیں' ان کو آپ پھاندتے' پار کرتے چلے جائیں۔ قدم قدم پر آپ کی دعاؤں کا جواب اس طرح سے ملے گا۔ اور یہ جو چیز ہے' یہ صحیح اجتماعی نظام کے اندر ہمیشہ نتائج پیدا کرتی ہیں۔ انفرادی طور پہ اگر آپ کی آرزو بھی صحیح ہے' کوشش بھی اس کے لیے کرتے ہیں' مگر جو نظام

باہر کا ہے' وہ نہایت باطل ہے' تخریب کا ہے۔تو تنہا آپ کی کوشش ان سب کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔یہ ایک اجتماعی کوشش ہے جس سے یہ نتائج یوں مرتب ہوتے ہیں۔

خوشگوار زندگی کے لیے سورۃ الفاتحہ میں بیان کردہ ایک عظیم راہنمائی کی وضاحت کے سلسلہ میں اجتماعی زندگی کی اہمیت' اس کی افادیت اور تاکید

برادرانِ عزیز! یہ ہے وہ چیز کہ آپ سارے قرآن میں دیکھیے' ہر دعا جمع کے صیغے میں ہے۔پہلے ہی سورۃ الفاتحہ میں یہ ہے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4)۔یہ اکیلا' تنہا' انسان نماز پڑھ رہا ہوتا ہے لیکن واحد کے صیغے کے اندر دعا نہیں مانگ رہا بلکہ یہ ہے کہ ''ہم تیرے احکام کے مطابق تیری اطاعت کرتے ہیں' تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں اور اس کے بعد ہم تجھ ہی سے یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہماری یہ کوششیں' ہماری یہ توانائیاں بھرپور نتائج پیدا کریں''۔اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (9:119) (اے ایمان لانے والو! قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہ داشت کرو' سنو! یہ) انفرادی زندگی نہیں ہے۔وہ جو یوں سچائیوں کو قبول کیے ہوئے ہیں' ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ہم غلط معاشرے کے اندر روز پٹتے ہیں۔نہایت عمدہ دیانتدار' امانت دار' صحیح آرزوئیں رکھنے والے پٹتے' یہ اس لیے پٹتے ہیں کہ انفرادی طور پر یہ الگ الگ رہتے ہیں اور وہ جو جتھہ بنا لیتے ہیں' وہ نہیں پٹتے۔اب بجائے اس کے کہ یہ دیانت و امانت والے جتھہ بنائیں' وہ جتھہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں' یہ ایماندار تنہا ہوتا ہے۔قرآن میں ساری دعائیں اس لیے جمع کے صیغے کے اندر کہی گئی ہیں۔

دوسروں کے لیے دعا کرنا یا دعا دینے کا بنیادی مفہوم

اب اگلی بات آجاتی ہے۔ہم کسی کے لیے جو دعا کرتے ہیں کہ اچھا بھئی! اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے' تمہیں شفا دے۔بھئی! یہ کیا چیز ہے؟ یہ اس کے لیے ہماری اپنی نیک آرزوؤں کے اظہار کا نام ہے' یہ دوسرے کو Moral Support (اخلاقی مدد) دیتی ہے۔جب آپ کہتے ہیں کہ اچھا بھئی! میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں اس کام میں کامیابی دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تائید کرتے ہیں کہ تمہارا کام ٹھیک ہے' تمہارا مقصد اچھا ہے۔ہم اسے Support کرتے ہیں ہم اسے Appreciate کرتے ہیں۔آپ دیکھتے ہیں کہ جسے Moral Support (اخلاقی مدد) کہتے ہیں وہ Material Support (مادی مدد) تو نہیں ہوتی' وہ کسی کی مادی مدد تو نہیں ہوتی لیکن اس سے اس کے اندر ایک تقویت پیدا ہوتی ہے کہ ہاں! میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ

صحیح فیصلہ ہے۔ اُنہوں نے بھی اس کی تائید کی ہے' وہ بھی کہتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تمہیں اس میں کامیابی عطا کردے۔ اس سے خود ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو ہم دوسرے کے لیے کہتے ہیں۔

دوسروں کے کسی تعمیری کام میں ہم آہنگی کا اظہار بھی ایک قافلے کا اثر رکھتا ہے

ہم دوسرے کے لیے دعا کرتے ہیں کہ ایسا ہو جائے۔ یہ ٹھیک ہے یہ ہونا چاہیے۔ اگر ہم کسی کے اچھے کام میں اس کی کوئی اور مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنی Moral Support تو اس کو دیں' Appreciate تو کریں' تاکہ اسے اور اس کے اس کام کو تقویت تو پہنچے کہ میں جو جا رہا ہوں' میرے مقصد کے ساتھ' بہر حال اور بھی ہم آہنگ ہیں۔ یہ ہے کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (9:119) کی کیفیت۔ ان کا ساتھ ہو جانا جو ہے یہ ان لوگوں کا ایک قافلہ بن جاتا ہے جو ایک نصب العین اور ایک منزل اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ آج کل کے سفر میں تو قافلوں کی کیفیت نہیں ہوتی لیکن آپ سوچیے تو سہی اس زمانے کا سفر کہ سارا راستہ رہزنوں سے اور قزاقوں سے پٹا پڑا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج رہزن اور قزاق جو ہیں وہ آپ کو آبادیوں میں ملتے ہیں' جنگلوں میں نہیں ملتے' وہاں ان کی ضرورت نہیں لیکن وہ زمانہ جب وہاں تنہائیوں میں یہ کچھ ہوتا تھا' وہاں تنہا سفر کرنے والا ہر قدم کے اوپر لٹنے کے اندیشے میں ہوتا تھا' وہاں قافلے کی ضرورت ہوتی تھی۔

قافلہ کس کو کہتے ہیں؟ یہ ہے ایک نصب العین' ایک منزل' پر پہنچنے والے اکٹھے چل پڑتے ہیں۔ اس میں اور کیا ہوتا ہے۔ لیکن کتنی تقویت ہوتی ہے قافلے کے ساتھ جانے میں۔ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (9:119) یہ ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے تمام دعائیں جمع کے صیغے میں کہی ہیں۔ دعا انفرادی چیز ہے ہی نہیں۔ ایک کی دوسرے کے ساتھ تقویت ہوتی ہے۔

پانی کا ایک ایک قطرہ مل کر ہی سمندر کی صورت میں ثابت رہتا ہے اور سمندر کی ہی خصوصیات کا حامل ہو جاتا ہے

کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَ صَابِرُوۡا وَ رَابِطُوۡا قف (3:200) اے وہ جو اب اس پروگرام کی صداقت پہ یقین رکھتے ہو! خود ثابت قدم رہو' دوسروں کو ثابت قدم رکھنے کا ذریعہ بنو۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ذریعہ بنو؟ کہا کہ رَابِطُوۡا قف (3:200)۔ یہ جو پانی ہے ذرا تیز ہے' یوں اکیلے اکیلے چلو گے تو بہہ جاؤ گے۔ یہ بانہوں میں بانہیں ڈال کر جو تیز ندی کو پار کرنے کے لیے چلنا ہوتا ہے' اسے رَابِطُوۡا قف (3:200) کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ چیز کرو۔ نیک آرزوؤں کا اظہار دوسرے

کے لیے کرو۔ اب اس کے ساتھ آپ دیکھتے ہیں کہ ہماری دعائیں کیا رہ گئیں؟ پہلی دعا تو وہی ہے جو قرآن نے کہا تھا کہ ندی کے کنارے پیاسا کھڑا ہے' ہاتھ بڑھائے ہوئے ہے' کہہ رہا ہے کہ آ جا پانی منہ میں۔ منہ میں نہیں آئے گا۔ اب یہ خود منہ میں نہیں آتا تو حضرت صاحب کے پاس چلے جاتے ہیں: ''میرے لیے خدا سے دعا کیجیے جی کہ وہ یہ کچھ کرے''۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ بڑا نیک کام ہے جو ہم کر رہے ہیں لیکن یہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

خدا اپنے قانون کو کسی حضرت صاحب کی خاطر تبدیل نہیں کرتا مگر ہم سوچتے نہیں ہیں

عزیزانِ من! بات وہی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسی پر بھیڑوں کی طرح چلے جا رہے ہیں۔ کھڑے ہو کر کبھی نہیں سوچتے کہ ہم یہ کر کیا رہے ہیں۔ خدا نے یہ کہا ہے کہ جہاں بھی کوئی پکارنے والا ہم کو پکارتا ہے' ہم اس کی پکار کا جواب دیتے ہیں مگر ہم ہیں کہ جہاں کوئی پکارنے والا پکارتا ہے' ہم جو ان کے پاس جاتے ہیں' تو ان سے یہ کہتے ہیں کہ جی! وہ خدا آپ حضرت صاحب کی دعا کو جلدی سن لیتا ہے۔ کیوں؟ یہ اس کے نزدیک مقرب ہیں یعنی وہ آپ کے قریب ہیں اور ہم سے دور ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو کہو کہ (اِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ) (2:186) میں تم میں سے ہر ایک کے قریب ہوں۔ ہم عملاً اسے کہتے ہیں کہ آپ ذرا تکلف برت رہے ہیں' قریب تو آپ انہی کے ہیں ''ساڈا دل رکھن نوں ایویں کہی جاندے پئے ہیگے او'' (ہمارا تو دل رکھنے کے لیے یونہی کہے جا رہے ہو)۔ یعنی ہم یہ کچھ جا کر کہتے ہیں۔

خدا کا کسی خاص کے قریب ہونے کا غلط مفہوم اور دعا مانگتے وقت انسانی کیفیت

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ تَتَفَكَّرُوۡا ۟ قف (34:46) سوچا کرو مگر یہ ہیں کہ یہ ان کو مقربینِ بارگاہِ الٰہی کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ (2:186) میں ہر وقت ان کے قریب ہوں۔ اور اُجِیۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) ہر بلانے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب مجھے پکارتا ہے مگر ہم ہیں کہ ان حضرت صاحب کے پاس جاتے ہیں۔ کیوں جاتے ہیں؟ اس لیے کہ یہ وہی خدا کے متعلق غلط تصور ہے۔ ہمارا جب دورِ ملوکیت آیا تو اس دور میں تو پھر قدم قدم پہ دعاؤں کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان دعا اس وقت کرتا ہے جب اس کا کوئی بس نہیں چلتا۔ جب وہ بے بس ہو کر رہ جاتا ہے پھر اپنے آپ کو کچھ تسکین دیتا ہے۔ جب کسی کے کام ہوتے چلے جاتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس وقت دعا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہاں پڑتی ہے جب کام نہیں ہوتا۔ جتنا غلط نظام ہوگا اتنی ہی رکاوٹیں ہر شخص کے راستے میں زیادہ حائل ہوتی چلی جائیں گی' اس کو اتنی ہی دعا کے لیے

زیادہ مجبوریاں پیش آتی چلی جائیں گی۔

تقسیمِ پاک و ہند سے پہلے یا بعد' مزاروں پر رونق افروز ہونے والوں کی تعداد کی کیفیت اور اس کی وجہِ جواز

کبھی آپ نے اس پہ بھی غور فرمایا کہ اس پارٹیشن وغیرہ سے پہلے یا اس کے بعد کے دور میں بھی ہماری یہ مزاروں پہ رونق نہیں ہوا کرتی تھی۔کبھی غور کیجیے گا۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ اتنی رونق نہیں ہوتی تھی۔جتنا جتنا معاشرے کے اندر قانون کا احترام اٹھتا جاتا ہے' کام قاعدے قانون کے مطابق نہیں ہورہے' اتنی رکاوٹیں پیش آتی چلی جاتی ہیں یعنی اتنا ہی آدمی بے بس ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس بے بسی کا نتیجہ ہے جو اتنا ہجوم ہم ان مزاروں پر اور حضرت صاحب کے پاس دیکھتے ہیں۔

دعا کے متعلق حضرت عمر فاروق اعظمؓ کا ایک بصیرت افروز اعلان

میں نے اپنے پچھلے درس میں دہرایا تھا' اسے پھر دہرا دوں کہ اسلام کے صحیح غوامض عملی دنیا میں سیکھنے ہوں تو حضرت عمرؓ (581-644/45ء) سے سیکھیے۔عجیب شخصیت تھی صاحب! انہوںؓ نے خلافت کے بعد یہ کہا تھا کہ خدا نے میرے ذمے یہ بات لگا دی ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں۔اللہ اکبر! کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے۔اس نے کہا ہے کہ مجھے خلیفہ بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ تمہیں کوئی ایسی مشکل پیش ہی نہ آئے کہ تمہیں خدا سے کچھ مانگنا پڑے۔اور خدا سے مانگنے کے معنی یہ ہونگے کہ تم میری شکایت کرو گے۔جب ہی اس سے کہو گے کہ میرا کام نہیں ہوا۔تو اس کے تو یہ معنی ہیں کہ تم میرے خلاف شکایت کرتے ہو۔یہ میرا فریضہ ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں' راستے میں روک لوں۔عزیزانِ من! صحیح نظام میں تو خدا کے احکام کے مطابق' نظام ان دعاؤں کا جواب دیتا چلا جاتا ہے' خدا تک دعا بھیجنے کی ضرورت نہیں رہتی۔جتنا معاشرہ بگڑتا ہے اتنا ہی زیادہ انسان مجبور ہو جاتا ہے۔اپنی تسکین کے لیے خود بھی دعائیں کرتا ہے' حضرت صاحبوں کے پاس بھی جاتا ہے۔صاحب! اس غلط معاشرے میں تو بڑا کاروبار چلا ہوا ہے۔ہر غلط کار کا چلا ہوا ہے' حضرت صاحب کا کیوں نہ چلے گا۔

خدا کا غلط تصور انسانی زندگی کو اجیرن بنا دیتا ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ ہمارا موجودہ اسلام دورِ ملوکیت کا ہے۔کہنے کو تو ہم نے یہ کہا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔دراصل ہم نے خدا کو آسمان پر بادشاہ کا سایہ بنایا کہ وہ عرش پر بیٹھا ہے' اس کے گرد کچھ مقربین ہیں'

وزرا ہیں' درباری ہیں' کچھ قصیدہ خواں ہیں' وہاں پھر حاجب اور دربان ہیں۔ دور کہیں دروازہ ہے' وہاں بھی کچھ لوگ کھڑے ہیں' آنے والے سے پوچھتے یہ ہیں کہ کیا پاسپورٹ' کوئی چِٹھی ہے؟ مقربین ہیں تو ہاں صاحب! چلے جایئے۔ دوسرا کوئی جاتا ہے تو اس کو وہاں سے دھکا مل جاتا ہے کہ چل اوئے چل! بھاگ جا' بھاگ جا۔ ''اے درخواست اوتھے دینی ہیگی اے۔ جا اوئے جا! روز آجاندے ہیگے نیں۔ آپا جاڈبے دے اندر۔ اوشام نوں ڈبہ مع درخواستاں دے ختم ہو یا ہونداہیگا'' (یہ درخواست وہاں دینی ہے' چلے جاؤ' اور منہ اٹھا کر چلے آتے ہو۔ یہ کچھ ڈبے میں ڈال جاؤ۔ شام تک وہ ڈبہ درخواستوں اور اس کچھ ڈالنے سے بھر جاتا ہے)۔ بجز اس کے کہ وہ ''ڈبے پیرداڈبہ نہ ہووے'' (لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ڈبہ ڈبے پیر کا نہ ہو)۔ یہ تصور ہم نے اپنے ذہن میں اس لیے رکھا ہے کہ ہم نے دیکھا کہ ملوکیت میں یہ ہوتا ہے۔ یہی ہوتا تھا! ہم نے بڑے پیمانے میں خدا کا یہی نقشہ ذہن میں رکھ لیا کہ ہماری درخواست براہِ راست اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہمیں کوئی ایسا ڈھونڈنا پڑے گا جو اس کا مقرب ہو۔ غلط معاشرے میں جو کام آپ کے ذہن میں آتا ہے تو کتنا ہی آپ حق پہ ہوں' کتنا ہی قانون کے مطابق ہو' پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ صاحب! کوئی ایسا آدمی تلاش کیجیے جو اس تک بات پہنچائے۔ ہے ناں یہ چیز۔ یہ تھی غلط معاشرے کی ضرورت کہ براہِ راست تمہاری بات نہیں سن سکتا وہ جج وہ حاکم وہ بادشاہ۔ تمہیں کسی کی وساطت سے اپنی بات' اپنی درخواست' وہاں تک پہنچانی ہوگی۔ ملوکیت کی جو یہ بات پیدا ہوئی' خدا کو ہم نے سب سے بڑا احکم الحاکمین سمجھا۔ سمجھا کہ یہاں اس تک براہِ راست درخواست نہیں پہنچتی تو اُس تک براہِ راست ہماری درخواست کیسے پہنچے گی؟ اس کے مقربوں کو تلاش کرو۔ پھر یہاں کا تجربہ بھی ہمارے سامنے تھا۔ مقربین کے متعلق پھر یہ بات پیدا کی کہ ''ایناں بزرگاں کول ایویں بانہواں لٹکوندے نئیں ترے جائیدا ہوندا'' (ان بزرگوں کے ہاں خالی ہاتھ نہیں جایا جاتا)۔ آپ دیکھیں گے کہ آدمی کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ وہی تصور ہے۔ اب ان کی منت ہو رہی ہے' سماجت ہو رہی ہے۔ وہ انکساراً کہتے ہیں کہ نہیں بھائی! تم کو کسی نے غلط بتا دیا تھا' میرے ان کے ساتھ ایسے مراسم اور ایسے تعلق کی بات نہیں ہے۔ وہ تو بڑے انصاف پسند ہیں' یہ بات نہیں ہے۔ اور وہ پھر اور لجاجت کرتا ہے' گڑگڑاتا ہے' دہائی دیتا ہے کہ نہیں جی! یہ کچھ ہے۔ شاید سودا بھی کرتا ہے۔ کر کرا کے اچھا بھئی! ہم کوشش کریں گے۔ وہ عرضی لے لیتا ہے تو آپ کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ اب پہنچ جائے گی۔ ہر بزرگ کے پاس جب جاتے ہیں اور آپ سے وہ کہہ دیتا ہے تو اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب خدا تک بات پہنچ جائے گی۔ اس سے پہلے اس تک نہیں پہنچنی تھی۔ جس نے کہا تھا کہ اِنِّیْ قَرِیْبٌ ط (2:186) اس سے کہہ دو کہ میں تمہارے قریب ہوں اور اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ لا (2:186) جب بھی کوئی شخص اپنی راہ نمائی کے لیے مجھے پکارتا ہے تو میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے

اندر محفوظ ہے اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔

مقربین کے ذریعے خدا تک پہنچنے کا تصور قرآنِ حکیم کے ہی خلاف ہے

برادرانِ عزیز! سوچو تو سہی ہم کونسا اسلام لیے پھر رہے ہیں۔ اور ہم قرآن کی کتنی تکذیب کرتے ہیں۔ خدا ہر بلانے والے کے بلانے کا جواب دیتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کام بہت بڑی نیکی کے گنے جاتے ہیں۔ کبھی ذہن میں بھی نہیں آتا کہ صاحب! اس میں کوئی چیز ایسی خلاف ہوسکتی ہے۔ ہجوم چلا ہوا ہے دعائیں منگوانے کے لیے ان کے پاس۔ اب یہاں سے پھر یہ بھی معدودے چند ہوتے ہیں۔ کچھ یہاں شاید سودا مہنگا پڑتا ہے تو قبروں کے سرہانے پہنچ جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم مُردوں کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وہ تمہاری پکار سن ہی نہیں سکتے۔ یہ نصِ صریح قرآن کہتا ہے کہ اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ (16:21) مردہ ہیں' زندہ نہیں ہیں وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ (16:21) ان کو تو اپنے متعلق بھی کچھ پتا نہیں ہے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے' وہ تمہاری کیا سنیں گے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ وہ جو دربان باہر کہا کرتا ہے کہ جاؤ جاؤ! یہ کسی کی سفارش نہیں مانا کرتے' یہ کسی کی بات میں نہیں آتے۔ ہم اس کو کبھی نہیں سچا مانتے۔ کہتے ہیں کہ یہ یونہی کہتا ہے' مقصد کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ کبھی نہیں مانتے۔ سنیے! خدا کہتا ہے کہ اِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡا دُعَآءَ کُمۡ ۚ (35:14) تم انہیں ہزار پکارو' یہ تمہاری بات سن ہی نہیں سکتے۔ وَ لَوۡ سَمِعُوۡا مَا اسۡتَجَابُوۡا لَکُمۡ ؕ (35:14) اور بفرضِ محال اگر کبھی سن بھی سکتے تو جواب ہی نہیں دے سکتے تمہاری بات کا۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے اس کے باوجود وہاں ہم ان مُردوں کے سرہانے کھڑے ہیں۔ ان کو پکار بھی رہے ہیں۔ ایمان یہ ہے کہ سن رہے ہیں' پکار کا جواب بھی دیتے ہیں۔ یہ جو اللہ میاں کہہ رہا ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ) اس دربان چپڑاسی (Peon) کی طرح ہے جو یہ کہتا ہے کہ جاؤ جاؤ! حضرت صاحب نہیں مانا کرتے۔ ایسے ہی کہہ رہا ہے۔ خدا یہ کہہ رہا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کتاب کو پسِ پشت ڈالنے سے ہم کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ جو یہ زندہ انسانوں کے پاس جا کر حرکتیں ہم کرتے پھر رہے ہیں' ان کی وساطت سے خدا تک بات پہنچادی۔ پھر ان مُردوں کے سرہانے جا کر یہ کچھ کرنا چہ معنی دارد۔ یہی بات نہیں کہ یہ ہماری منطقی دلیل کی رو سے بے معنی بات ہے بلکہ قرآن کی نصِ صریح ہے۔ ایک نہیں اس کے مطابق بیسیوں آیات ہیں لیکن یہ سب کچھ کیے چلے جا رہے ہیں۔

کسی تعمیری پروگرام کو عملی شکل دیے بغیر دوسروں کے سرہانے جنتی معاشرے کی اُمیدیں چہ معنی

عزیزانِ من! میں کہتا ہوں یہی کچھ کم وجۂ تذلیلِ انسانیت نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے جا کر گڑگڑا کر

ہاتھ پھیلا رہا ہو' اس سے یہ کہہ رہا ہو کہ ہمارا یہ ضرور کام کر دیجیے۔حق یہ ہے انصاف چاہ رہا ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے سامنے یہ کتنا ذلیل ہو کر کھڑا ہوتا ہے۔یہی کچھ کم ذلت کی چیز نہیں ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جتنے ہم نے حضرت جی بنا رکھے ہوتے ہیں' ان کی بارگاہ میں پہنچنے پر آپ کتنا گڑگڑاتے ہیں۔وہاں آپ سجدہ کرتے ہیں۔جرأت نہیں ہوتی کہ آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کریں۔آپ کا سر جھکا ہوا ہے۔اور اس کا اگلا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے خلاف دل کے اندر بھی کوئی بات نہ گزر جائے' یہ دل کی باتوں کو بھی جانتے ہیں۔اور حضرت صاحب اگر کبھی غضب میں آ گئے تو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔

مقامِ انسانیت کی عظمت کے برعکس ذلّت کی انتہائی شکل کا شافی علاج

اس سے زیادہ بھی کسی انسان کی ذلّت کچھ اور ہو سکتی ہے کہ اپنے جیسے انسان کے سامنے بیٹھا ہوا اور اس کی یہ کیفیت ہو۔اس سے بھی آگے ذلّت کی انتہا ہے کہ انسان بھی وہ نہ ہو' اس کی لاش کے متعلق یہ ہو کہ جہاں اس کو ہم نے مٹی کے نیچے دبایا تھا۔لاش باہر پڑی ہوئی تھی تو مردہ بدستِ زندہ یعنی جو جی میں آئے آپ اس کے ساتھ کیجیے۔وہ غوث ہوں' وہ قطب ہوں' وہ ابدال ہوں کچھ بھی ہوں' وہ کبھی یہ نہیں کرتے کہ آپ ٹھنڈے پانی سے غسل دیں اور وہ کہیں کہ ''اوئے کی کرنا پیا ہیگا ایں تُوں''(ارے ارے! یہ تم کیا کر رہے ہو)۔سوال ہی نہیں ہے۔یعنی وہ سرتاپا آپ کے بس میں ہیں۔اور جب آپ نے ان کو ہزار من مٹی کے نیچے دیدیا تو سرتاپا آپ ان کے بس میں ہیں۔اب آپ جتنے اوپر رہنے والے ہیں یہ سارے کے سارے پابند ہیں ان کے جو آپ کے پاس یوں تھے اور ان کو آپ نے یوں دبایا تھا۔اور جن کے متعلق آپ کا خدا یہ کہہ رہا ہے کہ بابا! وہ نہیں سن سکتے' نہیں جواب دے سکتے۔کوئی اور نہیں جو تمہاری مدد کرے' صرف قانون' ہماری کتاب' آپ کی مدد کرے گی۔زندگی کے دوراہے پر اسے پکارو' اس کے بعد دیکھو کہ یہ کس طرح تمہیں جواب دیتی ہے۔جواب یہ ہے کہ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ (3:195) جواب یہ ہے تمہاری پکار کا کہ ہم کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتے۔عورت ہو' مرد ہو۔تخصیص وتمیز کی بات نہیں۔تم سب ایک ہو' اس میں تخصیص کیا؟ یہ تو تمہاری جہالت کا زمانہ تھا کہ تم نے اپنے جیسے انسانوں کو اپنے سے ذلیل صنف قرار دیدیا۔خدا کی نگاہوں میں دونوں یکساں احترام کے واجب انسان ہیں۔عورت اور مرد میں قرآن کوئی تمیز نہیں کرتا۔کہتا ہے کہ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا (3:195)۔عزیزانِ من! یہ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ (3:195) دونوں کے متعلق آ رہا ہے: مرد عورت دونوں کے متعلق ہے کہ ہجرت بھی ہے' میدانِ جنگ میں جانا بھی ہے۔یہ سب چیزیں ہیں۔آگے کہا ہے کہ لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ

وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (3:195)

یہ ہے میری قرآنی بصیرت کے مطابق دعا کا مفہوم جو قرآن کہتا ہے۔ پھر میں عرض کردوں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر خدا کی کتاب کو پکارنا کہ مجھے معلوم ہوجائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس کے بعد منزل کا تعین' اس کے حصول کے لیے دل کے اندر ایک آرزو کی بیداری' شدتِ آرزو' اس کے بعد اس کی طرف قدم اٹھنا' قدم قدم پہ یہ دیکھتے چلے جانا کہ میں راستے سے اِدھر اُدھر تو نہیں ہٹ گیا' استقامت وثبات رکھنا' یہ سب کچھ کیجیے تو قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّـذِیْـنَ قَـالُـوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (41:30) یوں جو رہگذر جاتا ہے ثبات واستقامت سے چلا جاتا ہے' خدا کے فرشتے اس پہ نازل ہوتے ہیں۔ یہ ہے خدا کے ہاں سے دعا کا قبول ہوجانا۔ اور یہ ہے حُسْـنُ الثَّـوَابِ (3:195) (اعمال کا ایسا حُسن کارانہ بدلہ' قانونِ خداوندی کی رو سے ہی مل سکتا ہے)۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ (3:196)۔ عزیزانِ من! یہ دوسری بات شروع ہوگئی۔ سورۃ آلِ عمران کی تین چار آیتیں رہ جاتی ہیں لیکن بات ان میں دوسری آجاتی ہے۔ اس لیے ہم انہیں آئندہ لیں گے۔

سورۃ آلِ عمران کی آیت 195 ہمارے سامنے تھی۔ اور اسی ضمن میں' میں نے دعا کے موضوع پہ آپ کے سامنے قرآن کی دوسری آیات پیش کیں۔ خدا کرے کہ میں اپنے مطلب کی وضاحت اچھی طرح کرسکا ہوں اور آپ کے دل میں جو اس کے متعلق غلط فہمیاں چلی آرہی تھیں' وہ قرآن کی روشنی میں دور ہوگئی ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

پینتسیواں باب: سورۂ آلِ عمران (آیات 195 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنِ حکیم کی روشنی میں مرد وزن کی حیثیت اور رفاقت اور پھر ہمارے ہاں کی بیان کردہ روایات کی نوعیت

عزیزانِ من! آج مئی 1970ء کی 31 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی 195 آیت سے ہوتا ہے۔ یہ آیت تو سابقہ درس میں بھی سامنے آ گئی تھی بلکہ پورا درس ہی اس آیت کے مفہوم پر مشتمل تھا۔ دعا کے متعلق موضوع تھا ہمارا' اسی سلسلے میں یہ آیت آئی تھی۔ اور ہمیں اس کے بعد آگے بڑھ جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس میں تین لفظ ایسے آ گئے ہیں کہ جنہوں نے پھر انسانیت کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ جی نہیں چاہتا کہ اتنی اہم بات سامنے آ جائے اور اس سے ہم سرسری طور پر

آ گے گزر جائیں۔قرآنِ کریم کا تو کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے کہ جس سے انسان سرسری طور پر آ گے چلا جائے۔وہ تو ایک ایک لفظ کے متعلق تدبر اور تفکر کی دعوت دیتا ہے‘ علم وبصیرت کو پکارتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یوں ہی ان چیزوں سے آنکھیں بند کر کے آ گے نہ بڑھ جایا کرو۔ بڑی عظیم حقیقت ہے اس میں جو قرآن بیان کر گیا ہے۔الفاظ ہیں وہ اور بظاہر آپ دیکھیں گے کہ اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئے گی۔کہا یہ تھا کہ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ (3:195) دعا کے متعلق بات ہو رہی تھی اور کہا تھا کہ ٹھیک ہے تم ہم کو پکارتے ہو‘ ہم تمہاری پکار کو سنتے ہیں اور پکار کا سننا یہ ہے کہ تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کے اجر کو ہم ضائع نہیں کیا کرتے۔اور اس کے ساتھ تھی چیز مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ج (3:195) وہ مرد ہو یا عورت ہو۔اور اس کے آ گے ہیں وہ تین لفظ جن کی طرف میں نے توجہ ابھی مبذول کرائی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مقامِ عورت کی وضاحت اور اس کی اہمیت

بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ج (3:195) بڑے ہی آسان سے لفظ بلکہ بَعْضٍ ج(3:195) تو ایک ہی چیز جسے دہرائی اور درمیان میں تو وہ مِّــــــنْ ایک حرف آیا ہوا ہے۔یہ ایک پورا فقرہ بھی نہیں ہے تین لفظ ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ ایک عظیم انقلاب ہے ان الفاظ کے اندر۔ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ج(3:195) مرد اور عورت اور ان کے متعلق یہ بات کہی گئی ہے۔میں پہلے ذرا اس کا پس منظر بیان کرلوں‘ اس کے بعد یہاں تک پہنچوں گا تو پھر ان الفاظ کی اہمیت اجاگر ہو کر آپ کے سامنے آئے گی کہ قرآن کہہ کیا گیا‘ قرآن کر کیا گیا ہے اس میں۔عورت کی حیثیت کیا ہے؟ سیدھی سی بات ہے جب ہم انسان کہتے ہیں اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔انسان کو قرآن نے اتنا بڑا مقام دیا ہے کہ ملائکہ اس کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔اب جب انسان کو یہ مقام دیا ہے تو یہ مقام صرف مردوں کے لیے تو مخصوص نہیں۔یا توصفِ انسانیت سے نکال دیجیے اس آدھی آبادی کو اور پھر اس کے لیے کوئی دوسری ہدایات‘ دوسرے احکام ڈھونڈیے۔اور اگر آپ ان کو انسان کی صف میں رکھتے ہیں تو جو کچھ قرآن نے انسان یا بنی آدم کے لیے کہا ہے‘ اس کا اطلاق یکساں طور پہ مرد اور عورت دونوں پہ ہوتا ہے۔بات بڑی صاف سی ہے لیکن اتنی صاف اور واضح ہونے کے باوجود دنیا میں کسی حیوان نے بھی اپنے جوڑے کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو مرد نے اپنی اس صنفِ نازک کے ساتھ کیا ہے۔معلوم نہیں وہ کون سا منحوس دن تھا جس میں یہ چیز مرد کے ذہن میں آئی کہ مرد حاکم ہوتے ہیں‘ عورت ہمیشہ پست و محکوم ہوتی ہے۔تاریخی اعتبار سے تو بات اتنی سی تھی کہ فطرت نے جو وظائف‘ جو فرائض طبعی طور پر عورت کے سپرد کیے تھے‘ ان کی وجہ سے عورت کچھ وقت کے لیے کام کاج کرنے سے معذور ہو جاتی تھی۔عورت آنے والی انسانیت کی نسل کی تربیت کا مرکز ہوتی ہے۔

مرد کو اس کے لیے شکر گذار ہونا چاہیے تھا کہ وہ اتنا اہم فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔لیکن دنیا میں تو ہوتا یہ ہے کہ وجہ کوئی بھی ہو جب بھی کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہوتا ہے تو وہ اس کو EXPLOITE کرتا ہے۔ یہ جو اتنے دنوں کے لیے بے چاری معذور ہوئی کام کاج کرنے سے تو میاں صاحب نے اس کو EXPLOITE کیا۔اور اتنے وقت کی بات نہیں ہے کہ حمل اور وضع حمل اس کے بعد تو یہ بچے کی پرورش میں اتنا سارا وقت اس کا صرف ہو جاتا ہے۔اور پرورش ہی نہیں ہے اس میں تو تربیت بھی ہے اور تربیت بھی اس قسم کی کہ قرآن نے جو قوم کے لیے لفظ امت تجویز کیا ہے' استعمال کیا ہے اس کا تو مادہ ہی ام ہے جس کے معنی ہی ماں ہیں۔ امت تو بنتی ہی ماں کے آغوش میں ہے۔اب جس ہستی نے ایک امت کی تشکیل کرنی ہے آپ سوچیے تو سہی کہ اس کے فرائض حیات کتنے زیادہ کتنے مقدس' کتنے بلند اور پاکیزہ ہو جاتے ہیں۔اگر اس کو اس کا احساس ہوتا تو صرف اس فریضے کی بنا پہ جو وہ سر انجام دے رہی ہے' اس کے پاؤں دھو دھو کے پیتا۔لیکن محض اس لیے کہ اس دوران میں وہ روٹی کمانے کے قابل نہیں رہی انہوں نے EXPLOITE کیا عورت کو۔ساری تاریخ یہ چلی آ رہی تھی۔

عورت کے سلسلہ میں ارسطو جیسے نامور مفکر کی سوچ اور عیسائیت میں پائے جانے والے تصورات

مجھے اس تاریخ کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔کیفیت یہ تھی کہ اتنے اتنے بڑے مفکر' جہلا کی بات نہیں ہے' ارسطو جیسا مفکر جو اس وقت تک دنیائے منطق میں چھایا ہوا چلا آ رہا ہے اڑھائی ہزار سال سے منطق کی دنیا میں' تو فکر اس کا گردوں پیما اور گھر میں عورت کے متعلق کیفیت یہ کہ وہ کہتا تھا کہ مرد کے منہ میں تو بتیس دانت ہوتے ہیں عورت کے دانت بھی اٹھائیس ہی ہوتے ہیں۔یعنی ساری عمر اتنی تکلیف ہی گوارا نہیں جناب نے فرمائی کہ ذرا دیکھ تو لے۔ پسلیاں اس کی کم ہوتی ہیں دانت بھی کم ہوتے ہیں اور دماغ تو وہ کہتا تھا ہوتا ہی نہیں ہے۔روح کے متعلق تو فیصلہ تھا نا کہ وہ ہوتی مردوں میں ہے' چلیے قصہ ختم ہوا۔ یہ مفکرین جو دنیا کے بلند ترین مفکر تھے وہ یہ کچھ نظریہ لیتے آتے تھے۔لیکن سب سے بڑا دھچکا جو یہاں آ کے دیا اس کو وہ عیسائیت نے آ کے دیا۔حضرتِ عیسیٰؑ نے شادی نہیں کی تھی' تجرد کی زندگی گذاری۔اس کے اسباب کیا تھے اس کی ضروریات کیا تھیں ہم اس کی تفصیل میں نہیں جاتے۔انہوں نے تجرد کی زندگی گذاری تھی۔اب عیسائیوں کے نزدیک حضرتِ عیسیٰؑ کا یہ فیصلہ اس کی ایک ہی توجیہ ہو سکتی تھی کہ عورت اس قابل ہی نہیں ہے کہ کسی مقدس ہستی کے قریب جا سکے۔اور جو پھر عورت کے خلاف ایک پورے کا پورا نفرت کا جہاد (QUOTED کہہ رہا ہوں میں) جو شروع ہوا ہے عیسائیت کے اندر پوچھیے نہیں صاحب۔ گناہوں کا اولیں سرچشمہ عورت' اس لیے کہ آدم کو جنت سے نکلوانے کا باعث عورت۔ایسا گناہ کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ اس گناہ کی آلائش اپنے ساتھ لے

کے آ تا ہے اور وہ کسی عمل سے دھل ہی نہیں سکتی۔ اتنا گہرا اثر ہے اس گناہِ اول کا کہ بالآخر (ان کے الفاظ میں کہہ رہا ہوں) وہ مغموم باپ جس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا یعنی خدا ان کا کہ اب کیا کیا جائے' بچے پیدا ہو رہے ہیں پہلا گناہ اتنا زیادہ وہ ایسی وہ سیاہی وہ جو کہتے ہیں مٹا نہیں کرتی وہ لگ گئی' دھل سکتی نہیں کریں کیا؟ اب باپ بیٹے دونوں مشورہ کر رہے ہیں ایک ہی طریق سمجھ میں آیا۔ بیٹے نے کہا کہ آپ یہ کر بیٹھے ہیں' اس کا علاج کوئی نہیں سوائے اس کے مجھے بھیجئے۔ مجھے پھانسی دلوایے اور میرے خون کا کفارہ یہ لے کے ان لوگوں کو بخش دیجئے' اب اور کیا کیا جائے۔ بات میں کہہ رہا تھا اولیں گناہ' عورت جس کا سرچشمہ چلی آ رہی ہے۔ اور وہ پھر نفرت کی لہر جو دوڑی ہے وہاں عیسائیت میں اس کے خلاف' مشکل یہ پیش آ گئی کہ اس خدا یا خدا کے بیٹے کی ماں حضرتِ مریمؑ وہ عورت تھی' کیا کریں؟ تو پہلی چیز تو یہ کہی گئی کہ حضرتِ عیسیٰؑ نے یہ کہا تھا کہ جنت میں جانے کے لیے تمام عورتوں کو مرد بنا دیا جائے گا۔ اس سے بھی کام نہ چلا اس لیے کہ حضرتِ مریمؑ کی جو خصوصیت تھی ماں ہونے کی' اس کو تو مٹانا نہیں چاہتے تھے۔ باپ تو موجود تھا۔ سینٹ پال کی گاسپل کے اندر اس کا حل یہ بتایا گیا کہ یہ مرد اور عورت کی تخصیص جو ہے' یہ دونوں ختم کر دی جائیں گی جنت میں جانے سے پیشتر' قصہ ہی ختم' پتہ ہی نہ چلے ماں ہے یا باپ ہے۔ ان کے ہاں کا یہ عقیدہ ہے' ان کی انجیل کے اندر کی یہ چیز کہ جنت میں کیسے بھیجا جائے؟ مصیبت میں پڑ گئے اس عورت کی وجہ سے' پہلے یہ رہا کہ عورت عورت ہی نہ رہے پھر یہ رہا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ عورت اور مرد کی یہ جو سیکس کی تخصیص ہے اس کو ختم کر دیا جائے اور پھر ان کو جنت میں بھیجا جائے۔ تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو تھا عقیدہ اس کا عمل کس طرح سے شروع ہوا؟ ان کے ہاں یہ جو مرد ان کے ہاں بڑے بڑے سینٹ یا بڑے بڑے ممتاز مذہبی عہدوں پہ ہوتے تھے روحانیت کی دنیا کے اندر' مقربین بننے کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو CASTRATE کرنا شروع کر دیا۔ میری بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہیں کیا کیا جائے بات تو کرنی پڑتی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے ہاں ایک فرقہ عیسائیوں کے ہاں بڑا مقدس فرقہ ہے وہ پورے کا پورا فرقہ ہی مخنثوں کا ہوتا ہے VELETIANS ان کو کہتے تھے سارے کا سارا فرقہ ہی۔ وہ پہلے یہ خود مخنث بنتے تھے پھر اس فرقے میں آتے تھے کہ مرد اور عورت کی تخصیص یوں ختم کر دی جائے۔ غور فرمایے کہ یہ نفرت کے جذبے انسانوں کو کہاں تک لے جاتے ہیں۔ تو اس قدر جس ہستی کو اتنا زیادہ ناپاک اتنا قابلِ نفرت قرار دے دیا جائے آپ سوچتے ہیں کہ نفسیاتی طور پر اس پہ کیا گذرے گی پھر۔ عورتیں ان کے ہاں آئیں اگر اس کلٹ کے اندر تو وہ آئیں جنہوں نے ساری عمر شادی نہیں کرنی' ان کی شادی مسیح کے ساتھ یا خدا کے ساتھ ہو جاتی تھی یہ نُنز جن کو آپ کہتے ہیں۔ مرد آئے تو وہ اپنی یہ خصوصیت جو تھی رجولیت کی یا رجل ہونے کی' اس کو ختم کرنے کے بعد CASTRATION کے بعد اس کے اندر داخل ہوں۔ کہ یہ امتیاز جو مرد

اورعورت کا ہے اس کو یہاں کسی طرح سے ختم کیا جائے۔ یہاں تک اس طبقے کو قابلِ نفرت قرار دے دیا گیا تھا ساری دنیا میں لہر چل گئی صاحب اس کے متعلق۔اس پس منظر میں آپ دیکھیے قرآن آتا ہے ذَكَرٍ اور اُنْثٰى کا ذکر کرتا ہے تذکیر و تانیث کا MALE & FEMALE کا صرف عورت اور مرد کا۔ یہ ذکر کرتا ہے بات تو کچھ اور چلی آ رہی ہے۔ دعا کے متعلق بات ہے کہہ یہ رہا ہے کہ کسی کام کرنے والے کے کام کا اجر وہ ضائع نہیں کرتا خواہ وہ عورت ہو خواہ مرد ہو۔اتنی ہی بات کچھ کم نہ تھی کہ عورت اور مرد دونوں کام کے اعتبار سے ایک مقام پہ کھڑے ہو گئے اور ان میں کوئی تفریق نہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزول سے پہلے دنیائے مذاہب میں مقامِ عورت

عزیزانِ من! آگے یہ بات ضمناً آ رہی ہے اور دیکھیے کتنا بڑا انقلاب ہے جو وہ برپا کر رہا ہے۔عورت کے متعلق یہ پس منظر ذہن میں رکھیے، ساری دنیا میں عورت کے متعلق یہ تصور تھا۔لڑکی کا پیدا ہونا جو تھا وہ گھر میں صفِ ماتم بچھا دیتا تھا۔خود عربوں کے ہاں یہ کیفیت تھی کہ زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ ہندو کے ہاں جو کیفیت ہے تو آج تک ہمیں معلوم ہے، اسی کا اثر ہمارے ہاں ہے۔ یہ بات تو میں بعد میں کروں گا کہ ہمارے ہاں پھر کیا ہوا۔اس پس منظر میں قرآن آ رہا ہے۔عرب کے اندر آ رہا ہے جو لڑکی کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ساری دنیا میں عورت کے متعلق یہ تصور فکر کی دنیا میں نہیں مذہب کی دنیا کے اندر، تقدس کی دنیا کے اندر عورت کے متعلق یہ تصور۔اور قرآن ضمناً جا رہا ہے اور کہہ رہا ہے ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ج بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ج (3:195) ان تین لفظوں کا ترجمہ ہی نہیں ہو سکتا میں کیا ترجمہ کروں اس کا۔ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ج (3:195)

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یہ ایک چیز ہے اس طرح سے آپس میں ایک دوسرے کے جذب ہو جانا کہ کوئی پہچان ہی نہ سکے کہ اس میں سے کون کون ہے، ایک ہو جانا اس طرح سے بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ج (3:195) عربی میں اس طرح سے آتا ہے۔یعنی جن میں کسی قسم کی کوئی تفریق تخصیص تمیز باقی نہ رہے۔تم ایک ہی ہو۔ یہ تین لفظ وہ وہاں استعمال کیا کرتے تھے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے جہاں ہر قسم کے امتیازات ختم ہو جائیں اور ایک ہو جائے کوئی۔ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ج (3:195)۔

معاشرتی زندگی میں بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ج (3:195) کے الفاظ مفہوم کے تحت مرد اور عورت کی باہمی رفاقت کی نوعیت کا نتیجہ

اس پس منظر میں آیئے اور دیکھیے کہ یہ ہیں انقلاب آفریں انقلاب یا نہیں کہ عورت یا مرد کے متعلق کہا جائے کہ تم آپس میں تفریق کچھ کرتے ہو؟ یعنی قابلِ نفرت قرار دینا تو بہت دور کی چیز ہے تفریق قرار دیتے ہو؟ انسان ہونے کی جہت سے انسان بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ج (3:195) تم تو ایک ہی ہو تم میں تو فرق ہی نہیں کیا جا سکتا ایک نوع کے دو فرد بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ج (3:195)۔ عزیزانِ من! بڑی عظیم چیز تھی۔ قرآن اس مقام کے اوپر لایا اور یہ تین لفظ ہی استعمال نہیں کیے اب اس کے بعد قرآن نے جو جو خصوصیات مردوں کی بیان کیں' مومن مردوں کی' مسلم مردوں کی' ساتھ اس کے اسی طرح سے دوش بہ دوش قدم بہ قدم' وہی خصوصیات عورتوں کی بیان کرتا چلا گیا۔ ایک ہی آیت پیش کرتا ہوں۔ آیت کو سامنے رکھیے اور پھر دیکھیے جسے آپ کہتے ہیں دوش بہ دوش چلنا' پہلو بہ پہلو' متوازی چلتے جانا دونوں کا' دیکھیے کہ کوئی مقام ایسا آتا ہے کہ جہاں ان میں سے ایک کا قدم بھی ذرا پیچھے رکھا ہو قرآن نے۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ (33:35) عربی نہ جاننے والے احباب کی اطلاع کے عرض کروں کہ یہ صیغے جو ہیں عربی زبان میں ایک صیغہ ان میں مذکر کے لیے آتا ہے دوسرا صیغہ مؤنث کے لیے آتا ہے عام طور پہ جس کے ساتھ 'ت' لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ(33:35) پہلے آیت پڑھوں تو اس میں آپ دیکھیے گا کیسے جا رہے ہیں دوش بہ دوش۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ(33:35) الفاظ آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہے قرآن۔ مسلم مرد مسلم عورت' مومن مرد مومن عورت' قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنے والے مرد عورتیں' اپنے ایمان کو عمل کی رو سے سچ کر دکھانے والے مرد عورتیں' اس کے احکام کے سامنے جھک جانے والے شاخِ خزیدہ کی طرح مرد اور عورت' سب کچھ نچھاور کر دینے والے مرد اور عورت کو' جہاں رکنے کو کہا جائے وہاں رک جانے والے۔ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ (33:35) اپنی عصمت کے محافظ مرد اور عورت۔ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ لا (33:35) خدا کا ذکر کرنے والے سب سے زیادہ مرد اور عورت۔ آپ دیکھ رہے ہیں کس طرح سے یہ شانہ بہ شانہ دوش بہ دوش قدم بہ قدم متوازی حیثیت سے چلے آ رہے ہیں دونوں۔ کوئی امتیاز کوئی تخصیص کسی قسم کا کوئی فرق دونوں کے اندر نہیں

ہےاس لیے کہ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ (3:195) فرق کا سوال کیا ہے۔

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا (33:35) ان سب کے لیےان کے اعمال کا نتیجہ اجرِ عظیم ہے' مغفرت تمام چیزیں ان دونوں کے لیے یکساں کوئی تخصیص نہیں ہے۔اوراس قسم کی کئی آیتیں قرآن کے اندر ہیں۔ایک جگہ توسائحون کے مقابلے میں سائحت بھی آیا ہے یہ دنیا کے TOURIST جن کو آپ کہتے ہیں' سیاحت کرنے والے مرد سیاحت کرنے والی عورتیں۔کوئی زندگی کا شعبہ کوئی گوشۂ حیات ایسا ہے ہی نہیں کہ جس میں مرداورعورت کواس میں دوش بہ دوش اور شانہ بہ شانہ کھڑا نہ کیا ہو۔کوئی تمیز ہی نہیں' کوئی فرق ہی نہیں دونوں میں اس لیے کہ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ (3:195)۔یہ سوال ہی کیا ہے کہ آدھی آبادی انسانیت کی تم اسے انسانیت کی صف سے ہی الگ کردو۔

آسمانِ عالم پرعہدِ نبوی ﷺ مساواتِ انسانیہ کے لیےایک روشن چراغ ہے

عزیزانِ من! اس پس منظر میں دیکھیے یہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔قرآن نے یہ کیا اور ظاہر ہے کہ جب قرآن کے مطابق محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہؐ کے ہاتھوں سے آپ کا جو معاشرہ متشکل ہوا تھا' وہ قرآن کے ان ہی قوانین' احکام' ہدایات' تعلیم کے اوپر ہوتا تھا۔سوال ہی نہیں تھا کہ وہاں زندگی کے کسی گوشے میں بھی آپ مرداورعورت کی یوں تخصیص کردیں کہ ایک کو پست قرار دے دیں اور ایک کو بلند قرار دے دیں' ایک کو حاکم قرار دے دیں' ایک کو محکوم قرار دے دیں' ایک وجۂ تقدس ہو دوسرا باعثِ نفرت آپ کے ہاں یہ بن جائے وہاں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔وہاں تو میدانِ جنگ میں عورتیں ہوتی تھیں ساتھ۔یہ الگ چیز ہے کہ وہ فطرت کے وظائف میں سے جو چیزیں الگ الگ ہیں جنین کی پیدائش اس کی تربیت' یہ چیزیں طبعی اسباب میں سے ہیں' انسان ہونے کی جہت سے دونوں میں قرآن نے کوئی فرق نہ رکھا۔یہ سارے تفرقے مٹا دیے کہ ایک میں روح ہوتی ہے دوسرے میں نہیں ہوتی۔اس میں بڑا دماغ ہوتا ہے' اس میں چھوٹا دماغ ہوتا ہے سوال ہی نہیں ہے۔آپ دیکھتے ہیں کس طرح سے ہر گوشۂ حیات کے اندر وہ دونوں کو دوش بہ دوش چلا رہا ہے۔دونوں کے اندر خلقی اور طبعی طور کے اوپر اگر کسی قسم کی بھی کوئی کمی ایک دوسرے کی ہوتی' قرآن اس کو POINT OUT کرتا بتا تا کہ اس گوشے میں یہ یہاں تک جاسکتی ہے عورت آگے نہیں جاسکتی۔کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں اس نے یہ کہا ہو کہ یہ مرد وہاں تک جاسکتے ہیں' عورت وہاں تک نہیں جاسکتی۔

مذہبی طور پر مرد اور عورت کی رفاقت میں تنقیص کی ابتدا تورات سے ہوئی

جب یہ دور گذر گیا اور پھر خاص سازشوں کے تحت قرآن اور اس کی تعلیم کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ سب سے پہلا حربہ یا ردِ عمل یا وہ انتقام جو اس دور کی مساوات نے ان کے دلوں میں پیدا کیا تھا۔ جنہوں نے پھر قرآن کو چھوڑا' پہلی چیز پھر وہی آ گئی جو پہلے اعتقادات آیا کرتے تھے اور آئی مذہب کی دنیا سے۔ تورات میں یہ چیز تھی کہ خدا نے آدم کو پیدا کیا آدم مرد تھا اسے پیدا کیا تو پیدا ہوا تو وہ تنہا تھا' اداس ہو گیا۔ اس کی اداسی دور کرنے کے لیے' بچے کو کھلونا دینے کے لیے' اس کی اداسی دور کرنے کے لیے' خدا نے اس کی پسلی کو چیرا اور اس کے اندر سے عورت کو پیدا کر دیا۔ عزیزانِ من! یہ تورات میں ہے۔ ضرورت ہی نہیں کسی تنقیص کی ''یعنی جیویں اپنی اک مٹی ہیگی سی اوہدا تے بنا دتا کاکا بھا کا' ہُن عورت بنانی اے کی کتا جائے' مٹی مک گئ' اوتھے کوئی تھوڑی جئ فالتو لگی ہوئی ہونی ہیگی' اے کھرچ کے اوہدی عورت بنا کے باہر کڈ دتا''۔ یعنی اندازہ لگایے۔ بہر حال تورات کی بات ہے۔ یہاں سے وہ نکالی اس کے بعد یہ پسلی کی ہڈی وہ ٹیڑھی ہوتی ہے کہا اسی لیے اس کی فطرت ٹیڑھی ہوتی ہے۔ تورات میں کیا تھا' انجیل کس طرح اس کو لے کے آئی۔

قرآنِ حکیم کے خلاف ایک گہری سازش یعنی خودساختہ روایات پھر ان کا نتیجہ

قرآن کہتا ہے محرف کتابیں ہیں۔ جو خدا نے تعلیم دی تھی' ان میں وہ نہیں رہی' انسانوں کے خودساختہ خیالات کی آمیزشیں ان میں ہیں۔ ٹھیک ہے۔ آپ کے ہاں کیا ہوا؟ یہ ساری تورات کی جس قدر یہ خرافات تھیں یہ تمام کی تمام آپ کے ہاں آ گئیں کتبِ روایات کے اندر۔ قرآن میں آ نہیں سکتی تھیں اس کی حفاظت کا ذمہ تو خدا نے لے رکھا تھا۔ اب آپ کو معلوم ہے آپ کے ہاں صحیح روایات جنہیں کہتے ہیں: عورت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی اور اس کے بعد یہ ہے روایت میں حدیث میں یہ ہے کہ پسلی سے پیدا کی گئی۔ اس لیے پسلی کی ہڈی ٹیڑھی ہوتی ہے' عورت نے ٹیڑھا رہنا ہے۔ اگر تم نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو یہ ٹوٹ تو جائے گی' سیدھی کبھی نہیں ہوگی۔ یہ حدیث ہے اندازہ لگایے۔ اٹھا کے دیکھیے آپ بخاری شریف کو مسلم شریف کو اور حدیث کی کتابوں کو تو در تہ یہ حدیثیں عورت کے خلاف آپ کو ملتی چلی جائیں گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا۔ سنیے حدیثیں آپ کی کیا ہوتی ہیں؟ اگر حوا نہ ہوتی تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے پیچھے مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعثِ مضرت نہیں ہوگا۔ اور آپ ﷺ نے یہ

فرمایا کہ نحوست تین چیزوں میں ہے۔ گھر میں، گھوڑے میں، اور عورت میں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں جب معراج میں گیا تو جنت میں دیکھا تو وہاں اکثریت مردوں کی پائی، دوزخ میں میں نے دیکھا تو وہاں اکثریت عورتوں کی میں نے پائی۔

ہمارے ہاں صدیوں سے پیش کیے جانے والے لٹریچر کی نوعیت

اب جب آپ کے ہاں احادیث میں یہ کچھ شروع ہوا تو اس کی رو سے تو تفسیریں ہونی تھیں۔ الرجال قوامون علی النسا مرد داروغہ ہے عورتوں کے اوپر، اسے ہاتھ میں ہنٹر رکھنا چاہیے۔ یہ آئی تفسیر اس کی تائید میں پھر روایت: ایک صحابیؓ حضرتِ عمرؓ کے گھر میں مہمان تھے انہوں نے دیکھا کہ وہ پھینٹا چڑھا رہے ہیں بیوی کو کھٹا کھٹ۔ انہوںؓ نے پوچھا کہ کیا قصور کیا تھا انہوں نے؟ انہوںؓ نے کہا کہ کیا کہہ رہے ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ کوئی شخص اگر اپنی بیوی کو پیٹے تو کوئی اس سے پوچھے نہیں کہ کیوں پیٹ رہے ہو۔ سوچیے تو سہی۔ کوئی آپ ترجمہ اٹھا لیجیے کوئی تفسیر اٹھا لیجیے، الرجال قوامون علی النسا اس پہ لکھا ہو گا مرد داروغہ ہیں عورتوں کے اوپر، حاکم ہیں عورتوں کے اوپر۔ اور یہ تفسیر ہو گی کہ وہ پیٹ رہا ہو تو کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ کیوں پیٹ رہے ہو۔ رونا ان کی قسمت میں لکھا گیا ہے۔ ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ وہ ہابیل قابیل جو تھے دو بیٹے وہ جو ایک قتل ہو گیا تو ابلیس نے آ کے بتا دیا مائی حوا کو، انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ بابا آدم گھر میں آئے پوچھا کیوں رو رہی ہو وہ شدتِ غم میں تھیں تو وہ کچھ نہ بتایا، روئے جائے، روئے جائے تو انہوں نے تنگ آ کے کہا کہ اچھا تو روئے جا رہی ہے، تیری بیٹیاں قیامت تک روئے ہی چلے جائیں گی۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ حضرتِ مریمؑ جو تھیں وہ حضرتِ عیسیٰؑ کی ماں تھیں ان کی وجہ سے یہ سارا کچھ ہوا۔

خود ساختہ افسانوں کی بنا پر ماں اور بیوی کی حیثیت سے سوچ کے اندر پیدا ہونے والا فرق

آپ کو پتہ ہے آپ کے اوپر ماں کا کیا اثر ہوا؟ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے، حدیث ہے۔ یعنی عورتیں جہنم میں، ماں کے پاؤں کے نیچے جنت یعنی یا تو یہ عورت نہیں، اگر عورت ہے تو عجیب تماشا ہے جس کے پاؤں کے نیچے جنت، وہ خود جہنم کے اندر۔ آپ نے دیکھا یہ EXCEPTION اس میں استثنا کیوں ہوا ہے؟ کتنا گہرا اثر ہوتا ہے ان چیزوں کا، دوسرے مذاہب کا جو آپ کے اوپر اثر ہوا ہے۔ وہ جو میری تھی MOTHER کی حیثیت سے آپ دیکھیے، اب اس کے بعد جہاں آپ دیکھیں گے مسلمانوں کے ہاں تعریف کی گئی عورت کی صرف ماں کی حیثیت سے۔ جہاں بھی عورت ان کے ذہن میں آتی ہے وہ ہمیشہ بیوی کی حیثیت سے آتی ہے۔ اور وہاں سے جو بات چلی میں لمبی بات نہیں کرنا چاہتا، کوئی سی آپ کے ہاں تفسیر کوئی ترجمہ کوئی آپ کے

ہاں کسی بزرگ کی کتاب، کسی قسم کی اٹھا کے دیکھیے ایک مخصوص چیز یہ ہے کہ لٹھ لیے ہوئے عورتوں کے پیچھے یہ پھر رہے ہیں۔ دنیا میں ساری برائیوں کا سر چشمہ یہی ہے۔ آپ کے ہاں کے بھی جتنے اولیا اللہ مقدس گذرتے ہیں، وہ بیوی بچوں کی زندگی نہیں بسر کرتے، مجرد زندگی بسر کرتے ہیں، خالص عیسائیت کا اثر۔ پھر اس کے بعد آپ کے ہاں مقدسین کے طائفے، حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ سنیے کیا فرماتے ہیں؟ بہشت میں پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا اس کی اصل عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا یعنی ہابیل و قابیل کی لڑائی، اس کا سبب بھی عورت تھی اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو سزا دے، تو اس کا سبب بھی عورت کو قرار دیا اور آج بھی دینی اور دنیاوی تمام فتنوں کے اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں۔ یہ تو آپ کے ہاں مقدسین کے طائفے ہوئے۔ اور جب بات پھر شاعروں کے ہتھے چڑھے، نظامی گنجوی اپنے ہاں لکھتے ہیں

اگر نیک بودے سر احوالِ زن

زناں را مزن نام بودے نہ زن

فارسی زبان میں زن عورت کو بھی کہتے ہیں اور زدن مصدر جو ہے اس سے زن کے معنی ہیں مار۔ کہتا ہے اگر عورت کی فطرت کہیں نیک ہوتی اس کا نام مزن ہوتا ''مت مار'' زن ہوتا ہی نہ، زن کے معنی ہی ہیں مار۔

تہ چہ خوش گفت جمشید با رائے زن

کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن

کیسی عمدہ بات کہہ دی تھی جمشید نے اپنے مصاحب سے کہ عورت یا تو باندھ کے اندر رکھو، اس کو صندوق میں بند کر دو، یا گور کے اندر۔ بس تیسرا مقام ہی نہیں ہے۔ اور اس کے بعد لکھا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے نا کہ میری بیٹیاں اور بہنیں ہیں کیا عرض کروں

مشو او من از زن کہ زن پارساست

کہ خر بستہ بہ گرچہ دزد آشناست

غیر از قرآنی تصورات کی نشاندہی کے بعد مقامِ عورت کے سلسلہ میں ایک اہم سوال؟

اس چیز کا کبھی اطمینان نہ کر لینا کہ عورت پارسا ہو سکتی ہے۔ سنیے عورت: ماں اور بہن اور بیٹیاں اس کے اندر آ جاتی ہیں۔ کبھی اس کا اطمینان کر کے نہ بیٹھ جانا، بھائی! چور دوست بھی ہو تو اپنے گدھے کو باندھ کے ہی رکھنا چاہیے۔ یہ کہہ رہا ہے۔ چلا جا رہا ہے قصہ۔ ''اے گل جے گاں فیر وارث شاہ دے قابو آ جائے تے فیرا ے تریمتاں مکر دیاں کو نیاں نیں'' ''وارث شاہ ولایتی مرد میوہ''۔

میں نے عرض کیا ہے نہ ان حوالوں کی ضرورت نہ ان اقتباسات کی ضرورت' آج بھی یہ چیز ان طبقوں کے اندر آپ کے ہاں عام ہوئی ہوئی ہے: عورت قابلِ نفرت' مرد کا مقابلہ نہیں کرسکتی' اس کو دبا کے رکھنا چاہیئے' الرجال قوامون علی النساء ایسے پیش کر دیتے ہیں جیسے کہ اس کے لیے ہے ہی یہ چیز۔ سورۃ نساء اب آگے آتی ہے اس میں یہ مقامات آئیں گے میں بتاؤں گا قرآن کی رو سے ان الفاظ کے معنی کیا ہیں' ان آیات کے مفاہیم کیا ہیں۔ لیکن یہ تو آپ نے اصول ایک دیکھ لیا کہ قرآن جنہیں کہتا ہے بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ج (3:195) آپ سوچیے تو سہی کہ یہ کیا بات وہ کہہ گیا ہے۔ اور پھر جنہیں زندگی کے ہر شعبے کے اندر وہ دوش بہ دوش چلا تا چلا جاتا ہے' آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن اس قسم کی باتیں کہتا ہوگا؟ قرآن کی چیزیں نہیں' یہ ساری چیزیں خارج از قرآن آپ کے ہاں آئیں' دوسرے مذاہب سے آئیں' اہلِ فکر کی رو سے آئیں' اسرائیلیات کی خرافات کی رو سے آئیں' تورات کے رو سے آئیں' اور پھر عیسائیت کی رو سے آئیں۔ آپ کے ہاں پھر یہ گویا دین کا اب جزو بن کے رہ گئی ہوئی ہیں۔ پھر میں عرض کروں کہ اس تضاد کو ذہن میں رکھیے گا اور کبھی اس طرف توجہ ان کی نہیں جاتی۔ عورت کے متعلق جب آپ بات کہیں گے تو عورت کی ہر حیثیت اس میں آجائے گی۔ مرد جب آپ کہیں گے تو باپ کی حیثیت بھی اس میں آئے گی' بیٹے کی حیثیت بھی آئے گی' خاوند کی حیثیت بھی آئے گی' ہر حیثیت سے وہ بات ہوگی۔ عورت کے متعلق کہیں گے تو ہر حیثیت سے یہ بات ہوگی۔ انہیں اگر آپ جہنم میں بھیج رہے ہیں قابلِ نفرت قرار دے رہے ہیں' ناقابلِ اعتماد قرار دے رہے ہیں عورت کو' تو اس عورت کے اندر تو پھر ماں بھی آئے گی' بہن بھی آئے گی' بیٹی بھی آئے گی' بیوی بھی آئے گی۔ لیکن ان کے اعصاب پر بیوی اس طرح سے سوار رہی کہ یہ بھول ہی گئے کہ کوئی اور بھی عورت کی حیثیتیں ہوا کرتی ہیں۔ آپ سوچیے کہ دنیا میں جو قوم اپنے ہاں کی آدھی آبادی کے لیے یہی نہیں کہ زندگی کے جتنے بھی کاروبارِ حیات ہیں' ان سے اس کو روک کے محروم رکھے بلکہ اس کے متعلق تصورات یہ ہوں کہ یہ قابلِ نفرت چیز ہے' یہ دبا کے رکھنے کی چیز ہے' مشورہ تک اس سے کبھی نہیں کرنا چاہیے ہمیشہ یہ غلط راستے چلے گی' شیطان کے بہکاوے میں آجاتی ہے' اولیں گناہ کا سرچشمہ یہ ہے۔ یہ سارا کچھ تصور اس کے متعلق اپنے بچے اس کی گود میں دیے ہوئے ہیں۔ اللہ اکبر۔

اسرائیل کے ہاتھوں دنیائے عرب کے علاوہ پورے عالمِ اسلام کو ذلت آمیز شکست کیوں؟

سوچیے جس قوم کے تضادات کی یہ کیفیت ہو کہتا ہوں وہ قوم پاگل کیوں نہیں ہوگی۔ غور فرمایئے کہ قوم کو جب جذبات کے اوپر آپ بہلا کے لیتے چلے جائیں' قوم کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے۔ یوں ہی بات میں سے بات آگئی۔ آج دنیا میں مسلمانوں کے اوپر جس قدر مصائب اور مشکلات کی قیامت ٹوٹی ہوئی ہے' پوری تاریخ میں ایسا زمانہ آپ کے اوپر نہیں آیا۔ مٹھی بھر اسرائیل انہوں نے

پوری عرب دنیا آپ کی جو ہے' اس کو اس طرح سے تباہ کر رکھا ہے' ذلت آمیز طریقے کے اوپر۔ چھ گھنٹے کے اندر سارے عالمِ اسلام کو آپ کے اتنی بڑی شکست دے کے دندناتا ہوا وہ آپ کے سر پہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ قوم کہ جسے مغضوب علیہ آپ پکارتے چلے آئے کہ قرآن میں جو ہم کہتے ہیں غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّينَ (1:7)' مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ کے معنی ہیں یہودی ضآلین کے معنی ہیں عیسائی۔ خدا کی مغضوب قوم ملعون قوم' مٹھی بھر چھوٹے سے شہر کی سی آبادی ان کی ہے اٹھائیس لاکھ ساری۔ پورے آپ کے ہاں کی عربوں کی سلطنتیں اور پھر مسلمانوں کی باقی سلطنتوں کی اخلاقی مدد ان کے ساتھ ہے۔ اور انہوں نے جس بری طرح ذلت آمیز طریق سے آپ کو دبا کے رکھا ہوا ہے' شرم سے نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کے غمزدہ حالات کے تسلسل کے پیشِ نظر علامہ پرویزؒ کی آہ وفغاں

بھارت کے اندر مسلمانوں کے اوپر پچھلے ہفتے تک خون کے دریا بہہ رہے تھے۔ جو رپورٹیں ان کے ہاں کی بھی آ رہی ہیں اس میں نظر آتا ہے' ہزاروں گھر انہوں نے جلا دیے ہیں۔ آپ کی بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت وہاں محفوظ نہیں ہے۔ معلوم ہی نہیں کہ کتنی بیٹیاں اور بہنیں آپ کی ان کے گھروں کے اندر زینت بن گئی ہیں۔ کوئی مداوا نہیں آپ کی سمجھ میں آتا۔ پورا عالمِ اسلام اس وقت بے بسی کے عالم میں ہے۔ کیفیت آپ پہ یہ گذر رہی ہے (معاف رکھیے میں سیاست پہ نہیں آیا کرتا) اور آپ شوکتِ اسلام ڈے منا رہے ہیں۔ اللہ اکبر۔ ساری قوم پاگل ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں ماتم کے دن مناؤ' او! غیرت ہے تمہارے سینے کے اندر ڈوب کے مر جاؤ آج۔ اپنی کچھ شرم نہیں تو ان بچیوں اور بہنوں اور بیٹیوں اور ماؤں کی عصمت کی ہی شرم کر لو اور کچھ نہیں۔ اس مقام پہ تو کم از کم مسلمان کٹ کے مر جایا کرتا تھا۔ یہ تمام کی تمام وہاں سے خبریں آ رہی ہیں۔ بجائے اس کے کہ آج ان قوموں کے خلاف آپ یہ کہتے کہ آؤ مسلمانو! ایک ماتم کا دن مناؤ تا کہ ایک رجحان یہاں پیدا ہو رہا تھا بھارت کے خلاف ان کی دراز دستیوں کے متعلق کشمیر کے اوپر جو کچھ ہوا۔ یہ سارے کا سارا یوں ایک سوئچ آن کیا صاحب۔ قوم شوکتِ اسلام کا ڈے منا رہی ہے۔ افوہ۔ عزیزانِ من! میں عرض یہ کر رہا تھا کہ جب قوموں کو جذبات کے دھارے میں بہا دیا جائے پھر ان میں کھڑے ہو کر سمجھنے سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ عورت کے متعلق یہ چیز بہا دی جذبات میں آپ بہے ہوئے ہیں' شاعری کرتے چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے اپنی آدھی آبادی کو آپ زندگی کے کسی شعبے میں اپنا رفیق نہیں قرار دے رہے۔ قرآن نے تو ان کو زوج کہا تھا ایک گاڑی کے دو پہیے' کہے تھے۔

بچی کی پیدائش پر افسردگی کی وجہ سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیت کا اثر

ہزار برس سے اس گاڑی کو آپ ایک پہیے سے چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چل سکتی ہے وہ؟ اس سے آپ محروم ہی نہیں رہے ہوئے جب پھر اس کے متعلق تصور زندگی کا یہ ہے' گناہوں کا سرچشمہ نفرت کی چیز' غلاظت کی پوٹ' اس قابل ہی نہیں کہ اس سے کچھ ذرا سا بھی کسی عمدہ بہتر کام میں مشورہ تک لیا جائے۔ اس کی آغوش میں آپ کی نسلیں پروان چڑھتی ہیں اور ان نسلوں کے ہاتھوں پھر روتے ہیں آپ۔ INFERRIORITY COMPLEX پیدا کر دیا ہے آپ نے ان کے اندر۔ ان کی بھی یہ کیفیت آپ نے کر دی ہے صدیوں کے بعد کہ وہ خود بھی کچھ محسوس کرنے لگ گئی ہیں کہ ہمارا وجود دنیا میں مقصود بالذات نہیں ہے۔ ہماری EXISTENCE ہم تو مردوں کے لیے ہیں۔ ہزار برس سے گھر کے اندر آپ جو ایک چیز دیتے چلے جائیں گے' پہلے ہی دن سے لڑکی اور لڑکے کا امتیاز: بچی پیدا ہوئی ''اللہ دی مرضی' لو! اللہ دی مرضی کڑیاں ای پیدا کرن دی ہیگی'' ہوکا مار کے صاحب اللہ کی مرضی بچی پیدا ہوئی۔ گھر کے اندر یہ کیفیت ہے بہن بڑی ہے وہ بھائی چھوٹا ہے۔ وہ وہاں پتہ نہیں اس نے ذرا کچھ کہا اس نے آگے ذرا اونچی آواز سے کہا۔ وہاں باورچی خانے سے کہتی ہے ''اوکڑی اے بھرانوں گالاں کڈنی پئی ایں'۔ وہ بھائی کیا کر رہا ہے سوال ہی نہیں ہے۔ لڑکی اور لڑکے کے اندر ساری زندگی میں وہ روز دیکھتی ہے اس کے دل میں یہ چیز سمائی چلی جا رہی ہوتی ہے INFERRIORITY COMPLEX پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے اس کے اندر۔ آگے بڑھیے تو آپ کے ہاں بند رکھیں عورتیں اپنے آپ کو' باہر اس طرح سے نہ نکلیں۔ کیوں جی؟ مردوں کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ یعنی ان کے اخلاق سنوارنے کی ذمہ داری ان پہ۔ بند رہو گھروں میں' باہر تم نکلتی ہو مردوں کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ غور فرمایا آپ نے۔ یعنی گناہ کی محرک عورت۔ یہ پارسا مقدس' شرم نہیں آتی اسے کہتے ہوئے اپنے اس اخلاق کے اوپر نازاں ہوتا ہے جس اخلاق کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کوئی عورت چلی جاتی ہے وہ گڑ بڑا جاتا ہے' زلزلہ لے آتا ہے۔ یہ اخلاق ہے تمہارے ہاں کا۔ لہٰذا اس کے لیے ضرورت یہ ہے کہ ان کو بند کر کے رکھو۔ بعینہ اسی طرح سے جیسے اپنے ہاں گھروں میں تالے لگا کے رکھو۔ یعنی چوری یا چور کے لیے اصلاح آپ نے یہ سوچی ہوئی ہے کہ تالے لگا کے رکھو۔ چلتے جاؤ اور اپنی جیب کے اوپر اپنا بازو رکھو یہ ہے آپ کے ہاں طریقہ۔

چائنا میں مردوں کے اخلاقِ حسنہ کے علاج کا طریق کار

جو قوم اصلاح کرتی ہے' اس نے یہ اصلاح کچھ اس طرح کی کہ وہاں چائنا میں آج تالے کا وجود ہی کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ

نے مردوں کے اخلاقِ حسنہ کے لیے تجویز یہ سوچی ہوئی ہے کہ عورت کو بند کر کے رکھو۔ خمیازہ بھگت رہی ہے یہ قوم۔ اندازہ لگایے۔ اور پھر جو اسلام بدلتا ہے پھر اس کے متعلق عورت ووٹ دینے کے لیے بھی ناجائز' ووٹ بھی یہ نہیں دے سکتی یہ بھی آپ کا اسلام ہے۔ اور اس کے بعد یہ بھی اسلام کہ صدارت کے عہدے کے لیے بھی امیدوار ہوسکتی ہے یہ بھی اسلام۔ یعنی یہ بھی پتہ نہیں چلتا ۔لیکن کون ہوسکتی ہے؟ مادرِملت بیوی نہیں۔ وہی میری کا تصور جو آپ کے ہاں آیا ہوا ہے صرف ماں کا تصور۔

اسلام میں عورت کو ملنے والے حقوق کی وضاحت

عزیزانِ من! قرآن کہہ گیا بَعۡضُكُمۡ مِّنۡ بَعۡضٍ ۚ (3:195) ان الفاظ کو اپنے گھروں کے اندر جلی طور پہ لکھ کے لگاؤ' زندگی کے اور دروازے کے اندر' بچپن سے بچیوں کو یہ سکھاؤ اور بچوں کو کہ نہیں بیٹا اور بیٹیو بَعۡضُكُمۡ مِّنۡ بَعۡضٍ ۚ (3:195)۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ترجمہ نہیں کیا جا سکتا ان الفاظ کا' میں کس طرح ترجمہ کروں۔ وہ ایسے ہی ہے جیسے اکٹھی مٹی گوندھ کے اور اس میں سے کچھ اتنی سی لے کے اس میں سے یہ بنایا اور اتنی سی مٹی لے کے یوں جیسے بنایا جائے کچھ اس قسم کا تصور ہے۔ ایک دوسرے کے جزو وہ کہنے سے بھی بات نہیں بنتی وہ' ایک دوسرے میں سے بھی کہنے سے بات نہیں بنتی۔ ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡ بَعۡضٍ ۚ (3:195)۔ اواس کی بات تم کر رہے ہو انسان ہو۔ عزیزانِ من! آگے ایک اور بات سنیے۔ عورت اگر اتنی INFERRIOR ہے' اتنی کمتر درجے کی ہے' ہمیشہ محکوم و مغضوب رہنے کے لیے پیدا کی گئی ہے' گناہوں کا سرچشمہ ہے' قابلِ نفرت ہے۔ میں پوچھتا یہ ہوں ایک لڑکی جو پیدا ہوتی ہے وہ اگر آپ کے خدا سے یہ پوچھے کہ کس جرم کی سزا میں مجھے تم نے لڑکی بنا کے دنیا میں بھیجا ہے اور اس نے کون سے ایسے اچھے اعمال کیے تھے جن کی بنا پہ یہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ میں کیوں عورت اور لڑکی ہونے کی جہت سے ساری عمر میں کیوں ان کے جوتے کے نیچے رہوں؟ تم نے مجھے پیدا کیا ہے میرا تو کوئی جرم نہیں تھا۔ عزیزانِ من! ہندو کا عقیدہ کتنا ہی باطل اور غلط کیوں نہ ہو پھر بھی اس کے اندر ایک منطق اور LOGIC ہے۔ اس نے اپنے ہاں تناسخ کا عقیدہ وضع کیا' جون کا چکر جسے آپ کہتے ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جو بھی بچہ اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ اپنے پچھلے جنم کے کسی گناہوں یا ثواب کی بنا کے او پر اچھا برا مرتبہ رکھتا ہے۔ لڑکی جو پیدا ہوئی ہے اس نے پچھلے جنم میں' کسی مرد نے یا کسی انسان نے بھی اتنے زیادہ برے کام کیے تھے کہ اس کی سزا دینے کے لیے اس نے اس کو لڑکی بنا دیا۔ وہ تو باطل سہی' دلیل اس کے پاس ہے۔ آپ تو اسے بھی نہیں مانتے کہ پچھلے جنم کے کسی غلط کاموں کی پاداش کے لیے' سزا کے لیے خدا نے یہ کیا۔ اور تخصیص وہ کی کہ جسے آپ پھر ساری عمر مٹا ہی نہیں سکتے عورت' مرد بن ہی نہیں سکتی۔ وہ عیسائیت کا عقیدہ کہ یہ گناہِ اول وہ ہے جو کسی طرح سے دھل نہیں سکتا۔ عورت کا عورت

پیدا ہونا ایک ایسا DRAW BACK ہے اس کے اندر جو جی میں آئے وہ کرے یہ DRAW BACK کسی طرح سے ڈھل نہیں سکتا کیوں کہ اس نے تو عورت ہی رہنا ہے۔

سراپا مصائب و آلام سے تنگ ایک مظلوم عورت کی پکار اور آخر کار اس کا نتیجہ

سوچیے کہ اگر آپ خدا کی طرف اسے منسوب کریں کہ عورت کے متعلق اس نے یہ یہ چیزیں کہی ہیں اور پھر وہ خود ہی کسی کو عورت دنیا کے اندر پیدا کر دیتا ہے' تو ایسے خدا کے متعلق آپ کیا کہیں گے۔اب تک یاد آتا ہے مجھے وہ ایک مائی جس کی محض عورت ہونے کی جہت سے جس کی داستان سر سے پاؤں تک ساری مشکلات اور مصائب کی داستان تھی۔سینہ تمام داغ داغ۔اسے جب میں نے یہ چیز کہی کہ نہیں! خدا کے قانون کی طرف لوٹو۔اس نے یہ چیز کہی کہ آج تک مجھے خدا ہی کے احکام کے مطابق کہہ کہہ کے یہاں تک پہنچایا ہے۔اگر یہی خدا ہے' مردوں کا خدا وہ ہوگا۔عورت کا خدا کوئی عورت ہونی چاہیے اس نے کہا۔تنگ آ کے کیا نہ کہے وہ۔نہیں میرے بھائیو! قرآن کو ماننے والی قوم کو دنیا میں یہ اعلان کرنا چاہیے تھا انقلابی اعلان کہ لَآ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ج بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ج (3:195)۔خدا بننا اسے سجتا ہے۔سارے تفرقات جتنے بھی تھے تمیزات اور خصائص کی چیزیں مٹا کے رکھ دیں بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ج (3:195)۔پھر میدان کون سے آ رہے ہیں زندگی کے۔فَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا (3:195) یہ ان میں سے جنہوں نے اس حق اور صداقت کی خاطر جو کچھ چھوڑنا تھا' چھوڑنے کے لیے ضرورت پیش آئی' چھوڑ کے رکھ دیا اس کو' وطن تک چھوڑ دیا مرد اور عورت دونوں کو۔وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ (3:195) مستبد قوتوں نے انہیں ان کے گھروں سے نکال دیا۔وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ (3:195) ہمارے راستے میں ان کو بڑی ہی تکلیفیں دی گئیں۔انہوں نے کیا کیا؟ یاد رکھیے! ذَکَرٍ (3:195) اور اُنۡثٰی ج (3:195) دونوں کا ذکر آ رہا ہے مرد و عورت کا۔انہوں نے کیا کیا؟ وَ قٰتَلُوۡا (3:195) بالآخر یہ میدانِ جنگ میں اتر آئے۔ وَ قُتِلُوۡا (3:195) ٹھیک ہے انہوں نے جنگ کیا' جانیں بھی دیں۔ لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ (3:195) یہ ہیں وہ کہ جن کی یہ چھوٹی چھوٹی لغزشیں ناہمواریاں زندگی میں ہو جاتی ہیں' ان کے یہ بڑے کارنامے ان کے لیے زیادہ وزنی ہو جاتے ہیں' ان کا پلڑا جھک جاتا ہے۔ وَ لَاُدۡخِلَنَّہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ج (3:195) ایسی زندگی کے اندر سدا شاداب رہنے والی زندگی' اس میں ان کو داخل کیا جائے گا ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ط (3:195) (مرد اور عورت دونوں کا ذکر چلا آ رہا ہے) خدا کے ہاں سے RETURN وَ اللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ (3:195) اور جو ریٹرن خدا کے ہاں سے ملتی ہے کتنی حسین ریٹرن ہے۔عزیزانِ من! مرد اور عورت دونوں کے لیے

قرآن کہتا ہے۔ ہاں! بات چلی آ رہی تھی حق اور باطل کے تصادم کی' ٹکراؤ کی' مقابلے کی۔ کہا ٹھیک ہے ان لوگوں نے تمہیں گھروں سے بھی نکال دیا' بڑی تکلیفیں دے رہے ہیں۔ اب تم تیار ہو جاؤ اس کے لیے کہ ان کے ساتھ تمہارا تصادم ہوگا۔ **لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ** (3:196) اس وقت تم دیکھ رہے ہو کہ بڑی شان و شوکت سے یہ پھر رہے ہیں یہ چیز تمہارے لیے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا موجب نہ بن جائے کہ نہیں صاحب! یہ جو ہے ایسا کرنے والے ''لواوتے موجاں لٹ دے پئے ہیگے نیں' اسی ایمان دار بن کے کی لیا''۔ وہ جو میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ یہ تصور جو ہے کہ جنہوں نے یہ طریقے اختیار کیے وہ دیکھیے تو سہی دندناتے پھر رہے ہیں۔ اور قرآن میں وہ بھی تو ہے ہمارے ہاں کے دندنانے والوں کی وہ چیز' ہمارے ہاں وہ قول بھی ہے جس سے کہا گیا تھا کہ صحیح راستہ اختیار کرو' یہ کیا کر رہے ہو' اس طرح سے دولت جمع کرتے ہو' عذاب آئے گا۔ اس نے کہا کہ واہ! ہم یہاں بھی موج کرتے ہیں اور تم دیکھو گے انشا اللہ اگلی دنیا میں بھی اللہ ہمارے لیے جنت ہی لکھ دے گا (18:36)۔ میں نے مسجد بنوا دی ہوئی ہے ایک موتیوں کا گھر۔ سودے بازی کتنی عمدہ ہے یعنی یہاں بھی سودا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ''ایتھے وی اے صورت ہے ایٹاں دیندے ہیگے نیں تے اوہدا سونا لیندے نیں' ایتھے چونے دی مسیت بناندے نیں تے موتیاں دا گھر اوتھے لیندے ہیگے نیں''۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ اور خدائے رحیم و کریم کی طرف سے انعام و اکرام کا تذکرہ

قرآن کہتا ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں بھی ہمارے لیے موج ہی لکھی ہوئی ہے خدا نے۔ کہتا ہے کہ تمہیں غلط فہمی میں یہ بات نہ ڈال دے کہیں کہ اس طرح سے یہ پھر رہے ہیں۔ **مَتَاعٌ قَلِیْلٌ** قف (3:197) متاع تو ہے لیکن بہت کم وزن کی چیز ہے کچھ قیمتی شے نہیں ہے۔ طبعی زندگی کے مقابلے میں جب انسانیت کی اپنی ذات کی زندگی آتی ہے' یہ ہر شے جو اس سے متعلق طبعی زندگی سے متعلق ہوتی ہے' بڑی کم قیمت رہ جاتی ہے۔ **مَتَاعٌ قَلِیْلٌ** قف **ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ** ط (3:197) اس کے بعد ان کا ٹھکانہ' جہنم ان کا ٹھکانہ ہے **وَ بِئْسَ الْمِهَادُ** (3:197) کتنی بری جگہ ہے وہ رہنے کی۔ **لٰکِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ** ط (3:198) کیا بات ہے صاحب؟ اس کے مقابلے میں وہ کہ جنہوں نے اپنے اللہ کے قوانین کی نگہ داشت کی (وہی قرآن کا جو انداز کہنے کا ہے) زندگیاں ابدی شادابیوں کی' خوشحالیوں کی' ایسے باغات کی' کہ جن پر کبھی خزاں نہ آئے' اس قسم کی شادابیوں کی زندگی۔ کیا بات ہے وجد آ جاتا ہے۔ **فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ** ط (3:198) کھانے کے لیے فراوانی سے کسی دروازے پہ اگر نیاز بٹ رہی ہو تو وہاں سے فقیر کو بھی مل جاتا ہے' گدا کو بھی مل

جاتا ہے۔ مقدار کے اعتبار سے دیکھیے' چیز بھی وہ اچھی ہوتی ہے' پلاؤ بھی پکا ہوا ہوتا ہے' وہ بھر کے رکاب بھی دے دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہیں گے کہ اور کھایے یہ بھی کھا رہا ہوتا ہے باہر۔ گھر کے اندر مہمان آپ کے ہاں آیا ہوا ہے وہی آپ طشت پلاؤ کا اسے بھی دیتے ہیں۔

حضرتِ انسان کا وہ مقام جو قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں اس کے لیے متعین کر رکھا ہے

جہاں تک اس شے کا تعلق ہے تو دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ اس گداگر کے سامنے بھی وہ ہے' مہمان کے سامنے بھی وہ ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ دونوں میں فرق کیا ہے؟ قرآن نے کہا کہ یہ شادابیوں کی زندگی کس قسم کی؟ گداگری کی نہیں نُـزُلًا مِّـنْ عِـنْـدِ اللّٰهِ ط (3:198) خدا کے مہمان ہو گے تم۔ آہاہا۔ وہ یہ عزت کا مقام دے رہا ہے تمہیں۔ قرآن میں ہے سورۃ اعراف میں کہ ہم اپنی مشیت کی رو سے چاہتے تھے آسمان کی بلندیوں پہ اسے پہنچا دیں' یہ کم بخت اپنے اس جذبات کی رو سے زمین کی پستیوں میں گڑے چلا جا رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ تم ہمارے مہمان ہو گے' گداگری نہیں۔ اور ہم ہر وقت بخشیش مانگتے ہیں۔ یا اللہ بخش دے' جنت بخش دے یعنی بخشیش' بہشت گداگروں کی طرح مانگ رہے ہیں۔ وہ مہمان بنا کے لے جا رہا ہے تمہیں۔ ''بہشتے فی سبیل اللہ ہم است'' اقبالؒ کہہ گیا ہے اللہ واسطے کی جنت۔ ہر وقت دعا بخشش کی۔ نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط (3:198)۔ عزیزانِ من! قرآن کو اس نگاہ سے پڑھیے تو پتہ چلتا ہے خدا کے نزدیک اپنی اس تخلیقِ آدم کا مقام کیا ہے؟ قرآن قطعاً کوئی ایسی چیز اپنے ہاں آنے ہی نہیں دیتا۔ خدا اور انسان کے تعلق میں بھی جہاں انسان کے شرف کو کسی قسم کی بھی ٹیس لگ جائے۔

قدرت انسان کو کائنات کی طرح جنت بخشیش کے طور پر عطا نہیں کرتی

ہر شے جو وجۂ تذلیلِ انسانیت ہے قرآن کی رو سے کفر ہے۔ وہ شے کہ جس میں انسانیت کا احترام باقی رہتا ہے' وہ اسلام ہے۔ جنت جیسی چیز جس کے متعلق ساری دنیا نے یا تو کفارے کی رو سے دنیا نے جنت حاصل کی۔ ساری عیسائیت اپنے کسی عمل کے بدلے نہیں کفارے کی رو سے۔ گناہ گاروں کی حیثیت سے جا رہے ہیں۔ حضرتِ عیسیٰؑ کی وہی صلیب کی موت' ان کا خون ان تمام گناہ گاروں کا کفارہ بنا اور ان کو جنت میں بھیج دیا۔ سوچیے تو سہی کوئی کسی مجرم کو اس طرح سے چھڑا لائے تو کیا کیفیت ہوگی؟ ٹھیک ہے اس جیل سے تو وہ چھوٹ آئے گا لیکن ساری عمر کے لیے جس تذلیل کی زنجیروں میں یہ جکڑا جائے گا یوں چھوٹ کے آنے والا۔ یا تو انہوں نے کفارہ کہا یا خود خدا کے ہاں سے بخشش کے طور کے اوپر جنت مانگتے رہے۔

لفظ عاصی کا یا گناہگار کا ترجمہ عربی زبان میں مجرم ہے

ہر شخص بڑے فخر سے کہہ رہا ہے' بڑے گناہ گار ہیں ہم۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں عربی زبان میں عاصی کا ترجمہ مجرم ہے۔ ان سے کہیے کہ کہا کریں صبح سے شام تک کہ ہم جرائم پیشہ ہیں صاحب۔ یعنی کبھی خیال نہیں آتا کیا کہہ رہے ہیں۔ جنت کے متعلق وہ کہتا ہے ٹھیک ہے کہ ویسے ملی تھی' ایک جنت ایک لغزش ہوئی اس آدم سے جنت سے باہر۔ یہ مفت میں دی ہوئی جو ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے نا۔ اور اس کے بعد اس نے کہا کہ ہاں! اب تم اس جنت کو اپنے خونِ جگر سے حاصل کرو گے۔ اس طرح سے حاصل کردہ جنت کے متعلق اس نے یہ کہا وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (43:72) یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں ہم نے مالک بنایا ہے تمہارے اپنے کاموں کے بدلے میں خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ط (4:122) اب تمہیں یہاں سے کوئی نکال نہیں سکے گا۔

آں بہشتے کہ خدائے بہ تو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تیری پنہاں ہے تیرے خونِ جگر میں

مومن تو جنت میں خدا کے مہمان ہونگے اور اُن کی خصوصیت ابرار کی سی ہوگی' وہ تنگ نظر نہیں ہوں گے

یہ وہ جنت حاصل کی ہوئی ہوتی ہے جس کو وہ کہتا ہے مالک بنادیا ہم نے تمہیں اس کا اب تمہیں کوئی نہیں یہاں سے نکالے گا۔ خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ط (4:122) تم نے تو اس کو خریدا ہے' حاصل کیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ مقام ہے۔ نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللّٰهِ ط (3:198) مہماں نوازیاں تمہاری ہوں گی خدا کی طرف سے۔ وَمَا عِندَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ (3:198) لیکن ہے یہ کن کے لیے؟ لفظِ ابرار ہے یہاں۔ عجیب عجیب الفاظ قرآن لاتا ہے۔ بِـرّ کے معنی ہوتا ہے کشادٗ وسعتیں۔ زندگی ایک تنگ نظری کی زندگی ہوتی ہے گھٹن کی زندگی' کبھی ایسے انسان کو سامنے لایے جو بڑا ہی تنگ نظر ہو' گھٹن اس کے اندر ہو۔ عام طور پہ یہ جتنے لوگ اپنی ان نمازوں اور روزں سے تقویٰ اور پرہیز گاری سے نیک بنتے ہیں نا' ان میں ہمیشہ یہ تنگ نظری اور گھٹن ایک پیدا ہوتی

ہے آپ دیکھیں گے: ہمیشہ دوسروں کو یوں دیکھنا ذلت کی نگاہوں سے دیکھنا' بڑی تنگ نظری کی کیفیت ہونا۔ قرآن اس کے مقابلے میں جنت میں جانے والوں کی خصوصیت یہ بتائی خاص طور پہ ابرار: وہ کہ جن میں وسعتیں ہیں' کشادہ ہے نگاہوں کے اندر' قلب کے اندر۔ بِـرّ سے ہے یہ لفظ صحراؤں جیسی وسعتیں جن کے اندر ہیں صاحب! یہ وہ لوگ ہیں جو جنت میں جائیں گے' ہمارے مہمان بن کر یہاں آئیں گے اور یہ وہ جنت ہے۔

جنت کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کا عقیدہ اور پھر سینٹ پال کا فرمان

پہلے یہ کہا گیا تھا یہودیوں کا یہ عقیدہ کہ جو شخص بنی اسرائیل کے ہاں پیدا نہیں ہوا' اس نسل میں پیدا نہیں ہوا' وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ یعنی جنت ایک نسل کے لیے مخصوص ہو کے رہ گئی۔ اب یہ کسی انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ اسرائیلی کے گھر میں پیدا ہو یا غیر اسرائیلی کے گھر میں پیدا ہو۔ یہیں سے آپ کے ہاں عقیدۂ تقدیر آیا کہ خدا نے جسے جنت میں بھیجنا ہوتا ہے' اسے اسرائیلیوں کے گھر میں پیدا کر دیتا ہے پہلے ہی۔ جسے جہنم میں بھیجنا ہوتا ہے' غیر اسرائیلی کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ وہاں سے یہ بات آئی۔ اب غیرِ اسرائیلی جو جی میں آئے کرلے' جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔ عیسائیت نے یہ چیز کہی کہ نہیں! اسرائیلی غیر اسرائیلی تو خیر بڑی تنگ نظری ہے۔ حضرتِ عیسیٰؑ کے کفارے پہ جو ایمان لائے' وہ تو جنت میں جو اس کفارے پہ ایمان نہ لائے جو جی میں آئے دنیا میں کرے' جتنے صحیح اعمال جی میں آئے کرے' نہیں جا سکتا۔ سینٹ پال کا یہ خط موجود ہے کہ شریعت کے اعمال سے کوئی شخص جنت میں نہیں جا سکتا۔ جنت میں صرف اس ایمان سے جا سکتا ہے کہ حضرتِ مسیحؑ نے اپنی جان دے کے ہمارے خون کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ پھر وہی دائرہ تنگ نظری کا آپ کے ہاں آ گیا۔ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا' وہ ہے مقامِ انسانیت کے اوپر۔ برہمن کے بچے کی کوئی کاری گری نہیں ہے کہ وہ برہمن کے گھر میں پیدا ہو گیا۔ شودر کے گھر میں پیدا ہونے والا شودر رہے گا ہمیشہ کے لیے۔ یہ ہیں وہ تنگ نظری کے دائرے۔

عیسائی ہو یا یہودی جو بھی صداقتوں پر ایمان لائے گا اور باعمل ہوگا وہ جنت کا حق دار ہوگا

یہاں لفظ اَبْـرَار (3:198) قرآن نے یہ کہا۔ کیا ربط ہے قرآن کا؟ جنت میں جانے کے لیے پہلی چیز یہ ہے' کشادہ ہونی چاہیے' وسعت ہونی چاہیے۔ اور جب تمہارے فرد کے اندر یہ کیفیت ہونی چاہیے' تو وہ نظام بھی یہ ہونا چاہیے۔ اس نے کہا یہ بات غلط ہے کہ غیر یہودی نہیں اس میں جائے' غیرِ عیسائی نہیں اس میں جائے گا۔ وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَآ

اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِمۡ خٰشِعِیۡنَ لِلّٰہِ ۙ (3:199) یہ اہلِ کتاب بھی جو ہیں ان کے اوپر بھی جنت کے دروازے بند نہیں ہو گئے' کسے باشد جو بھی ان صداقتوں کے اوپر ایمان لے آئے گا اور اس کے بعد ان قوانین کے سامنے جھک جائے گا' جو بھی یہ ہوگا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ اسی طرح سے جنت کا حق دار ہوگا جیسے مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والا اور مسلمان کے گھر میں ہی پیدا ہونا' جو ہے یہ جنت کی ضمانت نہیں ہے۔ یہ تو وہی بات ہوگئی پھر وہ اسرائیلیوں والی اگر آپ یہ کہیں گے کہ اس گھر میں پیدا ہونے والا تو جنتی ہو گیا خود بخود ہی۔ سوال ہی نہیں کس گھر میں پیدا ہوتا ہے۔

کیا ہم مسلمان برہمن اور شودر کے باہمی طبقاتی امتیاز سے مبرا ہیں؟

عزیزانِ من! کوئی چیز نہ وجہ ذلت' نہ باعثِ امتیاز ہے۔ زندگی کے ACCIDENTS جس میں انسان مجبور ہوتا ہے' وہ چیز نہ سزا کا موجب ہوتی ہے' نہ جزا کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہم ہندوؤں کا تو مذاق اڑاتے ہیں کہ آواگون' تناسخ' جون کا چکر۔ کسی کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ برہمن کے گھر میں پیدا ہو گیا یا شودر کے گھر میں پیدا ہو گیا۔ کہ دیکھیے صاحب ساری عمر کے لیے اس کو یہ کرتے ہیں۔ واقعی یہ چیز ایسی ہے جس پہ طنز یا تنقید کی جائے' استہزا کیا جائے۔ آپ کی کیا کیفیت ہے؟ جھونپڑی میں پیدا ہونے والا بچہ اور اس کے ساتھ کوٹھی میں پیدا ہونے والا بچہ' کیا ان دونوں میں برہمن اور شودر کا امتیاز نہیں آپ رکھتے؟ جھونپڑی میں پیدا ہونے والے بچے کا کیا قصور تھا۔ یا مانیے ہندو کے اس منطق کو کہ اس نے پچھلے جنم میں کوئی برے کرم کیے تھے۔ وہ تو آپ مانتے نہیں ہیں۔ کہیے کہ کس جرم کی سزا میں ساری عمر کے لیے یہ مصیبتیں بھگتے گا۔ اور وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کے جو پیدا ہوا ہے' ان دونوں بچوں میں سے کس نے کیا جرم کیا ہے اور کس نے کون سا کارِ ثواب کیا ہوا ہے۔ کرتے ہیں آپ امتیاز یا نہیں؟ کس بنا پر؟ آپ کہتے ہیں کہ صرف ایمان اور عمل ہے جس کی بنا پہ یہ سب چیزیں ہیں۔ ان دونوں بچوں میں کون سی چیز ہے جو عمل کی ہے یا ایمان کی ہے؟ اور وہ پیدائشی گناہ جو دھل نہیں سکتا۔

ہمارے پاس انسانوں کے مابین باہمی تفریق کا کیا جواز ہے؟

اس غریب کے بچے کے ساتھ زندگی کے ہر گوشے میں' وہ پیدائشی گناہ جو اس کی پشت پہ لدا ہوا جاتا ہے یا نہیں؟ ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں' صحت گئی' بیمار ہوا' دوائی کے لیے پیسے نہیں' مضمحل' مرض کا شکار ہو گیا' بڑا ہو رہا ہے' فیس نہیں' مدرسے میں جانے کے لیے' تعلیم سے بے کار ہو کے رہ گیا۔ پڑھ پڑھا بھی لیا کسی طرح سے CONTACTS نہیں ہیں کہیں کچھ کہنے کے

لیے دروازے بند ہیں اس کے لیے۔ کمہار کا بچہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی کہیں چپراسی ہو جائے گا' سائیکل صاف کرتا پھرے گا۔ کس جرم کی پاداش میں؟ آپ مذاق اڑاتے ہیں ہندو دھرم کا کہ پچھلے جنم کے گناہوں کی پاداش میں وہ کہتے ہیں عمر بھر یہ مصیبت بھگتے گا۔ میں نے کہا ہے اس میں پھر بھی منطق ہے' باطل ہی سہی۔ آپ کے پاس اس کا جواب ہی نہیں ہے۔ لڑکی پیدا ہوگئی ہے ساری عمر کے لیے باعثِ طعنہ بوجھ بن گئی۔ قرآن تو اس کو نہیں لیتا۔ کہتا ہے ابرار ہو جاؤ' توڑ و ان چھوٹے چھوٹے دائروں کو' تنگ نظریوں کے دائروں کو' وسعتیں پیدا کرو صحرا جیسی۔ راستے میں کوئی چیز آتی نہیں جہاں نگاہ میں رکاوٹ پیدا ہو۔ اسے بِـــرّ کہتے ہیں یہاں سے قرآن ابرار لایا ہے۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ معاشرتی نظام کے سلسلہ میں بے رخی کا نتیجہ

یہ قرآن کی اصطلاحیں ہیں دنیا میں کسی مذہب میں یہ چیزیں نہیں ملیں گی۔ نیکوکاری ایک بات ملے گی۔ ابرار: تنگ ناؤں کے دائروں کو توڑ دینے والے' وسعتیں پوری انسانیت کو اپنی آغوش میں لے لینے والی۔ یہ ہے آپ کی تعلیم اور آپ کی جنت عَـرْضُهَـا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ لا (3:133) جس کی پہنائیاں زمین وآسمان دونوں کو محیط ہوئی ہیں۔ ابرار۔ اہلِ کتاب میں سے بھی اس نے کہا جو کوئی بھی ان صداقتوں کے اوپر ایمان لے آئے گا اور اس کے بعد پھر اس کی کیفیت ہوگی لَا یَشْتَـــرُوْنَ بِـاٰیٰتِ الـلّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ط (3:199) پھر خدا کی ان آیتوں کو پھر وہ تھوڑے تھوڑے پیسے لے کے بیچیں گے نہیں' پھر وہ فروخت نہیں کریں گے ان کو۔

دین کی طرف سے ملنے والی راہنمائی جو مذہبی دنیا میں شکم پروری کے کام آتی ہے

عزیزانِ من! مذہب جب بھی پروفیشن یا پیشہ بن جاتا ہے' خدا کی آیتوں کو بیچنا وہاں پیشہ ہوتا ہے۔ اور جنس کیا ہوتی ہے ان کے پاس؟ ''اے کوئی خربوزے لے کے بیٹھے ہوئے ہوندے نیں سوہنوں؟'' یہ ہوتا کیا ہے جسے بیچ کر یہ ساری عمر اپنے یہ گذارا کرتے ہیں اور نہایت عیش سے گذارا کرتے ہیں کیا چیز ہوتی ہے ان کے پاس؟ یہی کچھ پوچھنے کو جاتے ہیں نا لوگ ان سے کہ جی اس معاملے میں فتویٰ کیا ہے' اس باب میں شریعت کا کیا حکم ہے۔ یہ ہے آیات اللہ کو اس طرح بیچنا۔ کہتا ہے پھر وہ یہ نہیں کرتے اُولٰٓئِکَ لَهُـمْ اَجْـرُهُـمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط (3:199) یہ ہے جن کے کاموں کا اجر ان کے خدا کے ہاں ہے۔ پھر بھی وہ اجر ہی کہہ رہا ہے' گداگری کی بھیک نہیں کہہ رہا' مزدوری کہہ رہا ہے۔ کام کیا ہے اس کے پیسے مانگتا ہوں۔

انسانی اعمال کے نتائج کو مرتب کرنے میں خدا کا قانون بڑا سریع الحساب واقع ہوا ہے

ارض وسما کا خدا، وہ ایسا خدا ہے، یہ بھی نہیں ہے کہ شام کو مزدور کھڑا ہے مزدوری کر کے آپ بیٹھے ہوئے ہیں صاحب دوستوں کی محفل میں، سگریٹ اڑ رہا ہے، کش لگ رہے ہیں، سیون اپ پی جا رہی ہے۔ وہ بے چارا یوں کھڑا ہوتا ہے جیسے گداگر بھیک مانگنے والا۔ یہاں وہ ڈانٹ کے کہتا ہے ''کیوں کیوں کھلوتا ہیں؟ او جی پیسے لینے نیں مزدوری دے' جا جا کل ملن گے تہانوں''۔ یعنی مزدوری کے پیسے وہ مانگ رہا ہے، دھتکارا جا رہا ہے ایک گداگر کی طرح سے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ (3:199) اس مزدور کی مزدوری اس کا معاوضہ اس کے کام کا، ہم دیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ (3:199) انتظار نہیں کرائیں گے فوراً حساب کر دیں گے۔ عزیزانِ من! سریع الحساب ہے۔ جنت اور جہنم کو وہ مرنے کے بعد آخرت پہ اٹھا نہیں رکھتا ایک ایک سانس میں آپ کے ہاں کی جنت اور جہنم مرتب ہوتی چلی جاتی ہے۔ سریع الحساب۔ وہ اس کا ACCUMULATIVE EFFECT ہوتا ہے وہ میزانِ کل، جسے آخر میں آپ کہتے ہیں جو یہ چیز پیدا کرتی ہے۔ اس میں تو ایک ایک سانس میں آپ کے ہاں یہ چیزیں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ سریع الحساب۔

قرآنِ حکیم کے آئینہ میں جنت کا حصول اجتماعیت کے پیغام کی برومندی میں ہے

آخری آیت سورۃ اٰلِ عمران کی آ گئی۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا (3:200) آ و تمہیں بتائیں یہ جنت یہاں کیسے پیدا ہوتی ہے، وہاں کیسے ملتی ہے؟ قرآن انفرادی زندگی سکھانے کے لیے نہیں آیا۔ مذہب اور دین میں ایک فرق یہ بھی ہے، مذہب ہمیشہ انفرادی ہوتا ہے۔ ایک فرد اپنے گھر میں بیٹھا، ایک گوشے میں بیٹھا، اپنے مصلے پہ بیٹھا، مسجد میں بیٹھا، خانقاہ میں بیٹھا، جنگل میں بیٹھا، غاروں میں بیٹھا، پہاڑ کی چوٹی کے اوپر بیٹھا، ایک فرد وہ اپنے ذہن میں سمجھتا ہے میں خدا کے ساتھ تعلق قائم کیے ہوئے ہوں اپنا۔ گیان دھیان، بھگتی، پوجا پاٹ اور بعینہ آپ کے ہاں کی جسے آپ بندگی اور عبادت کہتے ہیں، وہیں ہیں آپ۔ قرآن دین دیتا ہے اور دین نظام کا نام ہے اور نظام انفرادی طور پہ نہیں ہوتا، یہ اجتماعی زندگی ہوتی ہے۔ افراد کے اندر ایک نظم پیدا ہوتا ہے۔ کس چیز سے یہ نظم پیدا ہوتا ہے؟ کس چیز سے یہ جڑتے ہیں؟ وحدتِ نصب العین سے، مقصدِ زندگی ایک، مقصودِ حیات ایک، منزل ایک، نصب العین ایک، آئیڈیالوجی ایک۔ پاکستان کا نظریہ کیا؟ ایک منزل، ایک منتہا، ایک مقصد۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے قبلہ کہتے ہیں۔ اسی کا ترجمہ نصب العین ہے۔ وہ شے جو ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے۔ نصب العین کی وحدت سے افرادِ مل کے ایک جماعت بنتے

ہیں' اسے نظام کہا جاتا ہے۔ نظام کے ساتھ جو زندگی ہے وہ دین کی زندگی ہے۔ اسی سے اس دنیا کے اندر جنت مرتب ہوتی ہے' اسی سے اس کے بعد کی زندگی جو ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے' جنت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ آخری آیت پوری سورۃ کی۔ اور آخری آیات سورتوں کی آپ دیکھیں گے ''اوجنوں تت کڈیا ہویا کیندے نیں'' نچوڑ ہوتا ہے ملخص ہوتا ہے پوری تعلیم کا۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا (3:200) پہلی چیز یہ ہے اے جماعتِ مؤمنین! زندگی میں تصادمات آئیں گے' ٹکراؤ آئے گا' مقابلہ ہوگا' موانعات آئیں گے۔ اور یہ موانعات ہی تو ہیں درحقیقت جو زندگی کی ندی کی روانیوں میں تیزی پیدا کرتے ہیں۔ یہ دیکھا یہ جسے ٹھوکر کہتے ہیں فیروز روڈ کے پل کے آگے جو ہے' راستے میں پتھر لگا دیے جاتے ہیں کاہے کے لیے؟ کہ اس سے ٹکراؤ کے بعد اس کی رفتار پہلے سے دس گنا زیادہ بڑھتی ہے۔ یہ جو منزل تک ندی پہنچتی ہے' یہ راستے کے ٹکراؤ ہوتے ہیں' فالز ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ پہنچتی ہے۔ ٹکراؤ پیدا ہونے کے لیکن ٹکراؤ میں بچتا وہ ہے جو استقامت سے اس کے اوپر رہے' ثبات جس کے اندر ہو۔ اِصبروا کے معنی یہ ہیں ثابت قدم رہو استقامت سے رہو۔ اور آپ کو معلوم ہے نا آپ کے وہاں پہ ترجمہ جب ہوا' ترجمہ ہی نہیں' لفظ ہی آپ کے ہاں جو استعمال ہوا ''اچھا بھئی ہن فیر ہوتے کچھ نئیں ہوسکدا ہن صبر کرو یعنی جدوں کچھ نہ ہوسکدا ہووے صبر'' یعنی انتہائی بے بسی بے کسی' جب کچھ نہ ہوسکتا ہو کوئی چارا نہیں ہے' اس کا نام۔

قومیں تب زوال پذیر ہوتی ہیں کہ جب انسان کے لیے بنیادی اصطلاحات کے الفاظ کا مفہوم بدل دیا جائے

آپ نے دیکھا جب بنیادی تعلیم بدلتی ہے' الفاظ وہی رہتے ہیں دین کے۔ جو الفاظ ہیں' ان کا مفہوم کس طرح سے بدل جاتا ہے۔ مردہ وہی ہوتا ہے جو دو منٹ پہلے ہوتا ہے۔ شکل وصورت اس کی اسی قسم کی ہوتی ہے' کئی دنوں تک بھی ایسا رہ سکتا ہے' ممی کرنے سے تو وہ ہزار ہا سال تک بھی رہتا ہے۔ فارم شکل وصورت اس کی وہی ہوتی ہے' ایک روح اندر نہیں ہوتی نا۔ عزیزانِ من! مذہب اور دین میں فرق یہی ہوتا ہے۔ دین کی جب روح نکل جاتی ہے تو اس کی فارم ساری وہی ہوتی ہے جسے مذہب کہتے ہیں۔ الفاظ کے مفہوم بدل جاتے ہیں' الفاظ وہی رہتے ہیں۔ اِصْبِرُوْا (3:200) عربی زبان میں اسے کہتے ہیں جو تمام توازن برقرار رکھے کسی کا' بیلنس برقرار رکھے جو چیز۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے پہلے بھی یہ کہا تھا ان کے ہاں کشتی جب ڈولنے لگے اس کے اندر جو سامان لدا ہو یا سواریوں سے وزن پورا قائم نہ ہو رہا ہو تو ایک بڑا سا پتھر لے کے اس کے ایک طرف رکھ دیتے ہیں اس سے توازن قائم ہوتا ہے ''آ ایتھے ٹانگے آں اچ وی اے رکھ دے ہیگے نیں'' یہ جو وہ رکھتے ہیں' یہ صبور کہلاتا ہے کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو قائم کرنے والی چیز' اسے صبر کہتے ہیں۔ زندگی کی شاہراہ کے اندر قدم لڑکھڑانے نہ پائے' یہ یقینِ محکم' یہ اس قسم کے مستحکم اعمال' یہ

تمہارا توازن برقرار رکھیں گے' پاؤں جمے ہوئے رہیں گے۔ پاؤں جمے ہوئے اس کے ہوتے ہیں جس کا بیلنس قائم رہے۔

زندگی میں کامیابی کا رازصبر' استقامت' سبقت اور ربط باہم میں پوشیدہ ہے

جس شخص کا بیلنس قائم نہیں رہتا' استقامت نہیں رہتی' پاؤں اکھڑتا ہے۔ اِصبروا کے معنی ہوتے ہیں ایسا توازن جس سے پاؤں جمے ہوئے رہیں۔اصْبِرُوْا ٹھیک ہے رکھواپنا اپنا؟ لیکن یہ تو دین ہے اصْبِـرُوْا وَ صَـابِرُوْا (3:200) خود ثابت قدم رہو دوسروں کو ثابت قدم رہنے کے لیے تقویت پہنچاؤ' ذریعہ بنو دوسروں کے ثابت قدم رہنے کا' ان کی استقامت کا۔ یہ دوسرا کام جب آپ ساتھ کریں گے تو پہلے سے سبقت لے جائیں گے۔ صَـابِـرُوْا کے وزن کے اندر سبقت بھی ہوتی ہے ہمیشہ۔ خود کرو پھر دوسروں کے ایسا ہونے کا ذریعہ بنو۔ کیا کرو اس کے لیے؟ وَ رَابِـطُوْا قف (3:200) ربطِ باہم رکھو۔ میں نے کہا تھا آپ سے ایسی پہاڑی ندیاں جس میں پانی زیادہ گہرا تو نہیں ہوتا لیکن تیز بڑا ہوتا ہے' اس میں اکیلا اگر آدمی اس کو پار کرنا چاہے' نہیں کرسکتا' بہا کے لے جاتی ہے۔ اس میں جانے کا طریقہ یہ ہوتا ہے دو چار دس آدمی وہ بانہوں میں بانہیں ڈال کے اور اس طرح سے وہ ندی کو پار کرتے ہیں۔ یہ ہر ایک کی ہمت ہر ایک کی قوت تو اتنی ہوتی ہے جتنے آدمی یہ جمع ہوتے ہیں اس سے ہوتا کیا ہے بانہوں میں بانہیں ڈالنے سے؟ آپ دیکھتے ہیں کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی ان کو پھر پاؤں سے نہیں نکال سکتا۔ یہ جو اس انداز سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کے زندگی بسر کرنا ہے اسے رَابِطُوْا قف (3:200) کہتے ہیں عربی زبان میں۔

جماعت سازی کا بنیادی مقصد انقطاع کے بغیر مفلحون کی منزل کو حاصل کرنا ہے

اصْبِـرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا قف وَ اتَّـقُوا اللّٰهَ (3:200) اور یہ سارا کچھ کاہے کے لیے کرو؟ جماعتیں تو نازی ازم میں بھی بنیں' گی فاش ازم میں بھی بنیں گی' ڈکٹیٹر شپ میں بھی بنیں گی' ڈاکوؤں کی بھی ہوں گی' یہ ساری چیزیں تو غالبًا وہ بھی پیدا کرلیں گے۔ ORGANIZATION جسے آپ کہتے ہیں۔وَ اتَّـقُوا اللّٰهَ (3:200) یہ سب کچھ کرو قوانینِ خداوندی کی نگہ داشت کے لیے۔ یہ اجتماعی زندگی ثبات کی' استحکام کی' ایک دوسرے کے لیے ثبات کے محکم بننے کا ذریعہ بننے کی' بانہوں میں بانہیں ڈال کے سفرِ حیات طے کرنے کی۔ یہ اجتماعی زندگی کاہے کے لیے ہے؟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ (3:200) بس یہاں آ کے مومن کی اجتماعی زندگی اور غیرِ مومن کی اجتماعی زندگی میں فرق پیدا ہوگیا۔وَ اتَّـقُوا اللّٰهَ (3:200) قوانینِ خداوندی کی نگہ داشت کرو۔ اور اس کے بعد ہے لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (3:200) چاہتے یہ ہونا کہ کامیابی ہو زندگی کے اندر SUCCESSFUL LIFE تمہاری بسر

ہو یہ ہے راز' یہ ہے گُر' یہ ہے اصول۔ اور پھر قرآن نے تو کامیابی کے لیے بھی جو لفظ استعمال کیا ہے' میں نے کئی دفعہ آپ سے عرض کیا ہے' وہ مثال ہمیشہ زراعت کی' کھیتی کی مثال دیتا ہے۔ وہ فلاحت کہتے ہی کاشت کاری کو ہیں۔ مُفۡلِحُوۡنَ کے معنی جن کی کھیتیاں پروان چڑھ جائیں۔ ایک مثال میں قرآن پورا پروگرام آپ کا دے جاتا ہے۔ کسان کیا کرتا ہے؟ نہایت محنت سے مشقت سے زمین کو تیار کرتا ہے۔ پھر کہیں سے ڈھونڈ کے اچھا بیج لاتا ہے۔ یہ ہے ایمان جسے آپ کہتے ہیں تخمِ صالح' کلمۂ طیب قرآن نے جسے کہا ہے' صحیح نظریۂ زندگی اسے لاتا ہے' مٹی میں ملا دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد پانی دیتا ہے' رکھوالی کرتا ہے' روز اس کے اندر آ کے صبح سے شام تک کرتا ہے اور جیسا میں کہا کرتا ہوں' اس صبر سے اس استقامت سے کرتا ہے وہ کہ درمیان میں کہیں انقطاع نہیں آتا INTERRUPTION نہیں آتی' تھکتا نہیں۔ ہر صبح اپنے گھر سے وہ کدال اور رسی لے کے نکلتا ہے' سارا دن محنت کرتا ہے' اسی طرح خالی ہاتھ گھر واپس آ جاتا ہے شام کو۔ کبھی تھکتا نہیں ہے۔ ورنہ جس مزدور کو صبح سے شام تک مزدوری کرے' شام کو مزدوری نہ ملے دو تین دن بھی' وہاں یہ کچھ کرے اور کچھ نہ ملے' اس کے بعد وہ کبھی اس مزدوری پہ نہیں جاتا۔ یہ کسان کیوں جا رہا ہے؟ اسے ایمانِ محکم ہے اس چیز پہ کہ جو بیج میں نے ڈالا ہے اور جو محنت میں کر رہا ہوں اس کے اور اس کی ثمر باری کے درمیان ایک وقفہ تو ہے لیکن یہ بیج سات سات سو دانے مجھے دے گا۔ اسے یؤمنون بالغیب کہتے ہیں۔ وہ شے جو اس وقت محسوس طور پر میرے سامنے نہیں لیکن آنے والی ہے اس پر ایمانِ محکم ہے اس کسان کا جو اسے چھ چھ مہینے تک لگا تار اس قسم کی محنت کرنے کے اوپر برابر محرک رکھتی ہے' ترغیب دیتی ہے' ثابت قدم رہتا ہے وہ۔ اور اس طرح سے پھر ایک دن جا کے اس کی کھیتی پک جاتی ہے۔ اصۡبِرُوۡا وَ صَابِرُوۡا وَ رَابِطُوۡا قف وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (3:200) تا کہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں۔

قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ اس کی ایک ایک آیت اور اس کی ہر ایک سورۃ باہمی طور پر مربوط ہے

عزیزانِ من! یہ ہے آخری آیت سورۂ آلِ عمران۔ تیسری سورۂ آج ہم نے ختم کی آئندہ درس میں ہم سورۃ نسآء کو شروع کریں گے۔ واتَّقُوا اللّٰهَ (3:200) سے بات ختم ہوئی اور وہاں بات شروع ہوئی یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ (4:1) اسی تقویٰ کی بات آگے چل پڑی۔ قرآن کی آیات میں ہی ربط نہیں ہے اس کی تو سورتوں کے اندر بھی ربط ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے' وہ میرے ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)